تبریز ترجمۂ ابریز

حصہ دوم

مواعظ وارشادات

قطب الواصلین، غوث العارفین حضرت عبد العزیز دباغ قدس سرہ

مترجمہ: حضرت مولانا مولوی محمد عاشق الٰہی میرٹھی نور اللہ مرقدہ

ناشر: مدینہ پبلشنگ کمپنی مشہور محل میکلوڈ روڈ۔ کراچی

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

قطبُ الواصلین غوث العارفین حضرت عبد العزیز دبّاغ قدس سرّہٗ

کے کلماتِ طیّبات وارشادات

بنام

تبریز

ترجمہ

ابریز

حصّہ دوم

مرتبہ: قدوۃ العلماء زبدۃ الفضلا مولانا الحافظ احمد بن مبارک السّلجماسی ؒ

مترجمہ حضرت مولانا مولوی محمد عاشق الٰہی میرٹھی نور اللہ مرقدہ

ناشر

مدینہ پبلشنگ کمپنی - بندر روڈ - کراچی

MASOOD-FAISAL JHANDIR LIBRARY
Acc No. 04-583
★ MAILSI ★
TECHNICAL SUPPORT BY
...GHTAI
PUBLIC LIBRARY

شالامار ٹاؤن لاہور

گزارش

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ؕ

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰہِ وَحۡدَہٗ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنۡ لَّا نَبِیَّ بَعۡدَہٗ ۔ اَمَّا بَعۡدُ

بندہ نے عرصہ ہوا کتاب ابریز کا مطالعہ کیا تھا جو کہ غوث الزماں شمس العارفین سید عبد العزیز دباغ قدس اللہ سرہٗ کے ارشاداتِ علیہ اور حقائقِ سنّیہ کا مجموعہ ہے اور اس کو ممدوح کے خادمِ خاص قدوۃ العلماء زبدۃ الفضلاء امام ہمام علّامہ احمد بن مبارک سلجماسی رحمۃ اللہ علیہ نے مدوّن و مبوّب فرمایا تھا۔ اس کے مضامینِ عجیبہ و مفیدہ کی وجہ سے دل چاہتا تھا کہ اس کا ترجمہ کر دوں کہ اردو داں برادرانِ اسلام بھی مستفیض ہوں۔ اور بعض احباب کا بھی بارہا اصرار ہوا مگر کبر سنی و ضعفِ دماغ کے ساتھ ان مباحثِ دقیقہ سے اپنے مبلغِ علم و فہم کا عجز و قصور دیکھ کر طبیعت رک جاتی اور ہمت پست ہو جاتی تھی لیکن اب میرے محترم جناب الحاج حافظ محمد اسمٰعیل صاحب دہلوی خلف حاج جیون بخش صاحب مرحوم نے اس کا شوق زیادہ ظاہر فرمایا اور مجھے بھی خیال ہوا کہ عمر کا اخیر حصہ ہے، کیا عجب ہے حق تعالیٰ شانہٗ کو کام لینا اور میرے لئے اس کو حسنِ خاتمہ کا وسیلہ بنانا منظور ہو، اسلئے محض اس کے لطف و کرم کے بھروسہ پر کیم محرم کو ترجمہ شروع کر دیا۔ میرے بدن کا بال بال اپنے مولیٰ کریم کا شکر گزار اور اس کے فضل و انعام کا معترف ہے کہ اس نے چند مہینے میں باحسن وجوہ اس سے فارغ فرما دیا۔ اور حصۂ اوّل طبع ہو کر ناظرین کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے حصۂ دوم زیرِ طبع ہے اور انشاء اللہ ماہِ آئندہ میں وہ بھی زیورِ طبع سے مزیّن ہو جائے گا۔ مجھے اس کے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس کتاب میں کیا جواہرات

بھرے ہوئے ہیں، جب کتاب آپ کے سامنے ہے تو مطالعہ سے آپ خود ملاحظہ فرمالیں گے میرا خیال یہ ہے کہ اس کا ہر مضمون ایسا بے بہا اور عوام ہی نہیں بلکہ خواص کے لیے بھی ایسا انمول ہے کہ دوسری جگہ نصیب ہونا مشکل ہے۔

حق تعالیٰ شانہٗ اس کو مقبول اور مخلوق کو اس سے متمتع فرماکر میرے لئے صدقۂ جاریہ بنائے اور حلاوتِ ایمان اور حُسنِ خاتمہ نصیب فرمائے۔ ویرحم اللہ عبداً قال آمینا۔ ناظرین سے التماس ہے کہ مطالعۂ کتاب سے مستفید و محظوظ ہوں تو بندۂ ناچیز کے لئے اور محمد اسمٰعیل صاحب کے لئے کہ اصل محرک اور سبب قریب اس کے وہی ہیں۔ دعائے خیر فرمادیں۔ وصلی اللہ تعالیٰ وبارک وسلم علیٰ نور الوجود والسبب فی کل موجود محمد وآلہ واصحابہ والتابعین وجمیع الاحراد۔

بندہ عاشق الٰہی عفی عنہٗ

واردِ حال

دارالسلام، مظفرنگر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

(باب سوم)

ان ظلمتوں کا ذکر جو بندوں کی ذات اور ان کے اعمال پر داخل ہوتی ہیں اور انکو خبر بھی نہیں ہوتی

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایک مرتبہ مجھے میرے شیخ حضرت عمر بن محمد ہواری رحنے اس جنگل کی طرف بھیجا جہاں ان کے مزدور اجرت پر کام کر رہے تھے اور تاکیداً فرمایا کہ جا کر ان کے کارِ خدمت کو غور سے دیکھو چنانچہ میں چلا گیا۔ ظہر کے وقت حضرت شیخ بھی تشریف لے آئے اور ہم نماز سے فارغ ہو کر شام تک وہیں بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ مزدور اپنے کام سے فارغ ہو گئے اور ان کی اجرتیں ان کو دے دی گئیں۔ جب سارے مزدور چلے گئے تو میں نے حضرت کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا دیکھا کہ غصہ آ رہا ہے۔ حتیٰ کہ میں بھی ڈر گیا۔ اس وقت آپ نے مجھ سے فرمایا تم نے کچھ دیکھا بھی؟ میں نے عرض کیا کہ میں نے تو کچھ نہیں دیکھا۔ فرمایا غور کرو شاید کچھ دیکھا ہو۔ مزدوروں کی کار خدمت میں تم نے کیا بات دیکھی؟ میں نے کہا جب تک آپ تشریف نہیں لائے تھے تو بہت سست کام کر رہے تھے اور جب آپ آگئے اور ان کی نظر آپ پر پڑی تو بڑی چستی کے ساتھ کام کرنے لگے فرمایا ہاں، آج تم نے فاسقین کے اعمال اور محرومین کے اعمال کا نظارہ کیا۔ فاسقین تو وہ لوگ ہیں جو عبادتیں کرتے ہیں مگر عبادت و اطاعت کا صدور بغیر نیت اور قصد کے محض عادت کی بنا پر ہوتا ہے کہ نماز میں بھی ان کا اٹھنا بیٹھنا اور حرکت و سکون باقتضائے عادت و طبیعت ہوا کرتا ہے۔ کوئی غرض اچھی یا بری اس کی محرک نہیں بنتی۔ لہٰذا ان کی عبادت نہ اللہ کے لئے ہے نہ غیر اللہ کے لئے۔ بلکہ محض عادت و طبیعت کی خاطر، جیسے ایک شخص کو بھوک ہو نہ پیاس بلکہ فرض کرو اتنا شکم سیر ہو کہ کھانے کی خواہش تو درکنار طاقت اور گنجائش بھی نہ ہو کہ کچھ کھا سکے وہ لوگوں کے ساتھ باغ میں چلا جاتے اور یہ دیکھ کر کہ لوگ وہاں چل پھر رہے ہیں اور قسم قسم کے پھل کھا رہے ہیں، یہ بھی ان کے ساتھ پھرنے لگے، تو دوسروں کا چلنا پھرنا پیٹ بھرنے کی خاطر اور نفس کو لذت پہنچانے کی غرض سے ہوگا مگر اس کا چلنا پھرنا محض عادت کی بنا پر ہوگا کہ نہ کھانا اس کو مقصود ہے نہ نفس کو لذت پہنچانا مطلوب ہے۔ نہ اپنے بھائیوں کی مدد کرنا اس کے لئے محرک ہے اور نہ ان کی موافقت و دل جوئی اس کی غرض ہے بلکہ دوسروں کو سیر کرتا اور گشت لگاتا دیکھ کر صرف عادت و طبیعت کے اقتضا سے چلنے پھرنے لگا ہے۔ بس یہ مثال ہے فاسقین کے اعمال کی اور محرومین وہ لوگ ہیں جن کے اعمال اپنے ذاتی نفع اور اغراض نفس کی خاطر ہوتے ہیں، اللہ کے واسطے

نہیں ہوتے۔ ایسے اعمال سے بجائے قرب کے حق تعالیٰ کا بعد بڑھتا ہے۔ اس لئے کہ وہ ذاتِ عبد کی حقیقت کے خلاف ہیں۔ کیونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ذاتِ عبد حق تعالیٰ کی پیدا کردہ ہے، اس کی مملوک ہے اور (ہر جہت سے) اسی کی طرف منسوب ہے۔ کسی دوسرے کی طرف اس کا انتساب کسی حیثیت سے بھی نہیں ہے پس اگر اس کے افعال کا صدور اس حقیقت پر ہوتا تو اس کے تمامی افعال صرف اللہ کے لیئے ہوتے۔ گویا وہ کہتا کہ میرے افعال میں میرا کوئی حصہ نہیں ہے۔ کیونکہ تمامی افعال جو مجھ سے صادر ہوئے وہ خود اللہ ہی کے مخلوق ہیں۔ ایسے اعمال کو بے شک کہا جاتا کہ حقیقتِ ذات کے موافق صادر ہوتے۔ لیکن جب وہ یہ کہہ رہا ہے کہ میں تو بے شک اللہ کا ہوں، مگر میرے افعال خود میرے ہیں اور ان کے صدور کے وقت نیت کر رہا ہے ذاتی نفع اور حصولِ اغراض کی تو ایسے اعمال کو سرِ حقیقت کے موافق کسی طرح نہیں کہہ سکتے اور ناممکن ہے کہ یہ اللہ کا کوئی حق کچھ بھی ادا کر سکے۔ کیونکہ جو عمل کرتا ہے وہ اپنی ذاتی غرض کے لئے کرتا ہے نہ کہ اللہ کا حق ادا کرنے کی خاطر اور جب یہ شخص افعال میں اللہ سے بے تعلق و جدا ہو گیا تو اللہ کی عطا بھی اس سے منقطع اور علیحدہ ہو جائے گی۔ اور منجملہ محرومین کے یہ بھی (اجر و ثواب سے) محروم ہو جائے گا۔ میں نے عرض کیا کہ عمل کرنیوالے کو اجر و ثواب کا ذکر کر کے بکثرت آیات و احادیث میں ترغیب دی گئی ہے۔ پس اگر اجر و ثواب کی خاطر (کہ وہ ذاتی نفع اور نفسانی اغراض ہیں) عمل کرنا اللہ سے بے تعلقی ہوتا جیسا کہ حضرت عمرو بن ہواری کے ارشاد سے معلوم ہوا تو احادیث و آیات میں بڑے بڑے اجر و ثواب بیان کر کے اعمال کی ترغیب کہیں نہ دی جاتی۔ فرمایا کہ آیات و احادیث کا مضمون ہمارے خلاف نہیں ہے کیونکہ ان میں یہ ارشاد نہیں فرمایا کہ اعمال اپنے نفسوں کی خاطر کیا کرو اور میں ایسے اعمال پر تم کو بڑے بڑے اجر و ثواب دوں گا۔ وہاں تو یہ ارشاد ہے کہ اطاعت کرو میری اور عبادت کرو خالص میرے لئے پس میں اجر و ثواب دوں گا جس کا مطلب یہ ہوا کہ اپنے اعمال میں ہماری نیت (اجر و معاوضہ کی نہیں بلکہ) اللہ کے لئے ہو (کہ سر جھکانا اور حکم کی تعمیل کرنا محض) اس کی عظمت اور کبریائی کی خاطر اور ان احسانات کی وجہ سے ہو جو رات دن بڑی بڑی نعمتوں کی صورتوں میں اس نے ہم پر فرمائی ہیں۔ اور اس پر وہ اپنے فضل و کرم سے اجر و ثواب عطا فرمائے ہاں اگر احادیث و آیات کا مضمون یہ ہوتا کہ اخلاص والی عبادت پر ہم اجر نہ دینگے تب بیشک ہماری تقریر کے خلاف ہوتا (مطلب یہ ہے کہ عبادت اس نیت سے کرنا کہ ہمیں اجر ملے خود غرضی ہے اور ثواب سے محروم بنا دیتی ہے۔ البتہ اس نیت سے کرنا کہ اللہ جل جلالہٗ کا ہم پر حق اور مالکانہ استحقاق ہے کہ ہم اس کی غلامی کا اظہار اور اس کے حکم کی تعمیل کریں اخلاص کہلاتا ہے اور اسی پر اجر و ثواب مرتب ہوتا ہے) اور کس درجہ جاہل اور احمق ہے وہ بندہ جس کا یہ گمان ہو کہ اپنے افعال سے نیکیاں حاصل کروں گا اور اجر و ثواب کماؤں گا

جب کہ جانتا ہے کہ افعال میں اس کا بال برابر بھی دخل نہیں، خود یہ بھی اللہ ہی کا پیدا کردہ ہے اور اس کے افعال بھی اللہ ہی کے پیدا کئے ہوئے ہیں پھر ہمیں کیسے جائز ہے کہ ان نیکیوں پر بھروسہ کریں جو اللہ تعالیٰ کے پیدا کئے ہوئے افعال پر مرتب ہوئی ہیں اور اللہ کے فضل وکرم پر بھروسہ نہ کریں مگر بات یہ ہے کہ غفلت آنکھوں کو اندھا بنا دیا کرتی ہے (اور اس لئے حقیقت تک نظر نہیں جاتی) ایک عابد اپنے ذاتی نفع کی خاطر کہ عبادت پر اللہ میری مرادیں پوری فرمائے گا کامل بیس برس عبادت کرتا اور بڑے الحاح کے ساتھ دعائیں مانگتا رہا۔ مگر ایک مراد بھی اس کی پوری نہ ہوتی۔ بہت حیران ہوا اور کہنے لگا کیا بات ہے بیس سال سے عبادت کر رہا ہوں اور دعا مانگ رہا ہوں مگر حق تعالیٰ پوری نہیں فرماتا۔ اس وقت حق تعالیٰ نے اس پر رحمت نازل فرمائی اور اس کو نفس اور افعال کی معرفت بخشی (کہ حقیقت منکشف ہو کر آنکھیں کھل گیئں)، تو کہنے لگا درحقیقت میں بڑا احمق ہوں جب کہ اللہ ہی نے مجھے پیدا کیا اور اسی نے میرے افعال کو پیدا کیا اور اسی نے میرے اندر صحت پیدا فرمائی اسی نے وہ جگہ پیدا فرمائی جس پر عبادت کر رہا ہوں اسی نے پانی پیدا کیا جس سے وضو کرتا ہوں، اسی نے کپڑا پیدا کیا جس سے ستر چھپاتا ہوں، اسی نے وقت اور زمانہ پیدا فرمایا جس میں عبادت کرتا ہوں (غرض عبادت کے تمامی اجزاء اور تمامی شرائط و ارکان اور تمامی افعال و قویٰ اسی کے پیدا کردہ اور عطا فرمائے ہوئے ہیں) میں نے کیا کیا جس پر اجر کا طالب ہوں۔ اور اس کی وجہ سے شکر و ثنا کا استحقاق جتاؤں۔ واللہ میں نے کچھ بھی نہیں کیا اور کیا تو یہ کیا کہ میرے اندر جو تصرفات و افعالِ الٰہیہ جاری تھے ان کو اللہ سے قطع کر کے اپنی طرف منسوب کر لیا۔ اور اس پر اجر و ثواب مانگنے لگا۔ اللہ سے ہر قسم کی تمنائیں رکھنے لگا۔ طرہ برآں تعجب کرنے اور یہ کہنے لگا کہ آستانہ خدا پر بیس سال سے پڑا ہوں مگر اس نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ۔ یا اللہ میری توبہ۔ غرض جب اس نے سچی توبہ کی (اور حقیقت شناس ہو کر سمجھ لیا کہ خود غرضی کی عبادت الٹا وبال ہے) تب حق تعالیٰ نے اس کی ساری مرادیں بھی پوری فرما دیں، اور وہ معرفتِ زائدہ عطا فرمائی جس کے مقابلہ پر جنت بھی کوئی چیز نہیں۔ ۱۲

امام سیوطی رحؒ نے بھی بدور سافرہ میں ایک حدیث نقل فرمائی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پہلے زمانہ میں ایک شخص تھا جس نے ایک جزیرہ میں چھ سو برس اللہ کی عبادت کی تھی۔ حق تعالیٰ نے اس کے لئے وہاں شیریں پانی کا ایک چشمہ جاری اور انار کا ایک درخت پیدا فرما دیا تھا جس میں روزانہ ایک انار لگتا اور وہ اس کی غذا کے لئے کافی ہو جایا کرتا تھا۔ جب اس کا انتقال ہوا تو حق تعالیٰ نے ارشاد فرمایا جاؤ جنت میں میری رحمت اور فضل سے۔ کہنے لگا نہیں اے پروردگار بلکہ چھ سو برس کی عبادت کی وجہ سے تب حق تعالیٰ نے محاسبہ شروع فرما دیا اور فرمایا کہ تیری یہ چھ سو برس کی عبادت تو میری عطا کردہ نعمتوں میں

ایک نعمت کی بھی مکافات نہیں کر سکتی۔ میں نے تیرے لئے شور سمندر میں میٹھے پانی کا چشمہ جاری کیا۔ بتا کہ اس نعمت کا تو مستحق کس بنا پر ہوا؟ نیز میں نے تیرے لئے انار کا درخت اگایا جس میں روزانہ پھل لگتا تھا حالانکہ دوسروں کے لئے سال بھر میں صرف ایک مرتبہ پھل آتا تھا۔ بتا کہ اس نعمت کا تو مستحق کس بنا پر ہوا؟ نیز میں نے تجھ کو اتنی دراز عمر عطا فرمائی حالانکہ دوسروں کی عمر اس سے بہت کم ہوتی تھی۔ نیز اس مدت دراز تک میں نے تجھ کو عبادت کی طاقت بخشی حالانکہ دوسروں میں یہ طاقت نہیں بخشی۔ نیز میں نے تجھ سے شیطان کو دور اور تجھے اس سے محفوظ رکھا حالانکہ وہ بہتیروں کو ہلاک و تباہ کر چکا ہے۔ نیز اتنی مدت دراز تک میں نے تجھ کو تندرست رکھا۔ حالانکہ دوسروں کو یہ صحت نہیں بخشی۔ نیز میں نے تیرے جسم کو پیدا کیا حالانکہ تو لاشئ محض تھا۔ میں نے تیرے حرکات و سکنات کو پیدا کیا اور ہر قسم کی نعمتوں سے تجھے مالا مال کیا (ان بے شمار پیشگی نعمتوں کی مکافات کا حساب کرنے کے بعد بتا کہ کیا لے کر آیا ہے) اچھا اس کو لے جاؤ دوزخ میں۔ چنانچہ فرشتے اس کو دوزخ کی طرف لے چلے۔ جب اس نے دیکھا کہ بس تباہ ہو گیا تو عرض کرنے لگا کہ اے پروردگار مجھے جنت میں داخل فرما دیجئے محض اپنے فضل و رحمت سے۔ حق تعالیٰ نے کہ ارحم الراحمین اور اکرم الاکرمین ہے ارشاد فرمایا، اچھا اس کو واپس لے جاؤ۔ اور جنت میں داخل کر دو میری رحمت اور فضل سے۔ اس کے بعد اس سے فرمایا جاؤ جنت میں تم میرے بڑے پیارے بندے ہو۔ اس کے بعد میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ زیادہ بری فاسقین کی عبادت ہے یا محرومین کی؟ فرمایا کہ محرومین کی عبادت پھر افضل اور بہتر ہے۔ ایک وجہ سے۔ اور وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ رؤف و رحیم اور لطیف ہے جب دیکھتا ہے کہ کوئی بندہ خود غرضی ہی کے درجے میں سہی مگر عبادت میں لگا اور پابندی سے جما ہوا ہے تو اس پر فضل و رحم فرماتا اور اس کی ذات اور اس کے افعال کی حقیقت سے واقف اور شناسا بنا دیتا ہے اور پھر وہ (خود غرضی سے) تائب ہو کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا (اور محض لوجہ اللہ عبادت کرنے لگتا) ہے۔ جیسا کہ قصہ مذکورہ میں بیس سال عبادت کرنے والے کا حال ہوا، اور نیز بے شمار مخلوق کے ساتھ حق تعالیٰ کا یہ برتاؤ ہو چکا ہے۔ میں نے عرض کیا تو اپنی رحمت و فضل ہی سے ان کو وہ اجر و ثواب بھی عطا فرما دے گا، جو آیات و احادیث میں مذکور ہیں کہ جو وجہ (یعنی لطف و کرم) اس کی ہو سکتی ہے کہ ان پر رحم فرمایا اور ان کو حقیقت سے واقف بنایا۔ وہی وجہ اس کے لئے کافی ہے کہ (باوجود خود غرضی کی عبادت کے) ان پر اجر و ثواب عطا فرما دے۔ فرمایا اگر تمہارا یہ مطلب ہے کہ جب حقیقت کی معرفت بخش دی تو اب اجر بھی عطا فرما دے تب تو ٹھیک ہے اور اگر یہ مطلب ہے کہ وہ افعال کو حق تعالیٰ سے قطع کئے اور اپنی طرف منسوب کرتے رہیں اور اس حالت (بے تعلقی) سے اللہ پر اجر کا استحقاق جتاتے رہیں۔ تو ایسا خیال بھی نہ لاؤ کہ اجر مل جائے کیونکہ گو قدرت میں

داخل ہے مگر عادتِ الٰہیہ اور قانون کے خلاف ہے) میں نے عرض کیا کہ اچھا ایک شخص نے حدیث میں سنا کہ جو فلاں کام کرے گا اس کو اتنا اجر ملے گا اور جو فلاں کام سے باز رہے گا اسے اتنا ثواب دیا جائے گا۔ یہ سن کر وہ حکم کی تعمیل کیلئے اور اس اجر و ثواب کے حاصل کرنے کے لئے لپکا جو حدیث میں آیا ہے، اور اس کا یہ عقیدہ بھی ضرور ہے کہ بغیر اذنِ خدا کے (میں تو کیا، ذرّہ بھی نہیں ہل سکتا) تو ایسی صورت میں اس عمل پر کیا حکم لگائیں گے ؟) فرمایا اگر اس کی خالص نظر اور اصل نیت تعمیلِ حکمِ خدا کی طرف گئی ہے اور اجر و ثواب لینے کی نیت اس کے تابع ہے کہ فرض کرو اجر و ثواب حدیث میں مذکور نہ ہوتا تب بھی وہ تعمیل میں ایسا ہی لپکتا جیسا اب لپکا ہے تب تو کچھ مضائقہ نہیں اور اگر اس کی خالص نظر اور اصل نیت تحصیلِ اجر کی طرف ہے اور تعمیلِ حکم کی نیت اس کے تابع ہے کہ اجر و ثواب اگر مذکور نہ ہوتا تو تعمیلِ حکم نہ کرتا تو یہ وہی عبادت ہے جس میں ہم گفتگو کر رہے ہیں اور اس کو مذموم بتا رہے ہیں کہ دنیا کا بھی نقصان اٹھایا (کہ محنت اور وقت خرچ کیا) اور آخرت کا بھی خسارہ پایا (کہ اجر و ثواب سے محروم رہا) اور اگر اس کی نظر اور نیت ان دونوں امر کی طرف ایک ساتھ گئی ہے تو اس کو اجر و ثواب ملے گا۔ بشرطیکہ دونوں باتوں پر نظر قائم رہے۔ اولؔ اس پر نظر ہو کہ یہ فعل طاعت ہے اور اس پر حق تعالیٰ نے اجر کا وعدہ فرمالیا ہے اور اس کے لئے عامل کو تاکید کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دومؔ اس پر نظر ہو کہ اللہ ہی میرا خالق ہے اور وہی میرے افعال کا خالق ہے اور اس نے ثواب کا جو کچھ بھی وعدہ فرمایا ہے وہ اس کا محض احسان اور لطف و کرم ہے اس پر واجب اور لازم نہیں اور باوجود وعدہ فرمانے کے اس کو اختیار ہے چاہے رحم فرمائے اور چاہے عذاب دے۔ مگر میں چونکہ غلام ہوں اس لئے آقا کا حکم سن کر تعمیل کے لئے تیار ہوا ہوں اور اپنے ربِ کریم سے اجر و ثواب کی توقع اور امید رکھتا ہوں۔ پس جب بندہ اس نظرِ صحیح سے اپنے رب کو دیکھے گا تو اب اجر و ثواب پر نظر رکھنا بھی مضر نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ یہ قسم تو وہ ہے جس میں علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ امام غزالی رحؒ نے تو ایسی عبادت کو اجر سے خالی بلکہ شرک فی العمل قرار دے کر ریا و نمود کے حکم میں لیا ہے جس سے عمل خبط ہو جاتا ہے (کیونکہ عبادت خالص اللہ کے لئے نہ رہی بلکہ اپنا نفع اور اپنی غرض اس میں شامل ہو گئی جو شرکِ خفی ہے) اور علامہ ابوبکر ابنِ عربی نے سراج المریدین میں اور امام القرانی نے القواعد والفروق میں لکھا ہے کہ ایسے عمل پر اجر ملے گا اور نہ یہ شرک فی العمل ہے نہ ریا و نمود جس سے اعمال خبط ہوتے ہیں۔ فرمایا ابنِ عربی اور قرانی کی رائے صحیح ہے کیونکہ حق تعالیٰ کسی عمل والے کے اچھے عمل کو ضائع نہیں فرمایا کرتا۔ اور اس نے بھی چونکہ عملِ نیک کیا ہے لہٰذا اس کا عمل جب اس کی ذات سے صادر ہوگا تو اس کا بھی ایک نور ہوگا اور اس کی نیتِ صالحہ کا اور اپنے رب پر نظر قائم رکھنے کا بھی ایک دوسرا نور ہوگا، نورِ عمل کے علاوہ۔ پھر اجر و ثواب سے کیسے محروم رہ سکتا ہے۔ ہاںؔ وہ شخص اس سے بھی بہتر

اور اکمل ہے جس کی اجر و ثواب پر نظر ہی نہ ہو (اور محض اپنی غلامی کے تقاضے سے امرِ الٰہی کا امتثال کرے) اور وہ پہلی قسم ہے جو مذکور ہو چکی۔ اور ان دونوں سے اکمل و افضل وہ ہے جو نیتِ عمل کے بعد نفسِ عمل سے بھی بے خبر ہو جائے کہ صرف عمل کے شروع کرتے وقت عمل سے باخبر تھا اور اس کے اللہ واسطہ کرنے کی نیت کر لی تھی مگر پھر اپنے خالق سبحانہ کے مشاہدہ میں اس کا فکر و خیال اللہ کی عظمت و کبریائی اور جلالتِ شان میں محو و مستغرق ہو گیا کہ عمل کی خبر ہی نہیں رہی (اور اب عمل کی تکمیل گویا منجانب اللہ یا خود گرفتہ طاعات طبیعت کے تقاضے سے ہوئی) اللہ سبحانہ و تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے ہمیں بھی یہ حال نصیب فرمائے۔ نیز آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ مشاہدہ موجبِ محبتِ الٰہی ہے، اور اللہ کی محبت کے لئے لازم ہے یکسوئی کے ساتھ تعلق مع اللہ اور اس تعلق مع اللہ پر ضروری ہے کہ اجر حق تعالیٰ کی طرف سے اتنا ہو کہ جو اس کی شاہانہ شان کو زیبا ہے۔ نہ کہ اتنا جو بندہ کی شان کے لائق ہے اور عدمِ مشاہدہ موجبِ غفلت ہے اور اللہ سے غفلت کے لئے لازم ہے یکسوئی کے ساتھ تعلق مع النفس اور اس تعلق مع النفس پر ضروری ہے کہ اجر بندہ کی حیثیت کے موافق ہو نہ کہ رب کی شان کے موافق۔ اور یہی سبب ہے کہ دو شخص درود شریف پڑھتے ہیں۔ مگر ایک کے لئے اجر بہت کم ہوتا ہے اور دوسرے کے لئے اجر بے پایاں و بے شمار۔ وجہ وہی ہے کہ پہلے شخص کے دہن سے درود نکلا غفلت کے ساتھ درآنحالیکہ اس کا دل مشاغل اور اغیار میں منہمک ہے اور گویا محض عادت کی بناء پر نکلا۔ لہٰذا اس کو اجرِ ضعیف دیا گیا اور دوسرے کے منہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود شریف محبت و تعظیم کے ساتھ نکلا اور آپؐ کے ساتھ محبت نصیب ہونے کی صورت یہ ہے کہ آپ کی جلالتِ شان اور عظمت کا دھیان کرے کہ آپؐ تمامی موجودات کی ہستی و وجود کا سبب ہیں اور آپؐ ہی کے نور سے ہر نور کا ظہور ہے اور آپؐ مخلوق کے لئے رحمت ہیں اولین و آخرین کو ہدایت آپؐ ہی کے ذریعہ اور آپؐ ہی کی وجہ سے نصیب ہوئی ہے۔ پس آپؐ پر درود و سلام آپؐ کی اس رفعتِ شان کی وجہ سے پڑھنا چاہیئے۔ نہ کہ اپنی ذات کو نفع پہنچانے (یعنی اجر اور دنیوی یا اخروی راحت حاصل کرنے) کی وجہ سے۔ اور آپ کی تعظیم نصیب ہونے کی صورت یہ ہے کہ آپؐ کی اس رفعتِ شان میں غور کرے اور سوچے کہ یہ آپ کو کس وجہ سے حاصل ہوئی؟ اور ایسی عالی مرتبت ذات کے لئے کیسے بہترین اخلاق و خصائل زیبا ہیں؟ یعنی ساری مخلوق ان میں سے ایک خصلت حاصل کرنے سے بھی عاجز ہے کیونکہ ہر خصلتِ حمیدہ کا وہ انتہائی عروج آپ کو حاصل ہے جس کو قوتِ فکر یہ سمجھ بھی نہیں سکتی۔ چہ جائیکہ کوئی ان کا حامل بن سکے۔ پس جب آپؐ پر درود و سلام بندہ کے دہن سے اس بناء پر نکلے گا تو اس کا اجر بقدرِ شانِ محمدیؐ اور بقدرِ شانِ رب ہو گا۔ کیونکہ اس درود پڑھنے کا محرک اور اس پر آمادہ کرنے والا یہی علوِ مرتبتِ محمدیؐ کا دھیان ہوا ہے۔ لہٰذا اس

کا اجر بھی بقدر اسی علو مرتبت کے ہوگا جو کہ درود کے لئے محرک ہوا ہے اور پہلے درود کی محرک چونکہ ذاتی غرض اور حظ نفسانی ہوا ہے لہٰذا اس کا اجر بھی بقدر اس کے محرک کے ہوگا۔ یہی حال بندے کے تمامی اعمال کا ہے کہ اگر ان کی محرک اللہ کی عظمت اور اس کی کبریائی و علوشان ہوئی ہے تو ان کا اجر بھی بقدرِ عظمت الٰہیہ ہوگا۔ اور اگر ان کی محرک ذاتی غرض اور حظِ نفسانی ہوا ہے تو ان کا اجر بھی بقدر اس محرک کے ہوگا۔ والسّلام۔

میں نے حضرتِ ممدوح سے دریافت کیا کہ ہمارے درود پڑھنے سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو نفع پہنچتا (اور آپؐ پر نزولِ رحمت میں اضافہ ہوتا) ہے یا نہیں ؟ کیونکہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ فرمایا حق تعالیٰ نے ہمارے لئے درود پڑھنا اپنے نبیؐ کو نفع پہنچانے کی غرض سے مشروع نہیں فرمایا بلکہ ہم کو منتفع بنانے کے لئے مشروع کیا ہے۔ مثلاً ایک شخص کے بہت سے غلام ہوں اور اس کی نظر ایسی زمین پر جائے جس کا مقابلہ زراعت و پیداوار میں کوئی بھی نہ کر سکے پس وہ بنگاہِ لطف وکرم فرما کر یہ زمین اپنے غلاموں کو عطا فرما دے، کہ اس کے تمامی منافع صرف انھیں کے ہوں اور وہ اس کے مستقل مالک بنیں۔ نہ یہ کہ شرکت اور بٹائی کی صورت میں زمین ان کے سپرد کر دی ہے۔ یہی حال آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم پر ہمارے درود پڑھنے کا ہے کہ اس کا سارا اجر و ثواب خالص ہمارے لئے ہے۔ اور جب اس کے اجر کا نور کسی وقت منتقل ہوتا ہے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے نور سے جا ملتا ہے تو اس کی یہ شان ہوتی ہے جیسے کوئی چیز اپنی اصل سے جا ملے۔ کیونکہ مومنین کے لئے جو اجر بھی ثابت ہوتا ہے وہ ان کے ایمان کی وجہ سے ثابت ہوتا ہے اور ان کا ایمان پرتو ہے نورِ محمدی کا۔ لہٰذا جتنے اجور بھی ہمارے لئے ثابت ہوں گے (ان کی اصل ذاتِ محمدی ہوگی، اور) آپؐ ہی کی طرف سے ہوں گے۔ محسوسات میں اس کی مثال سمندر اور بارش کا پانی ہے کہ بارش کا سارا پانی سمندر ہی کی طرف سے ہے۔ (کہ اسی سے بخارات اٹھ کر ابر میں جمع ہوتے اور زمین پر برستے ہیں۔) اور پھر وہ بہہ کر اور رَو بن کر آخر کار اسی سمندر میں جا ملتے ہیں۔ پس جب وہ پانی سمندر کی طرف واپس ہوگا تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے سمندر میں اضافہ کر دیا۔ (اسی طرح درود پڑھنے کے اجر کا نور چونکہ آیا ہی ہے بحرِ انوارِ محمدی سے لہٰذا اگر وہ بعد میں جا ملا نورِ محمدیؐ سے، تو یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس نے اضافہ کر دیا انوار و برکاتِ محمدیہؐ میں)۔ میں نے عرض کیا کہ بعض علماء نے ہمارے درود پڑھنے سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کو نفع پہنچنے پر اس طرح استدلال کیا ہے کہ درود کی مثال جنّت کے حور و غلمان کی سی ہے۔ پس جس طرح آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم جنّت میں میووں اور پھلوں سے منتفع ہوں گے جن کو ظروف میں لے کر حور و غلمان حاضر ہوں گے اسی طرح انوار اور اجور سے منتفع ہوتے ہیں جن کو حروف میں لے کر ہمارے دہن اور لب حاضر ہوتے ہیں۔ وہاں حامل ظروف ہاتھ ہوں گے اور یہاں حاملِ حروف دہن اور لب ہیں۔ اور حالتِ محمدیہؐ جیسی جنّت میں ہوگی ایسی ہی عالمِ

دنیا میں تھی۔ لہٰذا اس قیاس کے لئے کوئی امر مانع نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ اس عالم کا قول تو اس وقت صحیح ہو جب کہ حور و غلمان دوسری چیز ہوں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دوسری چیز اور جب حقیقت یہ ہے کہ خود جنت اور جو کچھ بھی جنت کے اندر ہے سب کا وجود ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نور سے ہے تو پھر کیسا قیاس اور کیسی تمثیل۔ بس میاں جس کو معلوم ہو جائے شانِ محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کیا ہے تو اس کو ہر قسم کا سکون و آرام مل جائے نیز حضرت نے فرمایا، تم دلائل الخیرات پڑھنے والے کو دیکھوگے کہ جب درود پڑھنے کا ارادہ کرتا ہے تو اپنے فکر و خیال میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورتِ شریفہ کو لاتا، اور پھر وسیلہ اور درجہ رفیعہ اور مقامِ محمود وغیرہ کی صورتوں کو جن کی طلب و درخواست کرتا ہے اور جو تقریباً ہر درود میں مذکور ہوتے ہیں اپنے متخیلہ میں جماتا ہے اور دھیان کرتا ہے کہ میں اللہ سے ان چیزوں کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے طلب کر رہا ہوں اور پھر اپنے خیال ہی میں اس کو تسلیم کر لیتا ہے کہ اللہ اس کو قبول فرمائے گا اور یہ چیزیں (میری دعا وطلب کے سبب گویا) میرے ہاتھوں اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو عطا فرمائے گا۔ ان تخیلات کی وجہ سے یہ طالب سمجھتا ہے کہ میری وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑا نفع پہنچا۔ لہٰذا پھولتا اور خوش ہوتا ہے اور خوب خوب جوش سے درود پڑھتا اور آواز کو بلند کرتا ہے۔ غرض قرارت میں اس کا شوق و ہیجان بڑھتا جاتا ہے۔ اور یوں محسوس کرتا ہے کہ درود (صرف زبان سے نہیں بلکہ) میرے دل کی رگوں سے نکل رہا ہے۔ پھر خشوع و خضوع کا ظاہر اور اس پر رقت طاری ہو جاتی ہے (کہ زار زار رونے لگتا ہے) اور سمجھتا ہے کہ یہ وہ عجیب حالت ہے جس سے بالا کوئی حالت نہیں۔ حالانکہ اس کا یہ خیال بالکل غلط اور خطائے عظیم ہے اور اس کے اس درود سے اس کو اللہ کی طرف سے کچھ بھی نہ ملے گا۔ اس لئے کہ اس درود کا تعلق اس کے وہم و گمان اور محض متخیلہ اور صورت فکریہ سے ہے اور اس کا وہم و گمان باطل اور خلافِ واقعہ ہے اور جو چیز باطل ہے اس کو حق تعالیٰ سے کوئی علاقہ نہیں۔ حق تعالیٰ کے ساتھ تعلق و اتصال صرف اسی شئے کو ہوگا جو نفس الامر میں حق اور واقعہ کے مطابق ہوگی۔ کہ اگر آنکھ کھول کر دیکھے تو ایسی ہی نظر بھی آجائے۔ جو شے ایسی ہوگی اس کو بے شک اللہ سبحانہ، سے تعلق ہوگا۔ اور جس کی یہ حالت ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھے تو نظر نہ آوے، وہ باطل کہلاتی ہے اور باطل کو حق تعالیٰ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے والے کو اس آفتِ عظیمہ سے ڈرنا اور بچنا چاہئے کہ اکثر آدمی حقیقت کو سمجھتے نہیں اور یوں خیال کرتے ہیں کہ یہ رقت اور حلاوت جو ان کو حاصل ہوئی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے، حالانکہ وہ شیطان کی طرف سے ہے تاکہ اس ذریعے سے ان کو دھکیل کر اللہ سبحانہ، سے دور کر دے اور دوری پر دوری بڑھاتا رہے ورنہ اس کے لئے زیبا تو یہ تھا کہ درود پڑھنے کا محرک بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت و عظمت کے کوئی چیز

بھی نہ ہوتی۔ اس وقت البتہ اس کا نور مشتعل ہوتا اور نور محمدی سے جا ملتا، لیکن اگر درود پڑھنے کی محرک اپنا ذاتی نفع اور نفسانی غرض ہوئی ہے تو وہ محجوب ہے اور اس کا اجر ناقص ہو جائے گا اور اگر اس کا محرک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نفع ہے تو (چونکہ خلافِ واقعہ ہے لہذا) نہ اس کے درود کو اللہ کے ساتھ کوئی تعلق ہے اور نہ وہ اللہ تک پہنچے گا۔ نیز حضرت ممدوح نے فرمایا ہر عمل کا ایک اجر ہوتا ہے اور ہر اجر کا ایک نور ہوتا ہے اور اس نور کا اس عالم دنیا میں ذاتِ عبد کے ساتھ آج بھی اتصال ہے کہ اگر اعمالِ صالحہ خالص اللہ کے لئے اور حسب بیانِ سابق ذات کی سرِ حقیقت کے مطابق صادر ہوں گے تو ان کے اجور کے نوادرات عامل پر چمکیں گے اور ذات کو ان کا ادراک و شعور ہو گا کہ کبھی لرزہ چڑھ آئے گا کبھی گریہ طاری ہو جائے گا اور کبھی خشوع و انکسار پیدا ہو گا غرض اس چمکنے والے نور کا مقتضا جو بھی ہو گا وہ بدن پر نمودار ہو گا اور اس سے صاحب بصیرت سمجھ لے گا کہ عمل مقبول ہوا نیز مقدار بھی معلوم کر لے گا کہ اس کا اجر اس مقدار کا عطا ہوا۔ اکثر آدمی یوں سمجھتے ہیں کہ اجر اور اس کی مقدار کا پتہ صرف آخرت ہی میں چلے گا، مگر یہ اہلِ حجاب کا حال ہے (کہ ان کو یہاں پتہ نہیں چلتا)، ورنہ اہلِ بصیرت سے تو ڈھکا چھپا نہیں، ان کے لئے تو اجر کی مقدار تک بھی واضح اور مکشوف ہے اور جب اعمال غیر اللہ (یعنی اپنے ذاتی نفع) کی خاطر ہوں گے تو بے سود محنت اور محض بیکار مشقت ہے جن کا نہ کوئی اجر ہے اور نہ ذات پر اس کا نور جھلکتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ہر صاحبِ عمل اس کا امتحان کر سکتا ہے کہ عمل کے وقت اپنے قلب کو غور کے ساتھ دیکھے، کیونکہ کتنا ہی چھوٹا اور دقیق عمل کیوں نہ ہو اس کے لئے ضرور اجر ہو گا اور اجر کے لئے ضرور نور ہو گا۔ جو ذات پر جھلکے گا اور ذات اس کو ادراک کرے گی۔ پس اگر قلب کو دیکھے کہ عمل کے وقت وہ دنیوی دھندوں سے لبریز اور غیر اللہ سے وابستہ ہے تو سمجھ لے کہ اللہ نے اس کو اجر سے محروم رکھا اور اسی لئے اس کے قلب کو شواغل سے معمور فرما دیا۔ اور اگر عمل کے وقت قلب کو دھندوں سے فارغ اور اللہ کی طرف متوجہ اور یکسو پائے تو سمجھ لے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو موجبِ اجر بنایا اور اس پر ثواب تجویز فرما دیا۔ ایک طالب علم شہر شہر اور ملکوں ملکوں کا سفر کرتا پھرتا ہے مگر اس نیت سے کہ علم حاصل ہو جائے گا تو عزت بڑھ جائے گی۔ لوگوں کے دلوں میں میرا جاہ اور میری بات کا اثر قائم ہو گا۔ دنیا خوب ملے گی اور جہاں جاؤں گا بہ نگاہِ احترام دیکھا جاؤں گا۔ غرض اغراض باطلہ و فانیہ حاصل کرنے کی نیت سے پردیس میں مارا مارا پھرتا اور برسہا برس محنتیں اور مشقتیں برداشت کرتا ہے۔ مگر یاد رکھو کہ حق تعالیٰ اس کو نورِ علم سے محروم رکھے گا اور وہ راسخ فی العلم کبھی ہرگز نہ بن سکے گا۔ کیونکہ حقیقتِ علم صرف اسی کو ملتی ہے، جو اپنے باطن سے علم کی طرف متوجہ ہو اور اس کا باطن علم میں نہیں، بلکہ ذاتی اغراض اور دنیوی مشاغل سے معمور ہے، صرف ظاہر اس کا حرکت و گشت کر رہا ہے علم میں، اور علم منجملہ اسرار کے ایک سرِ الٰہی ہے (جس کو باطن ہی لے سکتا ہے)، لہذا اس کا ظاہر اس کو کسی طرح نہیں پا سکتا۔

یہی حال اجورِ اعمال کا ہے کہ اگر ان میں اخلاص نہیں (محض اعضائے بدن کے ظاہری حرکات وسکنات ہیں) تو وہ اجور بندے کو نصیب نہیں ہو سکتے، کیونکہ اجور منجملہ اسرارِ الٰہیہ ہیں۔ اور باطن کے بغیر صرف ظاہر ان کو کبھی نہیں پا سکتا۔

میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے کہ لوگ بزرگوں سے مرادیں مانگتے اور استغاثہ کرتے ہیں، اللہ جل جلالہٗ سے نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ کوئی قسم کھانے میں اپنا وثوق جتانا چاہتا ہے تو بجائے اس کے کہ اللہ کی قسم کھائے، یوں کہتا ہے کہ قسم کھاتا ہوں سید عبد القادر جیلانیؒ کی۔ قسم کھاتا ہوں حضرت یعزیؒ کی قسم کھاتا ہوں حضرت ابو العباسؒ سبتی کی۔ اسی طرح جب کسی مصیبت یا تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے یا بھیک مانگتا اور سوال کرتا ہے جیسے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے فقیر پھرتے ہیں تو کہتا ہے مجھ فقیر کو فلاں بزرگ کے نام پر دے دو۔ اور فلاں ولی کا واسطہ مجھے روٹی کھلا دو۔ حالانکہ اس میں اللہ جل جلالہٗ سے قطعاً بے تعلقی ہے۔ حتیٰ کہ اگر ان سے کہا بھی جائے کہ اللہ کا وسیلہ لایا کرو اور اسی کی قسم کھایا کرو تو ان کے دل پر اس نصیحت کا بھی کچھ اثر نہیں ہوتا۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ فرمایا کہ اہلِ دیوان (یعنی مجلسِ اقطاب وابدال والے) اولیاء اللہ نے بالقصد ایسا کیا ہے۔ جب اللہ سے بے تعلق رکھنے والے اور قلوب میں ظلمت قویہ رکھنے والے بندوں کی کثرت پائی اور دیکھا کہ ان کی ذوات گندی اور خبیث بن گئیں اور ان کا دل چاہتا ہے کہ ہمارے خالق جل جلالہٗ کا نام وہ لے جس کی ذات ہر طرح پاک وصاف ہو۔ لہٰذا ان کے قلوب کو غیر اللہ یعنی بزرگوں کے ساتھ مربوط و وابستہ کر دیا۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ دعا اس کی قبول فرماتا ہے جو دعا مانگتے وقت اپنے قلب و باطن سے بالکل حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو اور قبولیتِ دعا کی دو صورتیں ہیں۔ یا یہ کہ جو شے مانگ رہا ہے وہ اس کو عطا فرما دے (اور یہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ اس شے کا ملنا اس کی تقدیر میں لکھا جا چکا ہے) یا یہ کہ عطا نہ فرمائے۔ مگر عطا مقدر نہ فرمانے کی مصلحت اور اس کا راز اس پر ظاہر فرما دے۔ اور یہ اولیاء کے لئے ہوتا ہے نہ کہ اہلِ حجاب کے لئے۔ پس اگر کوئی ظلمانی ذات (دعا مانگتے وقت) اپنے تمامی عروق اور جواہر ذات کے ساتھ (اللہ کی طرف) پوری متوجہ ہوئی اور کوئی چیز اللہ سے مانگی مگر حق تعالیٰ نے عطا نہ فرمائی (کیونکہ تقدیر میں اس کا دینا تجویز نہ فرمایا تھا اور ساتھ ہی) اس کو عطا نہ فرمانے کی مصلحت سے بھی آگاہ نہ فرمایا (بوجہ اس کی ظلمتِ ذات اور عدمِ ولایت کے) تو بہت ممکن ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کے وجود و ہستی ہی میں طرح طرح کے شک اور غلط وسوسے لاحق ہو جائیں (کہ عیاذاً باللہ کوئی وجود ہوتا تو اس الحاح و زاری پر ضرور ترس کھاتا) پس اس صورت میں ضرورت پوری نہ ہونے سے بھی زیادہ مصیبت و وبال میں پڑ جائے گا (کہ مراد کے ساتھ ایمان بھی ہاتھ سے گیا) اس مصلحت سے اہلِ دیوان نے (باطنی تصرف کے ذریعہ) عوام الناس کی عقول کو اللہ کے نیک بندوں

کے ساتھ وابستہ کر دیا کہ اگر مراد پوری نہ ہونے پر ان کے دلوں میں وسوسے بھی آئیں گے تو اولیا وصلحا کی ولایت ہی کے متعلق آئیں گے (کہ اگر سچے ولی ہوتے تو میری مراد بر لاتے) اور اس سے ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے گا (کیونکہ ولایت کا انکار کفر نہیں ہے) رہی یہ بات کہ اللہ سے بے تعلقی والے اور قلوب میں ظلمتیں رکھنے والے دنیا میں بہت زیادہ ہیں۔ اگر اس کا پتہ لگانا چاہو تو غور سے دیکھو۔ ایک شخص مثلاً بیس روپے لے کر گھر سے اس نیت وارادہ سے نکلتا ہے کہ میں فلاں بزرگ کے مزار پر چڑھاؤں گا تاکہ میری فلاں مراد پوری کر دے۔ چنانچہ وہاں جاکر قبر پر ڈال دیتا ہے۔ حالانکہ راستے میں اس کو بہتیرے محتاج اور ضرورت مند ملتے اور وہ اس سے سوال بھی کرتے ہیں کہ اللہ واسطے اور فی سبیل اللہ ہم کو کچھ دے دو اور یہ ان کو ایک پیسہ بھی نہیں دیتا، اور سیدھا مزار پر جاکر قبر کے سرہانے پوری رقم پھینک آتا ہے۔ بھلا اس سے زیادہ بری بات کیا ہوگی۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ یہ رقم اللہ واسطے صدقہ کے لئے نہیں نکلی۔ اور نہ اس کی محرک عظمت وجلالت شانِ الٰہی ہوتی ہے۔ اگر یہ محرک ہوتا تو راستے میں جو محتاج ومسکین بھی ملتا یہ اس کو ضرور دیتا۔ البتہ اس صدقہ پر آمادہ کرنے والی شے ذاتی نفع اور خود غرضی ہے کہ مراد پوری ہو جائے اور نفس کو حظ مل جائے اور جاہ یا مال کا نفع نصیب ہو۔ لہٰذا اس نے جس جگہ کو حصولِ غرض کے لئے اپنے خیال میں مفید سمجھا اسے خاص کر لیا۔ کیونکہ اس کا گمان یہ ہے کہ اگر یہاں دوں گا تو غرض پوری ہوگی اور اگر یہاں نہ دوں گا تو غرض پوری نہ ہوگی۔ نیز آپ نے فرمایا کہ آج میں نے غور کیا کہ دیکھوں بزرگوں کے نام کتنے صدقات دیئے جاتے ہیں تو صرف بابِ تلمسان سے لے کر ساقیۃ الحمرا تک کے باشندوں نے جتنی رقم نذرِ اولیار میں خرچ کی ہے اس کی تعداد ذاتی دینار سرخ (دو سو روپے سے زائد) اور تین سو ساٹھ بکریاں اور بہتر (۷۲) گائے اور بیل تھے کہ یہ سب کا سب صرف ایک دن میں صالحین کے نام پر نکالا گیا اور اللہ جل جلالہٗ کے نام پر آج جو رقم نکالی گئی اس کی مقدار دس درہم (ڈھائی روپیہ) بھی پوری نہیں ہوئی) اس سے اندازہ کر لو کہ اہلِ ظلمت اور اللہ سے بے تعلق والوں کی کتنی کثرت ہے) آپ نے فرمایا ایک سبب ہے منجملہ ان اسباب کے جو اللہ سے قطع تعلق کرانے میں قوی التاثیر ہیں اور امتِ محمدیہ پر ایسی طرح طاری ہوتے ہیں کہ اکثر کو ان کا پتہ بھی نہیں چلتا (بلکہ وہ اسی بے تعلقی کو تعلق مع اللہ سمجھ کر دھوکے میں پڑے رہتے ہیں) اور ایسے اسباب جو بندہ کے لئے موجبِ انقطاعِ تعلقِ رب بنے ہوئے ہیں تین سو ساٹھ کی تعداد میں ہیں۔ میں نے عرض کیا اس وقت ان میں سے کچھ جناب والا کو مستحضر ہیں؟ فرمایا ہاں، لکھو۔ اول یہی بطریقِ مذکور صالحین کے نام کی نذر اور ہدیہ کہ اللہ کے نام نہ ہو۔ دوم اولیاً

سے مراد مانگنا اور اللہ کا وسیلہ لانا کہ مزار پر آکر کہتا ہے اے فلاں بزرگ تم کو اللہ کا واسطہ دیتا ہوں کہ میری فلاں ضرورت پوری کردو اس کا موجب انقطاع ہونا، بایں سبب ہے کہ معاملہ برعکس کر دیا چاہیئے تو یہ تھا کہ اللہ سے مراد مانگتا اور صالحین کا وسیلہ لاتا کہ یا اللہ فلاں بزرگ کا واسطہ میری حاجت برلا نہ یہ کہ اس کو الٹا کر دے۔ سوم[۳] سر پر فرض یا قرض ہوتے ہوئے مزارات کا سفر کرنا۔ مثلاً فرض نمازوں کی قضا سر پر ہے' ان کا ادا کرنا تو چھوڑ دیا۔ باوجودیکہ اللہ کا حق ہے اور اس میں وہ نور خدا اور اسرار الٰہی ہے جس کی وجہ سے بندے پر رحم و کرم ہوا کرتا ہے اور ایک صالح کے مزار پر جا حاضری دی اور ظاہر ہے کہ اس میں اللہ سے بے تعلقی اور ظلمت ہے۔ چہارم[۴] عمر یا رزق وغیرہ کے متعلق کسی ظالم سے ڈرنا کہ دل میں یوں کہے کہ مجھے اس کے خلاف کبھی نہ کرنا چاہیئے۔ اگر میں نے اسے ناراض کیا تو یہ مجھے جان سے مار دے گا یا میری روزی بند کر دے گا۔ کیونکہ اس کے نزدیک اگر محقق ہوتا کہ اللہ اس کے ساتھ ہے اور اسی کے تصرفات اس کے اور اس ظالم کے اندر جاری ہیں تو ضرور سمجھتا کہ صرف اللہ ہی فاعل ہے کسی فعل میں بھی یہ ظالم یا کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں۔ اور پھر بجز اللہ کے کسی سے بھی نہ ڈرتا۔ بندے کی یہ نگاہ جتنی قوی ہوتی جاتی ہے اسی قدر اس کا قرب حق تعالیٰ کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے۔ اور جتنی کم یا معدوم ہوتی جاتی ہے اسی قدر اللہ سے اس کا بُعد اور انقطاع بڑھتا جاتا ہے۔ پنجم[۵] ظالم سے طمع اور توقع رکھنا کہ اس کا تقرب ڈھونڈے تاکہ اس سے مال و دولت حاصل کرے۔ کیونکہ اگر اس کے نزدیک محقق ہوتا کہ روزی دینے والا صرف اللہ ہے تو یہ فعل اس سے کبھی صادر نہ ہوتا۔ ششم[۶] کافروں کی اعانت کرنا کہ ان کو دنیا کے مصالح سجھائے مثلاً (ترقی دنیا کا) کوئی طریقہ بتائے (یا اور کسی طرح ان کے عروج و اقتدار کا ذریعہ بنے) پس یہ بھی منجملہ اسباب انقطاع کے ہے۔" جامع کتاب کہتے ہیں کہ واقعی ہم نے کبھی نہیں دیکھا کہ کسی نے ظالم کی خیر خواہی کی ہو۔ اور انجام کار خسارہ نہ اٹھایا ہو۔ ایک شخص نے پولیس کے ایک سپاہی کو نماز کے لئے جگانے کا ارادہ کیا تو حضرت سفیان ثوری رح نے فرمایا جگاؤ مت اور سونے دو کہ اتنی ہی دیر اس سے آرام اور اس کے شر سے امن نصیب ہو۔ ہفتم[۷] مسلمان کی خیر خواہی نہ کرنا کہ کسی بات کو ان کو ان کے لئے مضر پائے اور اس سے بچنے کی ان کو نصیحت نہ کرے یا کوئی چیز ان کے لئے مفید سمجھے اور اسے حاصل کرنے کی انھیں ترغیب نہ دے۔ ہشتم[۸] اللہ کی عبادت کے مقابلے پر دنیا کی طلب میں محنت و مشقت کو لذیذ سمجھنا جس کو اپنے نفس میں یہ اثر محسوس ہو (کہ عبادت گراں گزرتی ہے اور دنیا کی طلب میں مرنا کھپنا شیریں معلوم ہوتا ہے) اس کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اسباب انقطاع میں ضرور کسی سبب کا ارتکاب ہوا ہے (جس کا یہ اثر ہے) نہم[۹] دنیا کی تلاش ایسے ذریعہ سے جو دنیا سے بھی زیادہ ذلیل، حقیر اور دنی ہو مثلاً جھوٹ، مکر، چالبازی، بدزبانی اور جھوٹی قسموں کے ذریعہ دنیا کمانا کہ یہ سب معاصی ہیں اور دنیا سے بھی زیادہ حقیر و خسیس ہیں ورنہ سلفِ صالحین نے

دنیا کمائی ہے دنیا سے زیادہ معزز و محترم ذریعہ سے مثلاً جہاد و تجارت اور زراعت وغیرہ اسبابِ حلال سے۔ پس جس کی یہ حالت ہو کہ دنیا کمارہا ہے ذلیل ترین اسباب یعنی حرام طریقہ سے، اس کو اللہ سے توبہ کرنی چاہیئے دہم یہ کہ بندے کے اعمال اور طاعات اللہ کریم کی ذات اور ہستی قدیم کی خاطر نہ ہوں، بلکہ تحصیلِ اغراض اور ذاتی نفع کی نیت سے ہوں۔ کہ ان کی وجہ سے اللہ مجھ پر رحم فرمائے گا اور ہر قسم کی نعمتیں بخشے گا۔ اور یہ سبب انقطاعِ عموم لئے ہوئے اور اکثر لوگوں میں موجود ہے اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰہُ بات یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ شانہٗ جنّت اور دوزخ کو پیدا نہ فرماتا تب پتہ چلتا کہ کون اللہ کی عبادت کرتا ہے اور کون اس کی عبادت نہیں کرتا۔ اس وقت جو اس کی عبادت کرتا وہ خالص لوجہ اللہ ہوتی اور اس وقت عبادت کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی معرفت بھی بطریقِ کامل نصیب ہوتی۔ مگر جب لوگوں نے جنّت اور دوزخ کا تذکرہ سُنا تو ان کی اغراض ان دونوں کی جانب منقسم و متفرق ہوگئیں اور (اخلاص کے) راستے سے بھٹک گئے۔ یازدہم[11] جو جگہ عند اللہ محترم ہو مثلاً مساجد وغیرہ میں معصیت کا ارتکاب۔ کیونکہ اگر بندے کو متحقق ہوتا کہ اس جگہ کا انتساب اللہ کی طرف ہے اور اس کا دل اندر سے پکارتا کہ یہ خانۂ خدا ہے تو اس میں معصیت کا صدور کبھی نہ ہوتا۔ دوازدہم[12] اغلام اور اس کے مفاسد کا تذکرہ انشاء اللہ عنقریب آئے گا۔ سیزدہم[13] مرد کا اپنی عورت کو بغیر خطا کے مارنا، کہ عورت کے مرد پر حقوق ہیں۔ اور بے قصور اس کو مارنے میں ان کا اتلاف ہے جو سببِ انقطاع ہے۔ چہاردہم[14] اہل و عیال پر نفقہ کا احسان جتانا اور کہنا کہ دیکھو میں نے تم پر اتنا خرچ کیا۔ پنجدہم[15] حسد کرنا اور اس کے مفاسد بھی عنقریب مذکور ہوں گے شش دہم[16] معصیت کو سمجھتے ہوئے اس پر پیش قدمی کرنا اور اس کی شرح بھی آگے آئے گی ہفتدہم[17] حرام کمائی سے دنیا جمع کرنا۔ ہشتدہم[18] ماں باپ کی نافرمانی۔ چنانچہ ایک دن میں اپنے شیخ حضرت عمرو بن محمد ہواری کے پاس روضہ علی بن حرزہم کے باہر بیری کے درخت کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ان کا لڑکا جو والدین کا نافرمان تھا حج کے لئے جانے کا ارادہ کر کے باپ سے رخصت ہونے کو آیا حضرت عمرو بن محمدؒ نے اس کو جانے سے منع کیا۔ مگر وہ نہ مانا اور والد کو ناراض کر کے روانہ ہوگیا۔ اس وقت حضرت شیخ نے مجھ سے فرمایا کہ حقوق والدین کا انجام چار باتیں ہیں، ایک[1] یہ دنیا اس سے جاتی رہتی اور اس کو ایسا بُرا سمجھتی ہے جیسے مومن دوزخ کو بُرا سمجھتا ہے (لہٰذا دنیا میں تنگدست اور پریشان حال رہتا ہے۔) دوم[2] یہ کہ جب وہ کسی جگہ بیٹھتا ہے اور حاضرینِ مجلس سے کسی بارہ میں گفتگو کرتا ہے تو حق تعالیٰ ان کے قلوب کا رخ اس کی گفتگو سننے سے پھیر دیتا ہے اور اس کی گفتگو سے نور و برکت چھین لیتا ہے کہ دیکھا جائے اس کی تقریر کا اثر ہونے لگے) وہ ان کی نظروں میں مبغوض ہو جاتا ہے۔ سوم[3] یہ کہ صاحبانِ خدمت اہل دیوان اولیاء اللہ اس کو بہ نگاہِ شفقت نہیں دیکھتے اور ان کو اس پر کبھی ترس نہیں آتا۔ چہارم[4] یہ کہ اس کا نورِ ایمان آہستہ آہستہ ہر وقت کم ہوتا رہتا ہے۔ پھر کوئی بدنصیب تو اسی تنزل میں رہتا ہے حتیٰ کہ ایمان اس کا مضمحل اور فنا ہو جاتا ہے

اور کافر ہو کر مرتا ہے۔ اور کوئی ناقص الایمان بنا ہوا دنیا سے اٹھ جاتا ہے اور والدین کو راضی وخوشی رکھنے کا نتیجہ ان چاروں باتوں کی ضد ہوا کرتا ہے۔ یعنی دنیا اس کو محبوب سمجھتی ہے۔ جیسے مومن جنت کو محبوب سمجھتا ہے اور اس کی گفتگو لوگوں کو شیریں معلوم ہوتی (اور سامعین کے دلوں میں اثر کرتی ہے) اور اولیاء اللہ کی اس پر شفقت ہوتی ہے۔ اور اس کا ایمان ہر ساعت بڑھتا اور ترقی پذیر رہتا ہے۔ غور کرو چاروں مفاسد پر جو حقوقِ والدین میں ہیں اور چاروں محاسن پر جو خوشنودی والدین میں ہیں۔ نہم اہلِ حجاب کی صحبت اور ان سے خلا ملا۔ مثلاً امیروں اور رئیسوں کے ساتھ اختلاط کہ بندۂ مومن میں نور کا ایک ڈورا ہوتا ہے جو اس کی ذات کے سوراخ سے نکلتا اور عطیہ حق سبحانہ' سے جا کر ملتا ہے، وہ ادنیاء کی صحبت سے بڑھا کرتا ہے اور اس سے محروم رہنے پر کم ہوتا رہتا ہے۔ حتیٰ کہ بالکل منقطع ہو جانے کا خطرہ ہے اور صاحبانِ ریاست کی مخالطت سے نور کا سوراخ بند ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ وہ اپنی ریاست اور مال وجاہ کی وجہ سے اس کی ذات پر غلبہ پاتے رہتے ہیں اور یہ گویا ان کی قید وقبضہ میں آجاتا ہے۔ ہر وقت اپنے قلب اور بدن سے ان کی طرف جھکتا رہتا ہے اور جب مدتِ دراز اسی حالت پر گزر جاتی ہے تو حق تعالیٰ کا خیال وخطرہ بھی اس کے فکر وتخیل میں کبھی نہیں آتا اور پھر اپنی اغراض اور انقطاع کی ڈھیل میں پڑے پڑے نور کا سوراخ بالکل بند ہو جاتا ہے اور یہ ساری آفت صاحبانِ ریاست کے ساتھ خلا ملا کی بدولت پہنچی۔ دہم خلفائے اربعہ یعنی حضرت ابو بکرؓ وعمرؓ وعثمانؓ وعلیؓ رضی اللہ عنہم میں تفریق کہ روافض وخوارج کی طرح کسی سے محبت رکھے اور کسی سے بغض۔ اور یہ تفریق سببِ انقطاع اس وجہ سے ہے کہ ان میں ہر ایک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل میں سے کسی ایک خصلت کا وارث ہوا ہے اور اس لئے اس خلیفہ کے ساتھ بغض رکھنا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بغض رکھنا ہے۔ اور یہ حق تعالیٰ سے انقطاع کا سبب ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ خصلت کونسی ہے جس کے وارث حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ ہوئے؟ فرمایا ایمان باللہ کی خصلت۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مطہرہ میں تو ایمان باللہ عزوجل اس خاص کیفیت پر تھا کہ اس کو تمامی اہلِ زمین پر خواہ صحابہؓ ہوں یا غیر صحابہ ڈال دیا جائے تو سب (رانگ کی طرح) پگھل جائیں۔ اور حضرت ابو بکرؓ کو ان کی طاقت کے موافق اس کیفیتِ خاصہ کا وہ قلیل حصہ ملا جس کو وہ برداشت کر سکے۔ مگر باوجود اس کے امتِ محمدیہ میں کوئی بھی نہ تھا جو اس خصلت کو اتنا برداشت کر لیتا جتنا سیدنا ابو بکرؓ نے برداشت کیا بلکہ آپ کے قریب قریب بھی کوئی نہیں پہنچا۔ نہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے اور نہ اہلِ فتح کبیر اغواث واقطاب میں سے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسرارِ الوہیت اور حقائقِ ربوبیت اور دقائقِ معرفت میں اس درجے پر پہنچے ہوئے تھے کہ اس کی کیفیت بھی بیان نہیں ہو سکتی۔ اس کے جن سمندروں میں آپ غواصی فرمایا کرتے تھے

اس کے متعلق آپ کی گفتگو حضرت ابوبکرؓ سے ہوا کرتی تھی۔ لہذا وہ اس بلند مرتبہ پر پہنچ گئے۔ بایں ہمہ ان آخری تین سالوں میں ان حقائق کے متعلق آپ نے حضرت ابوبکرؓ سے بھی گفتگو نہیں فرمائی۔ اس اندیشے سے کہ (مبادا برداشت نہ کرسکیں اور پگھل نہ جائیں۔ اور وہ خصلت جس کی وراثت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ملی، وہ مسلمانوں کی خیر خواہی و شفقت، اپنے نفس پر ان کو ترجیح دینا۔ ان کے لشکر کا انصرام اور افواج کی ترتیب، اور وہ انتظامات ہیں جو عوام و خواص سب کی فلاح و بہبود کا سبب تھے۔ درحقیقت یہ خصلت منجملہ خصالِ محمدیہؐ کے ہے۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنی طاقت و برداشت کے موافق اس کے وارث ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جو خصلت ملی وہ رافت و شفقت اور صلہ رحمی و حسنِ سلوک کی خصلت ہے۔ کہ حقیقۃً وہ خصالِ محمدیہؐ میں سے ہے مگر حضرت عثمانؓ اپنی طاقت اور برداشت کے موافق اس کے وارث ہوئے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو جو خصلت ملی وہ خصلتِ شجاعت ہے، کہ درحقیقت وہ خصالِ محمدیہؐ میں سے ہے مگر حضرت علی کرم اللہ وجہہ اپنی طاقت کے موافق اس کے وارث ہوئے۔ نیز آپ نے فرمایا اسی طرح تمامی صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے ہر صحابیؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی نہ کسی شے کا وارث ضرور ہوا ہے۔ لہذا کوئی صحابی کیوں نہ ہو اس کے ساتھ بغض رکھنا موجب انقطاع عن اللہ ہے۔

اس کے بعد مجلس برخواست ہوگئی اور میں حضرت ممدوح سے پوری تعداد موجب انقطاع کی نہ سن سکا حتی کہ آپ کی وفات ہوگئی۔ ہاں البتہ ایک مرتبہ آپ نے وہ امور بیان فرمائے جن سے ایمان میں ترقی ہوتی ہے چنانچہ فرمایا، ان میں سے ایک زیارت القبور ہے (کہ گورِ غریباں میں جاکر شکستہ قبروں کو دیکھا کرے۔ تاکہ موت یاد آکر دنیا سے دل افسردہ ہو۔) اور ایک خالص اللہ واسطے خیرات دینا ہے۔ اور ایک جھوٹی قسمیں کھانے سے پرہیز کرنا ہے۔ اور ایک نامحرم عورتوں پر نظر ڈالنے سے بچنا اور نگاہ جھکائے رکھنا ہے، اور ایک لوگوں کے گناہوں سے تغافل ہے کہ جو شخص مخلوق کی معصیتوں کی کرید اور چھان بین کے پیچھے پڑتا ہے حق تعالیٰ اس کو ان معصیتوں میں یہ وسوسہ ڈال کر مبتلا فرما دیتا ہے کہ دیکھ اس کو تو باوجودیکہ معصیت میں مبتلا ہے اللہ نے کیا کیا نعمتیں دے رکھی ہیں۔ اور تجھے باوجودیکہ طاعت میں مشغول ہے ان سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ تو حکمت کا مقتضا نہیں ہے، وغیرہ وغیرہ۔ اور ایک علماء کی تعظیم و احترام ہے کہ یہ حضرات عاملینِ شریعت ہیں لہذا ان کی تعظیم کرنے سے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے۔ حق تعالیٰ ہمیں توفیق بخشے کہ ہم ان کا مرتبہ پہچانیں اور قدر شناس بنیں۔ نیز آپ نے فرمایا اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ علماء کی اللہ کے نزدیک کیا قدر و منزلت ہے تو ان کو کبھی زمین پر چلنے نہ دیں۔ بلکہ اپنے اپنے علاقہ کے علماء کو نمبردار

اپنی گردنوں پر چڑھائے چڑھائے پھریں۔

ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اغلام کے حرام ہونے کی وجہ یہ ہے کہ مرد کے نطفے کے ساتھ چند فرشتے گرا کرتے ہیں۔ پس اگر وہ نطفہ مقعد میں گرا جو کہ محلِ ولادت نہیں ہے تو وہ سب فرشتے مرجاتے ہیں اور ایک مرتبہ فرمایا کہ وہ ملائکہ گویا کبوتر کے بچوں کی طرح (نازک بدن) ہوتے ہیں۔ اگر کوئی بچہ اونچے گھونسلے سے گر کر کسی پتھر پر آ گر پڑے تو کیا اس میں کچھ باقی رہ جائے گا؟ البتہ جس وقت نطفہ فرج میں گرتا ہے جو کہ محلِ ولادت ہے تو نطفہ کے ساتھ دو گروہ فرشتوں کے باقی رہتے ہیں، ایک گروہ نطفۂ پدری کے ملائکہ کا اور ایک گروہ نطفۂ مادری کے ملائکہ کا اور ان سب کی تعداد تین سو چھیاسٹھ ہوتی ہے۔ دونوں نصفا نصف، البتہ مرد میں دس زائد ہوتے ہیں۔ اس فوقیت کے سبب کہ حضرت آدمؑ اصل میں حضرت حواؑ کے لئے۔ پھر اگر حق تعالیٰ نے پیدائش مقدر فرمائی ہے تب تو نطفہ ترقی پاکر علقہ اور مضغہ وغیرہ بنتا اور تدریجاً وہ مراتب طے کرتا ہے جو جنین مادر پر طاری ہوتے ہیں اور اسی طرح نطفہ کے نشوونما کے ساتھ ملائکہ بھی نشوونما پاتے رہتے ہیں حتی کہ جب بچہ بطنِ مادر سے نکل کر دنیا میں آتا ہے تو وہ فرشتے بھی اس کے ساتھ باہر آتے ہیں اور وہی اس کی ذات کے محافظ اور نگہبان قرار پاتے ہیں۔ ان کا سردار وہ فرشتہ ہے جو داہنے شانہ پر تعینات ہوتا ہے۔ پس جس طرح بچے کا نشوونما ماں اور باپ کے درمیان ہوتا ہے اسی طرح ان تین سو چھیاسٹھ فرشتوں کا نشوونما ملائکہ ذاتِ پدر، اور ملائکہ ذاتِ مادر کے درمیان ہوتا ہے۔ اور اگر بچہ کی ولادت اس نطفہ سے مقدر نہیں ہوتی تو وہ گروہِ ملائکہ نطفہ کے ساتھ رحمِ مادر میں جاتے ہیں اور وہاں پہنچ کر مرجاتے ہیں۔ مگر اس کا بار بوجھ بندہ پر کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس میں اس کے کسب وفعل کا کوئی دخل نہیں۔ (نطفہ سے بچہ پیدا فرمانا نہ فرمانا اللہ پاک کا فعل ہے) اس کی مثال ایسی ہے جیسے مقدار سے زیادہ تیل چراغ میں بھرا ہوا ہو تو بتی سے اس کے قطرے ٹپکتے ہیں) گرتے وقت تو روشن اور چمکتے ہوئے ہوتے ہیں۔ مگر زمین پر پہنچنے سے پہلے ہی بجھ جاتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ رحمِ مادر سے منی نکالنے کا سبب بننا جائز نہیں۔ کیونکہ ہمیں معلوم نہیں کہ اس نطفہ سے بچہ پیدا ہونا مقدر ہوا ہے یا نہیں ہوا لہٰذا (قصداً منی کا باہر کرنا گویا) گروہِ ملائکہ کا ہلاک کرنا ہے۔ اور زنا جس مفسدہ کی وجہ سے حرام ہوا ہے وہ ملائکہ کی جہت سے نہیں ہے (کہ بچہ کی پیدائش تو اس میں بھی ہوتی ہے) بلکہ اس کی تحریم قطع نسب کی وجہ سے ہے (کہ ولد الزنا مجہول النسب ہوا کرتا ہے) اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ قیامت کے دن لوگوں کو نسب کی وجہ سے کہ یہ فلاں کا بیٹا ہے، اور فلاں کا پوتا ہے) نفع عظیم پہنچے گا۔ اور دعویٰ نسب بغیر گواہی کے مقبول نہ ہوگا۔ اور اسی لئے آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا ہے نکاح میں دو گواہ بنانے کا اور اس کے اعلان واشاعت کا۔ چونکہ زنا میں یہ ہوتا نہیں بلکہ وہ چھپا کر ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر زانی اپنے زنا کا اعلان کرے تو اس پر حدِ زنا قائم کردی جائے۔ لہٰذا وہ نسب کو قطع اور مخلوط و مشتبہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے (اور ولد الزنا کو نسب کے نفع سے محروم بنا رہا ہے، لہٰذا حرام کردیا گیا) ف کلام اللہ میں ارشاد ہے فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَھُمْ کہ جب صور پھونکا جائے گا تو باہمی نسب کا کوئی تعلق نہ رہے گا۔ نیز احادیث میں آیا ہے کہ کسی کا نسب کسی کو جنت میں نہ لے جائے گا۔ باپ ہو یا بیٹا، ہر ایک کا کرنا اور ہر ایک کا بھرنا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے، کہ نسب سے آخرت میں کوئی نفع نہیں اور شیخ کی تقریر و نیز زنا کی حرمت کا راز نسب کا نافع ہونا بتا رہا ہے۔ اس شبہہ کا جواب یہ ہے کہ ایمان و کفر کے اختلاف میں تو بے شک نسب کا کوئی اعتبار ہے نہ نفع، نبی کا باپ اگر کافر ہے تو جہنمی ہے اور بیٹے کا نبی ہونا اس کو کچھ بھی نفع نہ دے گا۔ اور ممکن ہے کہ موجب سزائے جہنم معصیتوں میں بھی نسب سے نفع زیادہ نہ پہنچے۔ اور جو گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہو وہ جہنم کی سزا بھگتے گا۔ خواہ کسی جنتی کا باپ ہو یا بیٹا۔ مگر اس کے علاوہ صورتوں میں نسب کے ذریعہ ایک کو دوسرے سے بہت نفع ہوگا۔ چنانچہ وَاَلْحَقْنَا بِھِمْ ذُرِّیَّتَھُمْ کا اشارہ اسی طرف ہے اور معصوم بچہ کا ذخیرۂ آخرت و فرط ہونا اور باپ کو بشرطیکہ اس نے اس کے مرنے پر صبرِ جمیل کیا ہو ساتھ لئے بغیر جنت میں نہ جانا اور علماء و حفاظ اور دیگر صلحاء کا اپنے متعلقین اور اعزہ کی شفاعت کرنا اور اس کا قبول کیا جانا، وغیرہ وغیرہ یہ سب مضامین بتا رہے ہیں کہ ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان سے بوجہ تعلق نسب و رشتہ داری بہت کچھ نفع پہنچے گا۔ بلکہ عجب نہیں موجب جہنم کبیرہ معصیتوں پر بھی شفاعتوں کا اثر پڑے اور مغفور و ناجی ہونے پر چھوٹے درجہ والے کا نسبی رشتہ بلکہ صہری تعلق کی وجہ سے کبھی بڑے درجہ میں پہنچ جانا تو بکثرت وقوع میں آئے گا۔ چنانچہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے متعلقین و اعزہ کا ان کے پاس رہنا اسی بنا پر ہوگا کہ تعلقِ نسب و مصاہرت کی وجہ سے چھوٹے درجہ والے صلحاء بڑے اور اونچے درجہ میں پہنچ گئے۔ بلکہ دنیا کی بیویوں کے جنت میں ملنے کا یہی مفہوم ہے کہ زوجین کے اعمال اگرچہ متفاوت ہوں گے مگر ایک کی وجہ سے دوسرے کو تعلقِ زوجیت کے سبب ترقی دی جائے گی، جب معدن نسب کا یہ حال تو اصل نسب کے نفع کا کیا حال پوچھنا۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان محفوظ و سالم ہوتے ہوئے نسب کا نفع عظیم ہے اور ایمان ہی کے اگر لالے پڑ جائیں تو جس طرح کافر کے اعمالِ صالحہ بے کار و بے سود ہیں۔ اسی طرح اس کا کسی صالح کے ساتھ ہم نسب ہونا بھی غیر مفید و بے نفع ہے۔ واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا جانتے بھی ہو کہ قیامت کے دن سب سے زیادہ عذاب کس کو دیا جائے گا؟

میں نے عرض کیا حضرت ہی بیان فرمادیں۔ فرمایا کہ وہ شخص جسے حق تعالیٰ نے جسمِ کامل اور اعضائے صحیحہ عطا فرمائے، عقلِ کامل بخشی، صحت تامہ نصیب فرمائی، ہر قسم کا عیش اور رزق کے اسباب مہیا فرمائے، اور اس پر ایک دن، دو دن، یا زیادہ اس حالت پر گزرے کہ اس کو اپنے رب کا خیال بھی کبھی نہ آیا اور جب کسی گناہ پر قدرت پائی تو سارے بدن اور ساری عقل سے اس پر ٹوٹ پڑا۔ اور اس کے مزے لینے لگا کہ پروردگار کی طرف سے ذرہ برابر فکر بھی لاحق نہ ہوا۔ جو اسے پریشان کر دیتا۔ یا معصیت کی حلاوت میں کمی لے آتا۔ چونکہ اس شخص کو معصیت کے ساتھ کمال درجہ کا اتصال اور رب سے پورا انقطاع ہو چکا ہے کہ کلی درجہ میں جسدًا و قلبًا معصیت کی طرف مائل اور اس کو نہایت درجہ شیریں پا رہا ہے لہٰذا قیامت کے دن اسکی سزا بھی یہی ہوگی کہ یہ تمام اجزاء عذاب میں ڈال دیا جائے گا اور سارے کو یک دم آگ میں جھونک دیا جائے گا۔ اور عذاب میں اس کو وہ مزہ آئے گا جو کھجلی کے مریض کو کھجلانے میں آتا ہے اور جتنا کھجائے گا اسی قدر (کھجلی کا) وبال بڑھے گا۔ پس ارتکاب معصیت کی حالت بڑی قابلِ لحاظ ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ اگر معصیت بھی کرے تو اس کا علم ضرور قائم رکھے کہ کوئی اس کا پروردگار بھی ہے جو اس پر ہر طرح کی قدرت رکھتا ہے۔ تاکہ اللہ کا ڈر اور خوف پیدا ہو اور عذاب اگر بالکل معاف نہ ہو تو کم ازکم اس کا جوش ہلکا ضرور ہو جائے۔ ایک مرتبہ میرے شیخ حضرت عمر بن محمد ہواری نے ایک قصہ نقل فرمایا کہ ایک شخص جو گناہوں کا مرتکب ہوتا رہتا تھا میرے شیخ کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ حضرت مجھ سے معصیتیں چھوٹتی نہیں اور میں ان میں ہمیشہ مبتلا رہتا ہوں۔ اس کی کیا تدبیر کروں؟ شیخ نے فرمایا وائے افسوس کہ اپنے رب کی معصیت کرتے ہو۔ اس کو چھوڑ دو۔ اور کبھی نہ کرنا۔ کہنے لگا میں چھوڑنے پر قادر نہیں۔ شیخ نے پھر یہی فرمایا وائے تجھ پر۔ اللہ سے توبہ کر۔ اس نے پھر یہی کہا، کیا کروں، اس کا چھوڑنا میرے بس کی بات نہیں۔ اس پر حضرت نے تغافل برتا اور وہ شخص دو ایک دن حضرت کے پاس ٹھہرا۔ جب رخصت ہونے لگا تو پھر اس نے کہا۔ کہ اے میرے سردار بچنے کی کیا صورت کروں؟ شیخ نے فرمایا اچھا جب اپنے رب کی معصیت کا ارادہ کیا کرو تو تین باتوں کا دل میں تصور باندھا کرو۔ اوّل اس معصیت اور اس کی برائی کا (کہ بڑی قبیح اور عیب کی بات ہے) دوم اس کے انجام یعنی رب کے غضب کا (کہ اس پر خدا کا غضب مرتب ہوگا) سوم اپنی ذات اور نفس کی خساست و دناءت کا اور رب کی سطوت اور قہر و قدرت کا (کہ ایک ذلیل مخلوق ہو کر اللہ قہر و قدرت والے سے منھ پھیر رہا ہوں) پھر اس کا کہ باوجود قدرت کے کہ جب چاہے پکڑ لے، اس کا عفو و کرم مجھ پر کتنا عظیم ہے کہ پردہ پوشی فرما رہا ہے۔ ان تین باتوں کا دھیان کر جیسا کہ ان کا حق ہے اور پھر جو دل چاہے کیجو۔ پھر وہ شخص چلا گیا۔ ایک مدت کے بعد وہ مجھے

ملا اور اس نے سلام کیا۔ اور کہا کہ شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں نے کہا ہاں، فرمائیے آپ کون صاحب ہیں؟ کہنے لگا میں وہی مرتکبِ معاصی ہوں۔ حضرت شیخ کی برکت سے حق تعالیٰ نے میری دستگیری فرمائی۔ اور جب میں نے معصیت کا ارادہ کیا اور حضرت کی نصیحت کے موافق ان تین باتوں کا تصور کیا تو معصیت پر قادر نہ ہو سکا اور یہی میری توبہ کا سبب بن گیا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ میرے نزدیک کبیرہ گناہ وہ ہے جو بحالتِ انقطاع کیا جائے۔ کہ قلب اس کے ارتکاب کے وقت اللہ اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور قیامت کے دن سے بے تعلق ہو۔ اگرچہ اس کے ظاہر کو ان سے تعلق ہو کہ اس (ظاہری تعلق) سے کوئی نفع نہیں پہنچتا۔ اور اس حالت کی معصیت کو کبیرہ اس لئے کہا گیا کہ بے تعلقی کی حالت میں بندہ جب معصیت میں پڑے گا تو بدن سے بھی پڑے گا اور دل سے بھی۔ ہاتھوں سے بھی اور پاؤں سے بھی۔ محبت سے اور شوق سے اور اپنی تمامی ذات سے۔ لہٰذا نہ کوئی روکنے والا ہوگا جو دھمکائے اور معصیت سے روکے، اور نہ کوئی ناصح و واعظ ہوگا کہ رب کی یاد دلائے۔ اور صغیرہ گناہ وہ ہے جو ایسی حالت میں صادر ہو جب کہ اپنے رب سے وابستہ ہو اور اس کے رسل و ملائکہ یعنی ان وسائل سے متعلق ہو جو رب تک پہنچانے والے ہیں کہ ایسی حالت میں جب بندہ معصیت میں پڑے گا تو نیت کے بغیر اور معصیت سے ایک قسم کا بغض لئے ہوئے پڑے گا۔ کیونکہ قلب میں زاجر موجود ہوگا جو معصیت سے جھڑکے گا۔ اور اس لئے عین ارتکابِ معصیت کے وقت بھی اپنے رب کی شرم و حیا اس میں موجود ہوگی۔ میں نے عرض کیا کہ اس فرق پر تو یہ اشکال وارد ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے چند گناہِ کبیرہ گنوائے ہیں۔ ان میں انقطاع کی قید نہیں لگائی۔ چنانچہ بخاری و مسلم میں ایک حدیث ہے کہ کبیرہ گناہ یہ ہیں۔ شرک[1] باللہ، سحر[2]، نافرمانی[3] والدین، قتلِ نفس[4] اور بخاری میں اضافہ ہے جھوٹی قسم کا۔ اور ایک میں آیا ہے۔ بچو سات تباہ کن گناہوں سے۔ شرک[1] باللہ۔ سحر[2]۔ ناحق کسی[3] کا قتل۔ یتیم کا[4] مال کھانا، سود خوری[5]۔ جہاد[6] سے بھاگنا۔ اور بے خبر مسلمان عورتوں پر زنا کی تہمت لگانا۔ حضرت ممدوح نے فرمایا یہ سارے گناہ (جن کو کبائر کہا گیا ہے۔) بندے سے صادر ہی نہیں ہوتے جب تک وہ اپنے رب سے منقطع نہ ہو جائے۔ اگر اس کے قلب کو رب کے ساتھ کچھ بھی لگاؤ رہے گا، تو نہ شرک صادر ہوگا، نہ سحر کر سکے گا، نہ کسی کو ناحق مار سکے گا۔ نہ یتیم کا مال یا سود کھا سکے گا۔ نہ جہاد سے پشت پھیر سکے گا۔ نہ زنا کی تہمت لگا سکے گا۔ نہ عقوقِ والدین کر سکے گا۔ نہ جھوٹی قسم کھا سکے گا۔ اسکے بعد فرمایا کیا فلاں شخص کو نہیں دیکھتے کہ عنقریب ولی بننے والا ہے۔ حالانکہ اس وقت اس پر حجاب پڑا ہوا ہے، مگر اس کا قلب اللہ سے تعلق رکھے ہوئے ہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ (باوجود قدرت کے)

مذکورہ معصیتوں میں مبتلا نہیں ہو سکتا اور ان سے ایسا ڈرتا ہے جیسے کوئی آگ سے ڈرا کرتا ہے۔ اور دیکھو فلاں شخص کو کہ (صورۃً کیسا ہی ذاکر اور شاغل بنا ہوا ہے مگر) فتح نصیب نہیں ہوئی۔ کیونکہ اس کا قلب اللہ سے بے تعلق ہے اور محض زبانی ذکر اللہ کچھ نفع نہیں دیتا۔ پھر دیکھ لو کیسے گندے افعال کا مرتکب ہو رہا ہے۔ غرض بے تعلق کی معصیتیں بھی چھپتی نہیں۔ اور باتعلق کی معصیتیں بھی چھپتی نہیں۔ (انداز و قرائن بالخصوص نتیجہ و ثمرہ سے کھل جاتا ہے کہ یہ گناہ قطع تعلق عن اللہ پر صادر ہوا ہے۔ اور یہ گناہ تعلق مع اللہ قائم رہتے ہوئے صادر ہوا ہے۔)

نیز آپ نے فرمایا کہ حصولِ معاش کے جتنے بھی وسائل ہیں مثلاً تجارت، زراعت، ملازمت وغیرہ، ان کی مثال ایسی ہے جیسے فقیروں کے ہاتھ میں کشکول (کہ بھیک مانگتے وقت اس کو سامنے کر دیتے ہیں۔ دینے والا روٹی، پیسہ جو بھی دینا ہوتا ہے اس میں ڈال دیتا ہے) چونکہ حق تعالیٰ کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ بلاوسیلہ کسی کو رزق عطا نہیں فرماتا، بلکہ اس وقت دیتا ہے جب بندہ اسبابِ رزق میں سے کسی سبب کا کشکول لے کر آوے۔ پس جب اس کو سامنے کر کے روزی کا سوال کرتا ہے تو جو بھی اس کے لئے مناسب اور جتنا بھی اس کے لئے مصلحت سمجھتا ہے اس میں ڈال دیتا ہے۔ لہٰذا سببِ معاش اختیار کرنے والے پر ضروری ہے کہ وہ سبب کو اسی درجے پر رکھے۔ سبب اختیار کرتے وقت اس کی نظر اپنے رب کی طرف ہو نہ کہ سبب کی طرف۔ جیسا کہ بھک منگے فقیر کی نظر دینے والوں پر پڑا کرتی ہے نہ کہ اپنے کاسہ پر، جسے ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ اور جب سبب اختیار کرتے وقت نظر اپنے رب کی طرف ہو گی تو سبب کی حالت میں بھی اس کا تعلق رب ہی کے ساتھ رہے گا۔ اور سبب (یعنی تجارت و زراعت وغیرہ) اس کے اور رب کے درمیان وسیلہ اور ذریعہ بن جائے گا۔ لہٰذا سبب پر بھروسہ نہ کرے گا۔ بلکہ رب پر بھروسہ کرے گا۔ اور چونکہ اس کا بھروسہ رب پر ہو گا تو سببِ معاش بھی وہی اختیار کرے گا جس کی بابت اس کے رب نے اجازت دی ہے (یعنی حلال و جائز صورت نہ کہ حرام یا مکروہ) اور اب اس کے نزدیک اسبابِ معاش کی تقلیل و تکثیر میں بھی کوئی فرق نہ ہو گا۔ کیونکہ دینے والا پروردگار تو ایک ہی ہے اور وہ قادر ہے کہ ایک ہی سبب اختیار کرنے پر اتنا دے دے جو دوسروں کو متعدد اسباب اختیار کرنے پر دیتا ہے۔ لہٰذا ڈرنا چاہیئے اور تحصیلِ معاش میں خوبی کو اختیار کرنا چاہیئے (کہ جب دینے والا اللہ ہے تو مستحب و محبوب طریقِ معاش کیوں نہ اختیار کرے تاکہ دنیا بھی ملے اور دین بھی ملے۔) غرض اللہ سے تعلق والوں کے اسباب کی صورت تو یہ ہوتی ہے۔ اور جو اللہ سے بے تعلق ہوتے ہیں وہ سبب اختیار کرنے کی حالت میں محنت و خدمت کرتے کرتے مر کھپتے ہیں۔ اور جو کوئی بھی ذریعۂ معاش

دیکھتے ہیں اس کو اختیار کر لیتے ہیں۔ خواہ حلال ہو یا حرام اور اللہ نے اس کی اجازت دی ہو یا نہ دی ہو اور ان کا عقیدہ یہ ہوتا ہے کہ جتنی کوشش کریں گے اور تدبیر کریں گے اسی کے موافق رزق حاصل ہوگا۔ پس ان لوگوں کو دنیوی امور کی تدبیر اور طلبِ رزق میں (دن رات) تعب اٹھانا اور محنتِ شاقہ کا برداشت کرنا، اللہ سبحانہٗ کی طاعت اور عبادت سے زیادہ لذیذ اور شیریں معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان کو اللہ سبحانہٗ سے قطعی بے تعلقی ہو چکی ہے۔ نیز ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک قوم کی کمروں میں رسیاں باندھ دی جائیں اور ان کو بلند پہاڑوں کی چوٹیوں سے لٹکا دیا جائے کہ آسمان اور زمین کے درمیان ادھر اور ہوا میں معلق ہوں اور اس حالت پر زمانہ گزر رہا ہو۔ پس ان میں جو لوگ ذی فہم اور اہلِ عقل ہوں گے وہ تو بے قرار ہوں گے کہ کسی وقت ان کو سکون نہ ہوگا۔ کبھی تو ان کی نظر اس جگہ پر جائے گی جہاں گرنے کی صورت میں آپڑنے کا اندیشہ ہے کہ دیکھیں گے وہ جگہ قریب ہے یا بعید۔ اور نرم ہے یا سخت اور اگر اس جگہ جا گرے تو کیا حالت ہوگی۔ د سر پھٹے گا یا بچے گا اور مرینگے یا زندہ رہیں گے) غرض وہ وہ فکر لاحق ہوں گے جو کلیجہ شق اور دل پارہ پارہ کر دیں گے۔ اور کبھی نظر جائے گی اس شخص کی طرف جس کے ہاتھ میں وہ رسی ہے، جسمیں لٹکے ہوئے ہیں کہ آیا وہ رسی کو اپنے ہاتھ سے چھوڑ دینے کا ارادہ کر چکا ہے یا ابھی کچھ وقت باقی ہے اور آیا ہمارے اور اس کے درمیان محبت و شفقت کا تعلق قائم ہے کہ چھوڑتے وقت ترس کھائے گا اور جہاں بھی گرائے گا نرمی اور ملاطفت کے ساتھ گرائے گا۔ یا اس کے اور ہمارے درمیان نہ رشتہ محبت ہے، نہ تعلقِ شفقت، اس لئے گراتے وقت پروا بھی نہ کرے گا۔ (کہ مریں یا جئیں یا سسکیں)، اگر ایسا ہے تو اس کی خوشنودی و طلبِ رضا میں سعی کریں گے۔ اور یہ کسی تدبیر سے تو ممکن نہیں۔ کیونکہ وہ (بندھے، جکڑے اور لٹکے ہونے کے سبب خود) کوئی کام بھی نہیں کر سکتے۔ بجز اس کے کہ ان کے قلب میں شکستگی و انکسار ہو۔ اور زبان پر خاشعانہ و عاجزانہ کلمات اور نگاہ چشم پست اور ایسی جھکی ہوئی جیسے خوف زدہ اور رحم و کرم کے طالب و متمنی کی نگاہ ہوا کرتی ہے۔ پھر اس کے بعد اس کو اختیار ہے کہ چاہے رحم فرمائے اور چاہے سزا دے۔ پس ان لوگوں کے قلوب اس کے خوف اور عذاب سے مضطرب اور گویا آگ میں تپ رہے ہوں گے۔ مگر ان لٹکے ہوئے لوگوں میں جن کو عقل نہ ہوگی وہ نہ تو اس جگہ پر نظر ڈالیں گے جہاں گرنا ہے اور نہ اس شخص پر نظر ڈالیں گے جس کے ہاتھ میں ان کی رسی ہے۔ بلکہ ان پر نسیان کا غلبہ ہوگا۔ اور وہ پس و پیش سب کچھ بھولے ہوئے ہونگے، اور یوں سمجھیں گے کہ یہی ہماری قیام گاہ ہے۔ لہٰذا اسبابِ اقامت میں مشغول ہو جائیں گے۔ مکانات اور محل تعمیر کرنے لگیں گے اور زراعت و تجارت میں لگ جائیں گے۔ حالانکہ وہ ہوا میں معلق ہیں (جو نہ تعمیرات کی جگہ ہے نہ زراعت و تجارت کی) اور ان کو رسی کے معاملہ کا شعور و ادراک ہی نہیں۔ جس وقت

وہ رسّی کٹ جائے گی اور جہاں گرنا ہے وہاں آپڑینگے تب سمجھیں گے کہ بڑی غلطی کھائی اور حد درجہ کوتاہی ہوئی کہ اس کا کبھی خیال بھی نہ لائے اور نہ اس کی اصلاح کا کوئی طریق اختیار کیا۔ حتیٰ کہ دعا وزاری تک بھی نہ کی۔ نہ اس جگہ گرنے کی تیاری کی اور نہ اس کو پہچانا، جس کے ہاتھ میں ہماری رسّی تھی۔ ورنہ کم ازکم اس کے سامنے گڑگڑاتے اور اس سے نجات وسلامتی کی درخواست تو کرتے۔ پس یہ ہے حالت اس کی جو اللہ سے غافل اور آخرت سے بے خبر ہے کہ رسّی تو عمر ہے اور اس کا کٹنا موت ہے۔ اور وہ جگہ جہاں گرتا ہے یا جنت ہے یا دوزخ۔ اور وہ ذات جس کے ہاتھ میں رسّی ہے وہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہے۔ پس جن کو معرفت نصیب ہے (کہ عقلِ سلیم اس کی خادمہ ہے) وہ تو ہر وقت ان دونوں باتوں کے خوف میں رہتا ہے لہٰذا حق تعالیٰ اس کو بروزِ قیامت اس کے بدلہ ہر قسم کی راحت نصیب فرمائے گا (کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ط ان ہی کے بارے میں ہے) اور جو لوگ غافل ہیں ان کا حال اس کے برعکس ہوگا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لئے پیغمبر بھیجے اور ان کو طاعت کا حکم فرمایا ہے، صرف ایک بات کی خاطر۔ وہ یہ کہ اللہ کو پہچانیں اور اس کو یگانہ سمجھیں۔ اور اس کے ساتھ کسی شے کو شریک قرار نہ دیں۔ پس جب بندے سے یہ مقصود حاصل ہوگیا تو وہ محبوب وعزیز بن گیا اور طاعت صرف وہ دروازہ کھولنے کے لئے ہے جس سے نورِ حق مطیع کی ذات پر داخل ہو۔ اور معاصی کی ممانعت کا حاصل صرف ان دروازوں کو بند کرنا ہے جیسے عاصی ذات پر باطل کی ظلمتیں داخل ہوا کرتی ہیں تو جس شخص نے طاعتوں پر عمل کیا اور مخالفتوں سے بچتا رہا اس نے اپنی ذات پر نورِ حق کے دروازے کھول لئے اور ظلمتِ باطل کے دروازے بند کر دیئے اور جس نے طاعت بھی کی اور معصیت کا بھی مرتکب ہوا، اس نے اپنے اوپر ایک ساتھ دونوں دروازے کھول لئے۔ لہٰذا بندہ کو اس سے قبل کہ پشیمان ہو اور پشیمانی نفع نہ دے دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کس درجہ میں ہے اور کون سا دروازہ اپنے اوپر کھول رکھا ہے۔ لیکن اکثر آدمیوں کا خیال ہے کہ ظاہری عملِ طاعت کافی ہے دروازۂ نور کھولنے کے لئے۔ اور ظاہری ارتکابِ معصیت کافی ہے دروازۂ ظلمت کھولنے کے لئے۔ حالانکہ یہ غلط ہے بلکہ ضروری ہے کہ ظاہر کو باطن سے موافقت بھی ہو۔ لہٰذا آدمیوں کی چار قسمیں بن گئیں۔ ایک ۱ قسم وہ جن کا ظاہر اور باطن دونوں اللہ کے ساتھ ہیں کہ ظاہر کے مع اللہ ہونے کا اثر ہے۔ تعمیلِ حکم اور عمل بر طاعت اور باطن کا مع اللہ ہونا یہ ہے کہ طاعت کرتے وقت غفلت نہیں ہے۔ بلکہ شانِ حضور ومراقبہ، اور توجہ الی اللہ ومشاہدہ نصیب ہے۔ یہ قسم تو وہ ہے جو عند اللہ محبوب ہے۔ دوسری ۲ قسم وہ جن کا ظاہر و باطن غیر اللہ کے ساتھ ہے کہ ظاہر پڑا ہوا ہے معاصی میں اور باطن ڈوبا ہوا ہے غفلتوں میں۔ یہ وہ قسم ہے

جو عند اللہ مذموم ہے۔ تیسری قسم وہ ہے جن کا ظاہر اللہ کے ساتھ ہے اور باطن غیر اللہ کے ساتھ، کہ بدن تو طاعت میں لگا ہوا ہے مگر دل غافل ہے اور اس کی وجہ کہ عبادت کبھی اس کو اللہ کی طرف واپس نہ لائی یہ ہے کہ عبادت اس کے لئے منجملہ عادتوں کے ایک عادت بن گئی ہے اور اس لئے طبیعت اس سے مانوس ہو گئی ہے (جیسے پان کھانے کی عادت کہ جب تک مل نہ جائے طبیعت کھٹکتی ہے) پس یہ شخص طاعت کرتا ہے بحکم طبیعت، نہ کہ بحکم شریعت۔ اور کبھی اس کے ساتھ ایک مرض اور بھی شامل ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ عبادت اور زہد اور حسنِ سیرت میں لوگوں کے اندر اس کی شہرت ہوتی ہے اور اس کو اندیشہ ہوتا ہے کہ عبادت میں کوتاہی کروں گا تو لوگوں کی نظروں سے گر جاؤں گا۔ چنانچہ تم اس کو دیکھو گے کہ رات دن عبادت میں لگا رہتا ہے۔ اس لالچ میں کہ لوگوں کے نزدیک میرا مرتبہ بڑھ جائے (پس اس کی عبادت میں حکمِ طبیعت کے ساتھ حکمِ ریا و حصولِ جاہ عند الناس بھی ہے) یہ وہ قسم ہے جس کی عبادت اللہ سے بُعد بڑھاتی (اور دُور کرتی چلی جاتی) ہے۔ ہاں کبھی حق تعالیٰ اس نوع کے کسی شخص کو اپنے اکابر اولیاء میں سے کسی کی صحبت نصیب فرما دیتا ہے تو وہ اس کا مرض دیکھ لیتا ہے اور اس کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اس کی ظاہری عبادتوں میں سے جن کا وہ پابند تھا، کسی عبادت کے چھوڑنے کا اس کو حکم دیتا ہے۔ پس اگر یہ مرض قوی و مستحکم ہوتا ہے تو وہ کہنا نہیں مانتا اور ہلاک ہو جاتا ہے۔ صاحب کتاب کہتے ہیں کہ حضرت ابو سعید بسطامیؒ کے ایک مرید کا قصہ ایسا ہی ہوا تھا کہ حضرتِ ممدوح نے اس کو نفل روزوں کے چھوڑ دینے کا حکم فرمایا تو اس نے انکار کر دیا۔ اور کہنا نہ مانا۔ اس کے پیر بھائیوں نے اس سے کہا بھی کہ تجھ پر افسوس، اپنے پیر کا بھی کہنا نہیں مانتا۔ حضرتِ بسطامیؒ نے فرمایا چھوڑو جو اللہ کی نظروں سے گر گیا، اسے نصیحت سے کیا فائدہ۔ چوتھی قسمؔ وہ ہے جن کا ظاہر مخالفت میں ہے۔ مگر باطن اللہ کے مراقبہ میں۔ تم دیکھو گے کہ (بغلبۂ نفس) معصیت کا ارتکاب کر رہا ہے۔ مگر اس کا رب اس کی نظروں کے سامنے ہے اور اس کے فکر و خیال سے اوجھل نہیں ہوتا۔ اور اس لئے یہ معصیت اس کو (بعد فراغ جبکہ غلبۂ نفس ٹھنڈا پڑ جاتا ہے) اتنی بڑی معلوم ہوتی ہے گویا سر پر پہاڑ گر پڑا۔ پس وہ ہر وقت محزون و غمگین رہتا ہے۔ اور یہ اس شخص سے (جس کا ظاہر مشغول بہ طاعت تھا مگر اس کا باطن مغفل تھا) بدرجہا افضل ہے کیونکہ بندہ سے اللہ کا مقصود اس کا انکسار اور ذلت و عاجزی کے ساتھ اس کے حضور میں کھڑا ہونا ہے۔ اور وہ اِس کو حاصل ہے، اُس کو حاصل نہیں۔

ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا کہ بعض دفعہ آدمی تڑپنے لگتا ہے اور اس کی چیخیں نکلنے لگتی ہیں۔ اس کی حقیقت کیا ہے اور میں تو جب بھی ذکر یا عبادت میں مشغول ہوتا ہوں یہ حالت مجھ پر طاری ہو جاتی ہے

مجھے اندیشہ ہے کہ یہ شیطان کی طرف سے نہ ہو۔ کیونکہ جب دنیا کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یا اس کے مشغلہ میں لگ جاتا ہوں تو یہ حالت نہیں ہوتی۔ حضرت نے فرمایا کہ کبھی روح اپنے نور کو ذاتِ انسان پر پھینکا کرتی ہے اور اس کی وجہ سے بدن تڑپنے لگتا ہے۔ پھر کبھی تو روح یہ نور بحالتِ طاعت ڈالتی ہے اور کبھی بحالتِ معصیت، کہ انسان اپنے رب کی معصیت میں مشغول اور خواہش نفس پر جما ہوتا ہے۔ اور دفعتہً روح اپنا نور اس کی ذات پر پھینکنے لگتی ہے۔ جس کی وجہ سے ذات کو رجوع الی اللہ اور خشوع حاصل ہوتا ہے۔ لیکن اگر طاعت کی حالت میں یہ کیفیت طاری ہو تو اس کو اپنی طاعت اور عبادت کی طرف منسوب نہ کرنا چاہیئے۔ ورنہ خودستائی پیدا ہو جائے گی۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ اگر یہ اثر اس طاعت کا ہوتا تو دوسری حالت میں کبھی ظاہر نہ ہوتا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ یہ نور جو ذات کو روح کی طرف سے حاصل ہوتا ہے بمنزلہ لگام کے ہے۔ کیونکہ جب روح ذات کو دیکھتی ہے کہ راستہ سے مڑ چلی اور اندیشہ کرتی ہے اس کی کجی اور بدراہی کا تو وہ نور ظاہر ہوتا ہے۔ تاکہ اس کو کھینچ کر راستے کی طرف لے آئے اور اہلِ خیر وصلاح میں سے بناتے رکھے۔ کیونکہ ہدایت کے اسباب میں یہ بھی ایک سبب ہدایت ہے۔ اور نااہلوں کے لئے یہ نورِ روح خالص ظلمت بن جاتا ہے۔ (کہ راہِ حق سے باز رکھتا اور یہ سمجھا کر کہ میری حالت مستحسن ہے، اس پر جما دیتا ہے) اور اس کو پیغمبر کا حکم ماننے سے روک دیتا ہے۔ غرض ہر ذات کے لئے ایک روشنی ہے اور وہ اپنی ہی روشنی میں چلا کرتی ہے۔ پس اگر اس کی روشنی صحیح راستہ دکھا رہی ہے تو توفیقِ الٰہی اس کے شامل حال ہے۔ اور اگر اس کی روشنی اسے کج راستہ پر لے جا رہی ہے کہ اسی کا نام ہم نے ظلمت رکھا ہے تو اس کا ساتھ توفیقِ الٰہی نے چھوڑ دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ روح میں تین سو چھیاسٹھ اسرار ہیں۔ منجملہ ان کے ایک سِر ایسا ہے کہ اگر روح اس کو ذات پر ڈالے تو آدمی ہر وقت روتا ہی رہے اور ایک سِر ایسا ہے کہ اس کو روح اگر ذات پر ڈالے تو ہمہ وقت چیختا ہی رہے۔ اور ایک سِر ایسا ہے کہ اس کو روح اگر ذات پر ڈالے تو ہر دم ہنستا رہے۔ مگر روح وہی اسرار ڈالتی ہے جو تقدیر میں پہلے سے تجویز ہو چکے ہیں۔ میں ایک دن حضرت ممدوح کے پاس ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ کہ ایک شخص آکر ہمارے پاس بیٹھ گیا۔ حضرت ممدوح کچھ تقریر فرما رہے تھے کہ وہ بڑے زور سے چیخنے لگا۔ اس کے بعد حضرت نے مجھ سے فرمایا کہ یہ حالت بڑی چیز ہے۔ (کہ رقّتِ قلب اور توجہ الی اللہ ہے) بشرطیکہ شیطان اس کے ساتھ کھیلنے اور اس کی نماز کو فاسد نہ کرنے لگے۔ میں نے کہا حضرت یہ کیسے؟ فرمایا قلوب کا اللہ کی طرف رُخ ہونا قلب کی نماز ہے، جیسا کہ بدن کا رکوع وسجدہ بدن کی نماز ہے اور نماز اور دیگر طاعات کا مشروع ہونا محض اس لئے ہے کہ بندہ کو یہ توجہ قلب حاصل ہو جائے۔ کیونکہ تمامی عبادتوں کا نتیجہ اور وہ فائدہ جو بندہ کے نفع اور رحمت کا سبب

ہے، وہ یہی ہے۔ پس شیطان جب کسی شخص کو دیکھتا ہے کہ وہ ذکر اللہ یا وعظ وغیرہ سن کر اس توجہ کو حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ اس حسد و بغض کی بنا پر جو اس کو بنی آدم کے ساتھ مدت سے ہے، اس کے قلب میں گھس کر اس توجہ کو فاسد کرنے لگتا ہے۔ چنانچہ چیخنے والے پر کئی مفاسد مرتب ہو جاتے ہیں۔ ایک تو یہی کہ وہ توجہ فاسد ہو گئی جو سببِ فلاح تھی۔ ایک یہ کہ وہ سمجھنے لگتا ہے میں کچھ ہو گیا۔ ایک یہ کہ خطرہ ہو گیا اللہ سے قطع تعلق کا کیونکہ اس چیخنے چلانے سے وہ سمجھا کہ مجھے بزرگی مل گئی۔ نیز عوام بھی اس کو بزرگ اور بڑا سمجھنے لگتے اور اس کی طرف انگلیاں اٹھانے لگتے ہیں (کہ یہ ہیں وہ صاحبِ کمال جن کو وجد و حال آتا ہے اور اللہ کی محبت میں تڑپتے اور سر پھوڑتے ہیں) اور جس کی طرف انگلیاں اٹھتی ہیں وہ تباہ ہو جاتا ہے (کیونکہ نفس پھولتا ہے)، صاحب کتاب اس کی تائید میں ایک قصہ نقل کرتے ہیں جس کو شیخ زروق نے بیان فرمایا تھا، کہ چند درویش تھے جن کی فاس میں ایک خانقاہ تھی۔ ایک دن انھوں نے ایک صادق الحال بزرگ سے جو کہ نابینا تھے، درخواست کی کہ ہمارے ساتھ چلیں۔ چنانچہ وہ ان کی قیامگاہ پر آئے۔ جب فقرا اپنے ذکر میں مشغول ہو گئے تو دفعتہً نابینا بزرگ نے فرمایا کہ صاحبو دیکھو تم پر شیطان ایک سینگوں والے مینڈھے کی صورت میں گھس آیا۔ اس کے بعد پکارا، ارے یہ لال گدڑی والا تم میں کون ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ شیطان اس کو بری طرح سونگھ رہا ہے۔ اس کے بعد غل مچایا ارے اس کے تو سینگ مار دیا، لو اسکے پیٹ میں تو اس نے اپنے سینگ گھسا دیے۔ یہ نابینا اپنے کلام سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ لال گدڑی والا چیخنے لگا اور بدحواس ہو گیا (جس کو اپنے خیال میں کمال اور وجد و حال سمجھا ہوا تھا) اس کے بعد نابینا بزرگ نے کہا اور وہ تم میں فلاں لباس پہنے ہوئے کون ہے؟ میں دیکھ رہا ہوں کہ اب شیطان اس کی طرف آیا اور اس کو سونگھنے لگا۔ اس کے بعد شور مچایا۔ اللہ قسم اس کے تو بری طرح اس نے سینگ مارا۔ چنانچہ وہ بھی چیخیں مارنے لگا اور بدحواس ہو گیا۔ غرض اس صادق الحال کی معیت کے سبب سب سوا ہوئے۔ اس سے پہلے وہ سمجھ رہے تھے کہ ہم بڑے مرتبے پر پہنچ گئے ہیں۔ مگر ان کا یہ جہلِ مرکب تھا۔ (کہ شیطانی اثرات کو رحمانی برکات سمجھ لیا) ایک مرتبہ کسی عارف شیخ کے سامنے ایک شخص چیخیں مارنے لگا۔ شیخ نے فرمایا میاں میں نے تمھاری چیخ کا تعاقب کیا (کہ دیکھوں کہاں پہنچتی ہے) تو فلاں مقبرہ میں فلاں قبر پر جا پہنچا۔ تب چیخنے والے نے کہا، ہاں حضرت آپ نے سچ فرمایا۔ میرا ادھر کو گزر ہوا تو آپ صاحبوں کو پایا کہ اپنے محبوب کو یاد کر رہے ہیں۔ لہٰذا مجھ کو بھی میری محبوبہ یاد آگئی، جو کہ میری چچازاد بہن تھی، اور انتقال کر چکی۔ وہ قبر (جہاں تک آپ پہنچے) اسی کی ہے۔ بس اس کو یاد کر کے الم و فراق کی وجہ سے میری چیخیں نکلنے لگیں۔ حضرت نے فرمایا تمبا کو پینا حرام ہے۔ کیونکہ ایک تو بدن کو مضرت پہنچاتا ہے۔

دوسرے اس کی لت ایسی لگ جاتی ہے کہ اللہ کی عبادت سے غافل بنا دیتی اور قطع تعلق کرادیتی ہے۔ اور ہمیں تو جب کسی چیز کے حلال و حرام ہونے میں شک ہوتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں کوئی نص منقول نہیں ملتی تو ہم اہلِ دیوان اللہ کو دیکھتے ہیں جن کو اہلِ دائرہ کہا جاتا ہے۔ پس اگر ان کو اس کا استعمال کرتے دیکھتے ہیں تو سمجھ لیتے ہیں کہ وہ حلال ہے۔ اور اگر دیکھتے ہیں کہ وہ اس کا استعمال نہیں کرتے بلکہ اس سے پرہیز کرتے ہیں تو سمجھ جاتے ہیں کہ وہ حرام ہے اور اگر بعض کو استعمال کرتے دیکھتے ہیں اور بعض کو پرہیز کرتے تو پھر کثرت پر نظر ڈالتے ہیں (کہ ان میں سے اکثر کا معمول کیا ہے) کیونکہ حق وہ ہے جس پر اکثر ہوں۔ اور اہلِ دیوان میں اس دھواں پینے کا استعمال بالکل نہیں ہے۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ اس کی بدبو سے فرشتوں کو تکلیف ہوتی ہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک قصہ بیان فرمایا کہ ایک شہر تھا نہایت متعفن کہ آدمیوں کے بھی فضلے اس میں بہت جمع تھے اور مویشیوں کے گوبر اور نجاستیں بہت زیادہ تھیں اور وہاں پانی بہت کم تھا۔ (اس لئے نجاستیں دھل بھی نہ سکیں۔) غرض ہوا میں اتنی بدبو پھیلتی تھی کہ بیان نہیں ہو سکتی۔ ایک دن آٹھ اہلِ تصرف اولیاء اللہ اس میں داخل ہوئے۔ مگر جب وسطِ شہر میں پہنچے تو بڑی سرعت کے ساتھ باہر نکلے۔ اور اس کا سبب یہ ہوا کہ ان فرشتوں کو جو ان کی ذات پر تعینات تھے اس بدبو سے وحشت و نفرت ہوئی۔ اور اس وجہ سے ان اولیاء اللہ کو بھی نفرت و وحشت ہوئی۔ کیونکہ ملائکہ کی وحشت و علیحدگی سے جو خطرات ہیں ان کو وہی سمجھتا ہے جو صاحبِ بصیرت ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص کو ایسی جگہ لایا جائے جہاں دشمن اور چور جمع ہوں۔ اور اس کے ہتھیار اس کے بدن سے علیحدہ کر دیئے جائیں تو (اب اس کو جان کا خطرہ ہوگا۔ کیونکہ) اب چیز کون سی رہی جس سے دشمن کا مقابلہ کرے۔ ف اسی طرح ملائکہ گویا اہلِ تصرف کے ہتھیار اور اعوان و انصار ہیں کہ ان کی وجہ سے شیطان پاس آتا ہوا ڈرتا ہے۔ وہی گھبرا کر بھاگنے لگے اور جدا ہو گئے تو اب ہر قسم کا خطرہ ہو گیا۔ بودار چیزوں کے استعمال سے شریعت نے اسی وجہ سے منع کیا ہے اور بلا ضرورت کتے کے پالنے یا تصویر گھر میں رکھنے کی ممانعت کہ اس گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے، اسی بنا پر ہے کہ نورِ ملائکہ سبب ہے ظلمتِ شیاطین کے مٹانے کا۔ پس جس جگہ فرشتوں کو نفرت و وحشت ہوگی وہاں شیاطین کا عمل دخل اور زور ہوگا۔ ہر قسم کی ظلمت اور بے برکتی چھائے گی۔ اور طاعتوں سے دن بدن بے رغبتی اور معاصی سے روز بروز رغبت بڑھے گی۔ ایک چیز صورۃً ہلکی اور معمولی معلوم ہوتی ہے۔ مگر نتیجہ کے اعتبار سے بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ اسی قبیل سے کتا اور تصویر ہے کہ مسلمانوں نے بھی اس کو معمولی سمجھ لیا ہے۔ مگر اہلِ نور کا اس گھر سے بُعد و خروج اور اہلِ ظلمت کا اس سے قرب و دخول اگر دین سے متوحش اور علوم رسالت سے متنفر بنا کر عیاذاً باللہ کفر و انقطاع عن اللہ

تک پہنچا دے تو بعید نہیں۔ جب کہ شیطان کا قصہ مشہور ہے کہ دیوار پر ذرا سا شیرہ لگا کر علیحدہ کھڑا ہو گیا اور نوبت پہنچ گئی خونریزی کی کہ کتنی جانیں ہلاک ہو گئیں۔ چنانچہ تصویر کا انجام بت پرستی اور کتا پالنے کا نتیجہ درندگی و بے دردی تجربہ میں آرہا ہے۔ ۱۲

میں نے کہا کہ لہسن اور پیاز میں بھی تو بدبو ہے، حالانکہ ان کا کھانا حرام نہیں (صرف اس بدبو کے ہوتے ہوئے مسجد میں جانے کی ممانعت ہے) فرمایا جب آدمی اور فرشتہ کے حقوق کا مقابلہ آپڑتا ہے تو آدمی کے حق کو ترجیح دی جاتی ہے۔ کیونکہ ہر چیز آدمی ہی کی غرض سے پیدا کی گئی ہے (تو جس شے میں بنی آدم کے لئے کوئی منفعت ہو وہ حرام نہ ہوگی، اگرچہ اس میں فرشتے کے لئے مضرت ہو اور پیاز و لہسن میں جو منافع ہیں وہ ظاہر ہے کسی سے مخفی نہیں۔ بخلاف تمباکو نوشی کے کہ اس میں کوئی منفعت نہیں ہے۔ ہاں اس کے پینے سے ایک بدنی مضرت ضرور پہنچتی ہے۔ اور اس کے بعد حقہ پینا اس مضرت کا دافع بن جاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہوئی کہ خود کپڑے کو پھاڑا اور پھر خود ہی پیوند لگایا (کہ حقہ پی کر مرض لگایا اور پھر اس کا علاج حقہ نوشی کو بنایا) اگر یہ شخص حقہ نہ پیتا تو وہ پھٹن ہی پیدا نہ ہوتی جس میں پیوند لگانے کی ضرورت پڑ گئی۔ پس حقہ پینے والے سمجھتے ہیں کہ اس میں نفع ہے۔ حالانکہ اس نفع کی حقیقت بس اتنی ہے کہ اس نقصان کے لئے مفید ہے جو خود حقہ پینے سے لاحق ہوا ہے) شیخ حطاب اور شیخ مواق رحمہما اللہ میں اختلاف ہوا ہے، کہ حمام میں غسل کے لئے جانا جب کہ اس میں بے ستر اور برہنہ لوگ موجود ہوں شیخ حطاب کے نزدیک حرام ہے، اور فرماتے ہیں کہ ٹھنڈے پانی سے اندیشۂ ہلاکت ہو تو غسلِ جنابت کا تیمم کرنا ضروری ہے، مگر حمام میں جانا جائز نہیں، اور شیخ مواق کہتے ہیں کہ جائز ہے بشرطیکہ خود برہنہ نہ ہو اور نگاہ نیچی رکھے۔ میں نے اس کے متعلق جب حضرت سے دریافت کیا تو یہی نفرتِ ملائکہ کا ذکر فرما کر جواب دیا کہ شیخ حطاب کی رائے صحیح ہے اور شیخ مواق کی رائے پر عمل کرنے میں کتنا ہی اپنا سترِ عورت اور اپنی نگاہیں نیچی بلکہ بند کیوں نہ کرلے ایک آفت بڑی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ معصیت اور اللہ کے حکم کی مخالفت جہاں بھی ہوگی اس ظلمت کے ساتھ ہوگی کہ اس کے اور ظلمتِ جہنم کے درمیان اتصال اور لمبا تار کھنچا ہوا ہوگا۔ اور اس کے ذریعہ سے جہنم کی شقاوت اس جگہ تک پہنچتی ہے اور فرشتوں سے زیادہ اس کی شناخت کسی کو نہیں ہے۔ پس جب کوئی قوم مثلاً حمام کے اندر کسی معصیت (یعنی کشفِ عورت و برہنگی) پر جمع ہوگی اور معصیت ان سب سے ظاہر ہوگی، تو وہ ظلمت اس تمام جگہ پر چھا جائے گی۔ (جس کا اتصال شقاوتِ جہنم کے ساتھ ہوگا، لہٰذا فرشتے گھبرا کر ان لوگوں سے دور بھاگیں گے۔ اور جب فرشتے دور چلے جائیں گے تو شیطان مع اپنے لشکر کے آئے گا اور ساری جگہ کو آگھیرے گا۔ اس لئے اس مبتلائے معصیت قوم کے انوارِ ایمان کی ایسی حالت ہو

جائے گی۔ جیسے جلتے ہوئے چراغوں پر چار طرف سے تند ہوا کے جھونکے آویں اور چراغ کی لَو کبھی ادھر آوے کبھی اُدھر جاوے اور کبھی نیچے کے رُخ پلٹے کھاوے۔ حتیٰ کہ ہم کہنے لگتے ہیں اب بجھا، اب بجھا۔ اور اسی وجہ سے معاصی کو کفر کا قاصد کہا جاتا ہے (کہ شیطانی تھپیڑوں سے نورِ ایمانی کے بجھنے کا قوی اندیشہ ہو جاتا ہے۔ تو جب حمام کی اور حمام والوں کی یہ حالت ہوئی (کہ شیاطین سے معمور اور ظلمتوں سے لبریز ہو گیا ہے۔ اور اس میں دیندار صالح شخص داخل ہوا تو اس کے نورِ ایمان کو بھی اس ظلمت کی وجہ سے جو حمام میں موجود ہے اضطراب ضرور لاحق ہو گا۔ کیونکہ ظلمت ضد ہے ایمان کی، اور اس وجہ سے اسکے فرشتے (جو اس کی ذات کے ساتھ ہیں) مضطرب ہوں گے، اور گھبرائیں گے۔ لہٰذا شیاطین کو اس کے متعلق بھی امید بندھے گی اور وہ اس تک پہنچکر شرمگاہ پر نگاہ ڈالنے کی اس کو خواہش دلائیں گے اور اسے گمراہ کریں گے۔ غرض اس کے ساتھ ہر لمحہ اس کی جنگ رہے گی۔ آخر وہ قوت پکڑتے جائیں گے (کہ ان کی آمد کا سلسلہ جاری ہے) اور یہ دبتا اور کمزور ہوتا چلا جائے گا (کہ تنہا لڑتا لڑتا تھکتا چلا جا رہا ہے) آخر کار شہوت مستحسن معلوم ہونے لگے گی اور شرمگاہوں پر نظر ڈالنے میں مزہ آنے لگے گا۔ اسی طرح فرض کرو کچھ لوگ شراب پی رہے ہیں اور وہ معصیتیں ظاہر کر رہے ہیں جو دَورِ شراب چلنے میں ظاہر ہوا کرتی ہیں۔ کہ فحش بک رہے ہیں۔ گالیاں دے رہے ہیں۔ نہ کسی کا لحاظ کرتے ہیں، نہ کسی سے ڈرتے ہیں۔ پھر فرض کرو ایک شخص ہاتھ میں دلائل الخیرات لئے ہوئے آیا اور ان کے پاس بیٹھ کر اسے پڑھنے لگا۔ دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا۔ صبح سے شام تک وہ اپنی معصیتوں میں لگے رہے اور یہ قراءتِ دلائل میں لگا رہا۔ مگر کوئی دن گزرے گا کہ یہ بھی پلٹا کھائے گا اور ان جیسا بن جائے گا۔ اس کی وجہ یہی ہے جو ہم نے ابھی بیان کی۔ اور اسی وجہ سے فساق اور اور اہلِ معاصی کے پاس بیٹھنے کی شریعت میں ممانعت کی گئی ہے۔ کیونکہ خون اور شہوت اور غفلت ہم میں اور ان میں سب ہی میں ہے (لہٰذا جس کی بدولت وہ بگڑے اس کی بدولت ہمارا بگڑنا کیا بعید ہے) ہاں جس پر اللہ رحم فرمائے (وہ بے شک محفوظ رہ سکتا ہے) مگر وہ بہت ہی کم ہیں۔

ایک مرتبہ آپ دوزخ کی کیفیت بیان فرمانے لگے اور وہ باتیں ذکر کیں جن کا سننا ناقابل برداشت تھا۔ حتیٰ کہ حاضرین میں سے ایک صاحب نے کہا کہ حضرت اگر لوگوں کو دوزخ کا علم ہو جاتے تو کھانا پینا بھی بند ہو جائے چہ جائیکہ کوئی اور کام۔ فرمایا ہاں، اللہ و رسولؐ پر جن کا ایمان ہے سب کو دوزخ کا علم ہے۔ کیونکہ ان میں جب کسی کی زبان پر دوزخ کا تذکرہ جاری ہوتا ہے، تو یہ تذکرہ پہلے اس کے قلب پر جاری ہوتا ہے اور جب کان اس کے تذکرے کو سنتا ہے تو اول اس کا دل اس کو سنتا ہے۔ کیونکہ جہنم کے یقین میں ظاہر اور باطن دونوں برابر ہیں۔ اور جس طرح اس کا حضور ظاہر میں ہوتا ہے،

اسی طرح اس کا حضور باطن میں ہوتا ہے۔ مگر خوبی تو حضور کے دوام اور ہر وقت قائم رہنے میں ہے کہ جس کو یہ نصیب ہو گیا اس پر بارانِ رحمت کا نزول ہو گیا۔ اس کی غفلت دور اور مخالفت کم ہو گئی۔ اور جس کو اس کا دوام نصیب نہ ہوا اس کی حالت اس کے برعکس ہوئی۔ میں نے عرض کیا کہ حضور میں دوام نہ ہونے کا سبب کیا ہوتا ہے؟ فرمایا بدن کا خون اور اس کے بخارات ہی اس کا سبب ہوتے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ بندہ جب دوزخ کا تذکرہ کرتا یا سنتا ہے تو جیسا ہم ابھی کہہ چکے ہیں اوّل وہ قلب پر جاری ہوتا ہے اور اس کی وجہ سے خون اور اس کے بخارات بھاگنے لگتے ہیں (اور یہی وجہ ہے کہ خوف زدہ کا سارا جسم زرد پڑ جاتا ہے) اور جب خون بھاگتا ہے تو اس کا حکم یعنی غفلت معطل ہو جاتی ہے۔ اور وہ تذکرہ جو خون کے بھاگنے کا سبب تھا جب منقطع ہو جاتا ہے تو خون اپنی نالیوں میں واپس آجاتا اور ذات پر غفلت پھر مسلط ہو جاتی ہے اور پھر جب بندہ اسے یاد کرتا ہے تو خون پھر بھاگنے لگتا ہے اور غفلت دور ہو جاتی ہے۔ پھر جب اس کی یاد جاتی رہتی ہے تو خون پھر اپنی جگہ لوٹ آتا اور بندہ پر غفلت چھا جاتی ہے۔ اور جب تک پھر اس کی یاد نہ آوے اس کا غلبہ و تسلّط قائم رہتا ہے۔ حتیٰ کہ یاد کے بعد جب سہو طاری ہوتا ہے تو پھر غفلت آسوار ہوتی ہے۔ ہمیشہ یہی دَور جاری رہتا ہے۔ پھر یاد اور سہو کی درمیانی مدت میں لوگوں کے حالات مختلف ہیں کہ کسی کی واپسی گھڑی بھر بعد ہو جاتی ہے اور کسی کی دو گھڑی بعد، اور کسی کی ایک دن بعد، اور کسی کی دو دن بعد۔ اب تم دیکھ لو کہ تمھارا شمار کس فریق میں ہے۔ میں نے کہا اس کا کیا سبب ہے کہ اس کا تذکرہ سننے سے خون بھاگتا اور غفلت دور ہوتی ہے، اور اگر سنتا نہیں تو حالت برعکس ہوتی ہے؟ فرمایا کہ اس کا تذکرہ سننے سے قلب جاگتا اور ہوش آجاتا ہے گویا عقل واپس آجاتی ہے۔ اور اس کے افعال صحیح اور درست ہونے لگتے ہیں۔ اور پھر جب اس کا سننا موقوف ہو جاتا ہے تو پھر اسی نیند میں چلا جاتا ہے جس کا نام غفلت ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص نہایت میٹھی اور مزے دار گہری نیند میں سو رہا ہو۔ جب باتیں کی جائیں گی اور اس کو پکارا جائے گا تو جاگ جائے گا مگر گرانی اور ناگواری کے ساتھ جواب دے گا اور آواز کے بند ہوتے ہی پھر اپنی نیند میں چلا جائے گا۔ کیونکہ وہ اس پر اس پکار سے قبل مسلط ہو چکی ہے اور پہلے سے غلبہ پائے ہوئے ہے۔ یہی حال غفلت کا ہے جو ذاتِ انسانی پر پہلے ہی سے غالب اور مسلط ہے۔

میں نے آپ سے علومِ کشف (جفر و رمل وغیرہ) اور ان میں غور و فکر کے متعلق دریافت کیا۔ اور یہ کہ ان سے غیبی امور معلوم ہونے کا سبب کیا ہے؟ فرمایا خطوط اور جفر و رمل وغیرہ جن علوم سے واقعاتِ مغیبہ معلوم کیے جاتے ہیں۔ ان سب کی وجہ قلب کا اللہ سے قطع تعلق اور باطن کا اس کی شاہانہ

حکومت سے ویرانی ہے۔ اور اس کی شرح یہ ہے کہ بندہ جب اپنے رب کا دھیان کرتا ہے اور یوں سمجھتا ہے کہ وہی ہے جس کی شان یہ ہے کہ جو چاہے کرے، اور جو ارادہ فرمائے اس کا حکم دے (اور کرائے)، اس کے سوا نظامِ عالم کی باگ کسی کے ہاتھ میں نہیں۔ تمام ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ بندوں پر اس کی بے حد شفقت ہے کہ ان کی تمناؤں سے زیادہ اور وہم و گمان سے بالا ان کو عطا فرماتا ہے تو بندہ اپنے رب کو بطیب خاطر اپنا کارساز بناتا ہے اور اپنے تمامی امور میں اس کو رہبر قرار دے لیتا ہے۔ بالکل اس کی طرف سمٹ آتا اور سب سے منہ پھیر کر اسی کا ہو رہتا ہے۔ اپنی ساری کنجیاں اور اپنی ساری باگیں، اس کے ہاتھ میں دے دیتا ہے کہ کسی امر میں بھی اس کے سوا دوسرے پر اعتماد نہیں کرتا۔ اس وقت اس کو اپنے آقا کے برتاؤ میں جو اس کے ساتھ ہوتا ہے، وہ وہ خوبیاں اور بھلائیاں دیکھنے میں آتی ہیں جنھیں نہ آنکھوں نے کبھی دیکھا اور نہ کانوں نے کبھی سنا اور نہ کسی بشر کے دل میں ان کا وہم و خیال گزرا۔ یہ شان تو اس کی ہے جس کا قلب معمور ہو اللہ جل جلالہٗ سے لیکن جس کا قلب اپنے رب سے خالی ہو اور غفلت اس پر مسلط ہو گئی ہو کہ اس کو صرف اپنی ہی ذات نظر آتی ہو اور تمامی افعال کا صدور اپنے ہی نفس کی طرف سے سمجھ رہا ہو، تو وہ ان علوم مذکورہ کے استعمال و اشتغال میں لگا کرتا اور اپنی اندھی رائے اور تاریک تدبیر کے موافق یوں چاہتا ہے کہ واقعاتِ آئندہ کا علم حاصل کروں تاکہ بکثرت خوبیاں اور منافع کما سکوں۔ لہٰذا حق تعالیٰ اس کو اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کی تدبیر میں تدمیر و ہلاکت رکھ دیتا ہے اور قسم قسم کی بلاؤں اور مصیبتوں میں مبتلا کرتا، نامراد اور حصولِ مقصود سے محروم رکھتا ہے۔ چنانچہ اس فن والوں کی حالتوں کا مشاہدہ اس کا گواہ ہے اور یہ سزا بھی اس کے لیے بہت تھوڑی ہے جو اپنے مولا سے منہ پھیرے اور اس نے اس کی قسمت میں جتنا تجویز کر دیا ہے اس پر راضی نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شان مومن متوکل کی ہے کہ اللہ کو رزاق اور قاضی الحاجات اور متصرف و مالک سمجھ کر اور بندوں پر ماں باپ سے زیادہ شفیق و مہربان اور ان کی بہبودی و مصلحت سے واقف و آگاہ قرار دے کر اپنے آپ کو اس کے حوالے ایسا کر دیتا ہے جیسا مردہ بدستِ غسّال کہ جس کروٹ چاہے لٹائے وہ ہر حال بے عذر و بے شکوہ ہے، اس رضا و تسلیم کے صلہ میں دنیا کے اندر بھی جو راحت و سکون اور جاہ و عزت اس کو ملتی ہے وہ سلاطین کو نصیب نہیں۔ بخلاف اس کے کشفِ مغیبات کی سعی کرنیوالے جفار و رمال اور ہاتھوں کے خطوط دیکھ کر عمر و مرض وغیرہ معلوم کرنیوالے یا جو بھی اس نوع کے علوم ہیں ان کے سیکھنے اور برتنے والے چونکہ مدبر عالم جل جلالہٗ سے غافل اور اپنی فلاح و بہبود کی باگ اپنے ہاتھ میں سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے ان کی فہم نارسا ان کو سبق پڑھاتی ہے کہ آئندہ کے واقعات کسی طرح معلوم کرو۔ اگر پہلے ہی معلوم ہو گیا کہ فلاں مرض فلاں وقت ہونیوالا ہے تو اس سے بچاؤ کی تدبیر کر لیں گے۔ اور اگر معلوم ہوا کہ فلاں جگہ خزانہ مدفون ہے۔

تو جاکر اسے نکال لیں گے۔ غرض راحت و خوشحالی اور خیر و خوبی کے تمامی امور پر قبضہ ہو جائے گا اور مصائب و تکالیف اور حوادث افکار غرض تمامی پریشانیوں سے تحفظ و بچاؤ مل جائے گا۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے ان کی ڈھیل چھوڑی اور گویا فرمایا کہ اچھا اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لیتے ہو تو لو اور کچھ کر کے دکھاؤ بلکہ جس علمِ غیب کے گھمنڈ پر کودتے ہو کہ وہ حاصل ہو جائے تو کوئی خیر حاصل کئے بغیر چھوڑو گے نہیں اور کوئی برائی یا تکلیف پاس پھٹکنے نہ دو گے۔ اس کو بھی لے لو اور پھر دیکھو کہ کچھ بنا سکتے اور حسبِ خواہش پا سکتے ہو یا نہیں۔ چنانچہ وہ علوم عطا فرما دیئے۔ اور ان میں کچھ کامیابی بھی بخش دی تاکہ دل میں کوئی ہوس باقی نہ رہ جائے۔ مگر اب نتیجہ کا مشاہدہ کرو کہ فن تو ایسا بڑا جس پر عقل حکم لگاتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ راحت اور عزت ملنی چاہیئے مگر واقعہ اور مشاہدہ یہ کہ بھک منگا فقیر بھی اتنا ذلیل نہ ہو گا جتنا ذلیل یہ طبقہ ہے کہ پوتھی پتنگ لئے دروازے دروازے صدا لگاتا ہوا ٹکے ٹکے بلکہ ایک مٹھی چنے پر اپنا وقت، اپنی آبرو، اپنا ناموس اور اپنی شرافت بیچتا پھرتا ہے۔ جب فکرِ معاش میں رات دن کی تنگی اور مصیبت ہے تو دوسری مصیبتوں کا کیا پوچھنا۔ جن امراض و حوادث و آلام و احزان میں ساری دنیا مبتلا ہے غیب سے ناواقف ہو کر، ان سے کچھ زیادہ ہی مبتلا نکلے گا۔ جفار و رمال واقعاتِ مغیبہ سے واقف ہو کر۔ غرض وہ خود تو دین و دنیا کے خسارے میں پڑے ہی گئے، مگر دنیا کو سبق مل گیا کہ اپنی تدبیر پر عمل کرنے اور اعتماد کرنیوالے اور اپنی فلاح و بہبود کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے والے بندہ کا دنیا ہی میں یہ حشر ہوتا ہے۔ ان سے زیادہ تعجب ان کی حالت پر ہے جو غیب سے بھی ناواقف ہو کر محض اپنی عقل پر ناز کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جتنی تدبیر زیادہ کریں گے اسی قدر بامِ ترقی پر پہنچیں گے۔ تدبیر کرنا عیب نہ تھا مگر مدبرِ عالم سے غافل ہو کر اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لینا اور اپنی تدبیروں کو موثر و کارگزار سمجھنا بے شک عیب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تدبیر کرو مگر تدبیر پر بھروسہ نہ کرو۔ فقیر کا ہاتھ میں کاسہ لینا، یا کندھے پر جھولی ڈالنا محض اس لئے ہے کہ سخی کی عطا جھولی میں ڈالی جائے، نہ یہ کہ خود یہی ذریعہ عطا ہے۔ اور جتنی بڑی جھولی ہو گی اتنی ہی زیادہ بھر کر رہے گی۔ اگر کاسہ اور جھولی ہی کوئی چیز ہے تو اہلِ عطا سے باغی بن کر اور اہلِ سخا سے منھ پھیر کر نا دہند بخیلوں اور کنجوسوں میں دن بھر بلکہ عمر بھر چکر لگا کر دیکھے کہ کتنا ملتا ہے اور کاسہ علیحدہ رکھ کر سخی کا نوکر یا غلام بن کر اس کی چوکھٹ پر پڑ کر دیکھے کہ وہ از خود اس کی تمامی ضروریات کو قبل از سوال پوری کرنے کا خیال رکھتا ہے یا نہیں۔ ذرا غور کرو گے تو پتہ چلا لو گے کہ ہم نے اپنی تدبیر کو کاسہ سمجھا اور آقا کو معطی سمجھا ہے یا کاسہ ہی کو معطی اور آقا کو معطل قرار دیا ہے۔ حق تعالیٰ کو عیاذاً باللہ معطل و مغفل اور اپنی تدبیر و عقل یا علومِ غیبیہ کے کشف کو مدبر و ناظم سمجھنے کی سزا جو کچھ بھی ملتی وہ تھوڑی تھی۔ مگر لطف و کرم ہے بے نیاز خدائے رحمٰن کا کہ ذلت و بے برکتی اور کثرتِ احزان و افکار ہی پر اکتفا

فرمایا۔ نہ زندگی چھینی نہ تندرستی، روٹی بند کی نہ اولاد، کاش ہماری آنکھیں کھلیں اور ہم اپنے موجودہ مصائب کا جن کی گھنگھور گھٹانے چاروں طرف سے ہم پر اندھیرا چھا دیا ہے حقیقی راز سمجھیں اور جو تدبیر کریں محض سائل کی صورت بنانے کے لیے کریں اور تحت اذنِ مولیٰ کریں اور معطی و مدبر حق جل شانہ کو سمجھ کر کریں۔ پھر دیکھیں کہ حالت بدلتی اور فلاح وبہبود ملتی ہے یا نہیں۔ ورنہ لاکھ کمیٹیاں بناؤ اپنی تدبیر کے بل بوتہ خاک نہ ہوگا۔ بلکہ الٹی ذلت اور ناکامی بڑھے گی۔

ایک نصرانی راہب کا عجیب قصہ ہوا کہ راہبوں کا سردار اور سب میں بڑا سمجھا جاتا تھا اور گرجا میں رہا کرتا تھا۔ جب گرجا سے باہر نکلتا تو صلیب کی طرف پشت نہ کرتا اور اس سے منھ پھیر کر نہ چلتا۔ ایک دفعہ ایسا اتفاق ہوا کہ اس کے بیٹے نے عین طوفان اور تلاطم کے زمانے میں بحری سفر اختیار کیا اور اس لئے اس کو بے حد پریشانی تھی اور ہر وقت اس کی خیریت معلوم کرنے کے انتظار میں رہتا تھا۔ دفعتہً اس کو خبر ملی کہ وہ بعافیت وسلامتی آگیا۔ اس فرطِ مسرت میں وہ بیٹے سے ملنے کو گرجا سے باہر نکلا اور اپنی اس عادت ومعمول کو بھول گیا کہ صلیب سے منھ نہ پھیرے چنانچہ اس طرف پشت ہوگئی۔ مگر جب بیٹے سے مل چکا تو اس کو یاد آیا کہ بیٹے سے ملنے کی خوشی میں صلیب سے رُو گردانی ہوئی۔ لہذا فوراً واپس آیا اور راہبوں سے کہا کہ میرے سو دُرّے مارو۔ انھوں نے پوچھا کہ کیوں؟ کہا اس لئے کہ صلیب کی طرف آج میری پیٹھ ہوگئی۔ ان کو بھی یہ حرکت بڑی معلوم ہوئی اور انھوں نے دُرّے مارنے شروع کر دیئے، حتیٰ کہ سو کی تعداد پوری کر دی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ ضرب کی تکلیف کے سبب صلیب کے متعلق اب اس کی نیت بدل جائے گی اور دین سے پھر جائے گا (مگر بجائے اس کے کہ چوٹ کا اثر ملنے) ہوا تو یہ ہوا کہ اس نے چھری لے کر ٹخنوں سے اپنے دونوں پاؤں کاٹ ڈالے اور کہا کہ یہ ہے اس کی سزا جو اپنے آقا سے منھ موڑے اور پیٹھ پھیرے (کہ جن پیروں سے چلنا سبب ہوا پیٹھ پھیرنے کا وہی قطع کر دیئے جائیں۔ نہ آئندہ چل سکوں گا نہ صلیب سے منھ پھیرے گا) حضرت ممدوح نے فرمایا جب گمراہ اور اہلِ باطل سے ایسا صادر ہو تو کیا حال ہونا چاہیئے اہلِ حق کا جو حق کی پرستش کرتا ہو۔ مگر بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے علمِ قدیم میں طے ہو چکا ہے کہ وہ اپنی مخلوق میں ایک فریق کو نعمت و رحمت کا اہل بنائے گا اور دوسرے فریق کو مستحقِ نقمت و عذاب اور ہر فریق کی حرکات اور سعی اسی تجویز کے موافق ہوں گی جن کو رحمت کے لیے تجویز کیا ہے۔ ان کے قلوب کو اپنے ساتھ متعلق بنا لیا اور ان کی ہمت کو اپنی طرف پھیر لیا لہذا ان کے حرکات وسکنات اس کے تابع بن گئے۔ کہ ان کی نماز بھی اللہ کے لئے ہے اور روزہ بھی اللہ کے لئے۔ اٹھنا بھی اللہ کے لئے اور بیٹھنا بھی اللہ کے لئے۔ بیداری بھی اللہ کے لئے ہے اور خواب بھی اللہ کے لئے۔ غرض حق تعالیٰ ان کو اپنی محبوب و پسندیدہ چیزوں میں حرکت دیتا رہے گا۔ حتیٰ کہ وہ (وفات پاکر) اللہ تک پہنچ جائیں گے اور اس کی اس

رحمت کو پائیں گے جو ان کے لئے تجویز فرما دی تھی اور جن کو اہل نقمت بنایا ہے ان کے قلوب دوسروں کے ساتھ وابستہ کر دیئے اور ان کی ہمتوں کو اس شے کی طرف پھیر دیا جو مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بودے ہیں۔ جیسے یہی امور مذکورہ (علم جفر و رمل وغیرہ یا عقل اور اس کی تدبیر) لہذا ان کے حرکات و سکنات اس کے تابع بن گئے کہ ان کا اٹھنا بھی غیر اللہ کے لئے ہے اور بیٹھنا بھی غیر اللہ کے لئے۔ جاگنا بھی غیر اللہ کے لئے اور سونا بھی غیر اللہ کے لئے۔ غرض ہر سعی و کوشش غیر اللہ کے لئے بنا دی تاکہ اللہ سبحانہ کے ساتھ کسی حال ان کو تعلق نہ ہو سکے۔ آخر کار تقدیر پوری ہو کر رہی اور وہ (مرکر) اپنے عذاب مقسوم تک جا پہنچے۔

ایک بزرگ نے مجھ سے قصہ نقل کیا کہ میں ایک مرتبہ دو بوڑھے آدمیوں کے پاس جا بیٹھا جن کی عمر ستر برس کے قریب پہنچ چکی تھی۔ صبح سے لے کر زوال تک میں سنتا رہا کہ دونوں دنیا کی باتیں کرتے رہے اور ایک مرتبہ بھی ان کی زبان پر اللہ کا ذکر آیا نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا۔ اس وقت میں اٹھا اور تازہ وضو کیا اس کے بعد دو لڑکوں کے پاس آبیٹھا جو روزہ رکھنے کے قابل ہو گئے تھے۔ میں نے سنا کہ وہ آپس میں اللہ کی وحدانیت اور اس کی صفات کا عجیب عجیب تذکرہ کر رہے تھے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ان بچوں کی (باوجود نوعمری کے) یہ عالت اور ان بوڑھوں کی (باوجود لب گور پہنچ جانے کے) وہ حالت۔ ذٰلِكَ تَقْدِيرُ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ ۝ یہ غلبہ اور علم والے کی تجویز ہے جس کا نام تقدیر ہے کہ ارادہ عبد کا واسطہ ڈال کر کام کرا رہی ہے۔ تاکہ جبر بھی لازم نہ آوے اور علم قدیم میں بھی نقص لاحق نہ ہو) اس کی تائید میں کہ حق تعالیٰ جب بندے کے قلب کا تعلق کسی غیر کے ساتھ کر دیتا ہے تو اس کو ڈھیل دیتا اور ایسی چیزوں سے اس کو مدد پہنچاتا ہے جو اس کے لئے فتنہ بن جاتی ہیں۔ حتیٰ کہ مغیبات اور واقعات مستقبلہ کی خبریں اس سے ظاہر ہونے لگتی ہیں۔ حضرت ممدوح نے ایک عبرت ناک قصہ سنایا کہ ایک ولی تھا۔ حق تعالیٰ نے اس کی ولایت سلب کر لی اور نور حق اس کے قلب سے منقطع ہو گیا۔ سلب ولایت سے قبل اس سے کرامتیں ظاہر ہوا کرتی تھیں اور سلب کے بعد (بجائے اس کے کہ اندھیرا دیکھتا اور متنبہ ہو کر توبہ کر لیتا) فتنہ کی صورت میں اس سے تعجب خیز طبی امور اور نجومی معلومات کا ظہور ہونے لگا کہ سلب کے بعد بھی وہ سمجھا کہ میں کچھ ہوں (اور کسی بات میں کمی نہیں آئی) چنانچہ چاروں طرف اس کی شہرت ہونے لگی اور لوگ رقمیں لے کر جوق جوق اس کے پاس آنے لگے۔ اس کو مال جمع کرنے کی ہوس بہت تھی، اس لئے خوب سمیٹا۔ حتیٰ کہ تیرہ برس میں تقریباً ستر ہزار دینار (قریب دو لاکھ روپے کے) جمع کر لئے۔ آخر کار مر گیا اور کوئی وارث نہ چھوڑا۔ آخر سارا مال بیت المال میں داخل ہوا اور اس کا انجام ہر قسم کا خسارہ اور حرمان ہوا۔

(۱) میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ کسی شخص کو نہانے کی حاجت ہو اور اس نے غسل نہ کیا ہو تو ولی

کو کیسے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جنبی اور ناپاک ہے؟ فرمایا اولیار کے نزدیک جنابت کئی قسم کی ہوتی ہے اور غسل کے وجوب کی وجہ صرف ایک ہے۔ مگر اس کے اسباب اولیار کے نزدیک متعدد ہیں اور علمار کے نزدیک اس کا سبب صرف ایک ہے۔ لہٰذا تمامی اسباب میں غسل کا وجوب ہوگا اور علمار کے نزدیک بجز اس ایک سبب کے دوسری جگہ غسل واجب نہ ہوگا۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کیا وجہ ہے جس کے اسباب اولیار کے نزدیک متعدد ہیں اور علمار کے نزدیک صرف ایک ہی سبب ہے؟ فرمایا کہ وہ وجہ ذاتِ عبد کی نگاہ کا اللہ سے بایں صورت منقطع ہو جانا ہے کہ اللہ کی طرف سے اس کی ساری آنکھیں بند ہو جائیں اور اس کی رگیں غیر اللہ کے ساتھ فرح وسرور سے لبریز ہو جاویں۔ اور اس کا فکر اور تمامی اجزا وجواہر ذات اس غیر میں منہمک وغرق ہو جائیں بشرطیکہ یہ غیر اس حالت میں قاطع عن اللہ ہو (یعنی اپنے اندر اتنا فنا نہ کرے کہ حق تعالیٰ کے تصور و دھیان کی گنجائش ہی نہ رہے) پس ذاتِ عبد جب اس انقطاعِ کلی میں پڑے گی تو فرشتے اس سے گھبرائیں گے اور بھاگیں گے اور بندہ کی اپنے رب سے اس درجہ بے تعلقی ان کو ایک بڑی بات معلوم ہوگی۔ پس صوفیہ کے نزدیک تو ہر وہ سبب قاطع جو ذات کے لئے اس بے تعلقی کا موجب ہو غسل واجب کر دیتا ہے۔ اور علمار کے نزدیک غسل صرف جماع سے واجب ہوگا یا جو بھی جماع کے حکم میں ہے (جیسے انزال کسی دوسرے طریق سے کیونکہ لذتِ انزال انسان کی ہر قوت کو اپنے اندر اس درجہ فنا کرنے والی ہے کہ اللہ کے دھیان اور تصور سے بالکل غافل کر دیتی ہے اور اس کا سبب یعنی خروج منی چونکہ آنکھوں سے نظر آتا ہے اس لئے غسل کا حکم دیا گیا ہے۔ برخلاف دیگر قواطع کے کہ وہ مشاہد نہیں، اس لئے قانونی ضابطے میں ان پر کوئی حکم نہ لگایا گیا۔ اور غسل کا راز اس انقطاع سے ذات کو پاک کرنا ہے کہ اعتطاع عن اللہ (کی ظلمت ونجاست باطنیہ) کو حق تعالیٰ نے بمنزلہ حسی نجاست کے قرار دے دیا۔ اور جب بندہ غسل کرنے لگتا ہے تو فرشتے واپس آنے لگتے ہیں۔ پس ولی کو ذاتِ منقطع سے فرشتوں کو بھاگتا ہوا دیکھ کر جنابت کا پتہ چلتا ہے اور وہ سمجھ جاتے ہیں کہ ان کے بھاگنے کا سبب وہ انقطاع ہے جو حاصل ہوا ہے جنابت سے (اور اس بنا پر وہ ہر قاطع مخفی کا ادراک کر کے دیگر صورتوں میں بھی غسل کا حکم لگانے کا حق رکھتے ہیں) میں نے کہا کہ اس تقریر کا مقتضا تو یہ ہوا کہ جس شخص کو جماع کی حالت میں بھی حق تعالیٰ کا دھیان اور مراقبہ قائم رہے اس پر غسل واجب نہ ہونا چاہیے۔ فرمایا ایسا شخص شاذ ونادر کوئی ہوگا (ورنہ بالعموم لذتِ انزال سب کے لئے قاطع عن اللہ ہے) اور نادر (کی رعایت سے) کوئی حکم خاص نہیں ہوتا (اسی عموم کا یہ بھی محکوم ہوتا ہے) ایک مرتبہ فرمایا حق تعالیٰ نے ولی کو قدرت دی ہے کہ ایک شخص کے کان میں بات کہے اور راٹھنے نہ پائے کر دو اور یہ دو معرفت میں مساوی ہوں۔ ور دونوں میں کچھ بھی فرق نہ ہو یعنی ولی کامل بندہ کو ایک لحظہ میں واصل باللہ

بنا سکتا ہے۔ پھر فرمایا کہ ساری بات تو اس گوند کی ہے جس میں یہ سرِ الٰہی چپکایا جائے کہ اگر ذاتِ عبد میں گوند نہ ہوگا تو سر اپنی اصل کی طرف لوٹ آئے گا۔ جیسے کوئی شخص ہوا کو (شاندار آدمی بنانے کے لئے) کرتہ یا پاجامہ پہنانے اور عمامہ باندھنے لگے کہ وہ اس میں قائم نہیں رہ سکتا۔ میں نے چاہا کہ دریافت کروں کہ وہ گوند کیا ہے؟ مگر مجلس برخاست ہوگئی۔ رات کو میں نے خواب میں یہی سوال کیا تو آپ نے فرمایا وہ نفس کا مرجانا ہے۔ جب بیداری میں آپ سے ملنے کا اتفاق ہوا تو میں نے خواب عرض کیا۔ فرمایا جواب بالکل صحیح ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ نفس کے مرجانے کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا بندہ کے سب کام خالص اللہ واسطے ہو جائیں اور اگر اعمال غیر اللہ کے لئے ہوں تو یہ علامت ہے نفس کے زندہ ہونے کی۔ دوسری علامت یہ ہے کہ جب بندہ کے نفس میں وسوسے آویں تو سمجھو کہ نفس زندہ ہے اور جس قدر زندہ ہوگا اسی قدر وسوسے زیادہ آئیں گے۔ پس جسے کوئی وسوسہ نہ آوے اس کا نفس ہی نہیں رہا اور جسے وسوسہ آوے اس کا نفس زندہ ہے اور جس کا نفس زندہ ہے اس کے اعمال اللہ کے واسطے نہیں۔ بلکہ وہ نفس کے لئے سعی اور اسی کے لئے تدبیر کر رہا ہے۔ میں نے عرض کیا اس کا تریاق کیا ہے جس کے نفس پر ڈالنے سے وہ مرجائے اور پانی میں نمک کی طرح پگھل جائے۔ وہ ہمیں بتا دیجئے کہ ہم اسے ڈال کر مطمئن ہو جائیں۔ فرمایا جب تک اس پر بڑا پہاڑ نہ آپڑے کوئی بھی علاج نہیں میں نے کہا وہ بڑا پہاڑ کیا؟ فرمایا اللہ تعالیٰ کی معرفت اور اس کا مشاہدہ۔ قلب جب اس سے معمور ہو جاتا اور سمجھ لیتا ہے کہ (میں ہر وقت اللہ کے سامنے حاضر ہوں اور وہ) سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور میں کسی کام میں بھی حرکت نہیں کر سکتا جب تک وہی محرک نہ بنے۔ اور وہی ہے کہ جو چاہتا ہے نعمت عطا فرماتا ہے اور یہ کہ مجھے انجام کار آخرت میں اپنے رب کی طرف جانا ہے۔ پھر وہ (جنت و دوزخ کے) جس گھر میں چاہے گا، مجھے داخل فرما دے گا پس جب اس میں غور کرے گا تو یقیناً سمجھے گا کہ جب تک میرا رب قدرت نہ بخشے دنیا ہو یا آخرت کہیں بھی از خود نہ میں اپنے نفس کو نفع پہنچانے کی قدرت رکھتا ہوں، نہ کسی دوسرے کو۔ بس اب اللہ کے سوا اس کی نظر کسی پر نہ جائے گی۔ اور نفس مرجائے گا۔ حق تعالیٰ نفس مرنے کے اسباب کی اپنے فضل و کرم سے ہمیں توفیق بخشے۔ راستے میں میرا گزر چند لوگوں پر ہوا جو چوسر کھیل رہے تھے۔ میں نے حضرت سے اس کا حکم دریافت کیا، فرمایا حرام ہے۔ میں نے وجہ دریافت کی تو فرمایا حرام چیزوں کی حرمت کا سبب ہی صرف ایک ہے یعنی انقطاع عن اللہ۔ لہٰذا جو شے بھی (اپنے اندر غرق کر کے) بندہ کو اللہ سے بے تعلق کرنے والی ہے اور اس میں شارع کی کوئی غرض صحیح موجود نہیں تو حق تعالیٰ نے اس کو حرام فرما دیا ہے۔ اور اس کھیل میں کوئی منفعت نہیں بجز اللہ سے غافل بنانے کے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس کھیل میں مشغول ہونے کے وقت کھیلنے والوں کے قلب اور بدن کو اس درجہ اس میں استغراق ہوتا ہے کہ ذات کی ساری آنکھیں

حق تعالیٰ کی طرف سے بند ہو جاتی ہیں۔ (اور اللہ پر نظر جانے کی صورت ہی نہیں رہتی) میں نے کہا کہ یہ حال تو تیر اندازی اور گھوڑ دوڑ کا بھی ہے کہ اس میں مشغولیت کے وقت بھی اللہ سے انقطاع ہو جاتا (اور کھیل میں محویت ہر چیز سے بے خبر کر دیتی) ہے۔ فرمایا یہ چوسر کھیلنے کے برابر نہیں کہ اس میں شارع کی نہ کوئی غرض صحیح موجود ہے ورنہ اس کا کوئی نفع ذات عبد پر عود کرتا ہے۔ برخلاف اس کے تیر اندازی وغیرہ آلات جنگ کے کہ اس کا سیکھنا اس قوت کی تیاری میں داخل ہے جو آیۃ شریفہ وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ میں مامور ہے کہ کافروں (سے جنگ کرنے) کیلئے تیاری کرو قوت اور گھوڑے باندھنا جتنا بھی ہو سکے پس ہر وہ چیز جو شارع کے نزدیک مقصود ہو یا اس کا مقصود ہو سکنا صحیح ہو وہ قاطع عن اللہ نہیں (بلکہ امتثال امر ہونے کے سبب اس نوع میں داخل ہے جو صورۃً قطع ہے اور حقیقتہً وصل) اور اسی وجہ سے شطرنج کے بارہ میں ائمہ کا اختلاف ہوا ہے کہ بعض (یعنی امام شافعیؒ) نے یہ دیکھتے ہوئے کہ اس میں طریق جنگ کی تعلیم ہے اور اس کا مقصود شارع بننا صحیح ہے اس کو مباح کہا ہے اور بعض (یعنی امام ابو حنیفہؒ) نے اس پر نظر کر کے کہ طریق جنگ سیکھنے کا مقصود شارع خاص اس طریق پر موقوف نہیں بلکہ دوسرے طریق سے بھی حاصل کیا جا سکتا ہے جو اس سے زیادہ سہل اور واضح تر ہے۔ اس کو انقطاع عن اللہ کی وجہ سے حرام فرمایا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ سے شطرنج البتہ چوسر سے نسبتاً کم ہے۔

ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ مجھ میں توجہ الی اللہ کا استحکام اور قلب میں اس کی شاخوں کا پھیلاؤ اور اس کی رگوں کا جماؤ اور جگہ پکڑ لینا اور انتہا درجہ پر پہنچ جانا صرف اس وجہ سے ہوا ہے کہ میرے دل میں بلا تفریق تمامی مومنین کی محبت ہے۔ جیسا کہ بلا تفریق تمامی کافروں سے بغض ہے۔ پھر حضرت نے ارشاد فرمایا کہ جب بندہ کے اندر یہ محبت آجاتی ہے تو اس پر اللہ کی طرف سے توجہ نازل ہوتی ہے اور کتنا ہی اس کو ہٹانا چاہے مگر نازل ہوئے بغیر نہیں رہتی اور اس کا سبب یہ ہے کہ مومنین کے ساتھ محبت میں یہ تفریق کہ کسی کے ساتھ محبت ہو اور کسی کے ساتھ نہ ہو، دل میں چھپے ہوئے بغض کے بغیر نہیں ہوا کرتی جو کہ حسد یا تکبر وغیرہ سے پیدا ہوتا ہے لہٰذا اس کا ضمیر گندہ ہوا اور توجہ خالصہ کا نزول عمدہ زمین اور پاک طبیعت پر ہوا کرتا ہے اور جب عامہ مومنین سے محبت ہوئی تو چھپے ہوئے سارے کھوٹ قلب سے مرتفع ہو گئے۔ لہٰذا توجہ کا نزول ہو گا۔ اور ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ایسے شخص کو توبہ کی کبھی ضرورت نہیں ہوتی۔ کیونکہ یہی محبت عامہ اس کے سارے گناہ مٹانے کو کافی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ سارے کھوٹ جو گناہوں کا سبب بنا کرتے ہیں دل سے دُور کر دیتی ہے۔ نیز آپ نے فرمایا اور سب میں بڑا کھوٹ حسد ہے اور اس محبت کے ساتھ وہ قطعاً باقی نہیں رہتا۔ حسد کو سب سے بڑا کھوٹ ہم نے اس لئے کہا کہ تمامی معصیتیں اور سارے کھوٹ اسی کی شاخیں ہیں اور سب کا سبب صرف یہی ہے۔ کیونکہ

اگر کسی کے صاحبِ مال و صاحبِ اولاد ہونے کی وجہ سے عداوت و بُغض ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ ان نعمتوں پر حسد ہی کی وجہ سے ہوا ہے (کہ وہ اس کو کیوں مل گئیں)، اور اگر تمھارے پاس مال و اولاد اور قبیلہ زیادہ ہے اور تم کو تکبّر پیدا ہوا ہے تو ظاہر ہے کہ اپنی بڑائی کی وجہ سے تم دوسرے کو اپنے مرتبے پر پہنچ جانے سے دھکّے دے رہے ہو (کہ کبر کا مطلب یہی ہے)، اور یہ اس وجہ سے ہے کہ اس کا تمھارے مرتبے پر پہنچ جانا تمھارے لئے ناگوار ہے اور اسی کا نام حسد ہے۔ اسی طرح ہر معصیت انجام کار حسد کی طرف رجوع کرے گی اور سب کا سببِ اصلی یہی نکلے گا۔ میں نے عرض کیا کہ جب بندے کو بلا تفریق سارے مومنین سے محبّت ہوئی تو حبِ فی اللہ اور بغضِ فی اللہ کہاں رہے، حالانکہ وہ شاخہائے ایمان کی دو شاخیں ہیں۔ کیونکہ مرتکبِ معصیت اس کا مستحق ہے اللہ کی راہ میں اس سے بغض رکھا جائے اور جب ہم نے اللہ کی راہ میں اس سے محبت رکھی (کہ عامہ مومنین میں وہ بھی داخل ہے) تو مقتضائے معصیت کے خلاف کیا۔ فرمایا مرتکبِ معصیت میں جس کی طرف بغض کا متوجہ ہونا (بغضِ فی اللہ) میں ضروری ہے۔ وہ اس کے افعالِ معصیت ہیں نہ کہ اس کی ذات مومنہ اور قلبِ طاہر اور ایمانِ دائم۔ کیونکہ یہ چیزیں جو موجب محبّت ہیں اور اس کے لئے لازم (اور اس کی ذات کے ساتھ قائم) ہیں۔ اور گناہ موجبِ بُغض ہیں اس پر عارض اور ذات پر طاری ہوئے ہیں۔ لہذا اس کی ذاتی محبّت تو ہمارے قلوب میں قائم رہنی چاہیئے۔ اور بغض ان عارضی امور کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ اس کے گناہ ہماری نظر اور خیال میں ایسے ہونگے جیسے (کسی محبوب کے) کپڑوں میں پتھر باندھ دیئے جاویں کہ اس کی ذات تو محبوب ہی بنی رہے گی۔ مگر کپڑوں سے بندھے ہوتے عارضی پتھروں کے ساتھ بغض ہوگا اور اتنی مقدار کے بغض کا شریعت نے حکم بھی دیا ہے۔ اس سے زیادہ کا نہیں۔ مگر اکثر آدمی افعال خارج از ذات کے ساتھ بغض اور اصل ذات کے ساتھ بغض میں فرق نہیں کر پاتے۔ چاہتے ہیں کہ افعال کے ساتھ بغض رکھیں مگر سمجھتے نہیں کہ اس کی صورت کیا ہے۔ اس لئے بغضِ ذاتی میں جا پڑتے ہیں۔ حالانکہ ذات کے ساتھ بغض رکھنے کا ہمیں صرف حکم کافر کے متعلق دیا گیا ہے کہ اس کی ذات اور جو کچھ بھی اس سے صادر ہو سب ہی مبغوض ہونا چاہئے مگر گناہگار مسلمان کے ساتھ اتنے بغض کا ہمیں حکم نہیں دیا گیا۔ جس سے اس کی ذات، اس کے اللہ پر ایمان، اللہ کے رسول پر ایمان، پیغمبروں پر ایمان، تمامی انبیاء پر ایمان، تمامی آسمانی کتابوں پر ایمان، روزِ قیامت اور حشر، نشر، پل صراط، میزان، جنّت، دوزخ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، تقدیر پر ایمان کہ بھلی ہو یا بُری سب اللہ کی طرف سے ہے۔ غرض ہر وصفِ محمود سے جو اس میں پایا جاتا ہے، سب سے قطع نظر کر لی جائے (اور کسی کی بھی رعایت نہ رکھی جائے)، پس اگر ان خصائلِ حمیدہ کی محبّت پہلے سے ہمارے دلوں میں ہوگی تو ناممکن ہے کہ اس کی ذات کا بغض ہمارے قلوب میں کبھی آسکے۔ ہاں صرف اس کے افعال سے بغض

بغض ہوگا اور (اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ) ہم اس کے لئے دعائے خیر کریں گے۔ خصوصًا جب کہ بہ نگاہِ حقیقت دیکھیں گے (تو دعائے خیر ہی کا اس کو مستحق پائیں گے۔ لیکن اکثر آدمیوں کی حالت یہ ہے کہ جب انھوں نے مرتکبِ معصیت سے (بمقتضاء حدیث) بغض رکھنا چاہا تو سب سے پہلے بغض کو اس کی طرف متوجہ کر دیا۔ اور موجب محبت خصلتوں سے غفلت اختیار کی کہ عقول میں بھی ان کو مستحضر نہیں کرتے۔ لہذا عاصی کا بغض ان کے دلوں میں بیٹھ جاتا اور اس کی ذات تک سرایت کر جاتا ہے کہ اس کی ذات ہی ان کی نگاہ میں مبغوض ہو جاتی ہے۔ حالانکہ یہ حلال ہے نہ جائز ہے۔

ایک مرتبہ فرمایا جو شخص سواری ولباس ومکان وخورد ونوش میں امتیازی شان اختیار کرتا ہے بڑے عیب کی بات ہے۔ میں نے پوچھا، اس کے عیب ہونے کی کیا وجہ؟ فرمایا کہ وہ لوگوں کے قلوب اپنی طرف متوجہ اور ان کو اللہ سے منقطع کرتا ہے اور یہ اس کی امتیازی شان سببِ قطع بنتی ہے۔ میں نے کہا وہ اندھے لوگ جو اس کی طرف متوجہ ہوتے ہیں خود اللہ سے بے تعلق ہیں۔ پھر اس کی طرف توجہ کرنے سے اُن کا کیا نقصان؟ فرمایا بے تعلقی پر بے تعلقی کا اضافہ ہو جائے گا۔ نیز جو ذات اس امتیاز میں مشغول ہوتی ہے روح اس سے بھاگنے لگتی ہے۔ اس لئے کہ روح کو اس شانِ امتیازی سے ذلت وخواری لاحق ہوتی ہے کہ میں عام حالت پر بھی نہ رہی اور ذات مجھ سے بڑھ چڑھ کر کام کرنے لگی) لہذا وہ ذات کے فعل سے نفرت کھا کر اپنے خالق کے ساتھ جو برتاؤ کرنا مناسب تھا، اس کا راستہ دکھانا چھوڑ بیٹھتی ہے اور یہ اس کی ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے (غرض شانِ امتیازی میں دو مضرتیں ہیں ایک لازمی اپنی ذات کے لئے کہ رشد وسداد میں روح کی اعانت سے محروم ہو گیا اور ایک متعدی دوسروں کے لئے کہ بھائیوں کو اللہ سے اور زیادہ دُور لے جا ڈالا۔) حاضرین میں سے ایک صاحب نے جو بڑے سخی اور کریم تھے عرض کیا کہ حضرت اگر کوئی اس امتیازی شان سے صدقہ وخیرات کرے تو کیا وہ بھی مضر ہے؟ فرمایا ہاں اور اس لئے جہاں تک ہو سکے چھپا کر خیرات کرے۔ نیز فرمایا میں واقف ہوں ایک شخص سے کہ اس نے مغرب اور عشاء کے درمیان ۲۵ مثقال سونا بے شمار فقیروں پر صدقہ کیا مگر کسی کو بھی پتہ نہ چلا کہ وہ کون تھا۔ اس سخی نے سوال کیا کہ اچھا حضرت اگر صدقہ چھپا کر دے مگر نفس کو بھلا معلوم ہو اور خیرات کر کے خوشی ہو؟ فرمایا اگر یہ بھلا معلوم ہونا خود صدقہ کرنے پر خوشی اور اس کو اپنی نظر میں بڑا کام کرنے پر ہوا ہے تو مانعِ صدقہ نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے صدقہ کرنے والے کا نفس کبھی اس نظر سے غافل بھی ہو جائے اور صدقہ عیب سے سالم نکلے۔ جس کو حق تعالیٰ قبول فرمالے۔ نیز فرمایا کہ اسی فائدے کے لئے حق تعالیٰ نے ہمیں ساٹھ اور ستر برس کی عمریں عطا فرمائی ہیں کہ کیا عجب ہے اس دراز مدت میں کوئی ساعت قبولیت کی ہمارے ہاتھ آجائے کیونکہ ہم پر شہوت

ونفس کا اتنا غلبہ و تسلط ہے کہ ایک فعل بھی (ظلمت سے) صاف اور کوئی عمل بھی (ریا و نمود سے) خالص صادر نہیں ہوتا۔ لہٰذا یہ علّت (یعنی صدقہ و فرح و سرور جس کو عجب کہتے ہیں) فعل طاعت کے لئے مانع نہیں ہے (البتہ جس فعل میں ریا و نمود ہو وہ فعل ضرور ممنوع ہے) سخی نے کہا کہ حضرت ہمیں آگاہ فرمائیے کہ ہمارے صدقات اور دیگر اعمال خالص اللہ واسطے کیونکر بنیں؟ فرمایا جو عمل بھی اجر اور صلہ رحمی کی نیت سے کروگے وہ لغیر اللہ ہوگا اور اس میں وسوسے ضرور پیش آئیں گے۔ مثلاً خیال آئے گا کہ جس شخص کو صدقہ دیا ہے نہ معلوم وہ صدقہ کا اہل بھی تھا یا نہیں۔ اور اگر اہل تھا تو ممکن ہے وہاں کوئی دوسرا اس سے زیادہ مستحق اور قبولیت صدقہ میں اقرب الی اللہ موجود ہو اور میں اسے نہیں دے سکا۔ حتی کہ آخری وسوسہ یہ ہوگا کہ میرا صدقہ اللہ نے قبول بھی کیا یا نہیں اور جس عمل میں وسوسہ کا دخل ہو گیا (معلوم ہوا کہ) اس میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں۔ کیونکہ وسوسے شیطان کی طرف سے ہوا کرتے ہیں۔ اور جو عمل اللہ واسطے ہوا کرتا ہے شیطان اس کے پاس بھی نہیں پھٹکتا۔ سخی نے کہا اگر اجر و صلہ کی نیت سے نہیں بلکہ اللہ کا قرب حاصل کرنے کی نیت سے خیرات کروں تب کیا مضر ہے؟ فرمایا ہاں مضر ہے کہ قرب بھی ایک علّت ہے اور اس کی خاطر عمل کرنا بھی منجملہ اغراض کے ایک غرض ہے اہلِ اخلاص کے نزدیک عمل کے خالص اللہ کے لئے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ اللہ جل جلالہٗ کے اوصاف، جلال و کمال اور اس کی کبریائی و عظمت کو معلوم کرے اور جو بے شمار اور ان گنت نعمتیں اس نے عطا فرمائی ہیں ان کو سوچے اور سمجھے کہ واقعی وہ اسی کا مستحق ہے کہ اس کے سامنے سر جھکایا جائے۔ اس کے سوا حظوظِ نفس میں کسی حظ ولذّت کا دل میں وسوسہ بھی نہ آوے۔ چہ جائیکہ عمل حظ یا نفس ہی کی خاطر ہو۔ بلکہ یوں سمجھے کہ دشوار سے دشوار عبادت جو تصور میں آسکے اور بھاری سے بھاری تکلیف جو فرض کی جاسکے، دراز سے دراز زندگی ملنے پر، رات اور دن کے ہر لمحہ و ہر لحظہ بھی اگر اس کی عبادت کی جائے، تب بھی میں اپنے پروردگار کے حق واجب کا ذرہ برابر حق ادا نہ کرسکوں گا اور حظِ نفس کی خاطر کسی عمل کرنے کا تصور و خیال تو وہ کرے جو اپنے رب کے تمامی حقوق سے فارغ ہو لیا ہو۔ اور جب عمر بھر اس کا ایک حق ادا کرنے کی بھی طاقت نہیں رکھتا تو سارے حقوق ادا کرنے کی تو کیا ہوس ہو۔ اور اس سے فراغ پاکر حظ نفس کے لئے عمل کرنے کی توقع تو کس طرح کرے۔ نیز آپ نے فرمایا جنّتی جب جنّت میں داخل ہو جائیں گے اور ان کو اپنے خالق کی معرفت میں زیادتی نصیب ہوگی تو سب نادم ہوں گے کہ ہم سے اللہ سبحانہٗ کے بارے میں بڑی کوتاہی ہوئی۔ نیز آپ نے فرمایا میں نے جو کچھ کہا ہے اگر اس میں غور کروگے تو معلوم ہوگا کہ اجر کی خاطر عمل کرنا اللہ اور اس کے ادا رحقوق سے بے تعلق بنانے والی چیز ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایسے عمل کرنے والے کو ولایت اور قربِ الٰہی نصیب نہیں ہوتا بلکہ اللہ کا بعد بڑھتا ہے اور جب اللہ کے مستحق ہونے کی وجہ سے عبادت کروگے تو تمھاری عبادت میں

کبھی کسی وسوسے کا بھی دخل نہ ہوگا۔ میں نے عرض کیا حضرت اگر خیرات دینے والا خیرات دیتے وقت یہ سمجھے کہ مال بھی اللہ کا ہے میرا نہیں اور میں خود بھی اللہ کا ہوں اپنا نہیں، اور مسکین جس پر خیرات کی جا رہی ہے وہ بھی اللہ ہی کا ہے۔ غرض وہ خوب سمجھے ہوئے کہ سب کچھ اللہ کا ہے اور اب اس نیت سے وہ خیرات کرے اور اپنے نفس کے لئے کسی شے پر کچھ بھی نظر نہ ہو تو ایسی خیرات کا کیا حکم ہے؟ فرمایا سبحان اللہ بہترین سے بہترین ہے اور اس سے پہلے ہم تھیں اس تاخیر کی حکمت بتا ہی چکے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جب تک چالیس سال کی عمر کو نہ پہنچ لئے مبعوث نہیں فرمائے گئے۔ (اس کا تذکرہ آئندہ آئے گا) اس کے بعد فرمایا میں ایک شخص کو جانتا ہوں، صالحین میں سے تھے اور مجذوب صفت تھے موسم سرما میں ان کے پاس کوئی کپڑا نہ تھا، جو ان کو سردی سے بچا سکے۔ مجھے ان پر بہت ترس آیا اور ان کا اکثر فکر و خیال رہا کرتا تھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کسی نے ان کو کپڑا دیا کہ سردی سے بچاؤ ہو۔ مگر کوئی آتا جس کے دل میں اللہ کا خوف نہ ہوتا اور وہ کپڑا ان کے بدن سے اتار کرلے جاتا۔ وہ ایک کارخانے میں رہا کرتے تھے جہاں آٹا پستا تھا، ایک دفعہ میں ان کے لئے کپڑا لے گیا تو دیکھا کہ وہاں موجود تھے۔ میں نے ان سے باتیں کیں اور وہ جواب دیتے رہے۔ اس کے بعد میں نے کہا، میں آپ کے لئے یہ کپڑے لایا ہوں ان کو پہن لیجئے۔ فرمایا میں قبول نہیں کرتا اور اسے ہرگز نہ پہنوں گا۔ میری نیت ان کے لئے کپڑا لانے میں یہ تھی کہ حق تعالیٰ میری فلاں مراد پوری فرمادے۔ مگر بجز اللہ کے اس کی اطلاع کسی کو بھی نہ تھی۔ جب میں نے ان کا انکاری جواب سُنا تو پھر عرض کیا کہ قبول فرمالیجئے۔ مگر نہ مانے۔ کئی مرتبہ میں نے کہا اور وہ ہر مرتبہ انکار فرماتے رہے۔ آخر فرمانے لگے کہ میں وہ کپڑا نہیں پہنا کرتا جو کسی حاجت کی غرض سے صدقہ کیا گیا ہو اور میری حاجت بیان کردی۔ میں صرف وہ کپڑا پہنتا ہوں جو خالص اللہ نام کا ہو۔ غرض میں کپڑا وہیں چھوڑ کر چلا آیا اور کارخانہ والوں سے کہہ آیا کہ یہ ان کو پہنا دیجیو۔ مگر معلوم ہوا کہ وہ یوں ہی پڑا رہا اور انھوں نے اسے پہنا نہیں۔ جب مخلوق کا یہ حال ہے کہ جو چیز غیر اللہ کے لئے ہو اس کے قبول کرنے سے انکار کردیا۔ تو کیا پوچھنا خالق سبحانہٗ کا۔ نیز آپ نے فرمایا ایک عابد کو عبادت میں ولایت عطا کی گئی۔ وہ استسقاء کے مرض میں بیمار ہوئے۔ جب موت کے آثار نمودار ہوئے تو ان کے ہوش وحواس قائم تھے۔ کیونکہ اس مرض میں اکثر (تپ دق کی طرح) مرتے وقت عقل و ہوش قائم رہتا ہے۔ جب نزع کی تکلیف کو دیکھا اور علم ہوا کہ اس جیسی تکلیف کبھی عمر بھر پیش نہیں آئی تو (موت کا یقین ہو کر) اللہ کا خوف لاحق ہوا اور لقاء رب کے رعب و دہشت سے قلب لبریز ہو گیا۔ دفعتہً اپنی عبادت کثیرہ کا خیال آیا اور فرحت ہوئی۔ کہ اس خوف کا عبادت سے مقابلہ ہو کر قلب میں اطمینان وسکون آگیا۔ چونکہ اس نے عبادت پر اعتماد کیا اس لئے حق تعالیٰ نے فوراً عطا کردہ نعمت

سلب فرمالی اور مسلوب ہو کر اس کی موت آئی۔ نیز فرمایا اور جہنم میں اس جیسے عابد بہتیرے ہوں گے کہ اپنے عمل پر اعتماد کرنے کی وجہ سے حق تعالیٰ ان کو جہنم میں داخل فرمائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ عبادت پر اعتماد وہی کیا کرتا ہے جو اجر اور حظِ نفس کی وجہ سے عبادت کیا کرتا ہے۔ اگر عبادت خالص اللہ کے لئے ہوتی تو اس یومِ عظیم میں ضرور ان کو نفع دیتی۔ نیز فرمایا اور جو اللہ کے عارف (اور اس کی شانِ الوہیت سے واقف) ہیں۔ ان کی عبادت محض اس کے وجود کریم اور ذاتِ رفیعہ کی خاطر ہوتی ہے کہ بروئے اجلال اور تعظیم اور ہیبت و توقیر اس کی عبادت کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ اگر ساری عمر بھی اس کی عبادت کریں اور رو رو کر ہر وقت پیشانی رگڑتے رگڑتے پتھروں میں سوراخ بھی ڈال دیں تو اس کے حقوقِ ربوبیت میں سے کچھ بھی پورا نہ کر سکیں۔ پھر اپنے نفس کے لئے اجر کیسے مانگ سکتے ہیں جب کہ اجر کا طالب وہی ہو سکتا ہے جو سمجھتا ہو کہ حق پورا کر چکا اور اس پر جو ضروری تھا وہ ادا کر چکا۔ اور عارفین کا تو حال یہ ہے کہ وہ (ادائے حقوق میں بھی) اپنے آپ کو قاصر و مقصر سمجھتے ہیں کہ اللہ کے لئے کچھ کیا ہی نہیں۔ علاوہ ازیں ان کو مشاہدہ ہوتا ہے کہ (عبادت کا) جو فعل بھی ان سے صادر ہوا ہے، درحقیقت وہ اللہ کی طرف سے ہوا ہے۔ نہ کہ ان کی طرف سے۔ پھر دوسرے کے فعل پر اجر کس منہ سے مانگیں۔ میں نے عرض کیا کہ اس عابد سے سلب کیا چیز ہوئی؟ معرفت تو ظاہر ہے کہ تھی ہی نہیں۔ کیونکہ اس کو معرفت نصیب ہوتی تو اپنے عمل پر اعتماد ہی نہ کرتا۔ اب سلب شدہ چیز ایمان ہو گا یا نیکیاں۔ فرمایا ہاں جو نیکیاں اس نے کی تھیں۔ وہ چھین لی گئیں۔ کیونکہ ان پر نظر کرنے نے ساری رحمتیں جو ان پر مرتب ہوئی تھیں زائل کر دیں اور ان تمامی حسنات کو گناہ اور سیئات بنا دیا کہ ان پر جہنم میں عذاب کی سزا دی جائے گی۔ میں نے کہا کہ ان پر نظر کرنے کی سزا کے لئے اعمال کا حبط کر لینا کیا کافی نہ تھا جو مزید برآں ان کو گناہ بھی بنا دیا گیا؟ فرمایا ان پر نظر کرنے ہی نے تو ان کو گناہ بنایا۔ مثلاً اگر تم دیکھو کہ نیزہ تمہاری طرف جھکا اور ضرور پہلو میں گھس جائے گا تو جس وقت تم ڈھال کے ذریعہ اس سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو گے، ظاہر ہے کہ اُسی وقت کرو گے جبکہ تم کو اس کا پختہ یقین ہو گا کہ ڈھال میں نیزہ کی مار سے زیادہ قوت ہے۔ حتیٰ کہ وہ نیزہ کو بھی روک سکتی ہے اور دوسرے ہتھیاروں کو بھی رد کر سکتی ہے۔ اور اگر تمہارے علم میں یہ ہو کہ ڈھال نیزے کو رد نہیں کر سکتی تو کبھی اس کو سامنے نہ لاؤ گے اور اب صرف یہ کرو گے کہ پناہ مانگو گے نیزے والے سے، اور گھسو گے اس کی حمایت میں اور طلب کرو گے اس کی رضا و خوشنودی کو شاید رحم فرماتے اور اپنا نیزہ روک لے۔ بس یہی حال اس عابد کا تھا کہ جب اس نے اس خوف کا مقابلہ اپنی عبادت سے کیا اور قلب کو سکون ہو گیا اور دل میں خوشی و اطمینان آ گیا تو یہ سب کچھ اسی بنا پر تو ہوا کہ وہ عبادت

کو اللہ کے حقِ واجب سے زیادہ قوی اور قاطع سمجھتا تھا۔ کہ وہ اس کو بھی رد کر دے گی اور (عذاب و عتاب وغیرہ) دوسری چیزوں کو بھی روک دے گی اور یہ کھلی گمراہی ہے۔ نیز ساری عبادتیں اور طاعتیں بلکہ تمامی شریعتیں حق تعالیٰ نے بندوں کے لئے صرف اس لئے تجویز فرمائی ہیں کہ کلمۂ توحید قائم ہو اور مخلوق کے قلوب میں اپنے رب کی معرفت حاصل ہو۔ پس اگر (بندہ کو عبادت کرنے سے) معرفت حاصل ہو گئی تو مقصود حاصل ہو گیا۔ مگر جب معرفت ہی حاصل نہ ہوئی تو مقصود فوت ہو جانے پر وسیلہ (یعنی عبادت اور طاعت) کا کچھ اعتبار نہیں (لہذا اُن پر اجر و ثواب نہیں) اور معاصی کے حرام ہونے کی وجہ صرف یہی ہے کہ ان میں اللہ سے قطع تعلق ہے اور جب طاعتیں بندہ کا تعلق اللہ سے قطع کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ وہ معاصی ہیں۔ (لہذا وہ منافق کی عبادتوں کی طرح محض صورۃً طاعت تھیں مگر حقیقۃً معصیت ہیں۔ یہ مطلب ہے طاعتوں کے معاصی بنانے کا جیسا کہ برعکس اس کے اہلِ تعلق کی سیئات مبدل بہ حسنات ہو جائیں گی۔

ایک شخص نے (محکمۂ پولیس میں ملازمت کے متعلق جس میں عموماً ظلم و جور کرنا پڑتا ہے) آپ سے مشورہ لیا کہ اگر اس کو قبول نہ کروں تو مجھے جان کا خطرہ ہے (کہ سلطان ناراض ہو جائیں گے) فرمایا اہلِ ظلم میں ایسے لوگ بھی ہیں جن میں ایمان ہے اور ان کا قلب اللہ سے وابستہ ہے۔ اور ایسے بھی ہیں جو اللہ سے بے تعلق ہیں اور اس کی علامت انقباض اور انبساط ہے کہ جو شخص (اس کام میں پڑ کر) منقبض اور مکدر رہتا ہو اور یہ بھی علم رکھتا ہو کہ میں اپنے رب کے حکم کی مخالفت کر رہا ہوں اور غیر اللہ کی اطاعت کر رہا ہوں تو یہ پہلی قسم میں داخل ہے کہ آخرت میں حساب کتاب اور عقاب و عتاب کے بعد نجات پا جائے گا اور اللہ سبحانہٗ اگر بالکل ہی معاف کر دے تو یہ بھی متوقع ہے۔ اور جو ان میں بحالتِ ظلم مسرور و فرحاں اور اس کے قلب میں اطمینان و انبساط ہو کہ نہ ڈرے نہ حزن تو وہ دوسری قسم ہے کہ معصیت کو اور بندگانِ خدا پر ظلم و زیادتی کو ایسا لذیذ سمجھتا ہے جیسے نجاست کا کیڑا نجاست کو اور گندگیوں کے کھانے کو لذیذ سمجھتا ہے۔

نیز فرمایا کہ مومن کی مثال پرندی کی سی ہے اگر کسی گندی زمین پر اترے گا تو منقبض ہو گا اور اپنے پروں کو سمیٹے گا۔ اور اگر صاف ستھری زمین پر اترے گا تو منبسط ہو گا اور اپنے پروں کو پھیلائے گا اور (دانہ کی) تلاش میں سعی کرے گا۔ نیز فرمایا کہ اہلِ انقطاع جب حرام و ظلم سے دراہم وصول کرتا ہے جن پر (کلمہ طیبہ اور) اللہ کا نام کندہ ہوتا ہے۔ اور کوئی اللہ والا اس کے پاس آ کر کسی حیلہ سے مثلاً مانگ کر یا اور کسی تدبیر سے وہ دراہم اس کے قبضہ سے نکال لیتا ہے تو اس نے اللہ کے محترم فرشتوں کو قید سے چھڑا لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نامِ خدا کے ہر حرف پر ایک فرشتہ ہوتا ہے اور ہر اسم الٰہی پر وہ فرشتہ تعینات ہوتا ہے جس کو چالیس فرشتوں کی قوت دی ہوئی ہے، تو جب تک وہ دراہم جن پر اللہ کا نام ہوتا ہے اس

ظالم، منقطع عن اللہ کے پاس رہتے ہیں توان فرشتوں میں سے ہر فرشتے کی یہ حالت ہوتی ہے جیسے کسی پرند کو پکڑ کر اس کے بازو باندھ دیئے جائیں۔ اور اس کا سر اس کے پروں کے نیچے کو نکال دیا جائے۔

لہذا جب کوئی اللہ کا نیک بندہ آکر کسی تدبیر سے ان کو لے لیتا ہے تو فرشتے کو بڑی خوشی ہوتی ہے اور جو ضیق اس کو لاحق تھی وہ دور ہو جاتی ہے۔ کیونکہ فرشتوں کو اہلِ انقطاع سے کراہت و گرانی ہوا کرتی ہے۔ چونکہ اس کمزور بندے نے جو کمایا وہ اللہ سے غافل ہو کر کمایا کہ اپنے آپ کو اللہ سے جُدا کیا۔ اپنا انتظام اپنے ہاتھ میں لیا۔ اپنی تدبیر پر نظر رکھی، اسی پر عمل کیا اور اپنا مطلب حاصل کرنے میں اپنی انتہائی کوشش صرف کر گزرا۔ اس لئے حق تعالیٰ نے بھی اس کو اسی کے حوالے کر دیا اور اس کو اغیار کا محسوس کرنے والا بنا دیا کہ گرمی وسردی کی تکلیف اس کو محسوس ہوتی ہے اور زخم ہائے بدن اور قسم قسم کی اذیتیں اس کا دل دکھاتی ہیں۔ اور اگر یہ اپنے آپ کو اللہ سے علیحدہ نہ کرتا اور اپنی باگ اپنے خالق کے ہاتھ میں دے دیتا اور اغیار سے قطع نظر کر کے اغیار کو دل سے مٹا دیتا، تو لوہے کے کانٹوں اور سلاخوں پر بھی چلتا تب بھی کلفت و درد محسوس نہ کرتا۔ نیز فرمایا کہ غفلت عن اللہ ہی کے سبب بندہ پر (اوامر و نواہی) کا بڑا بوجھ ڈالا گیا اور اس کو احکام کا مکلف بنا دیا گیا۔ اور پیغمبروں کے ہاتھ شریعتیں بھیجی گئی ہیں تاکہ وہ اس کو غفلت سے لوٹائیں۔ اگر یہ غفلت عن اللہ نہ ہوتی تو بشر بھی فرشتوں کی طرح غیر مکلف ہوتے اور ان عظیم مشقتوں کے برداشت کرنے کی ان کو حاجت نہ ہوتی۔ اگر یہ غفلت عن اللہ نہ ہوتی تو دوزخ بھی قطعاً نہ ہوتی۔ اور بندہ اپنے افعال کو اپنے رب کا پیدا کردہ سمجھتا اور اس کے نفس ہی نہ ہوتا جس کی نظر افعال پر جاتی۔ چہ جائیکہ ان کو اپنی طرف منسوب کرتا۔ اور جب اس کی یہ حالت ہوتی تو ہر وقت فانی ہوتا۔ پھر مکلف ہی کیسے بنایا جاتا۔ نیز فرمایا کہ سب میں بڑا احمق وہ ہے جو فانی چیز یعنی دنیا اور اس کے متعلقات میں دَوڑ دھوپ کرے۔ اور سب سے بڑا عاقل وہ ہے جو باقی یعنی ذاتِ حق میں دوڑ دھوپ کرے۔ کیونکہ فانی جب فانی میں کھپ گیا تو کسی ایک نے بھی دوسرے کو نفع نہ پہنچایا۔ لیکن اگر فانی جذب ہو گیا۔ باقی میں تو فانی بھی باقی بن گیا۔ نیز فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ موت کا کوئی علاج نہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے، اس کی دوا ضرور ہے اور اس کی دوا یہی ہے جو ہمنے بیان کی۔ بجز اس کے کہ باقی کی طلب میں مر کھپے، اس کی اور کوئی دوا نہیں ہے۔ اس کے بعد قسم کھائی اور بار بار قسم کھا کر یہی فرماتے رہے۔ اور فرمایا جب بندہ اللہ سبحانہٗ میں ظاہراً اور باطناً پوری اور کامل دوڑ دھوپ کرتا ہے تو نہ وہ فنا ہوتا ہے اور نہ اس کو وہ موت آتی ہے جسے لوگ موت سمجھتے ہیں۔ نیز فرمایا اکثر اہلِ دیوان کی یہ حالت ہوتی ہے کہ جب مرتے ہیں تو خود ہی اپنے آپ کو غسل دیتے ہیں کہ تختہ پر نعش بھی پڑی نظر آئے گی اور غسّال بھی نظر آئے گا۔ حالانکہ دونوں ایک

چیز ہیں۔ اب ہم اس باب کو ایک عجیب حکایت پر ختم کرتے ہیں جو ہم نے حضرت ممدوح سے سُنی۔ اور اس کی صورت یہ پیش آئی کہ میں ایک دن تارک الدنیا فقیروں کی جو کہ قطع تعلقات کر کے پہاڑوں، غاروں اور جزیروں میں جا پڑے ہیں، آپ سے تعریف کرنے اور کہنے لگا کہ وہ تمامی اغیار سے قطع تعلق کر کے خالص اللہ کے ہو رہے اور مجرّد و یکسو ہو کر حق تعالیٰ کی عبادت میں لگ گئے۔ عوام بھی ان کی بڑی تعظیم کرتے اور ان کو زاہد اور بزرگ ترین مردم سمجھتے ہیں۔ فرمایا میں تمھیں ایک واقعہ سناتا ہوں اُسے غور سے سُنو۔ اور میں اگر اس میں اپنے طرف سے کچھ بھی بڑھاؤں تو اللہ مجھ سے باز پرس فرمائے۔ میں نے عرض کیا معاذ اللہ اس کا تو ہمیں وہم بھی نہیں ہو سکتا۔ فرمایا ایک روز باب الفتوح پر میں حضرت منصور قطب کے پاس عیدگاہ میں بیٹھا ہوا تھا کہ یکایک ہمیں خیال ہوا سمندر کے اس جزیرے میں جائیں جس کے کنارہ پر شہر سلا بندرگاہ واقع ہے۔ چنانچہ ہم گئے اور دیکھا کہ بقدر ایک میل رقبہ کا جزیرہ ہے جس میں شیریں پانی کے دو چشمے بہہ رہے ہیں۔ وہاں ہمیں ایک شخص ملا جس کی عمر قریب چالیس سال کے ہو گی۔ اور وہ اللہ کی عبادت کر رہا تھا۔ نیز اس میں بڑے بڑے مکانات تھے جن کو پتھر کھود کر بنایا گیا تھا اور مکانات کے وسط میں ایسی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں تھیں جیسی اندرونِ حمام ہوا کرتی ہیں۔ یہ ہمیں پتہ نہیں کہ وہ کس نے کھودے اور بنائے تھے۔ کیونکہ وہ جگہ آبادی سے بہت دور ہے کہ وہاں کوئی پہنچتا بھی نہیں۔ کبھی کوئی کشتی البتہ پہنچ جاتی ہے۔ نیز اس میں دو طرح کے درخت تھے۔ ایک نوع جن کے پھل بادام کے مشابہ تھے اور دوسری نوع کو اس درخت سے مشابہت تھی جس کا نام ہمارے ملک میں تغزاز ہے، البتہ طول میں اس سے کم تھا اور اس کے پتے چوڑے تھے اور ہمیشہ سبز ہی رہتے تھے میں نے دیکھا، اس عابد کی غذا وہ پھل تھے جو بادام کی مشابہ نوع میں لگتے تھے اور وہ سبز پتے تھے جو تغزاز کی مشابہ نوع میں نکلتے تھے۔ پھر ہم نے اس کے لباس پر نظر ڈالی تو اس درخت کی جو تغزاز کے مشابہ تھا پتلی پتلی شاخیں لے کر باہم گوندھ لیا اور لنگوٹ سا بنا کر کمر میں باندھ لیا۔ جس سے صرف ستر عورت ہو گیا تھا، باقی سارا جسم برہنہ تھا۔ ہم نے اس سے باتیں شروع کر دیں اور پوچھا کہ تم اس مقام پر کتنے دنوں سے ہو۔ اس نے کہا تقریباً چالیس برس سے۔ میں نے کہا کہ تمھاری تو کل عمر ہی چالیس کے قریب معلوم ہوتی ہے۔ پھر تم یہاں آئے کب تھے؟ کہا میں اپنے باپ کے ساتھ یہاں آیا تھا۔ اس وقت میری عمر تقریباً پانچ برس تھی کہ چھوٹا بچہ تھا۔ پھر قریب پچیس برس کے میں اپنے باپ کے ساتھ رہا۔ آخر ان کا انتقال ہو گیا اور میں نے ان کو یہیں دفن کر دیا۔ ہم نے کہا کہ ان کی قبر ہمیں دکھاؤ، تاکہ زیارت کریں۔ چنانچہ اس نے قبر دکھائی اور ہم نے مرحوم کے لئے دعائے مغفرت مانگی۔ پھر اس سے باتیں کرنے لگے۔ چونکہ اس کا آدمیوں سے کم ملنا ہوتا تھا اور بچپن ہی میں یہاں آ گیا تھا۔ اس لئے اس کی زبان بہت بھاری تھی دکہ مشکل سے سمجھ میں آتی

تھی) باتیں عربی میں کرتا تھا۔ کیونکہ وہ اس قوم کا تھا جو تونس کے نواح میں آباد ہے اور اس قوم کی زبان عربی تھی۔ چنانچہ ہم نے اس سے ایمان کے متعلق دریافت کیا۔ تو معلوم ہوا کہ وہ اللہ کو پہچانتا ہے مگر جہت کا معتقد تھا کہ اللہ آسمان پر ہے۔ اس سے ہمنے اس کو منع کیا اور امرِ حق بتایا (کہ وہ ہر جگہ ہے اور اس کے لئے کوئی جہت معین نہیں)، نیز ہم نے اس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی واقف پایا۔ اور اس سے بھی کہ آپ سید الاولین والآخرین ہیں۔ نیز حضرتِ ابوبکرؓ اور حضرت فاطمہؓ بنت الرسولؐ سے بھی واقف تھا۔ ان کے فرزند حضرتِ حسنؓ کے متعلق ہم نے سوال کیا تو معلوم ہوا ان سے واقف نہیں ہے۔ پھر ہم نے ماہِ رمضان کے متعلق دریافت کیا تو اس سے بھی ناواقف پایا۔ ہاں اس کے بیان سے معلوم ہوا کہ تیس دن کے روزے رکھا کرتا ہے۔ مگر سال کے اندر متفرق ایام میں۔ چنانچہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے ہم نے اُسے آگاہ کیا۔ اور معین کر کے بتایا کہ سال میں ماہِ رمضان کونسا ہے۔ پھر ہم نے پوچھا قرآنِ مجید میں کچھ یاد ہے؟ معلوم ہوا کچھ یاد نہیں، بجز اس کے اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝ اَلَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ اتنی مقدار اور اسی طرح غلط اس کو یاد تھا۔ ہم نے پوچھا تمھاری عبادت کیا ہے؟ کہنے لگا اللہ کے لئے رکوع اور سجدہ۔ ہم نے کہا کسی وقت سوتے بھی ہو؟ کہا ہاں سورج ڈوبتے وقت سوتا ہوں، اس وقت تک کہ خوب اندھیرا ہو جائے۔ باقی سارے وقت میں رکوع اور سجدہ کرتا رہتا ہوں۔ میں نے کہا کیا بلادِ اسلام کی طرف چلنے اور ان میں رہنے سہنے کو جی چاہتا ہے کہ ان کا دین بھی وہی ہے جو تمھارا دین ہے اور جس نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر تم ایمان لاتے ہو اسی پر وہ بھی ایمان لائے ہیں۔ کہا ہاں میں بھی مسلمان ہوں منجملہ مسلمانوں کے مگر میں اپنی اس جگہ سے نکلنا نہیں چاہتا۔ حتیٰ کہ یہیں موت آجائے۔ ہم دیکھتے تھے کہ جب باتیں کرتے ہوئے خطاب کے وقت ہم ــــ اس سے ذرا قریب جاتے تو وہ ہم سے بھاگتا تھا۔ اس لئے کہ آدمیوں سے اس کو انسیت نہ تھی۔ وہ ہماری غذائیں نہیں کھا سکتا تھا اور اس کا معدہ انھیں برداشت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ مدت سے دوسری غذا کا عادی تھا۔ پھر ہم نے دیکھا کہ قریب ڈیڑھ پاؤ وزن کے ریال (نقرئی سکہ) اس کے پاس ایک طرف پڑے ہیں جن میں چند طلائی مثقال (دینار) بھی تھے۔ ہم نے کہا کہ یہ تمھارے پاس کہاں سے آگئے؟ کہنے لگا کبھی کسی وقت کشتی والے اس جزیرے میں آجاتے ہیں اور مجھے دیکھ کر مجھ سے دعائے خیر کے خواستگار ہوتے ہیں اور بطور تبرک و زیارت کے یہ ریال و دینار دے جاتے ہیں میں ان کو دعا دے دیتا ہوں اور وہ واپس چلے جاتے ہیں۔ ہم نے کہا کہ یہ ریال و دینار ہمیں دے دو کہ تمھارے لئے تو بے کار ہیں۔ نہ تمھیں کوئی مکان تعمیر کرانا ہے، نہ نکاح کی ضرورت ہے، نہ کپڑے بنانے ہیں، اور نہ ہی ان کے خرچ کرنے کی ضرورتیں ہوتی ہیں۔ لہٰذا ہمیں تو ان کی ضرورت ہے اور تمھیں ان کی ضرورت نہیں ہے۔

کہنے لگا میں اپنے درہم تو تمھیں دوں گا نہیں۔ غرض ہم دیر تک اس کے پاس بیٹھے کہ اس کو احکام شرعیہ بتاتے اور سکھاتے رہے۔ اس کے بعد رخصت ہوئے اور چل دیئے۔ جب اس نے ہمیں دیکھا کہ سطح آب پر پاؤں سے چل رہے ہیں اور ڈوبتے نہیں تو ہم سے اللہ کی پناہ مانگنے لگا اور ہمارے متعلق یوں سمجھا کہ شیاطین ہیں نیز فرمایا وہ اب تک یعنی ماہ شعبان ۲۹ ۱۱۲۹ھ تک بقید حیات اسی جزیرے میں موجود ہے۔ ۱۲ صاحب کتاب کہتے ہیں کہ اس قصے میں چند نصیحتیں ہیں۔ اول تنبیہ ہے اس نعمت پر جو مومنین کی مخالطت اور مسلمانوں کے ساتھ رہنے سہنے سے حاصل ہوتی ہے، اس کی وجہ سے ہمیں احکام شرعیہ کی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کی، سیرت نبویہ، اور سیرت صحابہ کی واقفیت ہوتی ہے۔ اور یہ کہ آپؐ کا زمانہ اور آپؐ کے صحابہؓ کا زمانہ کیسا تھا۔ غرض وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن سے ایمان میں اضافہ ہوتا ہے۔ چنانچہ اس شخص کو مخالطت مسلمین نصیب نہ ہوئی تو احوال مذکورہ کی معرفت بھی نصیب نہ ہوئی حتیٰ کہ میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا اس کے باپ نے اس کو بڑا نقصان پہنچایا کہ اس کو جزیرے میں لا ڈالا اور اہل اسلام سے اس کو جدا کر دیا۔ اگر ان کے پاس رہنے دیتا تو وہ اس کے لئے نہایت بہتر اور مبارک ہوتا۔ فرمایا سچ کہتے ہو، اس سے قدر و قیمت معلوم ہوتی ہے مومنین کی اگرچہ مبتلائے معصیت ہی کیوں نہ ہوں۔ کیونکہ احکام شرعیہ کی برابر کوئی چیز نہیں بن سکتی۔ مسلمانوں کی مخالطت، حتیٰ کہ بازاروں میں ان کے ازدحام سے خلط ملط بھی قابل شکر نعمت ہے اور مواقع خیر میں تو کچھ پوچھنا ہی کیا۔ اسی لئے شیخ عبد القادر جیلانی رح فرماتے ہیں کہ مومنین کے چہرے پر نظر ڈالنے سے بھی ایمان میں ترقی ہوتی ہے۔ دوم اللہ کی نعمتوں سے واقفیت کہ کھانے پینے میں، لباس میں، سونے میں، آرام کرنے میں، نکاح میں، توالد و تناسل میں۔ غرض ہر صورت میں حق تعالیٰ نے ہمیں وہ نعمتیں عطا فرمائی ہیں جن سے وہ عابد تارک الدنیا محروم رہا۔ اگر اہل اسلام کے ساتھ رہتا سہتا تو وہ بھی ان نعمتوں سے متمتع ہوتا۔ اور اللہ کا شکر ادا کرتا۔ کیا عجب تھا کہ ان نعمتوں پر شکر کرنا جزیرے میں اس کی عمر بھر عبادت کرنے کے برابر ہوتا۔ سوم اکثر لوگوں کو بن باسی فقیروں اور اہل خلوت درویشوں کے معاملہ میں دھوکا ہوتا ہے کہ وہ ان کے کمال کا اعتقاد رکھتے اور یوں سمجھتے ہیں کہ جس درجہ پر یہ پہنچے ہیں لوگوں میں ملے جلے عارفین اولیا وہاں نہیں پہنچ سکتے۔ حالانکہ حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ میں اکثر ان انوار پر نظر ڈالتا ہوں، جو ذوات بنی آدم سے نکل کر برزخ سے جا ملے ہیں۔ وہ رقت اور غلظ میں مختلف ہیں کہ کوئی باریک و پتلا ہے اور کوئی موٹا اور غلیظ) اور رقت دلالت کرتی ہے ضعف ایمان پر اور غلظ دلالت کرتا ہے قوت ایمان پر۔ پھر میں ان عابدین کی طرف نظر کرتا ہوں جو غاروں اور بنوں میں رہتے ہیں تو ان کے انوار پر اکثر رقت ہی کو غالب دیکھتا ہوں۔ بجز خال خال کے اور عوام مومنین پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کے انوار ان تارک الدنیا فقرو

سے زیادہ اچھی حالت میں دیکھتا ہوں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ عوام کا اعتماد اللہ کے فضل پر ہوتا ہے (کہ اپنی عملی کوتاہیاں دیکھ کر نجات میں اللہ کے کرم ہی پر نظر جاتی ہے۔) اور عبادت گزاروں کا اعتماد اکثر اپنی عبادتوں پر ہوا کرتا ہے۔ نیز فرمایا۔ عابد کو اس کی عبادت کے ذریعے نجات نہیں مل سکتی جب تک کہ باطناً اس کو اپنے رب کی طرف سے نہ سمجھے۔ اور اس کا یہ خیال و فکر دائمی ہو۔ اگر ذرا بھی یہ اس کے دھیان سے ہٹ گیا تو سلامتی کی بہ نسبت ہلاکت اس کے زیادہ قریب ہے۔ غرض حضرت سے یہ قصہ سن کر ان نعمتوں کو یاد کر کے جو حق تعالیٰ نے ہم پر فرمائی ہے اور ہم ان سے غافل ہیں، مجھے بڑی رقت اور شانِ خضوع نصیب ہوئی۔ اس کے بعد میں نے حضرت سے عرض کیا آپ اس شخص کا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ لے کیوں نہ آئے کہ جزیرہ سے نکل کر اسلامی شہروں میں کسی بستی کے اندر رہتا۔ اور (دنیوی) راحت بھی پاتا اور (آخرت کے متعلق) حق تعالیٰ کی رحمت بھی اس پر برستی۔ فرمایا حق تعالیٰ نے اس کا قیام اسی جگہ تجویز فرمایا تھا۔ لہٰذا اس کا مقام وہی تھا۔ وہ ملک کا مالک ہے (جس بندے کے لئے جو جگہ چاہے تجویز فرمائے) نیز فرمایا جو شخص سطحِ زمین کی عجائبات پر نظر کرے تو اللہ کی وحدانیت معلوم کرنے کے لئے یہی کافی ہے۔ دوسری کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایک سطحِ زمین پر صدہا مختلف اقسام کی مخلوقات اس کو مجتمع نظر آئیں گی۔ بعض ان میں اہلِ عقل ہیں اور بعض دیوانے اور پاگل۔ کوئی خوشحال ہے کوئی محروم و مفلوک الحال۔ کوئی کسی کو قتل کر رہا ہے اور کوئی کسی پر ترس کھا رہا ہے۔ کسی کے تفکرات امورِ دنیا میں دوڑ رہے ہیں، کسی کے خیالات معاملاتِ تجارت میں اور کسی کے اپنے پڑوسیوں میں۔ کوئی شخص علمی امور میں غرق ہے اور کوئی امورِ آخرت میں۔ میرے شیخ حضرت عمر بن محمد ہواری نے ایک دن فرمایا کہ میں جمعرات کے دن باب المحروق پر بیٹھا ہوا دروازے سے نکلنے والوں کے باطن پر نظر ڈال رہا تھا۔ چنانچہ ایک شخص نکلا اور اس کے باطن کو دیکھا۔ تو بجز فلاں محبوبہ کے فکر و خیال کے اس میں کچھ نہ تھا۔ یہی تفکر اس پر مسلط تھا کہ وہ کیونکر ہاتھ لگے۔ اور کیا تدبیر کروں اس کے پانے کی۔ پھر دوسرا نکلا اور اس پر نظر ڈالی تو اس کا قلب بھی پہلے شخص کی طرح تھا۔ بجز اس کے کہ اس کے فکر کا تعلق (عورت سے نہیں بلکہ) لڑکے کے ساتھ تھا۔ پھر تیسرا[۳] آیا تو اس کا قلب دنیا کے ساتھ وابستہ تھا۔ اور اسی کے فکر میں غرق تھا کہ اور کسی بات کا ہوش ہی نہ تھا۔ پھر چوتھا[۴] نکلا تو اس کا باطن شراب نوشی کی محبت میں چور تھا اور اس کے سوا کسی دوسری بات کا فکر ہی نہ تھا۔ پھر پانچواں[۵] نکلا تو اس کا فکر دارِ آخرت اور اس کے معاملات میں دوڑ رہا تھا۔ اور اتنا غالب آگیا تھا کہ بدن پر ظاہر ہو گیا تھا۔ پھر چھٹا[۶] نکلا تو اس کا قلب علم اور اس کے پڑھنے کی محبت سے معمور تھا کہ بجز اس کے دوسری چیز اس کے خیال میں بھی نہیں آتی تھی۔ پھر ساتواں[۷] نکلا تو اس کا فکر سواری اسپ میں غرق تھا۔ اور اتنا غالب آگیا تھا کہ باقی سب کچھ بھلا دیا تھا۔ پھر آٹھواں[۸] نکلا تو اس کا فکر کھیتی کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا کہ اس کے سوا کسی سعی اور تدبیر کا خطرہ

بھی نہ گزرتا تھا۔ پھر نواںؒ نکلا تو اس کا فکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلّم کی محبت سے معمور تھا اور اس کا اتنا غلبہ تھا کہ احوالِ محمّدیہؐ کے سوا دوسری طرف اس کا خیال جاتا ہی نہ تھا۔ بس یہی دھیان تھا کہ لعبثت سے پہلے آپؐ کے حالات کیا تھے اور لعبثت کے بعد کیا تھے۔ پھر نزولِ وحی کے بعد آپؐ کے کیا احوال تھے۔ مکّہ میں آپؐ کی سکونت کس طرح رہی۔ اور مدینہ میں کس طرح رہی۔ پھر دسواںؒ نکلا تو اس کی محبت اللہ ربّ العالمین، اور خالق الکل اجمعین کی محبت سے لبریز تھا کہ کبھی اس کی عظمت وجلال اور تقدس وتنزہ میں جولانی کرتا تھا۔ اور کبھی اس کی صفاتِ کمالیہ میں۔ حضرت عمر بن محمّد نے فرمایا کہ اس کے بعد میں نے اس امرِ باطن پہ نظر ڈالی جو ان سب میں حاکم اور ارادۂ الٰہی سے ناشی تھا تو میں نے ان کے بواطن میں ایسا پایا جیسے ایک رسّی ان کو اس کام کی طرف کھینچے لئے جا رہی ہے جس کا حق تعالیٰ نے ان میں ارادہ فرمایا ہے۔ مگر وہ اس سے بے خبر ہیں کہ فعل کو اپنی طرف سے اور اختیار کو اپنے حوالہ سمجھ رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بڑی عبرت ہوئی اور میں نے کہا بے شک کوئی معبود و متصرف نہیں سوائے اللہ کے۔ لاریب ملک میں اس کا کوئی شریک نہیں۔ اور بلا شبہ وہ کرتا ہے، جو چاہتا ہے۔ اور حکم (دے کر کراتا ہے) جو بھی ارادہ فرماتا ہے۔ اس کے حکم کا کوئی بدلنے والا نہیں۔ اور وہ سریع الحساب ہے۔ مخلوق بڑی غفلت میں ہے ف بدن میں آنکھ، ناک، کان، ہاتھ، پاؤں، مختلف اعضاء ہیں جن میں فقط روح کار فرما ہے کہ ہر عضو سے جُدا کام لے رہی ہے۔ بظاہر معلوم ہوتا ہے آنکھ دیکھ رہی ہے۔ کان سن رہا ہے، ناک سونگھ رہی ہے۔ ہاتھ مل رہے ہیں، پاؤں چل رہے ہیں۔ مگر واقع میں یہ سب کام روح کرا رہی ہے اور اعضا اس کے لئے صرف آلہ اور محل بنے ہوئے ہیں۔ یہ کام بالذات اگر ان اعضاء کے ہوتے تو روح کے نکل جانے پر جبکہ کسی عضو میں کوئی فرق نہیں آیا ہے وہ معطّل و بے کار نہ بن جاتے۔ بایں ہمہ بُرا بھلا جو بھی اثر مرتب ہوتا ہے وہ اعضا ہی پر ہوتا ہے کہ ہاتھ سے بے احتیاطی ہوتی ہے تو وہی کٹتا ہے اور آنکھ سے اگر بدپرہیزی ہوتی ہے تو وہی پھوٹتی ہے۔ اسی طرح تمامی مخلوقات بمنزلۂ اعضا کے ہے اور ارادۂ الٰہیہ بمنزلۂ روح کے کہ وہی ہر ایک سے جدا کام لے رہا ہے اور پھر وہی صادر ہوتا ہے جس کے لئے مشیتِ الٰہیہ نے اس کو تجویز فرمایا اور بنایا ہے۔ بایں ہمہ افعال واعمال کے حسن وقبح کا اثر ان ہی پر پڑتا ہے اور محلِ جزا و سزا وہی قرار پاتے ہیں۔ اس کو خوب سمجھ لو کہ طبیعت اکثر اس میں شبہات کیا کرتی ہے ف نیز فرمایا دو شخص ایک جگہ گزرتے ہیں اور چند قدم بھی چلنے نہیں پاتے کہ ایک کی مغفرت ہو جاتی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اس کی وجہ کیا؟ فرمایا کہ صرف اس کی واقفیت کہ اللہ کی مخلوقات میں غور وفکر کس طرح کرنا چاہئے۔ اور دوسرا شخص جو اس کے ساتھ چل رہا ہے اس سے غافل اور اس کو بھولا ہوا ہے (لہٰذا وہ مغفرت سے، نوازا گیا) بس یہ ہے صورتیں بندوں پر اور ان کے افعال پر ظلمتوں اور انوار کے داخل ہونے کی۔ اور اس سے

قبل تعبیرِ خواب کے باب میں جو ظلمتوں کے دس درجات ہم بیان کر آتے ہیں یعنی سہوِ مکروہ، سہوِ حرام، عمدِ مکروہ، عمدِ حرام، عقیدہ حقیقیہ میں جہلِ بسیط۔ اس کا جہلِ مرکب عقیدہ ثقیلہ میں جہلِ بسیط اس کا جہلِ مرکب بارگاہِ محمدی میں جہلِ بسیط اور جہلِ مرکب۔ ان دسوں کے ساتھ ان ابوابِ ظلام کو بھی شامل کرلو تو ایک بڑی معرفت تم کو حاصل ہوگی۔ واللہ الموفق للسداد واللہ اعلم۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ ط

چوتھا باب

دیوان صالحین (یعنی اہل تصرف اقطاب و ابدال کی مجلس) کا بیان

شیخ فرماتے تھے کہ یہ دربار غار حرا میں ہوتا ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ وسلم قبلِ رسالت عبادت فرمایا کرتے تھے۔ غوث تو غار سے باہر بیٹھتا ہے کہ مکہ اس کے داہنے شانہ کے پیچھے ہوتا ہے اور مدینہ بائیں گھٹنے کے سامنے چار قطب اس کی دائیں جانب ہوتے ہیں اور وہ مالکی المذہب ہیں اور تین قطب اس کی بائیں جانب کہ ہر سہ مذاہب باقیہ کا ایک ایک ہے۔ اور وکیل سامنے ہوتا ہے جس کا نام قاضی محکمہ ہے۔ اور اس وقت وہ بھی مالکی مذہب ہیں خاندان بنی خالد کے جو کہ نواح بصرہ میں رہتے ہیں۔ ان کا نام محمد بن عبدالکریم بصراوی ہے۔ اور غوث وکیل ہی سے گفتگو کرتا ہے اور اسی لئے اس کا نام وکیل رکھا گیا ہے کہ وہ تمامی مجلس کی طرف سے قائم مقام اور نائب ہوتا تصرفات کا تعلق اقطاب سے ہے مگر غوث کے حکم کے موافق۔ ساتوں اقطاب میں ہر قطب کے ماتحت ایک مخصوص مرد ہے جو اس کی ماتحتی میں تصرفات کرتے ہیں اور وکیل کی پشت کی جانب چھ صفیں ہیں جن کا دائرہ چوتھے قطب سے شروع ہو کر بائیں جانب کے اقطاب ثلاثہ پر ختم ہوتا ہے۔ سات اقطاب اس دائرے کے اطراف بنتے ہیں اور یہ پہلی صف ہے۔ پھر اس کے پیچھے اسی طرح پر دوسری صف دائرہ نما ہوتی ہے اور پھر تیسری اور چوتھی اور پانچویں اور چھٹی۔ مجلس میں مستورات بھی شریک ہوتی ہیں مگر ان کی تعداد کم ہے اور ان کی تین صفیں ہوتی ہیں۔ ان کی نشستگاہ دائرہ صفِ اول سے اوپر بائیں جانب کے اقطاب ثلثہ کی جانب اس حصہ میں ہوتی ہے جو غوث اور اقطاب ثلثہ کے درمیان خالی ہوتا ہے۔ بعض کاملین اموات بھی اس میں شریک ہوتے ہیں۔ اور احیاء کے ساتھ ہی صفوں میں بیٹھتے ہیں۔ صرف تین باتوں سے ان کی شناخت ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ ان کی شکل اور وضع میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ برخلاف احیاء کے کہ کبھی ان کا سر منڈا ہوتا ہے، کبھی کپڑے

بدلے ہوتے ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر اموات اولیار کی حالت میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ پس اس مجلس میں جب ایسے شخص کو دیکھو کہ اس کی وضع میں تغیر نہیں ہوتا تو سمجھ لو کہ وہ اموات میں سے ہیں۔ مثلاً ہمیشہ ان کا سر منڈا ہوا دیکھو کہ بال بڑھتے ہی نہیں تو سمجھ لو کہ اسی حالت پر ان کی وفات ہوئی تھی۔ یا سر پہ بال دیکھو مگر ایک حالت پر کہ نہ بال بڑھتے ہیں نہ گھٹتے ہیں اور نہ منڈتے ہیں تو سمجھ لو کہ یہ اموات میں ہیں اور اسی حالت پر انتقال ہوا تھا۔ دوم یہ کہ عالم احیار کے متعلق ان سے مشورہ نہیں لیا جاتا۔ صرف عالم اموات کے متعلق مشورہ لیا جاتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ زیارتِ قبور کے آداب میں سے ہے کہ زائر جب کسی مردے کے لئے (مغفرت وغیرہ کی) دعا مانگے اور قبولیتِ دعا کے لئے کسی ولی کا توسّل لائے تو متوفّی ولی کا توسّل لائے۔ کیونکہ مراد پوری اور دعا قبول ہونے میں اس کو زیادہ دخل ہے۔ سوم یہ کہ اموات کا سایہ نہیں ہوتا۔ یعنی تمہارے اور سورج کے درمیان اگر میّت کھڑی ہو گی تو تم اس کا سایہ نہ دیکھو گے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنی روح سے حاضرِ مجلس ہوتی ہے نہ کہ ترابی ذاتِ فانیہ سے۔ اور ذات روح میں نہ ثقل ہے نہ کثافت (بلکہ نور کی طرح ہلکی و شفاف ہے لہٰذا اس کے سایہ نہیں) آپ نے فرمایا اکثر میں اس مجلسِ دیوان یا اولیار کی کسی دوسری مجلس میں جاتا ہوں اور دھوپ نکلی ہوتی ہے اور وہ مجھے دُور ہی سے دیکھ کر استقبال کرتے ہیں تو میں اپنی ان ہی آنکھوں سے یہ دیکھ کر ان میں (زندہ اور مردہ ولی کا) فرق کر لیتا ہوں۔ کہ اس کے سایہ ہے اور اس کے سایہ نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا دیوان میں حاضر ہونے والے اموات عالمِ برزخ سے اترتے اور روحی پرواز سے یہاں تک آتے ہیں۔ مگر جب محلِ دیوان کے قریب پہنچتے ہیں تو زمین پر اپنے پاؤں سے چلتے ہوئے مجلس تک آتے ہیں بوجہ احیار کے ادب و احترام اور ان سے خوف و ہیبت کے۔ اور یہی حال رجالِ غیب کا ہے کہ جب ایک دوسرے سے ملنے آئیں گے تو روح سے چل کر آئیں گے۔ مگر جب اس جگہ کے قریب پہنچیں گے تو براہِ ادب و خوف اپنی ذاتِ ثقیلہ (یعنی جسمِ ترابی) سے چلیں گے نیز آپ نے فرمایا کہ اس مجلس میں ملائکہ بھی آتے ہیں۔ مگر وہ تمام صفوں سے پیچھے ہوتے ہیں۔ اور کاملین جنّات بھی شریک ہوتے ہیں۔ جن کا نام روحانیون ہے اور وہ سب کے پیچھے بیٹھتے ہیں۔ مگر ان کی پوری ایک صف بھی نہیں ہوتی۔ ملائکہ اور جنّات کے شریک ہونے کا فائدہ یہ ہے کہ اولیار دیوان (اہلِ خدمت کو وہ کام بھی انجام دینا پڑتے ہیں جن تک ان کی ذات نہیں پہنچ سکتی اور وہ کام بھی انجام دینا پڑتے ہیں جن تک ان کی ذات پہنچ سکتی ہے۔ لہٰذا جن امور تک ان کی ذوات نہیں پہنچ سکتیں (اور وہ ان کی بشری طاقت سے بالا ہیں) تو ان میں فرشتوں اور جنات سے مدد لیتے ہیں۔ فرمایا کہ کبھی کبھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اس مجلس میں شرکت فرماتے ہیں۔ تو غوث کی جگہ تشریف رکھتے ہیں۔ غوث وکیل کی جگہ بیٹھتا ہے اور وکیل پیچھے صف میں آجاتا ہے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ کے ساتھ وہ انوار

آتے ہیں جن کے برداشت کی کسی میں طاقت نہیں۔ اور وہ انوار جلا دینے والے، گھبرا دینے والے ہوتے ہیں۔ فوراً قتل کر دینے والے۔ وہ انوار ہیبت وجلالت وعظمت کے ہیں۔ حتیٰ کہ فرض کرو چالیس آدمی ایسے ہوں جو شجاعت کے انتہائی درجے پر پہنچے ہوئے ہوں اور دفعتہً یہ انوار ان کے سامنے آجائیں تو یقیناً وہ سب یکدم بے ہوش ہو کر گر پڑیں۔ مگر حق تعالیٰ اپنے اولیاء (اہلِ مجلس) کو ان انوار سے مستفیض ہونے کی قوت عطا فرما دیتا ہے۔ لیکن باوجود اس کے بہت ہی کم اہلِ مجلس ہوتے ہیں جو ان معاملات کو محفوظ رکھ سکتے ہیں، جو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی کے وقت طے ہوتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی گفتگو غوث سے ہوتی ہے۔ اسی وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی غیبوبت کے وقت غوث کے لئے مافوق العادۃ انوار ہوتے ہیں کہ اہلِ مجلس غوث کے قریب بھی نہیں جا سکتے بلکہ دور بیٹھتے ہیں۔ پس جو امر اللہ جل جلالہٗ کی طرف سے نازل ہوتا ہے اس کی طاقت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے سوا کسی میں نہیں۔ مگر جب وہ امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے چلتا ہے تو اس کی برداشت بجز غوث کے دوسری کوئی ذات نہیں کر سکتی۔ پھر غوث کی طرف سے وہ امر ساتوں اقطاب پر پھیلتا ہے۔ اور ساتوں اقطاب سے تمامی اہلِ مجلس پر۔ اس مجلس کا وقت وہی ساعت ہے جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادتِ شریفہ ہوئی تھی یعنی رات کا آخری تہائی حصہ جو قبولیتِ دعا کا وقت ہے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے ہر شب میں ہمارا رب آسمانِ دنیا کی طرف نزول فرماتا ہے جب کہ رات کا آخری تہائی حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ پس فرماتا ہے، ہے کوئی جو مجھ سے مانگے۔ پس میں قبول کروں لخ جامع کتاب لکھتے ہیں کہ جو شخص اس ساعتِ نیک کو حاصل کرنا چاہتا ہے وہ سوتے وقت سورۂ کہف کی آخری آیت اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے تا آخر پڑھ کر دعا مانگے کہ بارِ الٰہا مجھے وقتِ مذکورہ میں بیدار فرما دیجو تو وہ ضرور اس وقت جاگ اٹھے گا۔ شیخ عبدالرحمٰن ثعالبی نے اس کو بیان کیا ہے اور ہم نے بھی بے شمار دفعہ اس کو آزمایا۔ اور دوسروں نے بھی بارہا دفعہ اس کا تجربہ کیا ہے۔ حتیٰ کہ اکثر ایسا ہوا کہ متعدد آدمیوں نے یہ آیت پڑھ کر اس وقت پر جاگنے کی دعا مانگی اور ایک کو دوسرے کی نیت کا علم بھی نہ تھا۔ مگر جب آنکھ کھلی تو سب کی ایک ہی وقت کھلی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ مجلسِ دیوان پہلے حضراتِ ملائکہ سے آباد تھی۔ مگر جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو یہ مجلس اس امت کے اولیاء سے آباد ہونے لگی۔ اس سے ظاہر ہوا کہ وہ ملائکہ امتِ محمدیہ کے اولیاء کے نائبین تھے۔ چنانچہ ہم نے دیکھا کہ جب کوئی ولی دنیا میں آیا اور حق تعالیٰ نے اسے فتح نصیب فرما کر اہلِ دیوان بنایا تو وہ صفِ اول میں یا جہاں بھی اس کی جگہ تھی آکر بیٹھتا اور وہ فرشتہ جو اس جگہ بیٹھا کرتا تھا، آسمان پر چڑھ جاتا تھا۔ پھر جب دوسرا ولی ظاہر ہوا تو وہ اپنی جگہ پر آکر بیٹھا اور اس

جگہ کا فرشتہ آسمان پر چڑھ گیا۔ غرض دیوان کی یہ ابتدا تھی۔ حتیٰ کہ بحمد اللہ مکمل ہوگیا۔ کہ ولی ظاہر ہوتا رہا اور فرشتہ اٹھتا اور آسمان پر چڑھتا رہا۔ اب وہ ملائکہ جو باقی ہیں اور چھٹی صفوں کے پیچھے بیٹھتے ہیں وہ اہلِ دیوان نہیں بلکہ ذاتِ محمدیؐ کے وہ فرشتے ہیں جو دنیا میں ذاتِ شریفہ کے محافظ تھے اور چونکہ ذاتِ محمدیؐ کا نور اہلِ دیوان میں پھیلا ہوا ہے اس لئے نورِ شریف کے ساتھ ذاتِ شریفہ کے فرشتے موجود رہتے ہیں۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان میں تشریف لاتے ہیں اور آپ کے ساتھ ناقابلِ برداشت انوار آتے ہیں تو یہ فرشتے جو اہلِ دیوان کے ساتھ تھے بڑی سرعت سے نورِ محمدیؐ میں سما جاتے ہیں۔ جب تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان میں تشریف رکھتے ہیں ان میں کا کوئی فرشتہ نظر نہیں آتا۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دیوان سے تشریف لے جاتے ہیں تو وہ فرشتے اپنی اپنی جگہ پھر آکھڑے ہوتے ہیں۔

ہر شہر و بستی میں ستر یا کم زیادہ فرشتوں کی تعداد اہلِ تصرف اولیاء کی ان کاموں میں مدد کرنے کے لئے موجود رہتی ہے جو ذات ولی کی طاقت سے باہر ہوتے اور یہ بستیوں کے ملائکہ انسانی شکل میں ہوتے ہیں۔ کہ کسی کو خواجہ کی صورت میں دیکھو گے، کسی کو فقیر کی صورت میں۔ اور کسی کو نوعمر بچے کی صورت میں۔ غرض ملے جلے رہتے ہیں مگر لوگوں کو اس کا پتہ نہیں چلتا۔ پھر شیخ نے اس بارے میں چند حکایتیں سنائیں جن کے اسرار کی کیفیت نہ بیان ہوسکتی ہے نہ برداشت ہوسکتی ہے۔ اور اس کے بیان فرمانے کا سبب یہ ہوا کہ میں ایک مرتبہ بعض حاضرین سے کہنے لگا کہ اہل اللہ کہتے ہیں کہ جو شخص بخاری شریف کا کوئی پارہ لے کر کسی ولی کے مزار پر جاتے اور اس کو کھول کر اس کے راویانِ حدیث اور اس ولی کے وسیلے سے دعا مانگے تو اس کی مراد پوری ہوتی ہے۔ خصوصًا بخاری شریف کا پارہ آخیر۔ اس کے بعد میں حضرت ممدوح سے پوچھنے لگا کہ یہ صحیح ہے یا غلط؟ آپ نے فرمایا کہ ہر شہر میں ملائکہ کی ایک خاص تعداد ہوا کرتی ہے اور جب وہ کسی بندے کو اللہ سے کوئی چیز مانگتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اگر نوشتۂ تقدیر کی موافقت پاتے ہیں تو سائل کو سوال پر قائم رکھتے اور اس کے ساتھ لگ لیتے ہیں۔ (کہ ان کی برکت سے) توفیق اس کے شاملِ حال اور شیطان راستے سے علیحدہ ہوجاتا ہے۔ اور اگر دیکھتے ہیں کہ مراد کا ملنا مقرر نہیں ہے تو سائل کو چھوڑ دیتے ہیں، اور شیطان اس کو آچپٹتا ہے۔ چنانچہ جب وہ بخاری شریف کا کوئی پارہ لئے ہوئے کسی ولی کے مزار کی طرف جاتا ہوا دیکھتے ہیں اور اس کی مراد کو پورا ہوتا ہوا لوح محفوظ) میں پاتے ہیں تو اس کو عزم پر قائم رکھتے ہوئے اس کے قلب میں گڑگڑاہٹ اور عرضِ مطلب میں بے چارگی و شکستگی ڈالتے اور بسوئے مزار اس کے ساتھ اس طرح جاتے ہیں کہ وہ شخص جزوِ بخاری کا جسم لئے ہوئے ہوتا ہے اور یہ حضرات اس کے اسرار اٹھائے ہوتے ہیں۔ اور جب وہ (مزار پر پہنچکر) دعا مانگتا ہے تو یہ آمین کہتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ

اس کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ اور اگر دیکھتے ہیں کہ حاجت (بمقتضائے تقدیر) پوری ہونے والی نہیں ہے تو کتاب کے اسرار نکال لیتے ہیں۔ لہٰذا سائل صرف جسم کتاب لئے ہوئے مزار پر جاتا ہے اور راستے میں شیطان وسوسہ و تشویش لئے ہوئے اس سے آملتا ہے۔ چنانچہ دعا میں حلاوت باقی نہیں رہتی (اور اس لئے دعا اس کی رد ہو جاتی ہے۔) میں نے کہا کہ وہ اسرار کیا ہیں جو جرم کتاب سے زائد ہو جاتے ہیں؟ فرمایا اور وہ اسرار کیا ہیں جن کی وجہ سے شہد کو رال سے امتیاز ہے؟ میں نے کہا وہ تو مٹھاس ہے۔ فرمایا ایک امر زائد ہی تو ہے جرم شہد پر۔ میں نے عرض کیا جی ہاں۔ فرمایا اسی طرح ہر کتاب میں اس کے جرم سے زائد ایک شے ہوتی ہے جس کو سر (یعنی برکت و نور معنوی) کہتے ہیں اور جس طرح شہد سے اگر اس کا مٹھاس نکال لیا جائے تو اس کا نفع بالکل جاتا رہتا ہے۔ اسی طرح کتاب کا حال ہے۔ کہ جب اس کا سر نکال لیا جائے۔ نیز فرمایا بہت سے کاغذ اور اوراق تم دیکھو گے کہ ان میں اسمائے الٰہی لکھے ہوئے ہیں اور وہ زمین پر پڑے ہوئے ہیں کہ لوگ ان کو پاؤں سے روندتے ہیں۔ اگر ملائکہ نے ان اسمائے الٰہیہ کے اسرار نکال کر نہ اٹھا لئے ہوتے تو (اس بے ادبی پر) تمامی انسان ہلاک ہو جاتے۔ یہ اللہ کا فضل و احسان ہے جس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا۔ میں نے پوچھا کہ مجلس دیوان میں کیا سیدنا ابراہیم و موسیٰ علیہما السلام وغیرہ انبیاء بھی تشریف لاتے ہیں؟ فرمایا ہاں، سال بھر میں صرف ایک شب میں۔ میں نے دریافت کیا کہ وہ کون سی شب؟ فرمایا کہ شب قدر، کہ اس شب میں انبیاءؑ و مرسلینؑ اور ملاء اعلیٰ مقربین ملائکہ بھی آتے ہیں اور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مع ازواج مطہراتؓ اور اکابر صحابہؓ کے بھی تشریف لاتے ہیں۔ میں نے حضرت خدیجہؓ اور حضرت عائشہ رضؓ کے بارے میں ایک کی دوسرے پر فضیلت کے متعلق جو محدثین میں اختلاف ہے آپ سے دریافت کیا تو فرمایا ہم نے جو دونوں کو آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ دیوان میں دیکھا ہے۔ تو حضرت عائشہ رضؓ کا نور حضرت خدیجہ رضؓ سے بڑھا ہوا دیکھا ہے۔ اس کے بعد شب قدر کا سبب ذکر فرمایا۔ کہ جرم آفتاب میں نور کے پیدا ہونے سے قبل سارا عالم تاریک تھا اور زمین و آسمان اور غاروں، پہاڑوں، جنگلوں اور وادیوں میں سب جگہ فرشتے آباد تھے۔ جب حق تعالیٰ نے آفتاب میں نور پیدا فرمایا اور سارا عالم اس سے چمک اٹھا تو آسمان اور زمین کے فرشتوں میں شور برپا ہو گیا اور سب ڈر گئے کہ عالم برباد یا ہم پر کوئی حادثۂ عظیم نازل ہونے والا ہے۔ چنانچہ آسمان کے فرشتے بھی زمین پر اتر آئے اور وہ اور ملائکۂ زمین دونوں نے روشنی سے سائے کی طرف بھاگنا شروع کر دیا۔ یعنی دن کی روشنی سے جس سے ناآشنا تھے، ظل کی تاریکی کی طرف، جس سے واقف تھے، ڈرتے، کانپتے۔ اور مل کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے اور زاری کرتے ہوئے بھاگے۔ اور اللہ سے اس کی خوشنودی طلب کرتے اور دعائیں مانگتے تھے کہ ان پر غضب نازل نہ فرمائے۔ کیونکہ ان کے خیال میں تو یہی تھا کہ حق تعالیٰ اس عالم کو تہ فرمانا چاہتا ہے۔ لہٰذا ہر لمحہ اس کے وقوع

کا خطرہ جمائے ہوئے مجتمعاً سب کے سب اس گریہ وزاری میں لگ گئے۔ اور جوں جوں دھوپ کی چمک ان کی طرف بڑھتی گئی، ووں ووں سائے کی طرف بھاگتے رہے۔ حتیٰ کہ ساری زمین کا چکر لگا لیا اور اب اسی جگہ پھر آگئے جہاں سے چلے تھے۔ جب کوئی حادثہ نہ دیکھا تو ان کو اطمینان ہوا اور آسمان و زمین میں اپنے اپنے پہلے مقامات پر واپس ہوئے۔ اس کے بعد وہ ہر سال ایک رات میں باہم جمع ہونے لگے اور یہ صورت بندھی شبِ قدر کی۔ میں نے کہا کہ اس کا مقتضا تو یہ ہے کہ شبِ قدر پیدائش آدم سے پہلے سے ہے۔ حالانکہ حدیث کا مقتضا یہ ہے کہ وہ مخصوص ہے امتِ محمدیہ کے لئے۔ آپ نے فرمایا اس امتِ شریفہ کے لئے تو بہ برکت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کا اجرا اور اس کی شناخت کی توفیق مخصوص ہے کہ دیگر امتوں کو اس سے واقفیت نصیب نہیں ہوئی۔ جیسے جمعہ کی ساعت قبولیت کی، کہ تھی وہ بھی آفرینشِ آدم کے دن سے، مگر اس کی معرفت بجز اس امتِ مرحومہ کے دوسری امتوں کو نصیب نہیں ہوئی۔ چنانچہ یہود پر پیش ہوئی تو انھوں نے یومِ شنبہ کا انتخاب کیا۔ اور نصاریٰ پر پیش ہوئی تو انھوں نے یکشنبہ کو اختیار کیا۔ اور ہمیں حق تعالیٰ نے اپنے لطف وفضل سے اس کی صحیح معرفت اور یومِ جمعہ کی توفیق بخشی۔ اب میں نے ساعتِ جمعہ کا سبب دریافت کیا تو فرمایا اس کا سبب یہ ہوا کہ جب حق تعالیٰ تمامی اشیاء کی تخلیق سے فارغ ہوا اور وہ جمعہ کی آخری ساعت تھی تو ساری مخلوق دعا اور تضرع الی اللہ کے لئے جمع ہوئی کہ ان کی ذوات پر نعمت کی تکمیل فرمائے، اور وہ عطا فرمائے جو اللہ کی رضا اور خوشنودی کے ساتھ ان کی بقاء و بہبود کا سبب ہو اور جس شخص کو حق تعالیٰ توفیق بخشے اور جمعہ کی ساعتِ مقبولہ پر مطلع فرمائے۔ اسے مناسب ہے کہ یہی دعا مانگے اور دنیا اور آخرت دونوں کی خیر و خوبی کی درخواست کرے۔ کیونکہ مخلوقات کے باطن سے اس دن یہی دعا نکلی تھی۔ ان کی دعا محض آخرت کے لئے نہ تھی۔ پس جس کی دعا اس ساعتِ مقبولہ سے موافقت پا جائے گی اس کی مراد بر آئے گی۔ نیز فرمایا کہ یہ ساعت بہت ہی تھوڑی ہے۔ یعنی باطمینان رکوع کرنے کی مقدار کہ ہر عضو اپنی جگہ واپس آکر ٹھہر جائے اور عروق و اعضاء کو سابقہ حرکت سے سکون مل جائے۔ نیز یہ ساعت منتقل ہوتی رہتی ہے۔ مگر یومِ جمعہ ہی کے اندر رہتی ہے۔ پس کبھی زوال سے قبل ہوتی ہے اور اس کی ساعتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اور کبھی عین زوال کے وقت ہوتی ہے اور کبھی بعدِ زوال اور غروبِ شمس تک کی ساعتوں میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ چھ مہینہ قبل زوال رہتی ہے اور چھ مہینے بعدِ زوال۔ نیز فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس ساعت کا وقت وہ تھا جس وقت آپ خطبہ پڑھا کرتے تھے۔ یعنی عند الزوال اور حضرت عثمان رضؓ کے زمانے میں منتقل ہو کر بعدِ زوال آگئی۔ اور خطبہ کا وقت وہ ہو گیا جو (بہ زمانہ نبوی ؐ) نماز کے لئے لوگوں کے جمع ہونے کا تھا بعد فراغ۔ حالانکہ خطبہ اور اجتماع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

نے اسی ساعتِ مقبولہ کو پانے کے لئے مشروع فرمایا تھا۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی علیہ وسلم کا اُٹھنا اور اللہ سبحانہٗ کے سامنے خشوع وخضوع کے ساتھ کھڑے ہو کر خطبہ پڑھنا وہ درجہ رکھتا تھا جس کی برابری کوئی شے نہیں کر سکتی اس لئے اس وقت کو جس میں آپؐ خطیب بن کر کھڑے ہوتے تھے اتنا شرفِ عظیم اور نورِ کثیر حاصل ہوا جو بمنزلۂ ساعت جمعہ کے بن گیا۔ بلکہ (قبولیتِ دُعا کے لئے) اس سے بھی افضل۔ تو جس کو (بعد زوال منتقل ہو جانے کی وجہ سے) ساعتِ جمعہ نہ ملی اگر خطبۂ نبویہؐ کی ساعت مل گئی تو اس کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ اور اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم نہیں فرمایا کہ جوں جوں ساعتِ جمعہ منتقل ہو خطبہ بھی منتقل ہوتا رہے۔ چونکہ آپؐ کی ساعتِ خطبہ (معین ہے) منتقل نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کا اعتبار زیادہ مناسب ہے بہ نسبت ساعتِ جمعہ کے جو منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بہ ایں وجہ خطبہ کے منتقل نہ ہونے میں امت پر رفق اور سہولت ہے نیز ساعتِ جمعہ کا قصہ تو غیب اور راز ہے جس پر بجز خواص کے کوئی مطلع نہیں ہو سکتا۔ اور ساعتِ خطبۂ نبویہؐ امرِ ظاہر اور زوال کے ساتھ منضبط و محدود ہے۔ جو کسی سے بھی پوشیدہ نہیں، لہٰذا اس کا اعتبار اولیٰ ہوا۔ اور اس بنا پر جو لوگ زوال کے وقت نمازِ جمعہ ادا نہیں کرتے اور ان کی عادت ہو گئی ہے کہ تاخیر سے پڑھتے ہیں تو ساعتِ نبویہؐ میں جو یقینی تھی کوتاہی کر گئے۔ اور ساعتِ جمعہ کے ہاتھ آنے میں شک ہے، لہٰذا انھوں نے شک کی بدولت یقین کو ہاتھ سے کھو دیا اور یہ بڑی کوتاہی ہے۔ میں نے عرض کیا کہ ہم لوگ (مدینہ سے) مغرب میں (رہتے ہیں اس لئے ہمارے بلاد کا طلوع و غروب بہت مؤخر ہے پس اگر ساعتِ نبویہؐ کی موافقت کرنا چاہیں۔ اور زوال کے وقت نماز جمعہ ادا کریں تب بھی اس کو نہیں پا سکتے۔ کیونکہ ہمارا وقتِ زوال مدینہ کے وقتِ زوال سے بہت مؤخر ہے اور اگر اپنے وقتِ زوال سے قبل اس کو تلاش کریں اور صحیح پتہ چلا کر اتنے گھنٹے اتنے منٹ مؤخر ہے، ساعتِ نبویہؐ کی تحقیق کر لیں) تو لازم آتا ہے کہ زوال سے قبل نمازِ جمعہ پڑھیں۔ اور یہ جائز نہیں۔ پھر تدبیر کیا کریں؟ فرمایا کہ سرِ ساعتِ نبویہؐ مطلقاً ہر جگہ کے زوال میں سرایت کئے ہوتے ہے۔ لہٰذا کسی خاص زوال کا اعتبار نہیں۔ جیسا کہ غروب اور طلوع میں کسی خاص جگہ کا اعتبار نہیں۔ بلکہ ہر جگہ کا طلوع و غروب جدا معتبر ہے (خواہ آگے ہو یا پیچھے) پس ہم صلوٰۃِ فجر ادا کریں گے، اپنی طلوعِ صبحِ صادق پر نہ کہ مدینہ کی طلوعِ صبح پر۔ اور روزہ افطار کریں گے اپنے غروب پر نہ کہ مدینہ کے غروب پر۔ تمامی احکامِ شرعیہ جو وقت کی طرف منسوب ہیں ان کی یہی صورت ہے اور منجملہ ان کے زوال بھی ہے (لہٰذا ہمارے ملک میں جس وقت زوال ہوگا اس کا وہی حکم ہوگا جو مدینہ میں وہاں کے وقتِ زوال پر حکم مرتب ہوگا۔) پھر میں نے درخواست کی کہ ساعۃ جمعہ کے منتقل ہونے کی کیفیت بیان فرمائیں۔ اور یہ کہ وہ جمعہ کی آخری ساعت سے کس طرح واپس ہوئی؟

منتقل ہوتی ہوئی زوال پر پہنچی۔ اور پھر آگے بڑھی تو قبل از زوال منتقل ہوتی ہوئی شروع دن پر پہنچی۔ اور پھر پہلی حالت پر جانے کے لئے اس کا انتقال شروع ہو جاتا۔ اور دن کے آخری حصے پر جا پہنچتا ہے حالانکہ (ساعتِ نبویہ کا) سرِ سابق چاہتا ہے کہ نہ ساعتِ جمعہ منتقل ہوا کرے۔ نہ شبِ قدر منتقل ہوا کرے جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ساعتِ ولادت یعنی شب کا آخیر تہائی حصہ منتقل نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں ساعتِ جمعہ جب بہت ہی قلیل ہے تو چھ مہینے میں زوال سے لے کر غروب تک (چھ گھنٹے) کا وقت کیسے پورا کرے گی۔ یہ تو اسی وقت ممکن ہے جب وہ بڑی (اور کم از کم دو منٹ) ہو۔ فرمایا ان باتوں کے ظاہر کرنے کی ممانعت کر دیگئی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اہلِ دیوان کی گفتگو سریانی زبان میں ہوتی ہے کیونکہ وہ بہت مختصر اور کثیر معانی ادا کرتی ہے۔ نیز اس لئے کہ اس مجلس میں ارواح اور ملائکہ کی شرکت ہوتی ہے اور ان کی زبان سریانی ہے۔ البتہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں اور شریکِ مجلس ہوتے ہیں تو اس وقت آپؐ کے ادب کی وجہ سے بزبانِ عربی گفتگو ہوتی ہے۔ نیز فرمایا کہ یہ کچھ ضروری نہیں کہ جو ولی دیوان میں حاضر ہو وہ لوحِ محفوظ کی تحریر بھی دیکھ سکے۔ بلکہ بعض ایسے ہیں کہ دیکھ سکتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو بہ نگاہِ بصیرت اس کی طرف توجہ کرتے ہیں مگر معلوم نہیں کر سکتے۔ اور بعض ایسے ہیں کہ متوجہ ہی نہیں ہوتے۔ کیونکہ جانتے ہیں ہم اس کو دیکھنے کے قابل نہیں ہیں۔ جیسا کہ پہلی شب کا چاند کہ اس کو دیکھنے والوں کی حالتیں مختلف ہوتی ہیں۔ (بعض تیز نظر ہوتے ہیں کہ کتنا ہی باریک چاند ہو فوراً دیکھ لیتے ہیں اور بعض متوسط النظر ہوتے ہیں کہ دیکھنے کی کوشش میں چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہیں مگر وہ ان کو نظر نہیں آتا۔ اور بعض ضعیف البصر ہوتے ہیں۔ جانتے ہیں کہ ہمیں نظر نہ آئے گا اس لئے وہ دیکھنے کا قصد ہی نہیں کرتے۔

نیز فرمایا کہ جب دیوان میں اولیاء اللہ جمع ہوتے ہیں تو ایک دوسرے کو (روحانی فیضان اور باطنی) مدد پہنچاتا ہے۔ چنانچہ انوار ان میں تیروں کی طرح (ایک سے) نکلتے اور (دوسرے) میں داخل ہوتے نظر آتے ہیں۔ لہٰذا جب مجلس سے نکلتے ہیں تو بہت ترقی پر نکلتے ہیں۔ نیز فرمایا کہ چھوٹا ولی (دیوان میں) اپنی ذات سے حاضر ہوا کرتا ہے۔ مگر بڑے ولی پر کوئی پابندی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چھوٹے درجے کا ولی جب دیوان میں آتا ہے تو اپنی جگہ اور اپنے گھر سے غائب ہو جاتا ہے اور وہ اپنے شہر میں موجود نہ ملے گا۔ کیونکہ وہ اپنی ذاتِ ترابی کے ساتھ دیوان میں جایا کرتا ہے (اور ذاتِ ترابی ایک وقت میں دو جگہ موجود نہیں ہوا کرتی۔) بخلاف بڑے ولی کے کہ وہ تفکر اور ہمت سے کام لیتا ہے اور اپنے گھر سے غائب نہیں ہوتا۔ کیونکہ بڑے درجہ کا ولی جس شکل و صورت کو چاہتا ہے اختیار کر سکتا ہے اور کمال

رُوح کی وجہ سے اگر چاہے تو تین سو چھیاسٹھ ذوات میں متکون بن سکتا ہے۔ بلکہ ایک مرتبہ تو آپ نے باب الحبشہ سے باہر مجھ سے فرمایا کہ دیوان اور اس کے قائم کرنے والے ہیں کیا؟ وہ سب میرے سینے کے اندر ہیں۔ ایک مرتبہ فرمایا وہ مجلس میرے سینے کے اندر منعقد کی جاتی ہے۔ ایک مرتبہ آپ باوجود اُمّی ہونے کے اکابر صالحین کا تذکرہ فرمانے لگے۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت آپ کو ان سے واقفیت کس طرح ہوئی؟ فرمایا فتح کبیر والے اولیاء کی ارواح کا مسکن عالم برزخ کا قبہ ہے۔ جسے ہم اس قبہ میں دیکھتے ہیں سمجھ لیتے ہیں کہ یہ اکابر میں سے ہے۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم دسوقی کا تذکرہ ہونے لگا تو آپ نے فرمایا وہ اکابر میں سے ہیں۔ پھر میں ان کے مناقب اور کرامات کا ذکر کرنے لگا۔ جو ان سے صادر ہوئی تھیں۔ تو فرمایا اگر حضرت ابراہیم دسوقی اپنے زمانہ سے اس زمانے تک بھی زندہ رہتے تو (اس مدتِ دراز میں بھی) وہ مقامات اور ترقی نہ پاسکتے جو تمھارے بھائی عبدالعزیز نے کل سے آج تک (صرف ایک دن میں حاصل کر لی ہے۔) اور واللہ عبدالعزیز بروئے فخر نہیں کہتا بلکہ اظہارِ نعمتِ رب کی بنا پر کہہ رہا ہے۔ ایک دن میں اور آپ باب الحبشہ سے شہر کے اندر آرہے تھے تو آپ نے میری طرف دیکھ کر فرمایا۔ اس وقت مجھے تین خلعت پہنائے گئے۔ اگر ان میں سے ایک بھی شہرِ فاس پر ڈال دیا جائے تو اس کا بوجھ (برداشت نہ کر سکے اور) سارے باشندے اور شہر کی فصیل اور تمامی مکانات جو کچھ بھی شہر کے اندر ہے سب کچھ پگھل کر عدم محض بن جائے ایک روز میں باب الفتوح سے شہر میں آرہا تھا، آپ میرے ہمراہ تھے۔ تو اسماء الٰہی اور ان کی تعداد کے متعلق میں نے آپ سے سوال کیا۔ کہ بعض علماء کا قول ہے وہ چار ہزار ہیں۔ فرمایا میں آنکھ بند کرنے اور کھولنے کے درمیان (یعنی پلک جھپکنے کی مقدار ایک لحظہ میں) ایک لاکھ سے زیادہ اسماء الٰہیہ کا مشاہدہ کرتا ہوں۔ اور اسی طرح ہر لحظہ دائماً ترقی ہے۔ ف حق تعالیٰ کے اسماء صفات مراد ہیں جن کی شمار محدود نہیں ہے مشہور و منقول ننانوے نام بھی اگرچہ اسمائے صفات ہیں مگر وہ ہیں جن کے انوار کا تحمّل امت عامہ کر سکتی اور اسی لئے بعض روایات میں ننانوے کے علاوہ دیگر اسمائے الٰہیہ منقول ہیں۔ جس سے معلوم ہوا کہ ننانوے میں حصر نہیں ہے۔ غیر متناہی ذات کی غیر متناہی صفات ہیں اور غیر متناہی اسماء۔ جس ولی کو جتنی ترقی ہوئی اسی قدر زائد اسماء کا اس کو مشاہدہ بڑھتا رہا۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ غوث غیر حاضر ہوتے ہیں۔ اور دیوان میں تشریف نہیں لاتے۔ ایسی صورت میں اہلِ دیوان اولیاء میں اختلاف پیش آجاتا ہے اور وہ تصرفِ باطنی واقع ہوتا ہے کہ جو باہمی قتل و قتال کا موجب بن جاتا ہے۔ پس اگر اکثر مجلس کی رائے متفق ہوئی اور اقل نے خلاف کیا تو یہ تصرف سابق ان میں واقع ہوتا اور وہ سب مر جاتے ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ ایک معاملہ میں اختلافِ رائے ہوا۔

توچند اولیار کی جماعت نے کہا اگر یہ معاملہ اس طرح نہ ہوا (جیسی ہماری رائے ہے) تو ہمیں مرجانا چاہیئے۔ اس پر دوسری کثیر جماعت نے کہا ایسا ہی جی چاہتا ہے تو مر جاؤ۔ پس قلیل جماعت فوراً مر گئی۔ اور اگر دونوں فریق برابر سرابر ہوتے ہیں تو تصرف سابق دونوں میں جاری ہوتا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ (علمار میں تو اختلاف اس لئے ہوتا ہے کہ ان کو مرادِ خداوندی معلوم نہیں ہوتی اور ان کی طلب و تلاش میں ان کو اپنی عقل اور علمِ ظاہر سے کام لینا پڑتا ہے مگر) وہ حضرات تو اہلِ کشف اور صاحبانِ بصیرت ہیں۔ اور اپنی بصیرت سے مرادِ خداوندی کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ پھر ان میں باہم نزاع کیوں ہوتا ہے؟ فرمایا جس صورت میں اہلِ مجلس کا اقل حصہ مخالف ہوتا ہے اس صورت میں تو حق تعالیٰ اپنی مراد سے اقل کو محجوب بنا دیتا ہے تاکہ ان کے متعلق (موت کی) قضا و قدر نافذ ہو (کہ اسی طرح ان کا مرنا علمِ الٰہی میں مقدر تھا) اور اگر دونوں فریق برابر سرابر ہوتے ہیں تو مرادِ خداوندی سب پر پوشیدہ کر دی جاتی ہے۔ کیونکہ اولیار اصفیا کے قلوب تقادیر کے منظہر ہوتے ہیں۔ (کہ ہر امر جس طرح مقدر ہوتا ہے اسی کے موافق ان کے دل میں خیال اور ارادے پڑتے ہیں) اور ان میں برابر کے درجہ کا اختلاف واقع ہو گیا۔ (لہٰذا مرادِ حق جو مقدر تھی کسی پر ظاہر نہ ہوئی۔) میں نے کہا کہ غوث کی غیر حاضری کا کیا سبب ہوتا ہے؟ فرمایا یا[1] تو متواتر کئی دن تک مشاہدہ حق میں ان کی محویت، کہ سارے عالم ان کی نظر میں فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اس لئے وہ دیوان میں تشریف نہیں لا سکتے۔ اور یا[2] ان کی ابتدائی تولیت کہ سابق غوث کا حال ہی میں انتقال ہوا اور یہ ان کی جگہ مقرر ہوئے تو جب تک آہستہ آہستہ ان کی ذات (اس عہدۂ جلیلہ کے فرائض سے) مانوس نہ ہو جائے شروع میں کبھی غیر حاضر ہو جاتے ہیں۔ نیز آپ نے فرمایا اور کبھی غوث کی غیر حاضری پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لے آتے ہیں۔ اس وقت اہلِ دیوان کو ایسا خوف و اضطراب پیش آتا ہے جو اُن کو بدحواس بنا دیتا ہے۔ کیونکہ حضوری صلی اللہ علیہ وسلم میں انجامِ کار کو معلوم نہیں کر سکتے اور تدبیر و تفکر کے قابل نہیں رہتے۔ حتیٰ کہ اگر زیادہ دنوں تک یہ صورت قائم رہے تو (تصرفات و انتظامات سب معطل اور) تمامی عوالم برباد ہو جائیں۔ اور جب غوث کی غیر حاضری پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لاتے ہیں تو آپ کے ساتھ حضرت ابوبکر رضؓ حضرت عمر رضؓ حضرت عثمان رضؓ حضرت علی رضؓ حضرت حسن رضؓ حضرت حسین رضؓ اور ان کی والدہ حضرت فاطمہ زہرا رضؓ ہوتی ہیں۔ کبھی سب اور کبھی بعض رضی اللہ عنہم اجمعین۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا مجلس کی بائیں جانب ان عورتوں کی جماعت میں بیٹھتی ہیں جو دیوان میں شریک ہوتی ہیں اور آپ ان سب مستورات کی امام ہوتی ہیں۔ نیز فرمایا کہ ایک شب میں نے حضرت فاطمہ رضؓ کو اپنے باپ صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ درود پڑھتے ہوئے سُنا۔ اللّٰھم صل علی من روحہ محراب الارواح والملئکۃ والکون اللّٰھم صل علی من ھو امام الانبیاء

والمرسلین اللھم صل علیٰ من ھو امام اھل الجنۃ عباد اللہ المومنین۔ درود کے لفظ تو یہ نہ تھے (غالباً سریانی ہوں گے، مگر معنی جو میں نے اس عبارت سے نکالے وہ یہی تھے۔ میں نے کہا کیا غوث کی موجودگی میں کسی کو قدرت ہے کہ ان کی مخالفت کرے؟ فرمایا کہ کسی کی طاقت نہیں کہ مخالفت میں ہونٹ بھی ہلا سکے۔ چہ جائیکہ زبان سے خلاف لفظ نکالنا۔ ایسا کرے تو اس کے سلب ایمان کا خطرہ ہے چہ جائیکہ کچھ اور۔ نیز فرمایا کہ اہلِ دیوان جب جمع ہوتے ہیں تو اس وقت سے لے کر کل آئندہ تک جو کچھ بھی ہونا ہے اس پر متفق الرائے بن جاتے ہیں۔ یعنی آئندہ دن رات کے متعلق مقدرات میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کو علوی اور سفلی تمامی عوالم حتیٰ کہ ستر حجب بلکہ عالمِ رتقا میں بھی کہ ستر حجب سے مافوق ہے تصرف کا منصب ہے پس وہ ہر عالم اور اہلِ عالم اور ان کے خواطر اور ما فی الضمیر میں تصرف کرتے ہیں کہ کوئی خطرہ بھی کسی کے دل میں بغیر اذن اہلِ تصرف کے خطور نہیں کرتا اور جب عالمِ رتقا میں تصرف کی یہ شان ہے جو کہ ان ستر حجابوں کے اوپر ہے جو یکے بعد دیگرے) عرش کے مافوق ہیں تو دیگر عوالم کا تو پوچھنا ہی کیا۔ ایک مرتبہ میرے ایک دوست کے لڑکے کو پولیس نے پکڑ لیا کہ کوتوالِ شہر اس کی تلاش میں تھا اور ڈر کے مارے وہ روپوش تھا جب گرفتار ہو گیا تو باپ کو اس کی ہلاکت کا یقین ہو گیا۔ اور وہ میرے پاس آیا۔ میں نے حضرت سے تذکرہ کیا۔ فرمایا اگر تمھارا ایسا خیال ہو کہ بلی چوہے کو کھا جائے گی فلاں کی (یعنی میری) اجازت کے بغیر تو بالکل غلط خیال ہے۔ لڑکے کا کچھ اندیشہ نہ کرو اور اس کے باپ سے کہہ دو کہ خاطر جمع رکھے۔ چنانچہ کوتوال کے سامنے جاتے ہی اس کو چھوڑ دیا گیا اور اس کا ظاہری سبب کوئی سمجھ میں نہ آیا۔

میں نے آپ سے دریافت کیا مجلسِ دیوان غارِ حرا کے علاوہ کہیں اور بھی منعقد ہوتی ہے؟ فرمایا ہاں سال میں صرف ایک مرتبہ شہر سوس اور غربی سوڈان کے درمیان اس جگہ پر ہوتی ہے جس کا نام زاویہ اتنا ہے، اس میں سوڈان کے اولیاء آتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو صرف اسی شب میں شریک ہوتے ہیں۔ اس شب کے دو تین دن پہلے سے باذنِ الٰہی یہاں ایک بڑا بازار لگ جاتا ہے جس میں دُور دُور کے سوداگر آتے ہیں اور دو تین دن بعد تک یہ بازار لگا رہتا ہے۔ یہاں بے شمار سونا جمع ہوتا ہے۔ میں نے دریافت کیا ان دونوں جگہ کے سوا کیا اور بھی کہیں اجتماع ہوتا ہے؟ فرمایا ہاں ہو جاتا ہے۔ مگر دس سے زیادہ کا اجتماع بجز ان دو جگہ کے اور کہیں نہیں ہوتا۔ کیونکہ زمین ان کے (یکجائی انوار کو) برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لئے ارادۂ خداوندی نے ان حضرات کا تفرق تجویز فرمایا ہے کہ دنیا اور اس کی مخلوق میں چار طرف پھیلے رہیں۔ میں نے کہا کیا مجذوب کا بھی دیوان میں کچھ دخل ہے اور کیا وہ بھی سالکینِ اہلِ تصرف کی طرح تصرف کیا کرتے ہیں؟ فرمایا ان کا مجلسِ دیوان میں بالکل دخل نہیں اور نہ ان کے ہاتھ میں کوئی

تصرف ہے۔ جس دن تصرف ان کے ہاتھ میں جائے گا دنیا تباہ ہو جائے گی۔ میں نے کہا ان کے قبضہ میں تصرف کب آئے گا، فرمایا خروجِ دجال کے وقت۔ کہ اس وقت تصرف ان کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور صدرِ مجلس بھی مجذوب ہی ہوگا اور چونکہ اس کو عقل اور فہم نہ ہوگی۔ لہذا تصرف میں اختلال واقع ہو جائے گا اور وہی سبب ہوگا خروجِ دجال کا۔ ایک مرتبہ آپ نے یہ قصہ نقل فرمایا کہ حضرتِ حماد ایک مجذوب تھے بلادِ مغرب کے باشندہ تھے اور مصر کے بازار میں روٹی کا سوال کرتے پھرا کرتے تھے۔ موسم تھا غلہ کی گرانی کا۔ ایک دفعہ کھانے کے لئے کچھ مانگنے کے واسطے ایک دوکان کی طرف چلے۔ ان کو باطنی نگاہ سے معلوم ہوا کہ کثیر مقدار سونا دوکان کے سامنے ایک دیگ میں زمین کے اندر مدفون ہے۔ حمادؒ اس پر پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ صاحبِ دکان بھی عارفین میں سے تھے۔ انھوں نے حضرتِ حمادؒ کو دیکھ کر آزمانا چاہا۔ اس لئے حمادؒ سے فرمایا کہ مانگتے پھرتے ہو حالانکہ پاؤں کے نیچے کی چیز کافی ہے۔ حمادؒ نے کہا کہ پاؤں کے نیچے تو سونا ہے اور مجھے روٹی چاہیئے کھانے کے لئے۔ ایک اکنی درکار ہے۔ تب صاحبِ دُکان کو ان کا حال معلوم ہوا اور دس اکنیاں اُن کے حوالے کیں۔ میں نے دریافت کیا کہ جب ان کو پہلے دیکھا ہی نہ تھا تو پہچانا کیسے کہ یہ حماد ہیں؟ اور پھر آزمانے کا ارادہ کیسے کیا۔ فرمایا دیکھنے سے قبل واقفیت کی صورت ایسی تھی جیسے کوئی خوابیدہ جاگنے کے قریب کسی اجنبی کو خواب میں دیکھے اور پھر آنکھ کھلے تو وہ شخص سامنے کھڑا نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ اب وہ اس کو ذرا غور سے دیکھے گا۔ کہ آیا وہی ہے جو ابھی خواب میں نظر آیا تھا یا کوئی دوسرا ہے تاکہ شک رفع اور یقین حاصل ہو جائے کہ ہاں بیداری میں جس کو دیکھ رہا ہوں وہی ہے جس کو خواب میں دیکھا تھا میں نے کہا اس کی کیا وجہ کہ پہلے ان کو انکاری جواب دے دیا کہ اللہ برکت دے، اور جب معلوم ہوا کہ ولی ہیں، ان کا سوال پورا کر دیا۔ بلکہ سوال سے بھی زائد دیا؟ اگر عطیہ اللہ واسطے تھا تب تو سائل کی طرف دیکھنا ہی نہ چاہیئے تھا کہ ولی ہے یا نہیں۔ کیونکہ دونوں کا رب ایک ہے اور اگر عطیہ غیر اللہ کے لئے تھا تو یہ عارف کی حالت کے مناسب نہیں۔ نیز جب پہلے انکار کر چکے تو دوبارہ بھی انکار ہی ہونا چاہیئے تھا۔ بشرطیکہ انکار کرنا اللہ واسطے تھا۔ فرمایا کہ مومن کا تو صرف ایک حق ہوتا ہے یعنی حقِ ایمان اور ولی کا حق دوسرا ہوتا ہے۔ ایک حقِ ایمان اور دوسرا حقِ معرفت باللہ تعالیٰ۔ پس اوّل جو انکار کیا تو یہ سمجھ کر کہ سائل منجملہ مومنین کے ہے۔ اور حقِ ایمان نے اس وقت ان کے مال میں کسی حصہ کا استحقاق قائم نہ کیا تھا۔ مگر جب امتحان کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ وہ عارفین میں سے ہیں تو ان کا حق نسبتاً مؤکد اور استحقاق پہلے سے زائد ہو گیا۔ اور بوجہ معرفتِ الٰہیہ کے جس میں دونوں برابر تھے عارف کے مال میں دوسرے کا حصہ واجب ہو گیا۔ کیونکہ معرفتِ الٰہیہ گویا دو دینی بھائیوں کی طرح دو عارفوں کے مابین عقدِ اخوت ہے۔

لہٰذا پہلے نہ دینا اور کہہ دینا اللہ زیادہ دے۔ یہ بھی اللہ ہی واسطے تھا اور پھر دینا اور سوال سے زائد دینا یہ بھی اللہ ہی واسطہ تھا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے دروازے پر کوئی سائل سوال کرے اور صاحبِ مکان جواب دے دے۔ کہ اللہ زیادہ دے پھر دروازہ کھولے تو دیکھے کہ سائل تو اس کا سگا بھائی ہے۔ اب اس پر واجب ہے کہ اس کو اجنبی کے درجہ میں نہ اتارے اور اس کے بھائی ہونے کا علم ہو جانے کے بعد ایسا انکار نہ کرے جیسا پہلے کر چکا ہے۔ کہ یہ اخوت کے منافی اور صلۂ رحمی کے مقتضا کے خلاف ہے۔ میں نے کہا وہ حصّہ کیا ہے، جو معرفت کے سبب مال میں واجب ہو جاتا ہے؟ فرمایا وہی ہے جو دینی بھائی بنانے میں واجب ہوا کرتا ہے۔ کہ اگر ایک دینی بھائی ہو تو نصفا نصف، اور اگر دس بھائی ہوں تو مال کا دسواں حصّہ۔ میں نے کہا کہ اس عارف نے پھر حمّادؓ کو اپنا آدھا مال کیوں نہ دیا۔ صرف دس اکنیاں کیوں دیں؟ فرمایا عارف سائل کا انحصار صرف اسی سائل میں نہ تھا۔ ممکن ہے اس کے جانے کے بعد دوسرا عارف سائل بن کر آئے، اور پھر تیسرا، چوتھا، اور پانچواں آوئے۔ پس انسان اپنے دینی برادران کے حصّۂ واجبہ کی تقسیم کو خود ہی خوب سمجھ سکتا ہے۔ میں نے کہا کہ یہ سید حمادؓ کیا تھے؟ فرمایا کہ مجاذیب میں سے تھے۔ اور صاحبِ دکان جن کا نام حضرت ابراہیم تھا سالکین میں سے تھے، اور دونوں اولیاء عارفین میں سے تھے۔ میں نے پوچھا کہ مجذوب اور سالک میں کیا فرق ہے جبکہ معرفتِ الٰہیہ میں دونوں شریک ہیں؟ فرمایا مجذوب وہ ہے کہ جو کچھ اس کو نظر آتا ہے اس کا ظاہر اس سے متاثر ہوتا اور اور جو مشاہدہ کرتا ہے اس سے مسرور ہو کر بدن سے اس کی نقل اتارتا اور اس کے حرکات و سکنات کا اتباع کیا کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ جب بندے پر لطف و کرم فرماتا اور اس کی چشمِ بصیرت کھول دیتا ہے تو وہ ہر وقت ملاء الاعلیٰ کے عجیب و غریب معاملات کا مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ پس اگر وہ مجذوب ہوتا ہے تو چشمِ بصیرت سے جو چیز دیکھتا ہے، اس کا ظاہر اس کا اتباع کرنے لگتا ہے۔ اور چشمِ بصیرت سے جو چیزیں نظر آتی ہیں وہ غیر منحصر اور لامحدود ہیں۔ اس لئے اس کا کوئی حال منضبط نہیں ہوتا۔ (کبھی روتا ہے، کبھی ہنستا ہے، کبھی لرزتا ہے، کبھی چیختا ہے۔) پس اگر مجذوب کو دیکھو کہ سرور میں جھوم رہا ہے تو سمجھ لو کہ حوروں کے مشاہدہ میں محو ہے۔ کیونکہ حوروں کی حرکات کا انداز یہی ہے۔ لہٰذا جو صورت (ان کے عشوہ و ناز کی) مشاہدہ کر رہا ہے اس کا ظاہر جسم اس کی نقل اتارنے میں مشغول ہے۔ اور سالک وہ ہے جس کا ظاہر اپنی دیکھی ہوئی چیز سے متاثر نہ ہو اور جو مشاہدہ کرے اس کی نقل نہ اُتارے کہ وہ ٹھہرا ہوا سمندر اور ساکن بحرِ ذخّار ہے۔ سالک مجذوب سے اکمل اور اس کا اجر مجذوب کے اجر سے سہ گونہ زائد ہوتا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ سالک قدم بہ قدم ہوتا ہے سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہ آپؐ کا ظاہر کسی شے سے بھی متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اور یہی سبب ہے کہ سالکین اہلِ عقل ہوتے ہیں۔ اور مجاذیب اکثر بے عقل ہوا کرتے ہیں۔ کیونکہ ان کا ظاہر جب

دوسروں کی نقل اتارنے میں مشغول ہو گیا تو وہ ظاہر جو فتح سے پہلے اصل خلقت میں ان کو ملا تھا معطل ہو گیا اور اس کے طبعًا ان کی عقول بھی زائل ہو گئیں ایک عارف سالک دیوان میں آیا کرتے تھے اور اکابر میں سے تھے، ان کا ایک لڑکا تھا اور ان کو معلوم تھا کہ (روحانی کمال میں بھی) ان کا وارث یہی ہوگا۔ مگر ان کو پتہ نہ تھا کہ یہ مجذوب اٹھے گا یا سالک۔ لہذا ایک مرتبہ وہ اس کو کندھے پر بٹھا کر مجلس میں لے آئے۔ اہلِ دیوان نے اعتراض کیا کہ یہ تم نے کیا کیا۔ حالانکہ جانتے ہو کہ اس مجلس میں غیر کا لانا جائز نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ میں آپ حضرات سے معافی چاہتا ہوں اور چشم پوشی و درگزر کا متمنی ہوں۔ اس کے بعد بچّہ کو لے کر غوث کے سامنے آئے اور عرض کیا کہ حضرت میں اس مقدس مجمع میں آنجناب کے حضور میں ایک خاص ضرورت لے کر آیا ہوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا واسطہ اور اس مجلسِ مقدسہ کا واسطہ، میرے بچّہ کے متعلق یہ ظاہر فرما دیجئے کہ یہ مجذوب اٹھے گا یا سالک؟ غوث نے فرمایا یہ تو ایسی بات ہے جس کا علم ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ جو نورِ ایمان سالک میں ہوتا ہے وہی نورِ ایمان مجذوب میں ہوتا ہے۔ اور جو معرفتِ الٰہیہ اس میں ہوتی ہے وہی بعینہٖ اس میں ہوتی ہے۔ رہا دونوں میں حسنات اور درجات کا فرق سو وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہے۔ اس کا علم آخرت ہی میں ہوگا۔ پھر وہ طریقہ کون سا ہے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ مجذوب ہے یا سالک۔ یہ ہو سکنے والی بات نہیں ہے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت آپ کو تو حق تعالیٰ نے غوث ہی اس لئے بنایا ہے کہ آپ ضرور معلوم کر سکتے ہیں۔ غرض دیر تک الحاح و اصرار کرتے رہے اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ کا واسطہ دیا۔ تو غوث نے کہا اچھا ایک لکڑی لاؤ۔ چنانچہ لکڑی حاضر کر دی۔ پھر فرمایا کہ چھری بھی ہے؟ چھری بھی حوالہ کر دی۔ آپ نے بچّے کو اپنے سامنے بٹھا لیا۔ اور لکڑی پر چھری کو چلانا شروع کیا۔ کبھی لکڑی کو کھینچتے تھے اور کبھی اس میں چھری گاڑ دیتے تھے۔ پھر کبھی اپنی زبان دانتوں سے کاٹتے تھے اور کبھی اپنے ہونٹ بھینچتے تھے۔ اور اس اثنا میں گوشۂ چشم سے بچّے کو دیکھتے جاتے تھے۔ بچّہ بھی ان کی نقل اتار رہا تھا۔ کہ وہ زبان کاٹتے تھے تو یہ بھی اپنی زبان کاٹتا تھا۔ اور وہ ہونٹ بھینچتے تھے تو یہ بھی اپنے ہونٹ بھینچتا تھا۔ تب آپ نے اس کے باپ سے فرمایا، لے جاؤ اپنے بچّے کو یہ مجذوب ہوگا۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت نے کیسے معلوم فرما لیا؟ فرمایا اس کا ظاہر جو شے دیکھتا ہے اور مشاہدہ کرتا ہے اس سے متاثر ہوتا ہے اور یہی خاصّہ ہے جذب کا، نیز آپ نے فرمایا کہ سالکین چند باتوں میں مجاذیب سے پرہیز رکھتے ہیں۔ اوّل یہ کہ سالک مجذوب کے ساتھ کھاتا نہیں۔ کیونکہ مجذوب کو پروا نہیں ہوتی، خواہ اس کی زبان سے گالی نکلے یا فحش۔ اس لئے سالک پر واجب ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔ دوم اس کے ساتھ سفر نہیں کرتا۔ اور اس کی وجہ بھی (یہی مجذوب کی) بے احتیاطی ہے۔ سوم مجذوب کا پہنا ہوا کپڑا نہیں پہنتا۔ کیونکہ وہ (بے عقل ہونے کے سبب) نجاست وغیرہ سے بچتا نہیں

ہے۔ چہارم سالک کو جائز نہیں کہ مجذوبہ سے نکاح کرے اور اسی طرح سالکہ کو مجذوب سے نکاح کرنا صحیح نہیں۔ رہا تربیت کا قصہ تو کبھی سالک شیخ کا تربیت یافتہ مجذوب ہوتا ہے۔ جیسا کہ اسی بچہ کا قصہ تھا کہ وہ مجذوب تھا۔ اور اس کا باپ سالک تھا۔ اور کبھی مجذوب شیخ کا مرید سالک نکل آتا ہے۔ جیسے حضرت یوسف فاسی کا قصہ ہے کہ وہ سالک تھے اور ان کے شیخ حضرت عبدالرحمٰن مجذوب تھے میں نے عرض کیا کہ یہ کیسے ہو جاتا ہے۔ حالانکہ مجذوب کو تو اپنی ہی خبر نہیں ہوتی۔ پھر دوسرے کی تربیت کیسے کریگا۔ فرمایا جذب کے درجات بلحاظ قوت وضعف مختلف ہوتے ہیں۔ بعض کا جذب قلیل ہوتا ہے (اور ان کو تربیت کا ہوش رہتا ہے) اور بعض کا جذب کثیر ہوتا ہے۔ کہ کسی وقت بھی ہوش نہیں آتا۔ (وہ البتہ کسی کی تربیت نہیں کر سکتا) نیز آپ نے فرمایا اہل تصرف اولیاء ایسے بڑے بڑے کام کرتے ہیں کہ دیکھنے والا حیران ہو جاتا ہے۔ مگر بچشم حقیقت دیکھو تو کرنے والا وہی حق سبحانہٗ ہے۔ اور یہ حضرات بلافرق دوسری مخلوقات کی طرح محض آلہ و واسطہ ہیں۔ میں نے کہا کہ اولیاء اللہ کو تو افعالِ الٰہیہ کا مشاہدہ ہوا کرتا ہے۔ اور جب ان کو مشاہدہ ہو رہا ہے پھر ان کو فعل کا صدور اپنی جانب سے کیسے نظر آتا ہے۔ اور وہ افعال کی نسبت اپنی طرف کیوں کرتے ہیں؟ فرمایا کہ اولیاء ہوں یا غیر اولیاء جن پر بھی حق تعالیٰ نے لطف و کرم فرمایا ہے ان کو دوسروں کے متعلق افعالِ الٰہیہ کا مشاہدہ ہوا کرتا ہے۔ اپنی ذات میں افعالِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرنے کی طاقت کسی مخلوق میں بھی نہیں ہے۔ اگر اپنی ذات میں افعالِ ربانیہ کا اسے مشاہدہ ہو تو اس کی ذات (نمک کی طرح) پگھل کر بہہ جائے۔ پس مخلوق میں اتنی ہی طاقت ہے کہ واسطہ کے ذریعہ افعالِ الٰہیہ کا مشاہدہ کرے، یا دوسروں میں مشاہدہ کرے۔ باقی اپنی ذات میں بلاواسطہ مشاہدہ کرنے کی طاقت ہرگز نہیں۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے واسطوں کو پیدا فرمایا اور فرشتوں کو ظروف بنایا کہ ان ہی پر افعالِ ربانیہ کا ظہور ہو تاکہ مخلوقات پگھل نہ جائے اور فرشتوں میں (بلاواسطہ مظہر افعالِ الٰہیہ بننے کی) یہ طاقت اس لئے آئی کہ ان کی ذوات نورانی اور صاف ہیں (انسان کی طرح کثیف) خاکی اجسام نہیں ہیں۔ اور فعلِ باری کا واسطہ بننے کے لئے ملائکہ میں ایک خاص خصوصیت ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔ یہی وجہ ہے کہ فتح نصیب ہو جانے کے بعد تم دیکھو گے کہ مخلوقات کی جگہوں میں کوئی جگہ بھی ان سے خالی نہیں۔ ستر حجابوں میں اور ان کے نیچے عرش میں، اور اس کے نیچے جنت میں، دوزخ میں، آسمان میں، زمین میں، غاروں میں، پہاڑوں میں، بنوں میں، سمندروں میں، غرض ہر جگہ ان کو موجود پاؤ گے اور اسی نفع کے سبب جو مخلوق اور خالق کے درمیان ان کا واسطہ بننے سے حاصل ہوا ہے، ان پر ایمان لانا ضروری ہوا (کہ ان کا احسان ہم پر کثیر در کثیر ہے) ورنہ ستر حجاب اور اللہ کی دیگر بڑی بڑی مخلوق موجود ہے، ان پر ایمان لانا ضروری نہ ہوا۔ (کہ ان سے ہم کو کوئی خاص نفع نہیں پہنچا) واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ میں آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ معجزاتِ انبیاءؑ کا تذکرہ آگیا میں کہنے لگا کہ حضرت سلیمانؑ کے لئے حق تعالیٰ نے جنات وانسان اور شیاطین اور ہوا کو مسخر کر دیا تھا اور ان کے والد سیدنا داؤد علیہ السلام کو لوہے کی صناعت سکھائی اور آہن کو اُن کے ہاتھوں میں گندھے ہوئے آٹے کی طرح نرم بنا دیا تھا اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست اور مُردوں کو زندہ کرنے کی طاقت بخشی تھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ حضرت ممدوح میرا مطلب سمجھ گئے۔ گویا میں کہہ رہا ہوں کہ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب سے افضل و برترین ہیں۔ مگر ایسی باتیں آپؐ سے ظاہر نہیں ہوتیں۔ اور جو معجزات آپؐ سے ظاہر ہوئے وہ دوسری قسم کے تھے (اس عام پسند و واضح نوع کے نہ تھے۔) آپ نے فرمایا کہ سیدنا سلیمان علیہ السلام کو ملکی حکومت واقتدار جو کچھ بھی عطا ہوا اور سیدنا داؤد علیہ السلام کو آہنی تسخیر جو کچھ بھی ملی اور سیدنا سلیمان علیہ السلام کو اقتدار باذن اللہ جو کچھ بھی دیا گیا وہ سب بلکہ اس سے زائد حق تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی امتِ مرحومہ میں اہلِ تصرف اولیاء کو عطا فرما دیا ہے کہ جنات وانسان اور شیاطین اور ہوا اور فرشتے بلکہ تمامی عالموں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب ان کے مسخر و تابع کر دیا ہے اور مادر زاد اندھے اور کوڑھی کو تندرست اور کسی مُردے کو زندہ کرنے کی بھی ان کو طاقت بخشی ہے۔ مگر یہ سب امرِ غیبی اور نظروں سے پوشیدہ ہے۔ مخلوق پر اس مصلحت سے ظاہر نہیں ہوتا کہ ان حضراتِ اولیاء کے گرویدہ ہو کر اپنے رب کو بھول نہ جائیں۔ اور ان ہی کے نہ ہو رہیں (چنانچہ عیسائی ان معجزات ہی کو دیکھ کر حضرت عیسےٰؑ کے بندے بن گئے اور خدا کو چھوڑ بیٹھے ہیں) اور ظاہر ہے کہ اہلِ تصرف کو یہ نعمتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت سے حاصل ہوئی ہیں۔ لہٰذا ان سب کا شمار آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے معجزات میں ہے (بلکہ زیادہ کہ جو خوارق عادات حضرات انبیاءؑ کو عطا ہوئے وہ مع شئ زائد غلامانِ محمدیؐ کو عطا ہوئے)

ایک دن میں نے آپ سے دریافت کیا کہ اہلِ تصرف اولیاء اللہ جب کفار کو جہاں کہیں بھی ہوں ہلاک کرنے کی طاقت رکھتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ باوجود ان کے کفر اور غیر اللہ کی پرستش کے ان کو چھوڑ رکھا ہے۔ حالانکہ ایسوں کو ہلاک کرنا واجب ہے۔ یہ سن کر آپ نے منھ پھیر لیا۔ اور ذرا دیر بعد منھ سامنے کر کے فرمایا کہ ولی کو بے شک اتنی قدرت ہے کہ لحظہ بھر میں اس سارے بر کو ہلاک کر دے۔ مگر باوجود اس کے جب وہ مسلمانوں اور کافروں کی باہم جنگ میں جائے گا تو اس کے لئے حرام ہے کہ کافروں میں اِس سرِ باطنی کے ذریعے کچھ بھی تصرف کرے بجز اس کے کہ جو طریقہ جنگ کا جاری ہے یعنی تلوار چلانا اور بھالا مارنا وغیرہ اسی طرح وہ کافروں سے لڑے اور کچھ نہیں کر سکتا۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اقتدا ضروری ہے۔ ایک مرتبہ مسلمانوں کی ایک کشتی کا جس میں دو (اہلِ تصرف) ولی بیٹھے ہوئے تھے کافروں کی ایک کشتی سے مقابلہ ہو گیا جب باہمی جنگ جوش پر

آئی تو ایک ولی جو چھوٹا تھا اُٹھا۔ اور سرِّ باطنی سے تصرف کر گزرا۔ دفعتہً کافروں کی کشتی میں آنکھوں دیکھتے دیکھتے آگ لگ گئی۔ اور اس کا کوئی سبب عادی اس سے صادر نہیں ہوا کہ جس کے پردے میں وہ تصرف چھُپ جاتا۔ بلکہ کشتی بلا سبب خود جل گئی۔ جب اس ولی نے ایسا کیا تو دوسرے ولی نے جو اس کے ساتھ تھا اور اس سے بڑا تھا اس فعل کی سزا میں فوراً اس کی قوتِ تصرف کو، سلب کر لیا (کہ آئندہ ایسا کرنے کی طاقت ہی نہ رہی) نیز فرمایا کہ کفار سرِّ باطنی کے ذریعہ تصرف کرنا ناجائز اس لئے ہے کہ صاحبِ تصرف اس حالت میں درحقیقت عالمِ بشر سے خارج اور دوسرے عالم سے جا ملا کرتا ہے۔ اور جیسے عالمِ ملائکہ کو جائز نہیں کہ اپنی قوتِ اصلیہ کے موافق کافروں میں تصرف کریں۔ اسی طرح صاحبِ سر کو جائز نہیں کہ ان میں اپنی قوت کا تصرف عمل میں لاوے۔ بلکہ اہلِ تصرف کے ہاتھوں وہی امور جاری ہوں گے جن میں ان کی بقاء زندگی اور دوامِ عیش مضمر ہے۔ جیسا کہ نگہبان فرشتے ان کی پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ان کے تمامی امور کا انتظام کرتے (اور ان کو بجائے ہلاک کرنے کے حسبِ مقدر ہر قسم کی ایذا و ناکامی سے بچاتے اور ترقیات میں مدد بہم پہنچاتے ہیں) الحاصل چونکہ عالمِ بشر میں سے ہیں لہذا ان کے ساتھ جنگ میں اسی کا استعمال کیا جائے گا جو عادتِ جاریہ ہے عالمِ بشر میں۔ دوسرا کوئی طریق استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ واللہ اعلم۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ایک نصرانیہ نوعمر لڑکی کی چاند پر نظر گئی۔ تو اپنے باپ سے پوچھنے لگی۔ ابا! اِسے کس نے پیدا کیا ہے؟ باپ نے زمین پر رکھی ہوئی صلیب کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس نے! لڑکی نے صلیب کو اٹھایا اور اپنے سر کے قریب لے جا کر ہوا میں چھوڑ دیا کہ وہ زمین پر آ گری۔ لڑکی نے کہا کہ ابا جو چیز اتنی قریب جگہ میں اپنے آپ کو خود نہ تھام سکی، اس کو کس نے تھا کہ اتنی بلندی اور اونچائی پر پہنچ کر وہ چاند کو پیدا کر آئی؟ باپ اس کو ڈانٹنے اور بُرا بھلا کہنے لگا۔ میں نے پوچھا کیا لڑکی مسلمان تھی؟ فرمایا نہیں۔ میں نے کہا بعد میں اسلام لائی؟ فرمایا نہ۔ میں نے کہا پھر ایسے صحیح اعتراض اور واضح نور کی توفیق کہاں سے ہوئی؟ فرمایا ایک اہلِ حق وہاں موجود تھا اور اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا جس کی وجہ سے اس نے یہ گفتگو کی۔ اس بزرگ سے مراد خود حضرت شیخ ہیں اور نظر جو اس پر ڈالی تھی وہ باطنی تھی جو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہے۔

میں نے دریافت کیا کہ اہلِ تصرف ولی جب کسی دوسری شکل کو اختیار کرے اور اس حالت میں فرض کرو قتل کر دیا جائے تو تکلیف کس کو ہوگی؟ آیا روح کو یا اس کے اصلی جسم کو۔ یا اس جسم کو جسے اس نے لے رکھا ہے۔ فرمایا کہ دنیا ہو یا آخرت دونوں جگہ درد و تکلیف کا طریق یکساں ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ درد و تکلیف سے مقصود جسم ہوا کرتا ہے۔ (کہ جہنم میں جلانے سے بھی مقصود بدن ہی کو جھلسنا ہے اور دنیا میں کسی کو مارا، یا قتل کیا جاتا ہے تو اس سے بھی بدن ہی کو کلفت پہنچانا مقصود ہوتا ہے) مگر یہ خیال غلط ہے۔ تکلیف پہنچانا روح کو مقصود

ہوتا ہے۔ (البتہ بدن اس کا ذریعہ و واسطہ و محل بنا کرتا ہے) اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اس ولی کو جب حق تعالیٰ ایسے مقام پر تعینات فرماتا ہے جسے گرمی یا سردی وغیرہ کسی مانع کی وجہ سے اس کی ذاتِ ترابی برداشت نہیں کر سکتی، تو اس کی روح اس کے بدن سے نکل کر اس جسم میں داخل ہو جاتی ہے جو اس گرمی و سردی کو برداشت کر سکتا ہے اور اس طرح خدمتِ مفوضہ کو انجام دے لیتا ہے۔ پس اگر اس جسم پر کوئی چوٹ پڑے گی جس میں وہ منتقل ہوا ہے تو ایسے ہی چوٹ پڑے گی اور تکلیف محسوس ہو گی جیسی اس بدن پر پڑتی جس کو چھوڑا ہے اور اس وقت تکلیف محسوس کرتا، اس میں کچھ بھی فرق نہ ہو گا۔ میں نے کہا وہ اجسام کون سے ہیں جن میں روح داخل اور منتقل ہو جاتی ہے؟ فرمایا مثلاً پہاڑ، یا بیل یا ایسے ہی (سخت اور مضبوط) دیگر اجسام۔ میں نے کہا۔ ان میں تو خود ان کی روح موجود ہے۔ پھر ولی کی روح ان میں کیسے داخل ہو جاتی ہے؟ فرمایا ہاں! ان کی روحیں ان میں موجود ضرور ہوتی ہیں۔ مگر ان کی روحیں بنی آدم کی روحوں کی طرح نہیں ہیں۔ چوپایوں کی ارواح ان کی عقول کی طرح (ضعیف) ہیں۔ اور ان کی عقول ان کی ارواح کے مثل (نارسا) ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ارواح کا ان کی ذات پر ایسا حکم نہیں چلتا جیسا بنی آدم کی ارواح کا ان ذوات پر چلتا ہے (چنانچہ انسان کی روح اپنے بدن، دماغ اور اعضا سے وہ کام لیتی ہے جو کھیل اور تماشہ بن کر عقل کو بھی متحیر بنا دیتے ہیں۔ ہر جانور کی آواز اور بولیوں کی نقل اتار لیتا ہے۔ مست سے مست ہاتھی کو داب لیتا ہے چیل کی طرح ہوا میں جہاز اڑا لیتا ہے۔ بجلی کو قید کر کے اس سے پنکھے جھلواتا، چراغ جلواتا اور لاکھوں من وزنی مشینیں چلواتا ہے۔ مگر گھوڑا، بیل وغیرہ باوجود ذی روح ہونے کے بجز اپنی ایک ڈگر کے جس پر قدرت نے اس کو چلایا ہے دوسرے جانور کی رفتار و گفتار بھی نہیں لا سکتا۔) لہٰذا ولی جب (حسبِ حکمِ الٰہی ایسے) امرِ مقدر کو نافذ کرنا چاہتا ہے جو تبدیلِ جسم پر موقوف ہو تو بہائم کی شکل اختیار کرتا ہے (کہ ان کی روح کے ضعیف ہونے کی وجہ سے اس کی روح ان پر حاکم بن سکتی ہے) مگر بنی آدم کے اجسام میں جن کے اندر ان کی روح موجود ہو نہیں جا سکتا۔ (کہ اس کی روح خود با اختیار حاکم ہے۔ لہٰذا دوسری روح کا ان میں سمانا ایسا ہی دشوار ہے جیسے ایک نیام میں دو تلواروں کا سمانا) میں نے کہا بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک روشنی اپنی جگہ ٹھہری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ پھر دفعتہً کوئی بات اس کو پیش آتی ہے اور وہ اپنی جگہ سے سرکتی اور کسی شخص کی طرف چلتی دکھائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اس کو (جلا کر) قتل کر ڈالتی ہے۔ عجب نہیں یہی سبب ہو کہ اس امرِ مقدر کے پورا کرنے کو اہلِ تصرف نے آگ کی شکل کو قبول کیا ہو۔ فرمایا ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ بشرطیکہ مقتول کافر ہو۔ اس لئے کہ نور کے لشکر اور ظلمت کے لشکر میں شدید جنگ رہتی ہے۔ میں نے کہا بلی اور کتوں کی شکل میں جو شیاطین متشکل ہوتے ہیں ممکن ہے کہ اس کی بھی یہی نوعیت ہو۔ فرمایا ہاں شیاطین میں ظلمت اور باطل (کی قوت) ہے۔ اور اولیاء اللہ میں حق اور نور (کی قوت) ہے۔ اور ظلمت اور نور دو لشکر ہیں کبھی تقدیرِ الٰہی کی تنفیذ میں بہائم مذکورہ کی صورت شکل یہ لشکر اختیار کر لیتا ہے اور کبھی ان کی صورت

وشکل میں وہ لشکر متشکل ہو جاتا ہے میں نے کہا کیا ولی سانپ کی صورت بھی لے لیتا ہے (جیسا کہ جنات اور شیاطین اس شکل کو لیا کرتے ہیں)؟ فرمایا ہاں، اگر حق تعالیٰ کا اسے حکم ہو کہ زید کو زہر کے ذریعے ہلاک کرے تو تقدیر کے نافذ کرنے کے لئے وہ زہریلے سانپ کی صورت میں متشکل ہو جائے گا۔ میں نے کہا مگر ولی کی روح میں زہر تو ہے نہیں۔ فرمایا زہر نام کس چیز کا ہے۔ ولی کی ہمت و عزیمت (بڑی چیز ہے کہ) ہر شے اس کا اثر قبول کرتی ہے۔ یعنی جس وقت بھی وہ کسی شے کا ہمت کے ساتھ عزم کرتا ہے (کہ یہ کام اس طرح ہو یا فلاں صورت وقوع میں آئے بحکمِ خدا) وہ فوراً ہو جاتی ہے۔ پھر میں نے آپ سے دریافت کیا کہ جب ولی کی روح (تنفیذِ تقدیر کے لئے) اپنے جسم سے باہر نکل جاتی ہے تو اس کا جسم کس حالت میں رہتا ہے؟ فرمایا بلا روح کے رہ جاتا ہے۔ پس اگر ولی چھوٹے درجہ کا ہوتا ہے، تب تو اس کے بدن کی حالت ایسی ہوتی ہے جیسے مبہوت مدہوش کہ کوئی بات نہیں کرتا۔ اور کرتا ہے تو نہ خود سمجھتا ہے کہ کیا کہہ رہا ہے اور نہ اس سے واقف ہوتا ہے کہ کون بول رہا ہے۔ اور اگر بڑے درجہ کا ولی ہوتا ہے تو اس کا جسم اسی حالت پر رہتا ہے جیسا روح ہونے کی حالت میں تھا کہ حالتِ سابقہ کی طرح ہنستا بھی ہے، بولتا بھی ہے۔ میں نے کہا جب روح ذات سے نکل گئی تو وہ مر گیا۔ پھر پہلے شخص کے مبہوت و مدہوش کی صورت رہنے کا کیا مطلب؟ اور دوسرے کے اپنی حالتِ سابقہ پر رہنے کی کیا صورت، جبکہ روح دونوں کی نکل چکی۔ فرمایا روح کے نکل جانے کے بعد بدن میں اس کے آثار مثلاً حرارت وغیرہ باقی رہتے ہیں۔ لہٰذا جب تک آثار باقی رہیں گے، ذات زندہ رہے گی۔ اور آثار چوبیس گھنٹہ سے پہلے زائل نہیں ہوا کرتے پس جس کی روح اس سے پہلے پہلے واپس آجاتی ہے وہ زندہ رہتا ہے۔ اور جس کی روح پر بدن سے مفارقت میں مدتِ مذکورہ گزر جاتی ہے وہ پھر اپنے بدن کی طرف کبھی نہیں لوٹ سکتی۔ اور ان کا شمار مردوں میں ہوتا ہے۔ بہتیرے ولی ہیں جن کی روح اس حالت میں قبض ہو جاتی ہے۔ مگر جن کی روح اس حالت میں قبض ہوتی ہے (چونکہ سرکاری خدمت میں قبض ہوئی ہے اس لئے شہید کی طرح) حق تعالیٰ کی ان پر بڑی عنایت ہوتی ہے۔ میں نے کہا کہ بعض اولیاء کا قصہ سنا ہے کہ تین تین دن ان کی روح جسم سے باہر رہا کرتی تھی اور پھر لوٹ آتی تھی۔ یہ تو تقریرِ مذکورہ کے خلاف پڑتا ہے۔ فرمایا تم نے جو سنا ہے وہ حق ہے۔ اور روح سترہ دن تک بلکہ اس سے بھی زیادہ غائب رہ سکتی ہے۔ مگر اس زمانے میں ذات کی طرف اس کی توجہ و نگرانی ضروری ہے کہ اس کی توجہ سے ذات کو حیات حاصل ہوتی رہتی ہے۔ جیسے کوئی شخص کپڑے اتار کر کنارے پر رکھ دے اور ندی میں اتر کر غوطہ لگائے تو خود پانی میں ہوگا مگر اندیشہ ہوگا کہ کوئی اس کے کپڑے اٹھا کر نہ لے جائے۔ لہٰذا بار بار پانی سے سر نکال کر اپنے کپڑوں پر نظر ڈالتا رہے گا۔ اسی طرح روح اپنے چھوڑے ہوئے جسم کو تکتی رہتی ہے۔ فرق اتنا ہے کہ غوطہ خور کی نگرانی کپڑوں کے متعلق صرف نگاہ کے ذریعے ہوگی اور روح میں

چونکہ ثقل نہیں اسلئے اس کا ذات کی طرف تکنا بذریعہ دخول کے ہوگا۔ کہ محض اس دھیان اور جھانکنے ہی سے اس کا ذات میں دخول ہو جائے گا۔ اور اس کے بعد امر مکلّف کو پورا کرنے کے لئے وہ پھر باہر نکل جائے گی اور پھر ذات کی طرف دھیان و توجہ کے ذریعہ داخل ہو جائے گی۔ اور پھر باہر چلی جائے گی۔ غرض جب تک وہ کام پورا نہ ہوگا یہی سلسلہ جاری رہے گا۔ خواہ تین دن میں پورا ہو یا زیادہ دنوں میں پس اس میں اور تقریر گزشتہ میں کوئی منافات نہیں ہے۔ بالکل مطابقت ہے۔

نیز آپ نے فرمایا اہلِ تصرف ولی جس کی بھی جیب میں چاہے ہاتھ بڑھا کر جتنے روپے چاہے نکال لیتا ہے۔ اور جیب والے کو خبر بھی نہیں ہوتی۔ (اس لئے کہ یہ تصرّف باطنی کا ہاتھ ہے نہ کہ ظاہری کا ہاتھ) اس کے بعد آپ نے ایک ولی کا قصہ سنایا۔ جو اس کے پڑوسی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ فرمایا کہ اس پڑوسی کی بیوی کے پاس ایک شخص پانچ دینار امانت رکھ کر دور کہیں سفر پر چلا گیا اور کہہ گیا کہ زندہ واپس آیا تو خود لے لوں گا اور اگر مر گیا تو ان کو میرے بچوں کے حوالے کر دیجیو۔ امانت رکھنے والے کے پردیس میں چلے جانے کے بعد اس عورت کا وقتِ مرگ قریب آیا تو اس نے وہ رقم اپنے شوہر کے حوالے کر دی اور اس کو وصیت کی کہ ان کا مالک جب واپس آئے تو اس کو واپس دے دینا۔ اس نے وعدہ کر لیا اور اس کے بعد عورت کا انتقال ہو گیا۔ ہمسایہ کی نیت اپنی بیوی کو دفن کرنے کے بعد بگڑ گئی۔ اور وہ امانت کو کھا پی گیا۔ کچھ دنوں بعد رقم کا مالک سفر سے واپس آیا اور اپنی امانت طلب کی تو یہ انکار کر گیا (کہ مجھے بیوی نے کچھ نہیں دیا۔ آخر وہ صبر کر کے بیٹھ رہا۔) اس کے بعد اس ہمسایہ نے کما کما کر جوڑنا شروع کیا حتی کہ پانچ دینار اس کے پاس جمع ہو گئے۔ اس پر وہ بہت خوش ہوا اور ولی کو (جس کا یہ ہمسایہ تھا) ان کے دروازہ مکان پر کھڑا چھوڑ کر باہر نکلا اور موم بتی فروخت کرنے والوں میں پہنچا۔ دونوں کے مکان شہر فاس کے محلہ راس الجنان میں تھے۔ غرض اس نیت سے کہ حضرت عبدالقادر فاسی کے مزار پر بتی روشن کروں گا اس نے ایک شمع خریدی۔ جس وقت یہ اس تنور کے قریب پہنچا جو بازار سبع لویات میں واقع ہے تو ولی نے راس الجنان سے ہاتھ بڑھا کر امانت میں غدر و خیانت کی بنا پر سزا کے طور سے اس کی جیب سے پانچوں دینار نکال لئے۔ حتی کہ مزار پر پہنچ کر اس نے شمع روشن کی۔ اور راس الجنان پر پہنچا۔ (تو ولی بدستور اپنے گھر کے دروازے پر کھڑا تھا) جب اس کی نظر ولی پر پڑی تو حق تعالیٰ نے اس کے دل میں خیال ڈالا کہ اپنی جیب کی رقم دیکھ لے چنانچہ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا تو کچھ نہ پایا۔ غصہ سے جھلا اٹھا، اور ولی سے کہ اس کی ولایت کا اسے ظن اور گمان بھی نہ تھا کہنے لگا۔ واللہ دنیا میں کوئی ولی ہی نہیں رہا۔ نہ زندہ نہ مُردہ۔ ولی کو ہنسی آگئی اور اتنی آئی کہ قریب تھا زمین پر گر پڑیں۔ اس کے بعد ولی نے ناواقف بن کر پوچھا۔ چچا عبدالرحمٰن کیا بات پیش آئی؟ کہنے لگا میری جیب میں پانچ دینار تھے اور میں یہ ارادہ کر کے گھر سے نکلا تھا کہ

موم بتی خرید کر حضرت عبدالقادر فاسی کے مزار پر روشن کروں گا۔ اس کی یہ برکت سامنے آئی کہ اچکوں نے جیب ہی خالی کر دی اور پانچوں دینارے اُڑے۔ اس پر ولی کو اور زیادہ ہنسی آئی (وہ ولی خود حضرت شیخ تھے) اس کے قریب قریب۔ ایک واقعہ حضرت ممدوح کا بھرے مجمع میں مولانا محمدؐ بن علی تجادی کے ساتھ پیش آیا۔ کہ شہر تازی کے نواح میں قبیلہ مجاوہ آباد ہے اور وہ اس کے باشندے تھے۔ اپنے وطن سے حضرت ممدوح کی زیارت کے لئے آئے تھے۔ حضرت اپنے گھر کے دروازے کے قریب دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گئے اور مولانا محمدؐ بن علی سامنے کے مکان کی دیوار سے کمر لگا کر بیٹھ گئے کہ دونوں کے بیچ میں راستہ تھا جس میں لوگوں کی آمد و رفت تھی حضرت ممدوح مولانا سے بہت محبت فرماتے تھے۔ آپ نے دریافت فرمایا کہ تمھارے پاس کچھ دراہم بھی ہیں؟ مولانا نے فرمایا، کہ حضرت میرے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ غرض تین مرتبہ ایسا ہی ہوا کہ حضرت نے تین بار یہی دریافت فرمایا اور مولانا نے یہی انکاری جواب دیا۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا ذرا سوچ کر جواب دو۔ چونکہ مولانا کی جیب میں درحقیقت ایک کپڑے میں بندھے ہوئے اٹھارہ موزونہ پڑے ہوئے تھے۔ اس لئے اقرار کئے بغیر چارہ نہ ہوا اور فرمایا۔ ہاں حضرت اٹھارہ موزونہ پڑے ہیں۔ فرمایا لاؤ ان کو نکالو۔ انھوں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور خوب تلاش کیا مگر کچھ نہ پایا۔ حیران رہ گئے اور پریشان ہو گئے۔ حضرت کو ہنسی آ گئی اور نیچے سے بندھی بندھائی پوٹلی نکال کر ان کے حوالے کی اور فرمایا۔ مولانا محمدؐ بن علی جس کو بھلا اتنی قدرت ہو اس سے چھپانے اور چال چلنے کی کیا ضرورت ہے۔ ایسے ہی حضرت ممدوح کی ایک دوسری کرامت ان ہی مولانا کے متعلق ظاہر ہوئی کہ ان کو پیسہ کی محبت زیادہ تھی اور روپیہ جمع کرنے کے حریص بہت تھے۔ اور حق تعالیٰ نے دنیا بھی ان کو اچھی خاصی دے رکھی تھی۔ اور ان کے کوئی اولاد نہ تھی۔ جب ان کو حضرت ممدوح کی صحبت نصیب ہوئی۔ اور حق تعالیٰ نے حضرت کی محبت ان کے دل میں ڈال دی تو حضرت ان کو اللہ واسطے خرچ کرنے کی ترغیب دیا کرتے اور یہ دل کھول کر خرچ کیا کرتے تھے۔ خود بھی اس پر تعجب کرتے تھے کیونکہ اس کی ان کو عادت ہی نہ تھی۔ آخر حضرت نے مواقعِ خیر میں مال خرچ کرنے کے متعلق اتنا تشدد فرمایا کہ ہمیں ان پر ترس آیا کرتا اور کہا کرتے تھے کہ حضرت نے ان کو تو بہت ہی سخت پکڑا۔ مگر یہ نہایت مسرور اور خوش ہوتے تھے۔ درحقیقت ہم نتیجے سے بے خبر تھے۔ اور نہیں سمجھتے تھے کہ مولانا کی وفات کا وقت آ چکا ہے اور حضرت ان کے روپے سے ان کے ہاتھوں جنت میں محل تعمیر کرا رہے ہیں اور ان کا مال و زر ان کے جانے سے قبل ان کے پاس پہنچا رہے ہیں۔ حتیٰ کہ جب اتنا روپیہ رہ گیا جو صرف بیوی کے مہر اور (گزر کے قابل) ترکہ کے لئے کافی تھا تو ان کا انتقال ہو گیا۔ یہی برتاؤ حضرت ممدوح کا مولانا علی بن عبداللہ صباغی کے ساتھ ہوا تھا جن کا قصہ شروع کتاب میں لکھا جا چکا ہے کہ حضرت نے اصرار فرما فرما کر اللہ واسطے ان کا مال خرچ کرا دیا اور ختم ہوتے ہی وہ خود جوارِ رحمت

الٰہی میں پہنچ گئے۔ حضرت ممدوح جیسے بزرگوں کی معرفت سے یہ نفع حاصل ہوا کرتا ہے۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ صاحبِ تصرف ولی کے لوگوں کا مال نکال لینے میں اور چور کے مال چرانے میں فرق صرف حجاب اور عدم حجاب کا ہے کہ ولی کو مشاہدہ نصیب ہے اپنے رب کا اور وہ منجانب اللہ مامور ہے اس کے لینے کا۔ چنانچہ حضرت خضرؑ سے چند واقعات جو صورۃً ناجائز صادر ہوئے تو اس کے متعلق حضرت خضرؑ نے خود اظہار فرمایا کہ اے موسیٰ وَمَا فَعَلْتُہٗ عَنْ اَمْرِیْ میں نے یہ کام اپنے حکم سے نہیں کئے۔ (بلکہ بحکمِ خدا کئے تھے۔ لہٰذا وہ معصیت اور ظلم نہیں ہیں۔) نیز آپ نے فرمایا کہ حضرت منصور قطب ایک مرتبہ مولانا ادریسؒ کے روضہ میں پہنچے۔ وہاں حضرت ابو لعیزی بکاری کو موجود پایا کہ زیارت کے لئے آئے تھے۔ حضرت منصور ان کا زادِ راہ لے کر چل دیئے۔ میں نے حضرتِ ممدوح سے ان کے متعلق ذکر کیا (کہ یہ تو صریح سرقہ ہے۔ قطب ہو کر اور ایسا کام کیا) فرمایا ولی اور چور کے مال لینے میں فرق حجاب اور عدم حجاب کا ہے۔ کہ اہلِ تصرّف سے پردہ اٹھا دیا جاتا ہے اور حقیقت ان پر منکشف ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ حضرت خضر علیہ السّلام سے پردہ اٹھا کر انجام اور مصالح کا ان کو مشاہدہ کرا دیا گیا۔ لہٰذا ولی کو اس کا لینا حلال ہوا۔ اور سارق پر پردہ پڑا ہوا ہے اور حقیقت مکشوف نہیں ہوئی۔ لہٰذا اس کو لینا حرام ہوا۔ پس حضرت منصور چونکہ قطب تھے اور ان کو مشاہدہ ہو چکا تھا کہ یہ زادِ راہ ان کا ہے۔ اور لوحِ محفوظ میں اس کو اپنی قسمت کا لکھا ہوا دیکھ چکے تھے اور پھر حق تعالیٰ کی طرف سے اس کے لینے کا حکم بھی سن لیا تھا۔ لہٰذا وہ ان کے لئے حلال تھا۔ برخلاف سارق کے کہ وہ محجوب اور رب سے غافل ہے لہٰذا اس کے لئے امرِ شریعت ہی حاکم ہے اور جب اس نے اجازت نہیں دی تو اس کو کسی کا پیسہ لینا حرام ہوا (پھر آپ نے حضرت عبدالرحمٰن مجذوب کا قصہ نقل فرمایا کہ ان کے رفقا نے ایک بیل پکڑ لیا۔ حضرت عبدالرحمٰن نے فرمایا کہ ذبح کرو اور کھاؤ۔ (چنانچہ سب نے کھایا) مگر حضرت یوسف فاسی نے جو ان کے وارث (اور خلیفہ) ہوئے تھے ہاتھ کھینچ لیا کہ مالک کی اجازت کے بغیر مالِ مغصوب کیسے کھا لیا جائے) آخر کار اس کا مالک آیا تو اس نے اطلاع دی کہ وہ بیل حضرت عبدالرحمٰن اور ان کے رفقا کے لئے صدقہ ہے۔ یہی صورت حضرت ابو لعیزی مذکور کی تھی کہ (وہ حضرتِ منصور کے اتنے مخلص و عاشق تھے) اگر ممکن ہوتا کہ وہ اپنے گوشت کے نوالے بنا کر حضرت منصور کو دے دیں تو ضرور کر گزرتے۔ واللہ اعلم

پانچواں باب

پیری مریدی اور اس کے متعلق حضرت ممدوح کے ارشادات

ایک مولوی نے آپ سے حضرت زروق رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کا مطلب دریافت کیا کہ صوفیہ کی

اصلاح میں جسکا نام تربیت ہے وہ منقطع ہوچکی۔ اور اب صرف ہمت اور حال کے ذریعے تربیت باقی رہ گئی ہے کہ کتاب اللہ اور سنتِ رسول ؐ کو اس میں کمی بیشی کئے بغیر مضبوط تھام لے۔ سوال یہ تھا کہ اصطلاحی تربیت صرف حضرت زروق کے زمانہ میں منقطع ہوچکی تھی یا سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کے نزول تک (ہمیشہ کے لئے) جاتی رہی۔ اگر (ہمیشہ کے لئے) جاتی رہی تو اس کی کیا وجہ؟ اور اگر باقی ہے تو ایسے شیخ کا پتہ بتائیے جو مرید کی روح میں بحالتِ خلوت جس قسم کا چاہے تصرف کرسکے (اور اس کو صاحبِ نسبت و واصل بنادے) یہ مولوی وہی تھے جنھوں نے سورہَ قٓ کے متعلق اور دو تحریروں والی اس حدیث کی بابت سوال کیا تھا جس میں اہلِ جنت اور اہلِ جہنم کی فہرستِ اسمار کا ذکر آیا ہے۔ حضرت ممدوح نے جواب ارشاد فرمایا کہ تربیت سے مقصود نفس کی نخوت و تعلی کا دور کرنا ہے کہ ذاتِ ترابی پاک صاف ہوکر سرِ الٰہی کا بوجھ برداشت کرسکے۔ اور یہ بغیر اس کے ناممکن ہے کہ اس کی ظلمت دور اور باطل کے تعلقات منقطع ہوجائیں۔ پھر باطل کے تعلقات قطع ہونے کی صورت کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ اس کی اصل آفرینش ہی میں طہارت و صفائی ہوتی ہے۔ کہ حق تعالیٰ بلاواسطہ اس کو (اخلاقی گندگیوں سے) پاک بنادیتا ہے۔ یہ حالت تو قرونِ ثلثہ کی تھی جن کو خیر القرون کہاجاتا ہے کہ اس زمانے کے لوگ بالطبع حق کے ساتھ متعلق اور اس کی تلاش میں لگے ہوئے تھے۔ سوتے تھے تب اسی حال میں، اور جاگتے تھے تب اسی میں۔ اور حرکت کرتے تھے تب اسی طلب و تلاش میں۔ حتیٰ کہ جسے خدا نے بصیرت بخشی ہے اس نے ان کے باطن پر نظر ڈالی ہے۔ تو ان کی عقول کو اللہ و رسول ؐ کے ساتھ وابستہ اور ان ہی دو کی خوشنودی کا طالب و جویاں پایا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے قلوب میں حق کا نور (سورج سے زیادہ) دمک اٹھا اور علم و اجتہاد کے اس درجے پر پہنچ گئے تھے جس کی کیفیت بھی ناقابلِ بیان ہے اور دوسروں کو اس کا حصول بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا اس زمانہ میں اصلاحی تربیت کی ضرورت ہی نہ تھی۔ طہارتِ ذات و صفائے عقل اور ہمہ وقت راہِ حق کے انتظار و دھیان کی وجہ سے محض اتنا کافی تھا کہ شیخ نے اپنے مرید کو پاس بٹھاکر بات کی اور مرید کو فتح نصیب ہوگئی۔ اور کبھی قطع باطل کی صورت یہ ہوتی ہے کہ شیخ کو مرید کی ذاتِ ترابی سے ظلمت مٹانے کی تدبیر کرنا پڑتی ہے اور حالت قرونِ ثلاثہ کے مابعد زمانہ کی ہے کہ نیتوں میں فساد آگیا۔ باطن خراب ہوگئے۔ عقول کا تعلق (بجائے اللہ و رسول ؐ کے) دنیا کے ساتھ ہوگیا اور حصولِ شہوات اور طلبِ لذت میں ڈوب گئے۔ لہٰذا صاحبِ بصیرت شیخ کے پاس جب مرید آیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی عقل متعلق و وابستہ ہے باطل اور شہوات کے ساتھ اور اس کی ذاتِ ترابی بھی عقل کی تابع بن کر اہلِ غفلت سے مانوس اور اہلِ باطل کی طرف مائل ہوگئی، کہ اس کے اعضار جو بھی حرکت کرتے ہیں۔ وہ غیر محمود افعال اور ناپسندیدہ احوال ہی میں، حرکت کرتے ہیں کیونکہ جوان کی مالک تھی یعنی عقل وہ خود باطل کے ساتھ وابستہ ہوگئی ہے۔ انھوں نے مرید کو اس حالت پر پایا، تو

خلوت اور ذکر اور تقلیلِ غذا کا اس کو حکم دیا۔ کہ گوشے میں بیٹھنے سے اہلِ باطل کا تعلق جن کا شمار مُردوں میں ہے قطع ہو جائے گا۔ اور ذکر میں مشغولیت سے لغوگوئی اور کلام باطل جو ہر وقت زبان پر جاری تھا زائل ہو جائے گا اور تقلیلِ غذا سے خون کے بخارات کہ شہوت اسی سے پیدا ہوتی ہے کم ہو جائیں گے۔ اور عقل اللہ و رسول صلعم کے ساتھ تعلق کی طرف لوٹ آئے گی۔ اور مرید جب اس طریق سے طہارت وصفائی تک پہنچ جائے گا تو اس کی ذات سرِّ الٰہی کو اٹھا سکے گی بس یہ ہے مشائخ کی غرض تربیت سے اور خلوت میں بٹھانے سے۔ چنانچہ مدت تک یہ طریق جاری رہا۔ حتیٰ کہ حق باطل کے ساتھ اور نور ظلمت کے ساتھ مخلوط ہو گیا۔ کہ اہلِ باطل کے پاس بھی جو آیا وہ اس کو بہ نیتِ فاسدہ اور بہ اغراض باطلہ خلوت میں بٹھانے اور اسمائے الٰہیہ کی تلقین کرنے لگے۔ بلکہ اس کے ساتھ تعویذات اور عملیات کا اضافہ کر دیا۔ جو استدراج کو مقتضی ہیں۔ (کہ ان کے اثرات اور رجوعِ مخلوقات دیکھ کر سمجھتے ہیں کامل بن گئے۔) حضرت زروق رح کے زمانے میں چونکہ یہ رنگ بہت پھیل گیا تھا۔ اس لئے انھوں نے دینی خیر خواہی کی غرض سے یہ مشورہ دیا کہ اس طریقِ تربیت کو جس میں اہلِ باطل کی شرکت ہو گئی ہے ترک کریں اور وہ امن کا راستہ اختیار کریں جس میں نہ کوئی خطرہ ہے نہ پریشانی۔ یعنی کتاب اللہ و سنتِ رسول صلعم اللہ کا اتباع (کہ اس میں اہلِ باطل کی شرکت محال ہے اور اگر کرینگے تو خود اہلِ حق بن جائیں گے۔ ان کی خیر خواہی بھی اسی میں ہے) الحاصل شیخ زروق کا یہ قول دینی مصلحت پر مبنی ہے۔ نہ یہ کہ اصلاحی تربیت کے وہ منکر یا منقطع سمجھ رہے ہیں۔ اور ایسا کیسے کہہ سکتے ہیں جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا نور اور آپؐ کی خیر و برکت امت کے شاملِ حال ہے۔ اور قیامت تک باقی رہنے والی ہے۔ رہا آپ کا یہ سوال کہ ایسا شیخِ تربیت کون ہے جس کے حوالے مرید اپنے آپ کو کر دے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شیخ ایسا ہونا چاہیئے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے آگاہ ہو۔ اور اس کی ذات نورِ محمدی سے سیراب کی گئی ہو کہ قدم بقدم ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ اور حق تعالیٰ نے اس کو کمالِ ایمان اور صفائے معرفت عطا فرمایا ہو۔ ایسے شیخ کا جب دامن پکڑا جائے گا اور اس کی محبت کو دل میں جگہ دے کر صحبت اختیار کی جائے گی تو وہ مرید کو اللہ تک پہنچائے گا، اور معرفتِ الٰہیہ میں جو خطرات و وساوس سدِّ راہ بنے ہوئے ہیں ان کو قطع کر دے گا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں ترقی دلائے گا۔ رہا یہ امر کہ اس کا نام بتایا جائے۔ سو اللہ کا ملک خالی نہیں ہے۔ الحمد للہ اکثر جگہ ایسی ہستیاں موجود ہیں۔ مگر اہلِ سنت والجماعت سے باہر نہ ہوں گے۔ کوشش کرو ضرور پاؤ گے۔ فَاِنَّ اللّٰہَ مَعَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِیْنَ ھُمْ مُّحْسِنُوْنَ۔ واللہ اعلم۔

نیز عالم مذکور نے حضرت ممدوح سے ایک سوال یہ کیا کہ جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بیداری میں دیکھنے کا دعویٰ کرے عارفین اسکے متعلق کہتے ہیں کہ اس کا دعویٰ قابلِ قبول نہیں جبتک کہ ثبوت پیش نہ

کرے اور وہ ثبوت یہ ہے کہ ایک کم تین ہزار مقام طے کر چکا ہو۔ لہذا وہ مقامات اس سے دریافت کیے جائیں۔ پس حضرتِ والا مختصر طور پر ہم سے بیان فرمائیں کہ وہ مقامات کیا ہیں؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ ہر ذات کے اندر تین سو چھیاسٹھ رگیں ہیں اور ہر رگ اس خاصیت کی حامل ہے کہ جس کے لئے وہ پیدا ہوئی ہے۔ اور صاحب بصیرت عارف ان تمامی عروق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ درآنحالیکہ ان کے خواص ان میں مشتعل ہیں۔ مثلاً ایک رگ کذب کی ہے جس میں اس کی خاصیت مشتعل ہے۔ ایک رگ حسد کی ہے جس میں حسد چمک رہا ہے۔ ایک رگ ریا کی ہے جس میں ریا روشن ہو رہا ہے۔ ایک رگ عذر کی ہے جس میں عذر چمک رہا ہے۔ ایک رگ خود پسندی کی ہے جس میں وہ روشن ہو رہی ہے۔ ایک رگ کبر کی ہے جو اس کو چمکا رہی ہے۔ اسی طرح تمام عروق میں جدا جدا خاصیتیں چمک رہی ہیں۔ حتیٰ کہ عارف جب ذات پر نظر ڈالتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ایک جھاڑ میں ۳۶۶ (تین سو چھیاسٹھ قمقمے لٹکا دیے جائیں اور ہر قمقمے کی روشنی کا رنگ جدا ہو کہ ایک دوسرے کے بالکل مشابہ نہ ہو پھر ان خواص میں ہر خاصیت کی مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً شہوت کی کئی قسمیں ہیں۔ اگر شرمگاہ کی طرف اس کا انتساب کیا جائے تو جدا قسم ہے اور جاہ کی طرف نسبت کی جائے تو جدا قسم ہے اور مال کی طرف نسبت کی جائے تو جدا قسم ہے۔ اور طول امل کی طرف نسبت کی جائے تو جدا قسم ہے۔ اسی طرح کذب کی خاصیت مثلاً اس اعتبار سے کہ صاحبِ کذب کبھی سچ نہیں بولتا۔ علیحدہ قسم ہے اور اس لحاظ سے کہ دوسرے کو سمجھتا ہے وہ سچ نہیں بولتا۔ اس کے کلام میں شک لاتا اور اس کو سچا نہیں سمجھتا یہ علیحدہ قسم ہے۔ اور بندہ کو فتح نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ ان تمامی مقامات کو طے نہ کر لے۔ جب حق تعالیٰ کسی بندہ کے ساتھ خیر کا ارادہ فرماتا اور فتح کی اہلیت بخشتا ہے تو آہستہ آہستہ بتدریج ان مقامات کو قطع کرا دیتا ہے۔ مثلاً خاصیتِ کذب کو قطع کرتا ہے تو مقامِ صدق پر پہنچ جاتا ہے اور پھر مقامِ تصدیق پر جا پہنچتا ہے۔ اور جب خاصیتِ شہوت فی المال کو قطع کرتا ہے تو مقامِ زہد حاصل ہو جاتا ہے اور شہوتِ زنا و دیگر معاصی کو قطع کرتا ہے تو مقامِ توبہ پر فائز ہوتا ہے اور شہوت طول امل کو قطع کرتا ہے تو اس دھوکہ کے گھر (یعنی دنیا) سے بے تعلقی کے مرتبے پر پہنچ جاتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ پھر جب اس کو فتح نصیب ہوتی ہے اور سرِ الٰہی اس کی ذات میں مستقر ہو جاتا ہے تو بہ تدریج عوالم کے مقاماتِ مشاہدہ قطع کرتا ہے۔ سب سے پہلے ترابی اجسام کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور اس کے بعد علوی اجرام کا اور پھر اجرامِ نورانیہ کا اور پھر مخلوق میں افعالِ الٰہیہ کے سریان کا۔ نیز ترابی اجسام کے مشاہدہ میں بھی تدریج ہوتی ہے کہ اول اس زمین کا مشاہدہ کرتا ہے جس میں خود موجود ہے۔ اس کے بعد ان سمندروں کا مشاہدہ کرتا ہے جو اس زمین میں واقع ہیں۔ پھر اپنی اس زمین کے اور دوسری زمین کے مابین کا مشاہدہ کرتا ہے۔ کہ اس کی نظر تخوم (ضخامتِ ارضی)

کو پھاڑتی چلی جاتی ہے زمینِ دوم تک۔ پھر دوسری زمین کا مشاہدہ کرتا ہے اور پھر اس کے تخوم کا ارضِ سوم تک، اسی طرح ساتوں زمین کا مشاہدہ کرنے کے بعد اس خلا کا مشاہدہ کرتا ہے جو زمین سے لے کر پہلے آسمان تک واقع ہے۔ پھر پہلے آسمان کا مشاہدہ کرتا ہے اس کے بعد اس فضا کا جو فلکِ اوّل اور فلکِ دوم کے درمیان ہے اور پھر فلک دوم کا۔ غرض زمینوں کی ترتیب کے موافق ساتوں افلاک کا مشاہدہ ختم کر کے عالمِ برزخ اور عالمِ ارواح کا مشاہدہ کرتا ہے جو آسمان میں ہیں۔ پھر ملائکہ اور محافظ فرشتوں کا اور امورِ آخرت کا مشاہدہ کرتا ہے۔ اور ان مشاہدات کے ہر مشاہدے میں بندہ پر ایک حق ہے منجملہ حقوقِ ربوبیت کے اور ایک خاص ادب ہے، آدابِ عبودیت میں سے۔ (جن کا ادا کرنا اس پر فرض ہے) اور اس زمانۂ مشاہدات میں اس کو موانع و قواطع پیش آتے اور ایسے خونریز و خوفناک امور پیش آتے رہتے ہیں کہ اگر اللہ کا فضل و کرم اور اس کی توفیق بندۂ ضعیف کے شاملِ حال نہ ہو تو ادنیٰ درجہ کا نقصان یہ ہے کہ صاحبِ مشاہدہ دیوانہ اور بے عقل بنجائے پھر مقاماتِ مشاہدہ کا قطع کرنا خواص نفوس کے مقامات قطع کرنے سے بھی زیادہ سخت ہے۔ اس لئے کہ مقاماتِ خواص کا قطع کرنا امر باطنی ہے جس کی خبر خود اس کو بھی فتح نصیب ہونے کے بعد ہوتی ہے۔ اور مقاماتِ مشاہدہ کا قطع کرنا امر ظاہری ہے کہ نگاہ سے دیکھتا اور مشاہدہ کرتا ہے۔ کیونکہ اس میں (نظم کی خدمت انجام دینے کے لئے) فتح کے بعد اس کو مشغول ہونا ہے۔ پس جب (تمامی مقامات طے کر کے) اس کی نظر صاف اور اس کا نورِ بصیرت کامل ہو جاتا اور اللہ کی وہ رحمت جس کے بعد شقاوت نہیں ہے اس پر برستی ہے تو سید الاوّلین والآخرین علیہ افضل الصلوٰۃ وازکی التسلیم کی رویت اس کو نصیب ہو جاتی ہے۔ کہ آپ کو آنکھوں سے دیکھتا اور بیداری میں آپ کی زیارت کرتا ہے اور اس نعمت سے مالا مال ہوتا ہے جسے نہ کسی آنکھ نے دیکھا نہ کسی کان نے سُنا اور نہ کسی قلب پر اس کا خیال گزرا۔ یہ وقت ہے اس کے فرح و سرور اور مستحقِ مبارک باد ہونے کا کہ ابدی سعادت اس کو مبارک اور صد مبارک۔ یہ تمام خواص نفوس مع ان کی اقسام و تفاصیل کے اور یہ مقامات جو مشاہداتِ مذکور میں طے ہوتے ہیں اگر ایک جگہ جمع کرو تو تین ہزار سے بھی زائد ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ بھی سمجھ لو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے شمائلِ مطہرہ امت پر پوشیدہ نہیں ہیں۔ کہ ذاتِ مقدسہ کے ظاہری و باطنی محاسنِ مخصوصہ کو حضراتِ علماء نے جمع اور کتابوں میں مدوّن کر دیا ہے۔ لہٰذا جو شخص دعویٰ کرے بحالتِ بیداری آپ کی رویت کا اس سے آپؐ کے شمائلِ زکیہ اور احوالِ علیہ دریافت کئے جاویں۔ اور اس کا جواب سُنا جائے کہ آنکھوں سے دیکھنے والا جیپ نہیں سکتا۔ اور نہ دیکھنے والے کے ساتھ مشتبہ نہیں ہو سکتا۔ والسلام۔ اگر اس جواب سے تسلی ہو گئی ہو فبہا ورنہ دوسری تقریر سنو حق تعالیٰ جب کسی بندے کو فتح نصیب فرماتا ہے تو اس کو انوارِ حق میں سے ایک نور عطا فرماتا ہے جو تمامی اطراف سے

اس کی ذات پر داخل ہوتا ہے اور وہ تمامی جہات میں حتی کہ (ایکسرے کی طرح) ہڈی اور گوشت میں گھستا چلا جاتا ہے اور ذات پر اس نور کے داخل ہونے کی تکلیف قریب قریب جانکنی اور سکراتِ موت کے ہوتی ہے۔ پھر اس نور کی شان یہ ہے کہ جس مخلوق کا حق تعالیٰ اس بندے کو مشاہدہ کرانا چاہتا ہے اس کے اسرار اس پر وارد کرتا ہے۔ کہ ذاتِ عبد پر یہ نور مخلوقاتِ مذکورہ کے الوان سے متلون ہو کر داخل ہوتا ہے۔ مثلاً جب حق تعالیٰ اس زمین کی مخلوقات کا مشاہدہ کرانا چاہتا ہے تو ایک دفعہ یہ نور آتا ہے اور وہ اسرار جن سے بنی آدم کی آفرینش ہو رہی ہے ساتھ لے کر ذات میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ پھر دوبارہ آتا ہے تو وہ اسرار جن سے چوپایوں کی تکوین ہوئی ہے ساتھ لئے ہوئے سرایت کرتا ہے۔ پھر تیسری دفعہ آتا ہے تو وہ اسرار جن سے جمادات یعنی پھلوں اور میووں کی تکوین ہوئی ہے ان کو لئے ہوئے سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ غرض جس مخلوق کا بھی مشاہدہ کرایا جاتا ہے اوّل اس کے اسرار سے اس بندہ کی ذات کو سیراب کیا جاتا ہے اور ہر مرتبہ اس کو جانکنی کی مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ اور منجملہ مخلوقات ہی کے سید الوجود اور علم الشہود صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہیں۔ لہٰذا جب حق تعالیٰ مشاہدۂ ذاتِ محمدی کا انکشاف فرمانا چاہتا ہے تو جب تک آپؐ کی ذاتِ مقدسہ کے اسرار سے اس کو سیراب نہ کر دیا جائے وہ آپ کا مشاہدہ نہیں کر سکتا۔ اب فرض کرو کہ فتح سے قبل ذاتِ عبد بمنزلہ ایک تاریک جسم کے ہے۔ اور ذاتِ محمدی گویا ایک نور ہے جس کی ایک لاکھ یا اس سے بھی زائد شاخیں ہیں۔ تو جب اس تاریک جسم پر حق تعالیٰ لطف و کرم فرمانا چاہے گا۔ تو وہ نور جو اس کو عطا فرمائے گا وہ ان شاخوں میں یکے بعد دیگرے نفوذ کرتا (اور حسبِ طاقت اس سے متاثر و متلون ہوتا) رہے گا۔ مثلاً شعبۂ صبر (میں نفوذ کرنے سے) اس کی ضد یعنی اضطراب و بے صبری کی ظلمت زائل ہو جائے گی اور جب مثلاً شعبۂ رحمت میں جائے گا تو اسکی ضد یعنی بے دردی کی سیاہی دور ہو جائے گی اور جب مثلاً شعبۂ حلم میں جائے گا تو اس کی ضد یعنی عدم تحمل کی سیاہی مٹ جائے گی۔ غرض اسی طرح ذاتِ مطہرہ کے تمامی شعبوں میں وہ نور جائے گا اور ذاتِ مظلمہ سے تمامی اوصافِ مظلمہ کی تاریکیاں زائل ہو جائیں گی۔ اس وقت بندہ اس قابل ہوگا کہ ذاتِ محمدیؐ کا مشاہدہ کر سکے کیونکہ جب تک ذرا سی بھی سیاہی باقی رہے گی، وہ ذات پر سیاہ نشان بنا رہے گا اور جب تک ذات سے سیاہی بالکل نکل نہ جائے گی، ذاتِ شریفہ کے مشاہدہ کی طاقت اس میں ہرگز نہ آئے گی۔ اور ذاتِ محمدیؐ کے اسرار سے سیراب کئے جانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ذاتِ ولی کو وہ کمال حاصل ہو جائے گا جو ذاتِ محمدیؐ کو حاصل ہے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اس کی ذات کو اصل آفرینش میں جتنی طاقت دی گئی ہے اس کے موافق اس کو سیرابی نصیب ہوگی۔ نیز ہماری یہ مراد بھی نہیں کہ جب ذاتِ ولی کو شاخہائے نورِ محمدی سے سیراب کیا جائے گا تو ذاتِ محمدیؐ میں نقص آ جائے گا۔ اور آپؐ کے نور کی جگہ خالی ہو جائے گی۔ کیونکہ نور سے (کتنے ہی چراغ روشن کر لو) نور اپنی جگہ سے

زائل نہیں ہوا کرتا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ بندہ کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشاہدہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک، کہ اس کے تمامی اوصافِ رذیلہ ذاتِ محمدی کے اسرارِ شریفہ و انوارِ لطیفہ کے ورود کی بدولت محو و معدوم نہ ہو جائیں اور اس میں بے شمار مقامات قطع کرنے کی ضرورت ہے۔ پس جس نے دو ہزار یا زیادہ میں حصر کر دیا ہے گویا اس نے اپنی حالت کی خبر دی ہے اور جتنی فتح اس کو نصیب ہوئی تھی اس کا حال ظاہر کیا ہے اور جو مقامات باقی رہ گئے وہ رہ گئے اور ہم نے جو یہ کہا ہے کہ جب تک ذاتِ مقدسہ کے تمامی شعبوں سے سیرابی نہ ہو گی آپ کا مشاہدہ نہ ہو گا۔ اس سے مُراد مشاہدہ علی الکمال ہے کہ فرض کرو ایک شعبہ باقی رہ گیا اور مشاہدہ حاصل ہو گیا تو مشاہدہ تو حاصل ہوا مگر بدرجہ کمال حاصل نہیں ہوا۔ واللہ اعلم۔

نیز عالم مذکور نے ایک سوال یہ کیا کہ شیخ کامل جب دعویٰ کرتا ہے کہ مرید کی تربیت ہمت اور حال کے ذریعے کیا کرتا ہے۔ تو کیا وجہ ہے کہ قرب کی حالت میں اس کو پورا نفع ہوتا ہے اور جب سفر وغیرہ سے بعد ہو جاتا ہے۔ تو مرید کے علم اور عمل اور حال (تینوں) منافع میں کمی آجاتی ہے؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ شیخ کامل کی ہمت درحقیقت اس کا نورِ ایمان ہے کہ اس کے ذریعے مرید کی تربیت کرتا اور مرید کو اسفل درجہ سے اعلیٰ درجہ پر چڑھایا کرتا ہے پس اگر شیخ کے ساتھ محبت مرید کو اپنے نورِ ایمان سے ہوتی ہے تو شیخ کی طرف سے اس کو فیضان غائب ہو یا حاضر بہرحال پہنچتا رہتا ہے۔ بلکہ شیخ کی وفات کے بعد بھی ہزاروں برس کیوں نہ گزر جائیں فیض جاری رہتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہر قرن کے اولیاء اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ ایمان سے فیض حاصل کرتے رہے۔ اور آپ کا نورِ ایمان ان کی تربیت فرماتا اور ترقی بخشتا رہا ہے کیونکہ اولیاء کی محبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (اغراضِ نفسانی سے) پاک صاف اور نورِ ایمان سے ہوا کرتی ہے۔ اور اگر مرید کی محبت شیخ کے ساتھ نورِ ایمانی سے نہ ہو بلکہ ذاتِ ترابی سے ہو تو جب تک سامنے رہے گا نفع پہنچے گا۔ اور جب ذاتِ مرید ذاتِ شیخ سے منقطع ہو جائے گی تو نفع بھی منقطع ہو جائے گا اور ذات کی محبت کی علامت یہ ہے کہ شیخ کے ساتھ تعلق و محبت کسی دنیوی یا اخروی نفع حاصل یا مضرت دفع کرنے کی غرض سے ہو۔ اور نورِ ایمان کی محبت کی شناخت یہ ہے کہ خالص لوجہ اللہ ہو۔ (کہ شیخ چونکہ اللہ کا ولی اور رسولؐ کا نائب ہے۔ اس لئے دل اس کی طرف کھنچتا اور اس کو پیارا سمجھتا ہے) کسی غرض کی خاطر نہ ہو۔ پس اگر مرید کو بحالتِ عدم موجودگیٔ شیخ کمی وضعف محسوس ہوتا ہے تو اس میں کمی اور کوتاہی اسی کی طرف سے ہے نہ کہ شیخ کی طرف سے۔ واللہ اعلم۔

نیز عالم مذکور نے ایک سوال یہ کیا کہ (وصول الی اللہ میں) طریقِ شکر اولیٰ ہے یا طریقِ مجاہدہ۔ امام شاذلی اور ان کے متبعین کا طریق شکر ہے جس کا مدار منعمِ جلالہٗ کے ساتھ فرح و سرور اور شکر امتنان پر ہے مشقتِ اعمال

اور ریاضت بدنی کے بغیر۔ اور دوسرا طریق امام غزالی اور ان کے متبعین کا ہے جس کا مدار ریاضت و مشقت اور تعب و محنت پر ہے کہ راتوں کو جاگے اور بھوک کی تکلیفیں جھیلے۔ پھر یہ دونوں طریق باہم متفق ہیں کہ کہ امام شاذلی بھی وصول کے لئے ریاضت کو ضروری کہتے اور وصول الی اللہ کے حصول یا قرب حصول پر شکر و فرح کا حکم فرماتے ہیں، یا ان کے نزدیک اول ہی دہلہ میں ابتداہی سے شکر مامور ہے (اس لئے دونوں طریق جدا ہیں؟ اور اگر جدا ہیں تو کیا ایک شخص کو دونوں طریق کا سلوک ممکن ہے یا جب تک دوسرے سے یکسو نہ ہو جائے ایک سے نفع نہیں اُٹھا سکتا؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ اصل طریق تو طریق شکر ہی ہے کہ حضرات انبیاء اور اجلہ صحابہ و دیگر اصفیاء کے قلوب اسی طریقۃ الشکر پر ہوئے ہیں جس کا حاصل یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ اللہ کی عبادت ہو اور تمامی حظوظ نفس سے بیزاری۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اپنے عجز و قصور کا اقرار اور حق ربوبیت ادا نہ کر سکنے کا اعتراف ہو، اور ہر حال اور ہمہ وقت یہ اذعان قلب میں جما ہوا ہو۔ جب حق تعالیٰ نے اس مضمون میں ان کی سچائی اور پختگی کو جانچ لیا تو اس کے صلہ میں بمقتضار لطف و کرم ان کو فتح اور اسرار ایمان سب کچھ عطا فرما دئے۔ اہل ریاضت نے جب یہ دیکھا کہ ان کو فتح اور معرفت الٰہیہ حاصل ہوگئی تو انہوں نے بھی اسی کو اپنا مطلوب و مقصود قرار دیا اور راتوں کو جاگ کر اور نمازیں پڑھ کر دنوں روزے رکھ کر اور ہمہ وقت خلوت و عزلت میں رہ کر اس کی طلب میں لگ گئے اور جو حاصل کرنا تھا انہوں نے بھی حاصل کر لیا۔ پس طریق شکر میں تو شروع ہی سے ہجرت ہوتی ہے اللہ اور اس کے رسول کی طرف نہ کہ فتح اور مکاشفات کی طرف۔ اور طریق ریاضت میں ہجرت ہوتی ہے فتح اور حصول مراتب و مشاہدات کی طرف۔ نیز طریق شکر میں سیر قلوب ہے (کہ دل کھنچے ہیں مولیٰ کی طرف) اور طریق ریاضت میں سیر ابدان ہے (کہ جسم جھکتا ہے اللہ کی طرف۔ طریق شکر میں فتح کا حصول دفعی ہے کہ بندہ کی طرف سے اس کا انتظار بھی نہیں ہوا اور وہ اپنے گناہوں سے توبہ و استغفار ہی کے مقام میں تھا کہ اچانک فتح مبین آگئی۔ (برخلاف طریق ریاضت کے اس میں طلب ہی فتح و مشاہدہ کی تھی اور وہ برسوں انتظار اور صدہا مشقتیں برداشت کرنے کے بعد نصیب ہوئی)۔ دونوں راستے صحیح اور سچے ہیں مگر شکر کا راستہ زیادہ صحیح اور با اخلاص ہے۔ ریاضت میں دونوں طریق متفق ہیں۔ مگر طریق شکر میں ریاضت ہے قلوب کی کہ ہمہ وقت وابستہ ہیں اللہ سے پڑے ہوئے ہیں اس کے آستانہ پر ایک لحظہ بھی ہٹنا نہیں جانتے، تمامی حرکات و سکنات میں پناہ پکڑے ہوئے ہیں اللہ کی، کہ اوقات حضور میں ایک لحہ کی بھی غفلت پاس نہیں پھٹکتی غرض طریق شکر میں ہمہ وقت اور دائماً تعلق مع اللہ کی ریاضت ہے اگرچہ بدن کسی بڑی عبادت میں مشغول نہیں اور اسی لئے اس طریق والے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ کبھی روزہ رکھتا ہے تو کبھی نہیں رکھتا۔ (نماز کے لئے) شب میں اٹھتا بھی ہے اور (باقی رات میں آرام سے) سونا بھی ہے۔ بیوی سے ہمبستر بھی ہوتا ہے اور تمامی

مباحات شرعیہ کو جو کہ بدنی ریاضت کے منافی ہیں اختیار کرتا ہے - اور طریق ریاضت والے کی ہجرت چونکہ حصول مراتب کی جانب ہوتی ہے اس لئے اندیشہ رہتا ہے اور) کبھی فتح حاصل ہو جانے کے بعد بھی اس کی یہی نیت قائم رہ جاتی ہے (جو اخلاص کے منافی ہے) اور اور اس کا قلب ان ہی امور میں پھنسا رہ جاتا ہے جن کا عوالم میں مشاہدہ کیا تھا، اور کشف وخوارق عادات مثلاً پانی پر چلنا اور ہوا پر اڑنا اس کی مسرت وشادمانی کا سامان بن جاتے ہیں۔ یہ لوگ تو وہ ہیں جن کے قلوب ابتدا میں بھی اللہ سے خالی رہے (کہ اس کو مطلوب نہ بنایا) اور انتہا میں بھی خالی رہے (کہ غیر اللہ سے مانوس ومسرور ہوئے) لہٰذا ان میں داخل ہوئے جن کے متعلق حق تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ بروئے اعمال سب میں زیادہ خسارہ کے اندر وہ لوگ ہیں جن کی دنیوی زندگی کی ساری محنت رائگاں گئی اور وہ سمجھتے رہے کہ ہم اعمال حسنہ کر رہے ہیں۔ البتہ بعض ایسے ہوتے ہیں کہ حصول فتح کے بعد ان کی نیت بدل جاتی اور حق تعالیٰ ان پر رحم فرما کر ان کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ لہٰذا وہ غیر سے منہ پھیر کر اللہ کے ہو جاتے ہیں مگر یہ حالت جو ان کو آخر میں نصیب ہوئی وہی ہے جو طریق شکر والے کو شروع میں نصیب تھی۔ اب خود دیکھ لو کتنا فرق ہے دونوں راستوں میں خلاصہ یہ ہے کہ طریق شکر میں چلنا پڑتا ہے قلوب کو اور طریق ریاضت میں چلتے ہیں ابدان۔ طریق شکر میں نیت خالص ہوتی ہے اور طریق ریاضت میں نیت (خود غرضی وطلب فتح سے) آمیز ہوتی ہے۔ طریق شکر میں حصول فتح دفعی ہے کہ بندہ کی طرف سے انتظار بھی نہ ہوا لہٰذا ربانی (اور وہبی) ہوئی، اور طریق ریاضت میں فتح کا حصول سبب اور تدبیر سے ہوا (لہٰذا کسبی واکتسابی ہوئی) طریق شکر کی فتح بجز مومن عارف اور محبوب مقرب کے دوسرے کو نہیں مل سکتی۔ اور ریاضت کی فتح میں (جوگی اور) عیسائی یہودی راہب بھی شریک ہو سکتے ہیں کہ اس کے ذریعہ استدراج تک پہنچ جانے (اور کشف وخوارق عادات کا ظہور ہونے لگتا ہے۔ ہماری یہ بحث مطلق ریاضت میں ہے حق ہو یا باطل (وسیلہ کشف وخوارق بنجاتی ہے) ورنہ خاص ریاضت جو امام غزالی کی طرف منسوب ہے وہ ہرگز اس میں داخل نہیں اور نہ اس میں گفتگو ہے کہ امام ممدوح تو سچے ولی اور اہل حق تھے (اور ان کا تعلیم کردہ طریق ریاضت بھی موصل الی الحق اور وسیلہ قرب الٰہی ہے۔) رہا یہ سوال کہ کوئی سالک ان دونوں طریق کو جمع کر سکتا ہے یا نہیں؟ سو جواب یہ ہے کہ دونوں میں منافات نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کا قلب تمامی حرکات وسکنات میں اللہ سے وابستہ ہو جو حاصل ہے طریق شکر کا) اور بدن اس کا مجاہدہ ریاضت میں لگا ہوا ہو (جو حاصل ہے طریق ریاضت کا)۔ واللہ اعلم **ف** حق تعالیٰ کا ارشاد ہے اَللّٰهُ یَجْتَبِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یَّشَآءُ وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ اللہ جس کو چاہتا ہے اپنا برگزیدہ بنا لیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتا ہے اس کو اپنا راستہ دکھاتا ہے۔ اس میں اشارہ ان ہی دو طریق کی جانب ہے کہ پہلا طریق طریق اجتبا کہلاتا ہے جس کا دوسرا نام طریق شکر ہے اور دوسرا طریق طریق انابت کہلاتا ہے جس کا

دوسرا نام طریق ریاضت ہے۔ پہلے طریق میں محبوبیت غالب ہے اور دوسرے میں محبّیت کا غلبہ ہے پہلے طریق میں روحانی ریاضت ہے کہ کسی حال بھی ذات حق سے قلب کی وابستگی مضمحل نہیں ہوتی مگر سکون ہوتا ہے اور دوسرے طریق میں جسمانی ریاضت ہوتی ہے کہ بدن کو ہر قسم کی تعب و مشقت میں ڈالنے کا اہتمام ہوتا ہے اور غلبہ ہوتا ہے ولولہ و شوق کا۔ کبھی تڑپ ہوتی ہے کبھی اضطراب، کبھی گریہ و زاری ہوتی ہے اور کبھی چیخ پکار ہر چند کہ دونوں طریق کا مبتدا حق تعالیٰ کا لطف و فضل ہے کہ ؎

عشق اول در دل معشوق پیدا میشود گر نہ سوزد شمع کے پروانہ شیدا میشود

اس لئے محبّیت کے لئے بھی محبوبیت شرط ہے کہ اللہ سبحانہ کی طرف سے کشش نہ ہو تو بندہ بیچارہ کر ہی کیا سکتا ہے مگر صورت حال اس طریق میں عاشقانہ اور والہانہ ہوتی ہے سوز و گداز ہوتا ہے۔ چہرہ پر زردی ہوتی ہے اور بدن میں نحافت و لاغری ؎

افروختن و سوختن و جامہ دریدن پروانہ زمن شمع زمن گل زمن آموخت

اسی غلبہ بیتابی میں شطحیات اور ایسے کلمات بھی کبھی زبان سے نکلجاتے ہیں جو صورۃً ناجائز اور بارگاہ احدیت میں سوء ادب ہوتے ہیں مگر چونکہ ان کا منشا آتش عشق ہے اس لئے نظرانداز اور مستحق عفو و درگذر ہوتے ہیں۔ ان کو وصال کی ذرا بھی جھلک نظر آتی ہے تو پھولے نہیں سماتے اور زبان سے بے اختیار نکلتا ہے ؎

امروز شاہ شاہاں مہماں شد است مارا جبریل با ملائک درباں شد است مارا

تجرد و خلوت نشینی اور عزلت و صحرا نوردی ان کا طبعی اقتضا ہوتا ہے۔ تعب اور فقر میں مزہ آتا ہے، تعلقات دنیا سے وحشت ہوتی ہے، خواب و خور خواب و خیال بن جاتا ہے اور راستہ کے کانٹے پھول معلوم ہوتے ہیں۔ راہ خدا کا جام شہادت ان کا منتہائے مقصود اور اپنے مولیٰ کے نام پر جان دیدینا ان کی اقصا مراد ہوتی ہے ؎

خرم آں روز کہ ازمنزل ویراں بروم راحت جاں طلبم وزپے جاناں بروم

نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے تادر میکدہ شاداں وغزل خواں بروم

اور طریق اجتبا و محبوبیت میں سکون و قرار ہوتا ہے طمانیت کی شان ہوتی ہے منعم ذوالجلال کی نعمہائے بیشمار کا ہر وقت تشکر و امتنان محسن لم یزل ولا یزال کے احسانات لاتعد ولاتحصی کا ہمہ وقت تصور و دھیان اور اپنے ضعف اپنی نا اہلی اپنے عجز و قصور اور اپنی بیچارگی اور ہمہ تن خطاوار ہونے کا ہر لمحہ ایسا اذعان ہوتا ہے جیسے مردہ بدست غسال کہ خوب سمجھ رہا ہے کچھ بھی نہیں ہوں۔ محض پتلہ خاک ہوں اور خاک میں ملنے والا۔ شان رضا و تسلیم ان کا لباس بنتی ہے اور کمال عبدیت و غلامی جس کا مقتضا ہے ہمہ وقت انکسار و شکستگی اور تذلل و افتقار، ان شعار و دثار قرار پاتی ہے۔ چونکہ سمجھتے ہیں کہ عمر نوح بھی ملے اور ہر لمحہ اس کا سجدہ میں گزرے تب بھی اس کی

ان گنت ہمیشگی نعمتوں میں ایک نعمت کا لاکھواں بلکہ مہا سنکھواں حق بھی ادا نہیں ہو سکتا، چہ جائیکہ یہ سجدہ بھی اسی کا کرایا ہوا اور اس کا ایک مستقل احسان ہے جس کا شکر ہم پر جدا واجب ہے اس لئے کثرت عبادت پر طبیعت نہیں ابھرتی۔ کیونکہ دل جو کہ حاکم و محرک ہے جوارح واعضاء کا وہ روز و شب اپنی کوتاہی و عجز کے دھیان میں غرق ہے اور اس لئے قلب کا یہ حضور اور آستانہ خدا پر پڑا رہنا بدن کے قبلہ رو اور سربسجود ہونے سے بڑھ جاتا ہے وہ عبادت بھی کرتے ہیں تو نادم و شرمسار ہوتے ہیں اور بزبان حال کہتے ہیں ؎

منت منہ کہ خدمت سلطاں ہمیکنم منت شناس ازو کہ بخدمت گزاشتت

واللہ اعلم۔ نیز عالم مذکور کا ایک سوال یہ تھا۔ کیا انسان اپنی خاص قابلیت کو جس کے لئے حق تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا ہے خود معلوم نہیں کر سکتا کوئی دوسرا مثلاً شیخ صالح یا برادر ناصح ہی معلوم کر سکتا ہے؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا ہاں خود بھی واقف ہو سکتا ہے۔ اس میں غور کرے کہ غالب فکر و تخیل کس حالت کا رہتا ہے اگر غلبہ اللہ کی محبت اور اس کی طرف کشش کا رہتا ہے کہ اس کی عظمتِ شان مستحضر رہتی ہے اور اس کے جلال وکبریائی کا خوف لگا رہتا ہے تو علامت ہے اس کی کہ حق تعالیٰ کا ارادہ اس کے متعلق خیر کا ہے خواہ اس کا بدن اسوقت طاعت الٰہی میں مشغول ہو یا معصیت میں کہ معصیت میں بھی مبتلا ہو گا تو اللہ سبحانہ اس کو (توبہ کی توفیق بخشے گا اور) عنقریب خیر و فلاح اور رشد و صلاح کی طرف لے آئے گا۔ پھر جس طرح (جسمانی) فطری قابلیت مثلاً شجاعت اور چستی میں قوت او ر ضعف کے درجات مختلف ہوتے ہیں کہ کھیلتے ہوئے بچوں میں غور کرو گے تو معلوم کر لو گے یہ چست ہے، اور یہ بہت سست ہے اور یہ بین بین ہے، اسی طرح (روحانی) فطری استعداد میں شان استحضار کی کمی و بیشی کا اختلاف ہوا کرتا ہے کہ بعض اونچے درجہ پر ہوتے ہیں اور ان پر استحضار جلالت خداوندی کا ہر وقت غلبہ رہتا ہے، اور بعض کو کبھی کسی وقت اس کا خیال آجاتا ہے ورنہ اکثر اوقات ان پر افکار دنیا غالب رہتے ہیں) اور بعض کی حالت متوسط درجہ پر ہوتی ہے۔ اور اس کی حقیقت یہ ہے کہ فکر و تخیل عقل کا ایک نور ہے جس کا فیضان تقدیر کی لکھت اور مقسوم ازلی کے موافق طبیعت پر ہوا کرتا ہے۔ پس اگر ذات کے ساتھ خیر کا ارادہ کیا گیا ہے تو عقل اس پر اسی کا فکر اور اسی کے اسباب کا خیال ڈالتی ہے۔ حتی کہ وہ (اسی طلب و جستجو میں لگا رہتا اور آخر کار) اس کو پا لیتا ہے اور اگر ذات کے ساتھ شر کا ارادہ کیا گیا ہے تو عقل اس پر اسی کا فکر اور اسی کے اسباب کا خیال ڈالتی ہے حتیٰ کہ وہ اسی تگ و دو میں لگا رہتا ہے اور انجام کار) اس کو پا لیتا ہے۔ پھر خیر ہو یا شر وہی تین درجے (اعلیٰ و ادنیٰ و متوسط) ہر ایک میں جاری ہوتے ہیں۔ نیز یہ قابلیت اور اس کی شناخت کچھ اسی (ایمان و کفر اور خیر و شر) میں منحصر نہیں بلکہ جو کچھ بھی تقدیر میں لکھدیا گیا ہے کہ فلاں شخص فلاں کام اس کی قابلیت بچپن ہی سے ظاہر ہونے لگتی ہے

چنانچہ چند بچوں کو سامنے بٹھاؤ جن کے متعلق ازلی تجویز نے طے کیا ہے کہ ایک ان میں منشی ہوگا اور دوسرا فوجی سپاہی اور تیسرا حجام تو دیکھو گے کہ پہلے قلم تھامنا آتا ہوگا یا کم از کم ذرا سی تنبیہ پر سمجھ لے گا کہ قلم ہاتھ میں اس طرح پکڑا کرتے ہیں، مگر اس سے واقف نہ ہوگا کہ سر مونڈنے کے لئے استرا کیونکر پکڑتے ہیں، یا تلوار کیسے لٹکایا کرتے ہیں بلکہ اس کو سمجھایا بھی جائے گا تو نہ سمجھ سکے گا اور دوسرے بچہ کو تلوار کا لٹکانا آتا ہوگا، یا ذرا بتانے سے اس کو آجائے گا۔ مگر قلم پکڑنا یا ہاتھ میں باقاعدہ استرا تھامنا بتانے سے بھی سیکھنا مشکل ہوگا۔ اور تیسرے کو استرا پکڑنا اور اس کا چلانا آتا ہوگا یا معمولی تعلیم سے بآسانی آجائے گا۔ مگر قلم تھامنا اور تلوار لٹکانا کسی کے سکھانے سے سیکھنا دشوار ہوگا۔ غرض کُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ ہر ایک کے لئے وہ کام آسان کر دیا گیا ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ ایک شخص کی طبیعت مثلاً چلتی ہے بزازہ میں اور کپڑے کی تجارت کا خیال اس پر غالب رہتا ہے لیکن اس کا باپ چاہتا ہے کہ اس کو کھیتی کے کام میں ڈالے (تو کتنا ہی مارے باندھے) اس میں کامیابی نہ ہوگی اور جس وقت بھی اسکو تجارت پارچہ میں لگا دیگا تو حسب خواہش ثمرہ مرتب ہوتا دیکھ لے گا۔ اس سے یہ نتیجہ نکلا کہ ہر کام کی قابلیت اس کے فکر پر مرتب ہے اور ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس کا فکر کس شغل میں دوڑ رہا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ ایک عورت کے دو لڑکے تھے اور ایک لڑکی۔ مرتے وقت عورت نے کہا کہ میرا یہ لڑکا صالحین میں سے ہوگا اور یہ لڑکا ظالمین سے، اور لڑکی کو دنیا خوب وافر ملے گی۔ لوگوں نے کہا کیا تجھے غیب کی خبر ہے؟ اس نے جواب دیا کہ غیب کی خبر تو (سوائے خدا کے کسی کو بھی) نہیں ہے۔ میں نے فراست سے قابلیت کا پتہ چلایا اور غور و فکر سے نتیجہ نکالا ہے۔ اس بچہ میں اللہ کا ڈر محسوس کیا کہ کبھی بچہ پر بھی زیادتی نہیں کرتا تھا۔ اس سے میں نے سمجھا کہ خیر و صلاح کی طرف جائے گا اور اس بچہ کی حالت اس کے برعکس دیکھی (کہ مارنے پیٹنے میں بے باک تھا) اس سے معلوم ہوا کہ شر کی طرف جائے گا۔ اور لڑکی کو دیکھا کہ چھوٹی بچی تھی اور (کپڑا مٹی سینکیں جو کچھ بھی اس کے ہاتھ آجاتا اس کی) اعلیٰ اعلیٰ درجہ کی پہونچیاں اور جھانور و دیگر زیورات بنایا کرتی اور ہر وقت اسی دھندے میں رہا کرتی تھی۔ اس سے میں نے سمجھا کہ اس کے مقدر میں خوش حالی اور دنیا کا ملنا لکھا ہے۔

میرے ایک دوست نے اپنا قصہ سنایا کہ بچپن میں میرے والد کا انتقال ہو گیا اور میں یتیم بن گیا تھا میری والدہ نے مجھے ریشم بننے کے کارخانہ میں داخل کر دیا۔ مگر میرا دل اس میں بالکل نہ لگتا تھا، دل اچاٹ اور ہر وقت ایک ضیق و گرانی رہا کرتی تھی۔ ایک دفعہ ان لوگوں پر میرا گذر ہو گیا جو چونہ کے پلاستر میں گلکاری کیا کرتے اور پھول بوٹے تراشا کرتے تھے۔ انکے کام کو دیکھ کر میں گرویدہ ہو گیا اور ایسی کشش ہوئی کہ دل بے قابو ہو گیا۔ آخر میں ان کے ساتھ لگ گیا اور بڑی آسانی کے ساتھ ان کا کام سیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ میں قید سے رہا ہو گیا اور

میرے بند کھولدئے گئے۔ اس کے بعد میں نے ریشمی کارخانہ میں قدم بھی نہ رکھا چنانچہ آج اس فن والوں کا مستری بنا ہوں۔ ایک اور شخص نے قصہ سنایا کہ میرے پاس ایک دبلا کمزور گدھا تھا جو دروازہ پر بندھا رہتا تھا میرے مکان کے سامنے محلہ میں ایک یتیم بچہ رہتا تھا جس کا شغل بجز اس کے کچھ نہ تھا کہ میرے گدھے پر آکر چڑھا کرتا۔ مگر اس کا انداز بالکل سواروں کا سا تھا۔ کانٹوں کی ایک مہمیز بنا کر پاؤں میں باندھ لیا کرتا تھا کھجور کے پٹھوں کی ایک لگام بنالی تھی اور لکڑی کو چھیل کر نیزہ قرار دے لیا تھا۔ جب ذرا نظر بچتی وہ لدّے پر آسوار ہوتا اور نیزہ ہلا ہلا کر گویا فوجی سوار کی نقل اُتارا کرتا تھا۔ جب ہم دھمکاتے تو بھاگ جاتا مگر جب موقع پاتا پھر اس پر آ چڑھتا تھا۔ جب بالغ ہوگیا تو ہم نے دیکھا کہ ملازم ہو کر ان لوگوں میں شامل ہوا جو سلطانی گھوڑے پھیرتے اور ان کو سیدھا کرتے ہیں ف ہندی مثل ہے پوت کے پاؤں پالنے ہی میں پہچانے جاتے ہیں۔ قدرت نے جس شخص کو جس کام کے لئے بنایا ہے اسی میں اس کو دلبستگی ہوتی ہے اور بچپن سے اسی کی رغبت کا ظہور ہونے لگتا ہے! اور اس میں راز یہ ہے کہ دنیا کا تمدن صدہا مختلف پیشوں کو مقتضی ہے۔ لوہار نجار معمار نداف حائک کاشتکار باغبان طباخ وغیرہ وغیرہ سب ہی کی دنیا میں ضرورت ہے کہ یہ اس کا محتاج ہے تو وہ اس کا حاجتمند ہے۔ اگر کسی ملک کی ساری رعایا کالجوں کی ڈگریاں حاصل کر کے عدالتوں اور دفاتر کی کلرک بن جائے تو خود ان کی زندگی بھی موت سے بدتر ہو جائے کہ نہ غلہ نصیب ہو کھانے کو، نہ کپڑا ملے پہننے کو، نہ معمار ہاتھ آوے مکان بنانے کو یہ نظام قدرت ہے کہ ضروریات زندگی کے سارے شعبے قائم رکھنے کے لئے ہر انسان میں ایک خاص کام کی استعداد رکھی اور اس کی طبیعت کو اسی طرف چلایا ہے جس کے لئے وہ تجویز کیا گیا ہے اگر ہم چاہیں کہ سب کو ایک ڈگر پر ڈالدیں تو ناممکن بھی ہے اور نظام عالم کی تبدیل خود ہمارے لئے مصیبت خیز بھی ہے ایسے قصے رات دن صدہا پیش آتے ہیں کہ ماں باپ اپنے بچہ کو مار مار کر مکتب میں لاتے ہیں اور برسوں اس پر جبر و قہر ہوتا ہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلتا اور آخر کار بچہ کسی صناعت یا حرفہ کی طرف جاتا ہے جس کے لئے قدرت نے اس کو بنایا اور پیدا کیا ہے۔ یہ علامت اور قرائن ایک سمجھدار شخص کو بچہ کی طبعی روش سے اس کے ہوش سنبھالتے ہی نظر آنے لگتے ہیں اور جوں جوں وہ بڑھتا ہے اس کی فطری استعداد کا ظہور ہوتا چلا جاتا ہے اسی طرح صلاح و طلاح رحم و سنگدلی عدل و ظلم حب دنیا و حب آخرت سلامتی و کجی و دیگر اخلاقی امور ہیں کہ طبیعت شروع ہی سے اس طرف چلتی اور اس میں انبساط و بشاشت لیتی ہے۔ مگر جس طرح دنیوی امور کے مختلف مقتضیات طبعیہ میں نظم کے لئے جسمانی قانون اور بادشاہ کی ضرورت ہے اسی طرح اخلاقی اقتضاءات مختلفہ کی بندش کے لئے انبیا اور شرائع کی حاجت ہے۔ خصوصاً جبکہ بعض قرائن ایسے خفی ہیں جنکا ادراک مشکل ہے اور اس لئے نہیں پتہ چل سکتا کہ اس کی فطرت کیا ہے اور وہ اس کو کس طرف لے

جاری ہے آسمانی قانون جس کا نام شریعت ہے فطرت کی روحانی کسوٹی ہے۔ جنت میں جانے کے لئے جو فریق تجویز کیا گیا ہے وہ اس کی گرویدہ ہو کر گویا اپنی کھوئی متاع کو پالیتی ہے اور دوسرا فریق جو جہنم کے لئے تجویز کیا گیا ہے وہ اس سے متوحش ہو کر سَوَآءٌ عَلَيْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس طرح پر عالم تکوین و عالم تشریع دونوں کا نظم جدا جدا حسب تجویز خداوندی اپنے طریق محمود پر چل رہا ہے اور چلتا رہیگا۔ پس اگر کسی کو اپنی طبیعت کی روش فسق و فجور کی طرف چلتی نظر آ رہی ہو تو اس کو ڈرنا چاہیئے اور اس امید پر کہ کیا خبر ہے اصلی فطرت کا تقاضہ صلاح و فلاح ہو مگر مجھے نظر نہیں آتا کوشش کرنی چاہیئے توبہ اور رجوع الی الحق کی۔ کہ ممکن ہے حضرت فضیل بن عیاض کی طرح مدت گذری ہو ڈکیتی میں مگر آخر وقت میں راکھ کے اندر چھپی ہوئی چنگاری بھڑک اٹھے اور ولی کامل بنادے کہ اصل فطرت وہی تھی جو صحبت فساق اور عادات بد کی راکھ میں دبی ہوئی خود کو بھی محسوس نہ ہوتی تھی۔ واللہ اعلم۔

ایک معلم نے اپنے شاگردوں کی فطری استعداد کا امتحان لینا چاہا اور ہر ایک کے ہاتھ میں ایک ایک پرندہ دے کر کہا کہ اس کو ایسی جگہ ذبح کر کے لاؤ جہاں کوئی نہ دیکھے۔ چنانچہ سب گوشوں اور جنگلوں میں ذبح کر کر کے لے آئے مگر ایک نوعمر بچہ جن کے متعلق مشہور ہے کہ حضرت ابوالعباس سبتی تھے، زندہ پرند کو لئے ہوئے واپس آئے اور استاذ سے کہا کہ جہاں بھی گیا اللہ کو اپنے ساتھ موجود پایا اور کوئی جگہ ایسی نہ ملی کہ اس کو ذبح کرتا اور کوئی نہ دیکھتا۔ استاد نے سمجھ لیا کہ یہ بچہ مقام معرفت پر پہنچنے والا ہے اور ان پر خاص توجہ فرمانے لگے۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کسی آدمی میں ولایت کی رگ ہوتی ہے۔ اور وہ مدت دراز تک فساق و فجار میں شامل رہتا ہے۔ مگر جس وقت بھی اللہ کا کوئی ولی اس کے پاس کو گذر جاتا ہے تو اس رگ میں باذن اللہ حیات آجاتی اور اس کو ایک انشراح او سرور حاصل ہوتا ہے۔ حالانکہ ولی سے کوئی بات بھی نہیں ہوئی اور مجمع عصاۃ میں بیٹھا ہوا ہے۔ پھر اگر اختلا و صحبت نصیب ہو جائے تب تو اس کی رگ کی حیات کا پوچھنا ہی کیا۔ دن بدن خیر و خوبی بڑھنے لگتی ہے۔ اسی طرح مثلاً کسی شخص میں سرقہ کی رگ ہوتی ہے اور وہ مدت دراز تک صلحا کی جماعت میں شامل رہتا ہے۔ پھر کسی سارق کا اس جماعت پر گذر ہوتا ہے تو (کسی پر کوئی اثر نہیں ہوتا مگر) اس کی رگ زندہ ہو جاتی ہے اور چوری کے لئے اس کا سینہ کھل جاتا ہے۔ پھر اگر دونوں میں تعارف دوستانہ ہو جائے تو کامل اور ماہر فن ہی بنجاتا ہے۔ غرض یہ باب بہت وسیع ہے خصوصًا ان کے لئے جن کو درس و تدریس میں اشتغال ہے کہ وہ تلامذہ کی استعداد کا باسانی پتہ چلا سکیں گے۔ میں الحمد للہ ستائیس برس سے تعلیمی خدمت میں مشغول ہوں حضرت ممدوح کا یہ کلام سن کر میری طبیعت سے تو بڑا بوجھ اتر گیا۔ ورنہ میری حالت یہ تھی کہ پڑھانے میں شدید محنت اٹھاتا اور یوں دل چاہا کرتا تھا کہ کسی

طرح ان کو گھول کر پلا دوں۔ مختلف تقریریں کرتا اور طرح طرح دلائل و براہین سے ایک مضمون کو طلبہ کے ذہن نشین کیا کرتا مگر دیکھتا تھا کہ ذرا سی غفلت و بے توجہی پر سب برباد ہو جاتا ہے ایسی حالت ہوتی تھی کہ جانور کو چلاتے اور قمچی مارتے رہو تو چلتا رہے مگر ذرا ہاتھ روک لو تو کھڑا ہو جائے یہ دیکھ کر اتنی کوفت ہوتی تھی کہ بیان نہیں کر سکتا اور بعض طلبہ کی یہ حالت دیکھتا تھا کہ معمولی طور پر ان کو پڑھایا مگر ہر بات ان کے ذہن میں اترتی چلی گئی اور ادنیٰ توجہ سے خلاف گمان کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ میں حیران ہو کر اس کا سبب تلاش کیا کرتا مگر کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ آخر جب حضرت سے یہ تقریر سنی تو ایک بھاری بوجھ سر سے اتر گیا اور سمجھ لیا کہ قدرت نے جس کو علم کے لئے تجویز کیا ہے اس کو کوئی رد نہیں کر سکتا۔ اور جن کو اس کا اہل نہیں بنایا کتنی ہی جد و جہد کرو ان کی فطرت کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَہٗ۔ ہر شخص کے لئے منجانب اللہ ان ہی کاموں میں سہولت و آسانی مہیا کر دی جاتی ہے جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ عالم مذکور کا ایک سوال حضرت سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی تحقیق میں تھا جس کا واقعہ یہ ہے کہ حضرت سہل میں اور ابلیس لعین میں مناظرہ ہوا۔ ابلیس نے کہا اے سہل حق تعالیٰ فرماتا ہے وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ کہ میری رحمت ہر شے کو شامل ہے اور میں بھی شے میں داخل ہوں (لہذا کیا دلیل ہے کہ رحمت الٰہیہ سے محروم رہوں) حضرت سہل نے فرمایا حق تعالیٰ فرماتا ہے فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ میں اپنی رحمت کو (قیامت کے دن) مخصوص کر دوں گا پرہیز گار بندوں کے ساتھ (اور تو چونکہ مومن بھی نہیں چہ جائیکہ متقی لہذا رحمت سے محروم رہیگا) پس آیت سابقہ میں جس رحمت کا عموم مذکور ہے وہ مقید و مخصوص ہے اتقیاء کے ساتھ۔ ابلیس نے کہا کہ مقید کرنا تو تمہاری شان ہے نہ کہ اللہ کی۔ حضرت سہل ساکت ہو گئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ اس پر حضرت محی الدین حاتمی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں اس خاص فائدہ کی تعلیم میں مقید کرنا خود ان کی شان ہے نہ کہ حق سبحانہ کی، ابلیس استاذ ہوا حضرت سہل کا۔ چونکہ علامہ شعرانی نے یہ پورا قصہ نقل کیا ہے اور شبہ کا کچھ جواب نہیں دیا اس سے سائل کو شبہ ہوا کہ شعرانیؒ نے ابلیس کا استاذ ہونا تسلیم کر لیا اور اس قول کو صحیح مان لیا۔ اس لئے حضرت ممدوح سے سوال کیا کہ (رحمت کو اتقیاء کے ساتھ) مقید کرنا تو آیہ سأکتبہا الخ) حق تعالیٰ سبحانہ ہی کی طرف سے ہوا ہے نہ کہ سہل کی طرف سے۔ پھر ابلیس کا یہ کہنا کہ مقید کرنا تمہاری شان ہے نہ کہ اللہ کی، اور حضرت سہل کا ساکت ہو جانا اور پھر حاتمی کا یہ فرمانا کہ اس نفع پہونچانے میں ابلیس استاذ و معلم ہوا حضرت سہل کا، اور علامہ شعرانی کا بھی اس واقعہ کو نقل کر کے سکوت کرنا اور کچھ جواب نہ دینا سب امور شافی جواب کے محتاج ہیں۔ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ ہاں مقید کرنا حق تعالیٰ کی طرف سے ہے نہ کہ سہل کی طرف سے۔ کیونکہ آیت میں مذکور ہے جس کا نزول من اللہ ہوا ہے۔ اور شیطان کا استدلال صریح باطل اور

غلط تھا۔ مگر حضرت سہل کا سکوت اور علامہ حاتمی کی مدح و ثنا محض اس بنا پر ہے کہ دونوں حضرات کا خیال شیطان کے اس کلام سے دوسرے مضمون کی طرف منتقل ہوا جس کو ابلیس سمجھ بھی نہ سکا۔ وہ یہ ہے کہ حضرات صوفیہ کو جب معرفت الٰہیہ نصیب ہو جاتی ہے اور وہ رب کی شان سے جیسی کہ وہ درحقیقت ہے، واقف ہو جاتے ہیں تو اپنی پہلی حالت پر کبھی نظر ڈالتے اور دیکھتے ہیں کہ ہم تو حق سبحانہ کی صفات غیر متناہیہ کو محدود و مقید ہی سمجھتے اور بڑی جہالت میں پڑے رہے۔ پس جب شیطان کی زبان سے یہ لفظ نکلا کہ مقید کرنا تمہاری شان ہے تو حضرت سہل کے اُس دبے ہوئے اثر میں حرکت پیدا ہوئی اور خوابیدہ امر جاگ اٹھا (یعنی اپنی گذشتہ حالت کہ شان حق کو مقید سمجھتے رہے یاد آگئی) اس لئے ان پر سکوت و تحیر طاری ہو گیا۔ حالانکہ نہ ابلیس ملعون کی اس قول سے یہ مراد تھی اور نہ اس کا ذہن اس کی طرف منتقل ہوا تھا۔ ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ اپنے مرید کے گھر گئے اور دروازہ پر دستک دی۔ مرید نے اندر سے جواب دیا کون صاحب ہیں آجاؤ۔ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے۔ شیخ یہ لفظ سن کر کہ یہاں میرے سوا کوئی نہیں ہے بیہوش ہو گئے (کہ ذہن توحید خدا کی طرف منتقل ہوا اور دریں خانہ بجز خدائے دیگرے نیست کے مضمون کا اثر لیا۔ حالانکہ مرید کا اس قول سے نہ یہ مطلب تھا نہ خیال بلکہ) مرید کو اپنے شیخ کے بیہوش ہو کر گر جانے کی بھی خبر نہیں ہوئی۔ اب اگر یوں کہدو کہ اس بارہ میں مرید اپنے شیخ کا استاذ ہو گیا تو گنجائش ہے کوئی حرج بھی نہیں۔ کیونکہ محبوب کی طرف ذہن منتقل ہونے کا سبب تو اسی کا قول بنا ہے) ایک لڑکی اپنے بوڑھے باپ سے ضد کر رہی تھی کہ فلاں چیز مجھے بازار سے ابھی لا کر دو۔ باپ اٹھ کر چلا تو لڑکی کی ماں نے لڑکی سے کہا تجھے ترس نہ آیا بوڑھے باپ کو تو نے تکلیف دی؟ لڑکی نے کہا باپ کے سوا اور میرا ہے کون، ایک اہل دل نے لڑکی کا یہ فقرہ سنا تو بیہوش ہو کر گر پڑے (لا الٰہ الا اللہ کی حقیقت اور ما فی قلبی غیر اللہ کے ذوق نے ذہن اپنی طرف منتقل کر کے بیتاب بنا دیا) غرض یہ شان ہے (اہل دل محبّین) صوفیہ کی کہ ایک بات کان میں پڑتی ہے تو اس کے اشارہ سے ان کی چھپی ہوئی چنگاری چمک اٹھتی ہے اور وہ مضمون ذہن میں آتا ہے جس کا قائل کو وہم و گمان بھی نہیں گذرتا۔ واللہ اعلم

نیز عالم مذکور نے ایک سوال یہ کیا کہ ایک عارف کا قول ہے ارتکاب معصیت میں مومن پر سو رحمتیں نازل ہوتی ہیں وہ سو رحمتیں کونسی ہیں جن کی اصل غضب خداوندی ہے (کہ ثمرہ ہے ارتکاب معصیت کا) اور غضب کے مبدل بہ رحمت ہونے کی حقیقت کیا ہے۔ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ اس معصیت سے مراد اس مومن کی معصیت ہے جو اپنے رب کے جلال و عظمت کا عارف ہو کہ ایسے مومن سے معصیت کا صدور (غفلت و ظلمت کے سبب نہ ہو گا بلکہ) بحکم غلبۂ تقدیر ہو گا۔ اور اس مومن عارف سے ہماری مراد صاحب

مشاہدہ نہیں ہے۔ بلکہ ہر مومن جس کا ایمان (ریاد نمود سے) خالص اور اس کا یقین (جنت دوزخ اور حشر ونشر کے متعلق) صاف اور کامل ہو مراد ہے۔ کہ جس کی یہ حالت ہو گی اس کے دل سے بحالت طاعت بھی خوف خدا جدا نہ ہوگا۔ حالت معصیت کا تو کیا پوچھنا۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے قلب میں خوف الٰہی کے مستقر و متمکن ہونے کا سبب تو اس کی معرفت اور قدرت الٰہیہ کی عظمت وسطوت سے واقفیت ہوئی ہے جو ہر لحظہ قائم ہے اور کسی حال میں بھی مفارقت نہیں کرتا حتیٰ کہ طاعت کی حالت میں بھی اس کو یہ خوف ہوگا کہ کہیں میری یہ طاعت (سوء ادب قرار پاکر) بُعد من اللہ کا سبب نہ بن جائے اس احتمال سے اس کا دل لرزیگا اور رگیں اتنا پھڑکیں گی کہ ان کو قرار نصیب نہ ہوگا۔ پھر اس خوف کے لئے کوئی وقت مخصوص نہ ہوگا) عمل سے قبل اور عین بحالت عمل اور بعد عمل ہر حال اس کو اندیشہ رہیگا کہ کہیں مجھ پر عذاب نازل نہ ہو جائے جب طاعت میں اس کی یہ حالت ہے تو معصیت کے ارتکاب پر اس خوف اور ہیبت سطوت کا کیا پوچھنا۔ ایک مومن سے معصیت کا صدور ہوا تھا اور وہ اس کے بعد چوبیس برس زندہ رہے۔ مگر اس طویل مدت میں ایک پہر بھی ایسا نہیں گذرا جس میں ان کے آنسو تھم گئے ہوں۔ ہر وقت خوف کے مارے آنکھوں سے آنسو بہتے رہتے تھے۔ پس حق تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے ایک معصیت پر جو خوف ان کے دل میں ڈالا وہ ذریعہ بن گیا صدہا حسنات کا۔ کہ چوبیس برس تک اللہ کا دھیان اور اس کی سطوت وقہاری کا مراقبہ قائم رہا۔ اور اس مدت طویلہ میں کبھی ایک معصیت بھی ان سے صادر نہ ہو سکی ماحاصل رحمت الٰہیہ کا مدار اس خوف پر ہے جو ہر وقت دل میں قائم ہو۔ اور اس کا سبب شان ربوبیت کی معرفت ہے جو روح کی طرف سے حاصل ہوا کرتی ہے ———— کہ روح عالم بالا اور ملأ الاعلیٰ کی چیز ہے جس کو معرفت الٰہیہ تمامی مخلوق میں نسبتہً زیادہ حاصل ہے۔ پس ذات عبد جب صاف ستھری ہوتی ہے تو روح اپنے معارف ہر حالت میں خواہ طاعت ہو یا معصیت اس کو دیتی رہتی ہے اور اگر ذات نجس وناپاک ہوتی ہے تو روح اپنے معارف کا فیضان اس سے روک لیتی ہے اور وہ لذات و شہوات کی طرف مائل وگرویدہ ہو کر اسی کو اپنے اندر متمکن بنا لیتی ہے اور حالت محمودہ اس کے نزدیک بمنزلہ خواب وخیال کے بن جاتی ہے۔ اور چونکہ جس شے کا غلبہ ہوا کرتا ہے اسی کا حکم چلتا ہے اس لئے اس کے تمامی اعمال تحصیل لذت کے لئے ہوتے ہیں حتیٰ کہ طاعت بھی کرتا ہے تو ذاتی اغراض کے لئے نہ کہ مقتضاً ربوبیت کی خاطر۔ اور اگر معصیت کرتا ہے تب تو لذت پانے اور مزے اڑانے کے لئے کرتا ہی ہے۔ اور اسی لئے (گریہ وبیتابی تو کیا) پروا بھی نہیں ہوتی کہ کیا ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ (رحمت وعذاب کا) مدار طاعت ومعصیت پر نہیں ہے بلکہ خوف اور عدم خوف پر ہے۔ اور درحقیقت (اس پر بھی نہیں بلکہ) معرفت اور جہل پر

مدار ہے (کہ خوف اسی کا اثر ہے۔) لہذا رحمت کی بھی شئے کے ساتھ کوئی تخصیص نہیں (بلکہ جس درجہ پر معرفت اور اس کا اثر یعنی خوف ہوگا اسی کے موافق اس کے ثمرات یعنی رحمتوں کا ترتب ہوگا) واللہ اعلم

ایک سوال عالم مذکور کا یہ تھا کہ عارف کا قول ہے، میں نے کوئی چیز نہیں دیکھی جس میں خدا نظر نہ آیا ہو ذات حق سبحانہ حلول واتحاد سے منزہ ہے پھر حادث وفانی میں باقی وواجب الوجود کیسے نظر آیا؟ حضرت نے جواب دیا کہ ذات حق نہیں بلکہ افعال حق کا نظر آنا مراد ہے۔ چونکہ ہر شے میں حق تعالیٰ کے افعال جاری وساری ہیں۔ اس لئے عارف اپنی قوت معرفت کے سبب تمامی مخلوقات میں افعال خالق کا مشاہدہ کرتا ہے۔ نیز ایک سوال یہ تھا کہ بعض کو شان حق سبحانہ کے متعلق یہ کہتے سنا ہے کہ ہم اللہ کے نہ عین ہیں نہ غیر، اس کا کیا مطلب ہے؟ فرمایا یہ ٹھیک نہیں معلوم ہوتا۔ حادث لامحالہ غیر اور مباین ہے واجب وقدیم سے۔ لہٰذا کوئی چیز بھی عین خدا نہیں ہوسکتی۔ بلاشک وشبہ غیر ہے۔ ایک سوال عالم مذکور نے یہ کیا کہ مومن کے ذہن میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا استحضار اور تشخص عالم ارواح سے ہے، یا عالم مثال سے، یا عالم خیال سے؟ اور اس صورت شریفہ سے جو گفتگو اور باتیں ہوتی ہیں آیا وہ بھی عالم خواب کی صورت شریفہ کی طرح شیطانی اثر سے محفوظ اور اس ارشاد میں داخل ہیں کہ جس نے مجھے دیکھا واقعی مجھ ہی کو دیکھا۔ کیونکہ شیطان میری صورت نہیں لے سکتا؟ حضرت ممدوح نے جواب دیا کہ یہ استحضار اس شخص کی روح اور عقل کا فعل ہے کہ جو شخص اپنا فکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف متوجہ کرے گا اس کے ذہن میں آپ کی صورت شریفہ آئے گی۔ پس اگر یہ شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت شریفہ سے واقف ہے مثلاً صحابی ہے یا ان علماء میں سے ہے جنہوں نے حلیہ شریف کو پوری تحقیق سے حاصل کیا ہے، تب تو صورت مستحضرہ واقعہ کے مطابق اور حقیقی صورت شریفہ کے موافق ہوگی۔ ورنہ ایک کامل انسان کی صورت ذہن میں آئے گی جو اعلیٰ درجہ کا حسین اور خوب صورت ہو پس ممکن ہے کہ واقعی صورت شریفہ کے موافق متصور ومستحضر ہوجائے، اور ممکن ہے کہ واقعی نہ ہو اور کچھ کسی بات میں فرق رہجائے) بہرحال (ہر دو فریق کے فکر وخیال میں جو صورت آتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت ذات ہے نہ کہ صورت روح۔ کیونکہ صورت شریفہ جسکو صحابہ نے آنکھوں سے دیکھا تھا اور علمائے جسکو بیان کیا ہے وہ ذات مبارکہ ہی کی صورت تھی نہ کہ روح شریفہ کی صورت۔ اس لئے کہ قوت فکریہ میں وہی شئے آسکتی ہے جس سے واقفیت ہو پس تمہارا یہ سوال کہ اس کا تعلق عالم روح سے ہے یا عالم مثال سے یا عالم خیال سے، اگر اس سے تمہاری مراد استحضار ہے۔ تب جواب یہ ہے کہ اس کا تعلق عالم روح سے ہے۔ یعنی یہ فعل فکر کنندہ کی روح کا ہے۔ اور اگر مراد صورت حاضرہ ہے کہ ہماری قوۃ فکریہ میں جو صورت آتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت روح ہے یا نہیں تو جواب نفی میں ہے کہ ہم بتا چکے ہیں وہ ذات محمدی کی صورت شریفہ

نہ روح محمدی کی۔ رہا یہ سوال کہ وہ گفتگو (خطا سے) محفوظ ہے یا نہیں، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اس فکر کنندہ کی ذات اگر طاہرہ ہے کہ اس کی روح اس کے ساتھ محبت کرتی (اور اپنے معارف کا فیضان اس کو پہنچاتی) ہے اور ایسی ہو گئی ہے جیسے دوست کی شان دوست کے ساتھ ہوتی ہے تب تو صورت فکریہ معصوم ہے (اور واقعی یہ گفتگو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف سے ہے) اور اگر ذات کی حالت برعکس ہے تو صورت فکر کا حکم بھی برعکس ہے۔ واللہ اعلم

میں نے ایک دن آپ سے عرض کیا کہ ایک قصہ سنا ہے کوئی بزرگ اپنی جماعت کے ساتھ ذکر میں مشغول تھے۔ دفعتہً ان میں سے ایک صاحب کا رنگ فق پڑ گیا، حالت متغیر ہو گئی اور اپنی نشست کو بدل لیا (کہ مؤدب ہو بیٹھے) کسی نے پوچھا کیا ہوا؟ تو بولے وَاعْلَمُوٓا اَنَّ فِیْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰہِ۔ منشا یہ تھا کہ اس وقت مجلس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے اور میں آپ کو دیکھ رہا ہوں پس یہ مشاہدہ اُس شخص کا مشاہدہ فتح تھا یا مشاہدہ فکر؟ فرمایا مشاہدہ فکر تھا، مشاہدہ فتح نہ تھا۔ اور مشاہدہ فکر کا درجہ اگرچہ مشاہدہ فتح سے کم ہے۔ مگر وہ بھی اسی کو نصیب ہوتا ہے جو (اللہ پر) خالص ایمان اور (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ) بے لوث محبت اور نیت صادقہ رکھتا ہو خلاصہ یہ ہے کہ جس کا تعلق ذات محمدی کیساتھ کمال درجہ پر پہنچا ہوا نہ ہو اس کو یہ مشاہدہ فکر بھی نصیب نہیں ہوتا بہتیرے لوگ اس مشاہدہ کو مشاہدہ فتح سمجھ بیٹھتے ہیں۔ حالانکہ یہ فکر کا مشاہدہ ہے اور اُسی کو ہوا کرتا ہے جو اہل فتح نہ ہو۔ با ایں ہمہ اس کے ایمان کے مقابلہ میں عامہ مومنین کا ایمان بمنزلہ عدم اور لاشے کے ہے۔

جامع کتاب کہتے ہیں کہ مشاہدہ فکریہ کی تائید اور یہ کہ اس کا وقوع اس کے لئے ہوتا ہے جس کے تئیں کامل تعلق ہو اس واقعہ سے ہو رہی ہے کہ ہمارے شہر فاس میں ایک قصاب تھا، اس کے بیٹے کا انتقال ہو گیا جس کے ساتھ اس کو محبت بہت زیادہ تھی۔ اس کی صورت ہر وقت اس کی نظروں کے سامنے پھرتی تھی اور رات دن اسی کے دھیان میں ڈوبا رہتا تھا۔ اس نے مجھ سے خود بیان کیا کہ ایک دن قصابان کی عادت کے موافق بکریاں خریدنے کے لئے میں باب الفتوح سے باہر گیا۔ مرنے والے بیٹے کے دھیان میں غرق تھا کہ خفیف سی محویت مجھ پر طاری ہوئی اور میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف آ رہا ہے حتیٰ کہ میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا اور میں اس سے باتیں کرنے لگا۔ ایک بکری میں خرید چکا تھا میں نے اسی حالت میں اس سے کہا کہ بیٹا ذرا اسے پکڑے میں دوسری بکری خرید لاؤں۔ جو لوگ میرے قریب کھڑے تھے اُنہوں نے جب سنا کہ میں مرنے والے سے باتیں کر رہا ہوں تو کہنے لگے میاں کس سے باتیں کر رہے ہو اس پر مجھے ہوش آیا اور بیٹا نظروں سے غائب ہو گیا اس وقت صدمہ و غم کا جو پہاڑ مجھ پر ٹوٹا بس اس کا حال خدا ہی جانتا ہے۔

حضرت ممدوح نے فرمایا بس مرید اور شیخ کے درمیان ایسی محبت ہونی چاہیے کہ اس سے بیحد نفع ہوتا ہے۔ نیز فرمایا کہ اس محبت والوں میں نفع اور نقصان پہنچانے کے متعلق اہلِ تصرف کی سی قوت آجاتی ہے اور فرمایا کہ آتش محبت جب بھڑکتی ہے تو کوئی چیز اسے رد نہیں کرسکتی۔ نیز فرمایا کہ ایک مرید تھا اس کو اپنے شیخ کے ساتھ بہت محبت تھی کہ کسی وقت بھی دھیان سے نہ ہٹتا تھا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ شیخ اپنے گھر میں جو کام کیا کرتے وہی کام مرید اپنے گھر میں کیا کرتا حتی کہ شیخ اپنی لڑکی کو آواز دیتے اے فاطمہ، تو مرید اپنے گھر میں یہی کہتا اے فاطمہ۔ اور شیخ یہاں کہتے فلاں کام کرو، تو مرید وہاں کہا کرتا فلاں کام کرو۔ شیخ اپنے سر پر یہاں عمامہ باندھتے تو مرید کوئی کپڑا لے کر اپنے سر پر وہاں لپیٹا کرتا تھا غرض شیخ کے ہر معاملہ میں اس کی یہی حالت ہوگئی تھی (کہ فرط محبت میں حق تعالیٰ نے خاصیت ہی یہ رکھی ہے) جب محبت اس درجہ پر پہنچ جاتی ہے تب شیخ کی میراث مرید کو ملتی ہے۔ ایک شخص کو کسی لڑکی سے عشق ہوگیا تھا اس فرطِ محبت میں اس کی یہ حالت ہوگئی تھی کہ جب کوئی شخص اس لڑکی کا نام لیکر پکارتا کہ اے فاطمہ، تو بے اختیار اس کی زبان سے نکلتا جی (گویا فنا ہوکر محبوبہ میں گھل مل گیا تھا) میں نے اس شخص کو اور اس کی حالت کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ جب بھی کوئی اس کی معشوقہ کو پکارتا تو بے حسی کے عالم میں خود اس کو بھی خبر نہ ہوتی تھی۔ اس کی زبان سے نکلا کرتا تھا۔ جی۔ جب اُمور ہزلیہ میں محبت کی یہ تاثیر ہے تو کیا پوچھنا حقیقی معاملہ والوں کا۔

حضرت منصور قطب فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کی محبت کا دعوی کرنے والوں پر یہ قصہ حجت بنے گا جو ایک عیسائی بچہ کو پیش آیا کہ اس کو ایک بڑے درجہ کے پادری کی لڑکی سے عشق ہوگیا۔ جب اس کو وصال نصیب ہوا اور دونوں ایک بستر پر لیٹے تو اس کا فکر و خیال بحر شوق و محبت میں غوطے لگانے لگا۔ محبوبہ کی نظر اس کے چہرہ پر پڑی تو ایک مسّہ نظر آیا۔ اس نے چاہا اس کو کاٹ دوں چنانچہ چاقو نکال کر اس کو چھیل دیا۔ چاقو زہر میں بجھا ہوا تھا اس لئے فوراً ہی زہر سارے بدن میں سرایت کرگیا اور اس کی روح نکل گئی مگر اسے کسی بات کی کچھ خبر نہ ہوئی۔ جب شیطانی محبت میں محب کا یہ حال ہوجاتا ہے کہ دم نکل جائے اور حس و شعور نہ ہو تو کیا حال ہونا چاہیئے مومنین کا اپنے رب کیساتھ (جبکہ ارشاد ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ — کہ مومنین کو اللہ کیساتھ عشق ہوا کرتا ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ بڑے کی محبت سے خواہ وہ نبی ہی کیوں نہ ہو، چھوٹے کو نفع نہیں ہوا کرتا جب تک کہ چھوٹے ہی کو اس بڑے کے ساتھ محبت نہ ہو۔ البتہ حق تعالیٰ کی محبت بندہ کیساتھ (اس قانون سے مستثنیٰ ہے) کہ بندہ کتنا ہی روگردان کیوں نہ ہو جب حق تعالیٰ اس سے محبت فرمائیگا تو وہ محبت اس کو ضرور نفع دے گی (اور اپنا برگزیدہ بنالیگی) نیز فرمایا کہ چھوٹے کو جب بڑے کے ساتھ محبت ہوا کرتی ہے تو بڑے کے اندر جو چیز بھی ہوتی ہے سب کھینچ لیتا ہے مگر بڑا کسی چھوٹے سے محبت

کرے تو وہ جاذب نہیں بنتا۔ اس وقت آپکے سامنے ایک آلوچہ رکھا ہوا تھا اس کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ دیکھو اگر حق تعالیٰ اس کے اندر ترش سیب کی محبت کاملہ پیدا فرمادے تو یہ سیب کی ساری ترشی کو چوس لیگا حتیٰ کہ دونوں کو چیر کر دیکھو گے تو آلوچہ میں سیب کی ترشی موجود ملے گی اور سیب کے اندر آلوچہ کا مزا برائے نام بھی نہ آئیگا (درخت کی قلم لگانا اسی قانون فطرت پر متفرع ہوا ہے) مگر اللہ تعالیٰ کی ذات اس سے بھی مستثنیٰ ہے) کہ بندہ جب اللہ کیساتھ محبت کریگا تو بندہ اسرار الٰہیہ کو نہیں کھینچ سکتا جب تک کہ حق تعالیٰ اس کے ساتھ محبت نہ فرماوے اور اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ بندہ کو حق تعالیٰ محبوب ہی اُس وقت بناتا ہے جبکہ اس کو اپنی معرفت بخشدیتا ہے اور معرفت سے اسرارِ الٰہیہ کی واقفیت ہوا کرتی ہے۔ لہٰذا بندہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف کشش ہوتی ہے برخلاف اس کے کہ بندہ کو اللہ کیساتھ محبت ہو۔ بلا معرفتِ الٰہیہ کے کہ اس سے کچھ نہیں بنتا۔ میں نے کہا لوگ کہتے ہیں کہ شیخ اپنے مرید کی ذات میں متمکن ہوتا اور اس کے ساتھ ساتھ رہتا ہے۔ فرمایا ہاں صحیح ہے مگر یہ خوبی مرید ہی کی ہے کہ جب شیخ کیساتھ اسکو محبتِ کاملہ ہوتی ہے تو وہ شیخ کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے اور مُرید کی ذات شیخ کا مسکن بنجاتی ہے جیسے حاملہ عورت کہ اپنے پیٹ کو بچہ کا مسکن بنائے ہوئے ہے مگر اس کا حمل کبھی تام ہوتا ہے کہ وضع حمل تک یکساں حالت پر رہتی ہے، اور کبھی ناقص ہوتا ہے کہ ناتمام بچہ کا اسقاط ہوجاتا ہے اور کبھی بچہ پیٹ میں سوجاتا ہے (جس سے شبہ پڑجاتا ہے کہ حمل ہے بھی یا نہیں) اور پھر افاقہ ہوجاتا (اور بچہ میں حرکت محسوس ہونے لگتی ہے) اسی طرح مرید کی تین حالتیں ہیں کہ کبھی تو شیخ کے ساتھ اس کی محبت کامل و خالص اور دائمی ہوتی ہے۔ اس صورت میں تو شیخ کے کمالات مرید کے اندر متواتر ظہور پاتے اور بڑھتے رہتے ہیں حتیٰ کہ نسبت مسلسلہ حاصل اور رسوخ نصیب ہوجاتی ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ شروع میں سچی اور کامل محبت ہوتی ہے مگر چند روز بعد کسی عارض کے پیش آجانے سے منقطع ہوجاتی ہے اور شیخ کے متعلق نیت بدل جاتی ہے تو ایسی صورت میں شیخ کے اسرار و انوار بھی بند ہوجاتے اور جو شعاعیں پہلے پھیل رہی تھیں، وہ رک جاتی ہیں اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ محبت چلتے چلتے ٹھٹک جاتی اور اسکی رفتار ترقی رک جاتی ہے مگر کبھی جلد اور کبھی کچھ دنوں بعد اور کبھی مدت طویلہ کے بعد آگے بڑھنے لگتی ہے۔ ایسی صورت میں ذات شیخ کے اسرار بھی رک جاتے ہیں اور جب محبت عود کرآتی ہے تو انکی آمد بھی عود کرآتی ہے۔ اب مرید کو اپنی حالت کا امتحان کرلینا چاہیئے کہ وہ تینوں اقسام میں کس قسم کے اندر داخل ہے اور اللہ سے توفیق اور ہدایت کی درخواست کرنی چاہیئے۔ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ قَرِیْبٌ ط

نیز آپ نے فرمایا کہ مرید کو اپنے شیخ کیساتھ محبت اگر اسکی ولایت یا علم یا کرم وغیرہ کی وجہ سے ہو تب بھی یہ محبت کچھ فائدہ نہیں دیتی۔ فائدہ مند صرف وہ محبت ہی جو بلاغرض اور صرف ذاتِ شیخ کی طرف متوجہ ہو۔ جیسے

بچوں میں ایک کو دوسرے کے ساتھ ہوا کرتی ہے کہ محبت پر اُبھارنے والی نہ کوئی غرض ہوتی ہے نہ کوئی سبب۔ محض الفت اور ذاتی کشش ہوتی ہے پس اگر مرید کو شیخ کے ساتھ اس قسم کی محبت ہے تب تو ذاتِ شیخ کی محبت ہے، اور جاذبِ انوار و اسرار ہے اور اگر اس میں دخل ہے کسی غرض اور سبب کا تو ضرور دخل ہوگا شیطان کا اور طرح طرح کے وسوسے پیش آیا کریں گے اس لئے کبھی رُکے گی اور کبھی منقطع ہو جائیگی یعنی سہ اقسام مذکورہ میں آخری دو قسموں میں دخل ہوگی (کامل و دائم قسم اول نہ بن سکے گی)۔ میں نے دریافت کیا کہ علم یا ولایت وغیرہ کی وجہ سے محبت کرنا غیر مفید کیوں ہوتا ہے؟ فرمایا اس لئے کہ اسرار و معارف وغیرہ جو کہ (سببِ محبت ہوئے ہیں) سب اللہ کی طرف سے ہیں۔ اور اللہ کی محبت سب کو ہے (اسلئے یہ محبت عام مخلوق کی سی ہوئی)۔ خاص شیخ کی محبت ابھی تک نہیں ہوئی۔ شیخ کی محبت تو اس وقت کہی جائے گی جب کہ خاص اس کی ذات سے ہو نہ کہ ان اسرار سے جو اس کی ذات میں موجود ہیں۔ میں نے کہا یوں تو شیخ کی ذات بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے بلکہ ہر چیز اللہ کی طرف سے ہے۔ پھر اس کی کیا وجہ کہ ایک کی محبت مفید اور دوسرے کی محبت مفید نہ ہو؟ فرمایا یہ سچ ہے (کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے) مگر ذاتِ شیخ سے محبت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ محبت خالص لوجہ اللہ ہو۔ کیونکہ شیخ کی ذاتِ مجرد سے تو نہ نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان (وہ تو محض آلہ و واسطہ ہے۔ نفع نقصان سب اللہ کی طرف سے پہونچتا ہے) پس جس وقت محبت کا رُخ ذاتِ شیخ کی طرف ہوگا تو یہ علامت ہوگی خلوص کی کہ (اغراض و اغیار کی) آمیزش نہیں ہے (لہٰذا مفید ہوگی کہ ہر شے میں اخلاص ہی فائدہ دیا کرتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے قبلہ کی سمت۔ کہ وہ بھی اگرچہ دیگر جہتوں کی طرح ایک جہت ہے مگر نماز میں اس کی طرف منہ کرنا علامت ہے توحید اور اخلاص کی کہ خاص اللہ کی طرف منہ کر لیا) میں نے کہا کہ انسان کیلئے تو اغراض کے بغیر چارہ ہی نہیں۔ کوئی کھیتی باڑی کرتا ہے تو غلّہ کی خاطر کرتا ہے لہٰذا زراعت کی محبت ہوئی تو غلّہ کی غرض سے ہوئی نہ کہ خود زراعت سے۔ فرمایا ہاں ٹھیک ہے لیکن اگر شروع میں غلّہ کی نیت اور ارادہ کرے اور پھر اپنا خیال دوسری طرف بٹالے اور غلہ کی فکر سے خالی الذہن بن جائے۔ تو امید ہے اس کو کثیر غلّہ حاصل ہو اور ہر کام اس کا راست آتا رہے اور اگر اس کا فکر و تخیل رات دن اسی میں پڑا رہا اور ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں لگا رہا کہ اب کیا کرنا چاہیئے اور فلاں کام کیونکر کیا جائے تو غلّہ حاصل ہونے سے پہلے ہی طرح طرح کے توہمات اس کو ستائیں گے کبھی خطرہ ہوگا دیکھئے غلّہ ہوگا یا نہیں ہوگا اور ہوگا تو کتنا ہوگا۔ کبھی فکر ہوگا کہیں ٹڈی نہ آپڑے یا اولہ اس کو تباہ نہ کر دے کبھی وہم ہوگا اس میں چور نہ گھس جائیں۔ یا فلاں دشمن اس میں آگ نہ لگا دے، وغیرہ وغیرہ۔ برخلاف پہلے شخص کے وسوسوں سے بھی راحت میں ہے اور غلہ کی فکر سے بھی امن و آرام میں۔ یہی حال اس مرید کا ہے جس کو ذاتِ شیخ کے ساتھ محبت ہو، یا ذات کیساتھ نہیں بلکہ اس کے علم و کمال کے ساتھ محبت ہو۔ ایک دن میں آپ سے باتیں کر رہا تھا کہ فرمایا حضرت منصور بر دن

شہر تشریف رکھتے ہیں کیا اُن سے ملاقات اور تعارف کو تمہارا دل چاہتا ہے؟ میں نے عرض کیا بسر و چشم۔ بھلا قطب وقت سے ملنے کو دل کیوں نہ چاہے گا۔ فرمایا مگر ہمارا تو یہ حال ہے کہ تمہارے ماں باپ سے تمہارے ہی ہمشکل اور ہم صفت تنو بچے بھی اگر پیدا ہوں تو وہ سب میری نظر میں عام لوگوں کی طرح ہوں گے اور تم تم ہی رہوگے کہ بجز تمہارے کسی کی طرف بھی نگاہ اٹھا کر نہ دیکھوں گا۔ یہ سن کر گویا مجھے ہوش آگیا اور سوتے سے آنکھ کھل گئی کہ واقعی مجھ سے کچھ نہ بنا، اور توحیدِ مطلب سے محروم رہا کیونکہ محبت کسی کی بھی شرکت کو قبول نہیں کرتی۔

نیز فرمایا کہ طالبِ اسرار، مرید کی ذات ترابی ہوا کرتی ہے اور معطی اسرار شیخ کی ذات ترابی ہوا کرتی ہے پس جب مرید کی ذات ترابی شیخ کی ذات ترابی کے ساتھ محبت کرتی اور اسی پر نظر روک لیتی ہے تو ذاتِ شیخ اپنے اسرار و معارف ذات مرید پر ڈالا کرتی ہے اور جب ذات مرید (ذات شیخ کیساتھ نہیں بلکہ) اسرار شیخ کیساتھ محبت کرتی ہے تو شیخ کی ذات ترابی اپنے اسرار و معارف کے فیضان کو روک لیتی ہے اور پھر نہ رُوح میں قدرت ہے کہ اسرار جاری کردے نہ کسی اور شے میں۔ لہٰذا مرید کو پوری کوشش کرنی چاہیئے کہ نفع سے بالکل نظر ہٹالے اور خالص ذات شیخ کی محبت رکھے (کہ نفع لینے کا طریق یہی ہے) میں نے دریافت کیا کہ اس محبت کی کوئی شناخت بھی ہے جس سے معلوم ہو کہ ذاتِ شیخ کی محبت ہے؟ فرمایا۔ ہاں دو علامتیں ہیں۔ اوّل یہ کہ مرید کی راحت منحصر ہو جائے، ذاتِ شیخ میں کہ اسی کا فکر ہو اور اسی کا دھیان۔ اسی کی خوشی ہو اور اسی کا غم۔ غرض تمامی حرکات و سکنات چھپے، اور کھلے، موجودگی میں، اور غیر موجودگی میں، ذاتِ شیخ کی بہبودی و راحت رسانی اور اسی کے متعلقات، ضروریات میں صرف ہوں کہ اپنی ضروریات و مصالح کی پروا ہی نہ ہو۔ دوم شیخ کی تعظیم اور اس کا ادب و احترام۔ حتی کہ فرض کرو شیخ کنوئیں میں پڑا ہو اور مرید عبادت خانہ میں ہو تو قلب پر بلکہ عقل پر اس کے ادب و احترام کا اتنا غلبہ ہوگا کہ اس کا عکس نظر آدیگا کہ میں کنوئیں میں پڑا ہوں اور شیخ عبادت خانہ میں ہے۔ نیز فرمایا کہ لوگ سمجھتے ہیں کہ احسان شیخ کا ہے مرید پر۔ حالانکہ درحقیقت احسان مرید کا ہے شیخ پر۔ کیونکہ ظاہر ہو چکا کہ بڑے کی محبت کچھ بھی نفع نہیں دیا کرتی اور مرید ہی کی محبت جاذبِ اسرار ہوا کرتی ہے۔ پس اگر مرید کی ذات میں صفائی و طہارت اور خیر کے قبول کرنے کی قابلیت اور محبت جاذبہ نہ ہوتی تو شیخ کچھ بھی نہ بنا سکتا۔ اگر شیخ کا محبت کرنا نفع دیا کرتا تو اس کے سارے ہی مرید واصل اور کامل بن جایا کرتے (کہ اس کو تو سارے ہی مریدوں سے محبت ہوتی ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ شیخ کیساتھ مفید اور سچی محبت ہونے کی علامت یہ ہے کہ فرض کرو اس کی ذات میں جتنے بھی اسرار اور خوبیاں تھیں سب زائل ہو جائیں اور شیخ کی ذات تمامی کمالات سے خالی ہو کر بالکل عوام کی طرح رہ جائے۔ پس اگر مرید کی محبت شیخ کیساتھ اب اسی حالت پر قائم رہے تب تو محبت سچی ہے اور ذرا بھی قدم ڈگمگائے اور اسرار شیخ کے ساتھ ساتھ اسکی محبت بھی زائل ہو جائے تو وہ جھوٹی محبت ہے۔ نیز فرمایا کہ محبت صادقہ کی ایک علامت یہ بھی ہے کہ شیخ کو وزن کرنے کی

ترازو مرید کے ہاتھ سے گر جائے یعنی شیخ کے تمامی اقوال و افعال و احوال اس کی نظر میں صحیح و صواب ہوں (اپنے کو جانچ کنندہ نہ سمجھے کہ اس کا فلاں کام میرے نزدیک شریعت کے موافق ہے اور فلاں کام خلاف شرع) اگر کوئی توجیہہ خلاف شرع فعل کی) سمجھ میں آجائے فبہا ورنہ (حقیقت کو) اللہ کے حوالہ کرے مگر یہ یقین قائم رکھے کہ شیخ ضرور حق پر ہے (اور وجہ کا میری سمجھ میں نہ آنا اس کی خطا کا مثبت نہیں) لیکن اگر شیخ کو غلطی پر سمجھا تو بس سر کے بل گرا اور کاذبین کے زمرہ میں محسوب ہوا **ف** طالب کسی کو شیخ بناتا ہے تو یہی سمجھکر بناتا ہے کہ میں چھوٹا ہوں اور یہ بڑا ہے میں راستہ سے ناواقف ہوں اور یہ اس سے آگاہ ہے۔ میں جاہل ہوں یہ عارف ہے۔ میری سمجھ ناکافی و نارسا ہے اور اس کی سمجھ عالی اور روشن ہے پس اگر مرید ہو کر بھی اس نے شیخ کی خطا و صواب کا جانچنے والا اپنے کو سمجھا تو قضیہ معکوس کر دیا اور گویا اپنے کو شیخ سے اعلیٰ و فہیم تر سمجھا مگر یہ اسی شیخ کے متعلق ہے جس کی معرفت الٰہیہ متحقق ہو چکی ہو ورنہ ظاہر ہے کہ بددین اور خلاف شرع کو شیخ بنانا ہی عقل و نقل کے خلاف ہے۔ آنرا کہ خود گم است کرا رہبری کند۔ آدابِ تصوّف کا پہلا درجہ یہ ہے کہ اول جامع طریقت و شریعت کی تلاش میں پوری جدوجہد کرے اور شریعت کی کسوٹی پر کسے بغیر کبھی کسی کو پیر نہ بنائے کہ فاسق کبھی عارف نہیں بن سکتا۔ البتہ جب شیخ مل جائے اور اس کے ہاتھ میں ہاتھ دیدے تو اب اس پر زبان یا دل سے کوئی گرفت یا اعتراض نہ کرے کہ ممکن ہے کہ صورت کچھ ہو اور حقیقت کچھ ہو۔ ایک دیندار شخص حالتِ اضطرار کو پہونچکر خنزیر کھا رہا ہے تو دیکھنے والے کے نزدیک حرام خور ہے۔ مگر درحقیقت مباح پر عمل کر رہا ہے مگر یہ حسن ظن وہیں ہو سکتا ہے جہاں ہزارہا اُمور میں اتنا محتاط و متقی ثابت ہو چکا ہے کہ مشتبہ سے بھی بچا کتا رہا ہے اور اگر عام فساق و فجار میں بھی یہ قانون حسن ظن کا جاری کریں تو پیری مریدی ایک کھیل اور اعجوبہ بن جائے۔ بایں ہمہ اس حسن ظن کا اثر اتنا ہوگا کہ شیخ کو معذور سمجھیں گے کہ خطا بھی ہوگی تو اجتہادی ہوگی جس پر اجر موعود ہے۔ باقی اتباع اس کا اس فعل میں جائز نہ ہوگا کیونکہ مرید کیلئے وہ عذر متحقق نہیں جس کا احتمال شیخ میں سے نکال کر اس کو معذور سمجھا گیا ہے لہٰذا بمقتضاء لاطاعة لمخلوق فی معصیة الخالق یہ فعل اس کے لئے معصیت ہے مگر شیخ میں اس وجہ سے نہیں کہ اس کیلئے معصیت جائز ہو گئی بلکہ اس وجہ سے کہ ابھی اس کے لئے معصیت ہونے ہی میں احتمال اور عمر بھر کے تقوے اور پرہیزگاری کی بنا پر غالب یہی کہ کوئی وجہ اباحت و جواز کی ایسی مخفی ہے جو ہماری فہم میں نہیں آئی۔ لہٰذا اس کو اس فعل میں بوجہ فقدان علت کے خاطی و گناہگار نہ سمجھیں گے۔ واللہ اعلم۔

نیز فرمایا کہ شیخ اپنے مرید سے نہ ظاہری خدمت کا طالب ہے' نہ روپیہ کا کہ مجھ پر خرچ کیا کرے' اور نہ زیادہ بدنی عبادات کا۔ بس اگر چاہتا ہے تو صرف یہی چاہتا ہے کہ شیخ کے متعلق اعتقاد رکھے کمال کا اور

توفیق کے شامل ہونے کا۔ معرفت وبصیرت کا اور قرب من اللہ کا اور اس پر قائم رہے کہ دن گذریں، مہینے گذریں اور سال پر سال گذریں مگر اس اعتقاد میں تزلزل نہ آئے۔ پس اگر یہ اعتقاد پایا گیا تو مرید کو نفع ہوگا شیخ سے، اور پھر اس خدمت سے جو وہ (بدن یا مال سے شیخ کی) کریگا۔ اور اگر یہ اعتقاد نہ پایا گیا یا پایا گیا مگر اس کو بقائے دوام نہ ہوا کہ طرح طرح کے وسوسے پیش آنے لگے تو مرید کچھ بھی نہیں۔

ایک دن میں آپ کے پاس بیٹھا ہوا تھا اور ایک شخص اور بھی بیٹھا تھا جو حضرت ممدوح کی بہت خدمت کیا کرتا اور ہر کام خود انجام دینے کیلئے اشارہ پر دوڑا کرتا تھا۔ حضرت نے اس سے فرمایا کیوں جی کیا تمہیں میرے ساتھ اللہ واسطہ کی محبت ہے؟ اس نے کہا ہاں خالص لوجہ اللہ الکریم محبت ہے جس میں نہ ریا ہے نہ سمعہ۔ فرمایا اچھا اگر تمہارے کانوں میں پڑے کہ میری نسبت سلب ہو گئی اور جو اسرار میری ذات میں تھے وہ سب زائل ہو گئے کیا پھر بھی میری محبت پر قائم رہو گے؟ اس نے کہا۔ ضرور قائم رہونگا۔ فرمایا اگر لوگ تم سے کہیں کہ میں بدخلق اور فحش گو بن گیا تو کیا پھر بھی تم کو میری محبت رہے گی۔ اس نے کہا۔ ہاں حضرت رہے گی۔ فرمایا اگر لوگ کہیں کہ میں مبتلائے معصیت ہو گیا اور اسکی پرواہ نہیں کرتا تب؟ اس نے کہا تب بھی محبت رہے گی۔ فرمایا اگر مجھے اس حالت پر سال، دو سال، دس سال، بیس سال گذر جائیں تب بھی؟ کہا جی ہاں مجھے کسی قسم کا شک وشبہ بھی پیش نہ آئے گا۔ حضرت ممدوح نے فرمایا اچھا ہم تمہارا امتحان لیں گے۔ میں یہ سُن کر کانپ گیا اور میں نے اس شخص سے کہا میاں بڑے اندیشہ کی صورت ہے۔ بھلا اندھے میں کہاں طاقت ہے کہ بینا کے امتحان میں پورا اُتر سکے۔ شیخ سے معافی مانگو اور اپنے عجز و تقصیر کا اعتراف کرو۔ چنانچہ اس نے اور میں نے بعجز و انکسار عفو واقالہ کی درخواست کی مگر جو بات ہونی تھی وہ ہو چکی تھی اس لئے کچھ دنوں بعد حضرت نے اس کو ایک بات کا حکم فرمایا جس میں اسکی بہبودی ومصلحت مضمر تھی مگر اس کی وجہ اسکے فہم میں نہ آئی اس لئے پھر گیا اور شیخ کے متعلق اس کی نیت بدل گئی (کہ حسن ظن مبدل بہ سوء ظن ہو گیا)۔ درحقیقت سر الٰہی کا تحمل وہی کر سکتا ہے جس کی طینت پاک صاف ہو، صحیح العزم ہو، نافذ العزم ہو، اعتقاد میں پختہ ہو، کہ بجز شیخ کے کسی کی طرف نگاہ بھی نہ جائے اور اپنے شیخ کے سوا سب پر نماز جنازہ پڑھ چکا ہو۔ اب ہم اس بارہ میں چند واقعات بیان کرتے ہیں۔ جن سے طالب صلاح کو عبرت حاصل ہو۔ مگر پہلے مقدمہ حکایات کی صورت میں حضرت ممدوح ہی کا واقعہ نقل کرتے ہیں۔ حضرت ممدوح نے فرمایا اس سے قبل کہ مجھے فتح نصیب ہو مجھ کو ایک لمبی سیاہ ڈراؤنی صورت اونٹ کی شکل پر دکھائی دی۔ جب حق تعالیٰ نے مجھے فتح نصیب فرمائی اور میں نے تمامی عوالم میں جتنا حق تعالیٰ نے میرے لئے مقدر فرمایا تھا اس کا مشاہدہ کیا تو اس خوفناک صورت کو میں نے تلاش کیا کہ کہاں اور

کس عالم اور کس ملک کی ہے۔ مگر کہیں نہ پایا اور اس کا کوئی پتہ مجھے کہیں نہ لگا۔ تب میں نے حضرت محمد بن عبدالکریم سے اس کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اس صورت کی جنس کا کہیں وجود نہیں ہے میں نے کہا پھر وہ کیا چیز تھی جو میرے مشاہدہ میں آئی۔ فرمایا وہ صرف تمہاری روح کا فعل تھا میں نے کہا۔ یہ کیسے؟ فرمایا۔ ذات جب کسی (خیالی و فرضی) صورت کو اپنے سامنے لاتی اور اسکا پختہ یقین کرتی ہے (کہ وہ واقعی ایک چیز موجود ہے) تو رُوح اس صورت کے موجود کرنے میں جس کا ذات نے یقین کر لیا ہے اور اس سے ڈر رہی ہے ذات کی موافقت کیا کرتی اور اس کو موجود بنا کر سامنے لا کھڑا کرتی ہے۔ اگرچہ اسمیں ذات کے لئے ضرر ہی کیوں نہ ہو اس کے بعد حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ذات کا یہ پختہ یقین جس کا نام جزم ہے ایسی چیز ہے کہ کوئی چیز اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ نہ جانب خیر میں نہ جانب شر میں (چنانچہ امر شر میں اسی سے کام لیکر مسمریزم ایجاد ہوا اور امر خیر میں اس کو ذریعۂ اصلاح خلق بنایا گیا) پھر حضرت محمد بن عبدالکریم نے فرمایا کہ فتح نصیب ہونے سے قبل میرا ایک مقام پر گذر ہوا۔ راستہ میں دریا پڑا جس کو کشتی کے بغیر عبور کرنا ممکن نہ تھا اس وقت مجھے ایک جزم عظیم حاصل ہوا کہ میں پانی پر چلا جاؤنگا اور ہرگز نہ ڈوبونگا۔ چنانچہ میں نے سطحِ آب پر پاؤں رکھدیا۔ میرا جزم بڑھتا جاتا تھا اور میں پانی پر (خشکی کی طرح) چل رہا تھا حتیٰ کہ دوسرے کنارہ پر پہنچ گیا۔ جب دوسری مرتبہ پھر اس مقام پر آیا تو وہ جزم زائل ہو گیا اور مجھے شک پیدا ہوا (کہ دیکھئے چل سکوں یا نہ چل سکوں) چنانچہ آزمائش کیلئے میں نے پاؤں ڈالا تو وہ پانی میں ڈوب گیا۔ میں نے جلدی سے اس کو باہر نکال لیا اور سمجھ لیا کہ پانی پر اب نہیں چل سکتا۔ حضرت ممدوح نے فرمایا۔ جب تک ذات کو کسی شے کا جزم حاصل رہتا ہے شیطان اس کے پاس نہیں پھٹک سکتا۔ وہ پاس اسی وقت آتا ہے جب جزم جاتا رہتا ہے اور شیطان کو اس کے جانے کا علم ہو جاتا ہے کیونکہ بنی آدم میں جہاں جہاں خون چلتا ہے وہاں تک شیطان کی بھی رسائی ہے اس لئے جب دیکھتا ہے کہ جزم جاتا رہا تو آتا ہے اور طرح طرح کے وسوسے ڈالتا ہے حتیٰ کہ خیر و خوبی اس کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جزم گویا شہر کی مضبوط فصیل ہے جب تک فصیل قائم رہے گی دشمن کو شہر میں گھسنے کی طمع اور توقع نہ ہو سکے گی اور جب فصیل میں نقصان آئیگا اور اس میں دروازے اور شگاف کھل جائیں گے تو دشمن شہر کے اندر گھسنے میں عجلت کریگا۔ پس شیطان اور اس کے وسوسوں کا عیب تابع ہے ذات کی فصیل یعنی جزم کے عیب کا۔ لہٰذا عقلمند کو چاہیئے کہ اپنی ذات کی فصیل کو مضبوط کرے تاکہ نہ شیطان پاس آسکے نہ کوئی انسان جگہ سے ہلا سکے۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جب کوئی سچا شخص کسی سے دنیا یا آخرت کے متعلق کسی شے کا وعدہ کرے تو اس کو چاہیئے کہ اپنے دل کو ٹٹول لے۔ اگر اس کا وعدہ سننے کے وقت اس کو سکون و اطمینان اور وعدہ کے سچائی کا جزم حاصل ہو تب تو علامت

ہے کہ یہ شے اسکو ضرور ملے گی اور اگر وعدہ سنتے کے وقت تذبذب و اضطراب اور وعدہ کی سچائی میں شک و شبہ ہو تو علامت ہے کہ یہ شے اُسے ہرگز نہ ملے گی۔ غرض جزم علامت ہے اہل صدق و تحقیق کی۔ خدا ہمیں اپنے لطف و کرم سے اس کی حلاوت و اسرار نصیب فرمائے۔ اب حکایات سنو۔

حضرت نے فرمایا۔ ایک شخص کو صلحاء کیساتھ محبت تھی۔ حق تعالیٰ نے اس کے دل میں ڈالا کہ کسی صالح کی خدمت میں رہ کر کچھ حاصل کرے۔ لہٰذا اس نے ساری پونجی بیچکر روپیہ جمع کیا اور اس کو لیکر گھر سے چل پڑا۔ ایک شخص کی صلاح و بزرگی کی شہرت تھی اور چارطرف سے مخلوق اس کے پاس جوق جوق آتی تھی اسکے شہر میں پہونچکر گھر کا پتہ لگایا اور دروازہ پر دستک دی۔ اندر سے خادمہ آئی اور پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ اس نے کہا عبد العلی۔ یہ شخص جس کی بزرگی مشہور تھی، درحقیقت بددین فاسق تھا اور اس کے ایک خاص ہم صحبت کا نام بھی عبد العلی تھا جو شراب و کباب میں اسکا ہم پیالہ و ہم نوالہ رہتا تھا۔ خادمہ نے جاکر اطلاع دی کہ دروازہ پر جس نے دستک دی تھی اس کا نام عبد العلی ہے۔ شیخ نے اپنا قدیم خاص سمجھکر کہدیا کہ اندر بلالے چنانچہ یہ شخص اندر آیا اور دیکھا کہ شراب سامنے رکھی ہے اور ایک کسبی بغل میں بیٹھی ہے۔ حق تعالیٰ نے ان سب باتوں سے غفلت اس کو نصیب فرمائی اور اس نے کہا حضرت میں نے اپنے وطن میں آپ کی شہرت سنی تھی اور اس ارادہ سے آیا ہوں کہ مجھے اللہ کا راستہ بتائیں اور یہ میری عمر بھر کی پونجی ہے جو اللہ کے واسطے آپکی نذر کرنے کو لایا ہوں۔ شیخ نے اس کو لے لیا اور کہا اللہ تمہاری خدمت قبول فرمائے۔ اس کے بعد خادمہ سے کہا اس کو ایک روٹی دیکر کھرپا کھدال پکڑادے کہ ہمارے فلاں باغ میں جاکر فلاں خدمت انجام دیا کرے۔ چنانچہ یہ مسکین اسی وقت باغ میں چلا گیا اور اسکا دل اس پر مطمئن و مسرور تھا کہ شیخ نے خدمت میں قبول فرمالیا حالانکہ سفر کا تعب و تکان تھا مگر اس نے ذرا بھی آرام کرنا پسند نہ کیا اور نہایت انبساط و نشاط کے ساتھ فوراً باغ کی خدمت میں لگ گیا۔ اس کی خوش نصیبی اور اللہ کا اس پر انعام کہ اس کا بددین شیخ کے پاس آنا عین اُس وقت تھا جبکہ اہلِ دیوان میں ایک بڑے عارف کی وفات کا وقت قریب آچکا تھا اور غوث مع ساتوں اقطاب کے اُنکے پاس آئے ہوئے ان سے یہ کہہ رہے تھے کہ دوست ہم نے کتنی مرتبہ تم سے کہا کہ کسی اسلامی شہر میں جاکر اپنا وارث تلاش کرو مگر تم نے ہمارا کہنا نہ مانا۔ اب تمہاری وفات کا وقت آپہونچا اور تمہارا سرِ باطن ضائع ہوجائیگا اور تم بغیر وارث کے دنیا سے جاؤگے۔ عارف نے کہا اے میرے بزرگو مجھے اپنی جگہ سے کہیں جانا بھی نہ پڑا اور اللہ پاک نے میرا وارث یہیں بھیجدیا انہوں نے دریافت کیا کہ وہ کون؟ کہا وہی عبد العلی جو فلاں بددین کے پاس آیا ہے۔ ذرا اللہ کیساتھ اس کے حسن طبیعت اور کمال صدق اور رسوخ خاطر اور پختگی جزم پر تو نظر ڈالو کہ اتنا کچھ دیکھکر بھی اپنے ارادہ سے متزلزل نہیں ہوا اور نہ اسے

کوئی وسوسہ پیش آیا۔ یہ صفائی و جزم جو اس کی ذات میں موجود ہے کیا آپ حضرات کے کبھی سننے میں آئی ہے؟ اور کیا اسکے وارث بنانے میں آپ حضرات میری موافقت فرمائیں گے؟ سب نے کہا ہاں ٹھیک ہے آتنا کہتے ہی عارف کی رُوح پرواز کر گئی اور حق تعالیٰ نے عبد العلی کو اس کے حسن نیت کے صلہ میں سرِّ باطنی کا ترکہ دیکر فتح نصیب فرمادی۔ اس وقت اس کو علم ہوا کہ یہ رحمتِ الٰہیہ ہے یہ کدھر سے آئی اور وہ شیخ جس کے پاس آیا تھا بددین و کذاب تھا۔ جو نعمت ملی وہ محض نیت اور جزم کی وجہ سے ملی۔

ایک شیخ کے مریدوں میں ایک سچّا مرید تھا۔ شیخ نے ایک روز اس کا امتحان لینا چاہا اور اس سے پوچھا کیوں جی تم کو ہمارے ساتھ محبّت ہے؟ اُس نے کہا۔ ہاں حضرت ہے۔ فرمایا اپنے باپ کیساتھ زیادہ محبت ہے یا ہمارے ساتھ؟ اس نے کہا آپکے ساتھ زیادہ ہے۔ فرمایا بھلا اگر میں تم سے کہوں کہ اپنے باپ کا سر مجھے لادو تو کیا تعمیل کروگے؟ کہا حضرت تعمیل کیوں نہ کرونگا۔ اسی وقت دیکھ لیجئے۔ یہ کہتے ہی وہاں سے چل دیا اور چونکہ شب کا وقت تھا اور مخلوق سو چکی تھی۔ اس لئے دیوار پھاند کر اپنے گھر کی چھت پر گیا اور وہاں سے نیچے اتر کر اس مکان میں آیا جہاں اس کے والدین رہا کرتے تھے۔ دیکھا کہ باپ اس کی ماں سے ہم بستری کر رہا ہے۔ فراغت کا بھی انتظار نہ کیا اور گھٹنے اس کے اُوپر رکھکر اس کا سر کاٹ لیا۔ سر لیکر شیخ کے پاس آیا اور سامنے ڈالدیا کہ لیجئے حضرت حکم کی تعمیل کر لایا۔ شیخ نے کہا۔ کیا اپنے باپ کا سر لے آیا؟ کہا ہاں حضرت یہ آپکے سامنے پڑا ہے۔ شیخ نے فرمایا۔ کمبخت میں نے تو مذاق میں کہا تھا۔ مرید نے کہا میرے نزدیک تو حضرت کا ہر کلام واقعی ہے، اسکو مذاق سمجھتا ہی نہیں۔ تب شیخ نے کہا۔ ذرا غور سے دیکھو کیا یہ سر تمہارے باپ کا ہی ہے۔ مرید نے دیکھا تو باپ کا سر نہ تھا۔ شیخ نے کہا یہ کس کا سر ہے؟ مرید نے کہا یہ تو فلاں مجوسی غلام کا ہے۔ مرید کے وطن میں رواج تھا کہ مجوسی غلام زیادہ رکھتے تھے جیسا کہ آجکل حبشی غلاموں کے رکھنے کا رواج غالب ہے۔ اُس رات اس کا والد کہیں باہر گیا تھا اور اس کی ماں نے خائنہ بن کر اپنی ناموس کو مجوسی غلام کے حوالہ کیا۔ شیخ کو کشف کے ذریعہ حال معلوم ہوا اور مرید کے امتحان کی صورت میں اس کا قتل عمل میں آیا مگر معلوم ہو گیا کہ مرید اپنے عزم و ارادت میں گویا اٹل پہاڑ ہے۔ چنانچہ شیخ کے سرِّ باطن کا وہی وارث اور فتح پر اُنکے بعد وہی قابض ہوا۔

ایک عارف کے پاس ایک طالب آیا اور کہا حضرت مجھے اپنی خدمت میں اللہ واسطے قبول فرمالیجئے۔ فرمایا۔ بہت اچھا ہمارے پاس رہو۔ اس کے بعد ایک بیلچہ اس کے حوالے کیا جس کے سرے پر ایک آہنی خول بمد زائد تھا جس کا کوئی نفع نہ تھا، فضول بوجھ تھا جس سے بیلچہ بھاری ہو گیا تھا۔ یہی مرید شیخ کا وارث قرار پایا تھا۔ بشرطیکہ اس آہنی خول کی طرف توجہ نہ کرے اور اگر اس پر متنبہ ہوا اور اس نے دریافت کیا

کہ اس خول سے کیا فائدہ ہے اور کس غرض کے لئے اس کو لگایا گیا ہے، اور بجز اس کے کہ بیلچہ وزنی ہوگیا۔ اسکا اور کوئی نفع نہیں ہے، تو اس کو شیخ کا ترکہ کچھ نہ ملے گا۔ چنانچہ وہ کامل سات برس شیخ کی خدمت میں رہا اور اس بیلچہ سے کام کرتا رہا مگر کبھی وسوسہ بھی نہ آیا کہ یہ آہنی خول کیوں لگایا گیا ہے۔

ایک[۴] عارف کا وارث ہونیوالا ایک سچا مرید تھا جو مدتِ دراز تک انکی خدمت میں رہا اور حق تعالیٰ نے اسکو شیخ کے اکثر امور ایسے دکھلائے جو صورۃً خلافِ شرع تھے مگر مرید کی ارادت میں فرق نہ آیا۔ جب شیخ کی وفات کے بعد حق تعالیٰ نے اس کو فتح نصیب فرمائی تب مشاہدہ ہوا کہ صرف اشتباہ تھا اور حقیقت بالکل حق تھی۔ ایک عورت مشہور فاحشہ تھی۔ ایک دفعہ مرید نے دیکھا کہ شیخ اسکے ساتھ ہم خلوت ہیں مگر فتح کے بعد معلوم ہوا کہ شیخ کی زوجہ بالکل اس کی ہم شکل تھیں اور ہمبستری ان سے ہوئی تھی۔ ایک دفعہ ہمبستری کے بعد شیخ نے تیمم سے نماز پڑھی بظاہر غسل نہ کرنے کا کوئی سبب نظر نہ آیا مگر حصول مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ اندرونی مرض تھا جس میں پانی کا استعمال مضر تھا۔ ایک دفعہ معلوم ہوا کہ شراب پی رہے ہیں مگر حصولِ مشاہدہ کے بعد معلوم ہوا کہ فالسہ کا شربت تھا اور محض شراب کا ہم رنگ تھا۔

ایک[۵] مرید کا پیر بھائی تھا۔ اس کا انتقال ہوگیا اور مرید تنہا رہ گیا۔ اس نے اپنا معمول کر لیا کہ جو چیز بھی اس کو حاصل ہوتی اسکے دو حصے کرتا، ایک خود رکھتا اور دوسرا پیر بھائی کے بچوں کو دیدیا کرتا تھا۔ اس کی کچھ زمین حقیقی بھائیوں میں مشترک تھی جس کو حکومت کی طرف سے ظلماً فروخت کر دیا گیا۔ اسکی قیمت میں جتنا حصہ اس کے ہاتھ میں آیا اسکی مقدار ہمارے زمانے کے سکہ سے چالیس دینار (سو روپیہ کے برابر) تھی۔ اسکے بھائیوں نے اس سے پوچھا کہ اپنی رقم کس کام میں لاؤ گے؟ کہا اپنے اور اپنے پیر بھائی کی اولاد کے درمیان نصفا نصف کرونگا بھائی کہنے لگے ہم نے تجھ سا احمق بھی کوئی نہیں دیکھا، ارے کوئی جائداد خرید کہ رقم محفوظ رہے اور اس حماقت کو چھوڑ جس میں لگا ہوا ہے۔ یہ سن کر اس کے نفس نے چاہا کہ بھائیوں کے مشورے کی طرف مائل ہو مگر اس نے اپنے نفس کو خطاب کیا کہ اے نفس بھلا کیا جواب دیگا اپنے اللہ کو جبکہ تو اس کے سامنے کھڑا ہوگا اور وہ دریافت فرمائیگا کہ ہم نے تجھے چالیس دینار عطا کئے تھے مگر تو نے اپنے آپ کو ترجیح دیکر حق اخوت کو ضائع کر دیا۔ لہٰذا آج ہم بھی تجھے ضائع کر دیں گے جیسا کہ تو نے اخوت کو ضائع کیا تھا۔ چنانچہ اسی وقت اس نے رقم کو نصفا نصف بانٹ دیا۔ بھائیوں کے پاس سے چلا ہی تھا کہ حق تعالیٰ نے اس کو فتح نصیب فرمادی اور چشم بصیرت وا ہوگئی۔ حق تعالیٰ نے حسن نیت اور صدق عزم کی بدولت ایک لمحہ میں عارف بنالیا اور وہ نعمت بخشی جو نہ آنکھوں نے دیکھی نہ کانوں نے سنی نہ کسی قلب پر اس کا وہم و خیال آیا۔

ایک شیخ کے بکثرت مرید تھے مگر انکا خیال ایک کی طرف تھا کہ میرا وارث ہوگا۔ اسلئے ایک مرتبہ اُس کو

آزمایا کہ ایسی صورت ظاہر کی کہ گویا اجنبی عورت آئی اور شیخ اس کو خلوت میں لے گئے۔ یہ دیکھکر سارے مُرید رفوچکر ہوگئے صرف یہی ایک رہ گیا بلکہ غسل کے لئے پانی لا کر گرم کرنے لگا جب شیخ باہر نکلے تو فرمایا کیا کر رہا ہے؟ عرض کیا کہ عورت کیساتھ حضرت کو خلوت میں جاتے دیکھا تھا اس سے خیال ہوا کہ شاید حضرت کو غسل کی ضرورت ہوگی اسلئے پانی گرم کر رہا ہوں۔ شیخ نے کہا کیا مجھے معصیت پر بھی دیکھکر تو میرے ساتھ رہے گا؟ مرید نے کہا حضرت کا ساتھ کیسے چھوڑ سکتا ہوں جب کہ معصیت کا ارتکاب آپ سے ناممکن نہیں۔ معصیت تو صرف نبی سے ناممکن ہے، اور میں نے آپکا دامن یہ سمجھکر نہیں پکڑا کہ آپ نبی ہیں اور آپ سے معصیت ہو نہیں سکتی، صرف یہ سمجھ کر دامن پکڑا ہے کہ آپ بشر ہیں اور راستہ کے مجھ سے زیادہ واقف ہیں اور یہ راستہ کی واقفیت آپ میں اب بھی موجود ہے۔ ارتکاب معصیت سے جاتی نہیں رہی۔ پھر میری نیت کیوں بدلے اور میری طبیعت متغیر کیوں ہو اس وقت شیخ نے فرمایا صاحبزادہ وہ دنیا تھی جو عورت کی شکل بنکر میرے پاس آئی تھی۔ میں اس سے متمتع ہوا اور ایسا میں نے عمداً کیا تاکہ یہ بازاری لوگ مجھ سے جُدا ہو جائیں۔ اب تم میرے ساتھ خلوت میں آؤ اور دیکھو اندر کیا کوئی عورت ہے؟ چنانچہ وہ حجرہ میں گیا اور دیکھا کہ وہاں کچھ بھی نہیں۔

حضرت شیخ تاج الدین مصری کے شاگرد مولانا محی الدین کی کتاب میں یہ قصہ میں نے لکھا ہوا دیکھا کہ ایک طالب کسی بڑے عارف کے پاس آیا اور درخواست کی کہ حضرت مجھے سرِّ باطنی عطا فرما دیجئے۔ شیخ نے کہا میاں تم اس کی طاقت نہیں رکھتے۔ اس نے کہا نہیں حضرت مجھ میں اس کی طاقت ہے اور میں اس کو ضرور برداشت کرونگا۔ شیخ نے اس کو آزمانا چاہا اور فرمایا اچھا ٹھہرو اور چند روز ہمارے پاس رہو۔ ہم تم کو سر عطا کر دینگے۔ شیخ کے پاس ایک نوعمر لڑکا رہتا تھا جو کسی بڑے شخص کا بیٹا تھا۔ شیخ نے اس کو ایک مکان میں چھپ جانے کا حکم دیا کہ کسی کو بھی خبر نہ ہو۔ اس کے بعد اپنے حجرہ میں ایک بکری لیجا کر خفیہ طریق سے اس کو ذبح کیا اور کچھ خون اس کا اپنے کپڑوں پر لگایا پھر چھری ہاتھ میں لئے ہوئے کہ اس سے خون ٹپک رہا تھا اور ہاتھ پر بہہ رہا تھا۔ غیظ و غضب کی صورت بنائے ہوئے اس طالب سر مرید کے پاس تشریف لائے۔ مرید نے گھبرا کر پوچھا حضرت کیا ہوا۔ فرمایا فلاں نوعمر بچہ کی ایک حرکت پر مجھے غصّہ آگیا اور اتنا آیا کہ میں بے قابو ہو گیا۔ آخر میں نے اس کو ذبح کر دیا اور حجرہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا دیکھو وہ اس میں ذبح ہوا پڑا ہے پس اگر تم مجھ سے سرِّ باطنی لینا چاہتے ہو تو عزیزمن اس راز کو پوشیدہ رکھیو اور کسی سے بھی اس راز کا تذکرہ نہ کیجو۔ جب اس کا باپ مجھ سے پوچھے گا تو میں کہدونگا کہ وہ بیمار ہو گیا تھا اور انتقال کر گیا (چونکہ وہ میرا معتقد ہے اسلئے) میری بات کو سچ سمجھے گا اور بات رفع دفع ہو جائیگی لہٰذا تم اس میں میری موافقت کرو اور میرا پردہ ڈھانپے رکھو۔ ایسا کروگے تو انشاء اللہ میں تم کو سرِّ باطنی دیدونگا۔ مرید کا یہ سنتے ہی رنگ بدل گیا اور چہرہ پر بل پڑ گئے۔ غصّہ برسنے لگا اور یہ سمجھ کر کہ شیخ اب میرے قبضے میں ہے منہ بنا کر جواب دیا بہت اچھا ایسا ہی کروں گا اس کے بعد وہاں سے چلا اور لپکا ہوا لڑکے

کے باپ کے پاس پہنچا۔ اسکو سارا قصہ سنایا اور کہا اس مکار کذاب پیر نے جسے تم بزرگ سمجھے بیٹھے ہو تمہارے لڑکے کو ذبح کر ڈالا اور میرے پاس آکر خواہشمند ہوا کہ اس کو چھپائے رکھوں اور تم سے اس کا ذکر نہ کروں۔ اگر تمہیں اس کے متعلق کوئی شک و شبہ ہے تو ابھی میرے ساتھ چلو۔ آنکھوں سے دیکھ لوگے کہ بچہ اپنے خون میں لتھڑا پڑا ہے۔ سننے والوں نے کہا نہیں میاں فلاں حضرت ایسا نہیں کر سکتے۔ تم کو ضرور کوئی اشتباہ ہوا ہے۔ اس نے کہا میرے ساتھ چلو تمہیں میرا جھوٹ سچ ابھی معلوم ہو جائیگا۔ غرض یہ بات چار طرف پھیل گئی اور فسرانِ حکومت کے کانوں میں پڑ گئی۔ وہ بعجلت تمام شیخ کی طرف چلے کہ مُرید انکے آگے آگے تھا اور حجرہ کے سامنے کھڑے ہو کر کواڑوں پر دستک دی۔ شیخ باہر نکلے تو دیکھا کہ کثیر مجمع ہے پوچھا کیا بات ہے آپ لوگ کیسے آئے؟ انہوں نے مرید کی طرف اشارہ کیا اور کہا کیا تم نے سنا نہیں یہ کیا کہہ رہا ہے؟ شیخ نے کہا کیا بات ہوئی بتاؤ۔ مُرید بولا وہی بات ہے جس کی مجھے ترغیب دے رہے تھے کہ چھپائے رکھیو کسی سے کہیو مت۔ شیخ نے کہا کونسی بات؟ میرے اور تمہارے درمیان تو کوئی بات ہوئی نہیں اور نہ میں نے تم سے کچھ کہا۔ مرید نے کہا میاں جھوٹ بولکر جان نہیں بچ سکتی۔ تم لوگوں کے بچوں کو قتل کرتے ہو۔ اس پر چار طرف سے شیخ پر بوچھاڑ پڑنی شروع ہوئی کہ تو نے بچے کو قتل کیا ہے، اب ہم تجھے قتل کرینگے اے دشمن خدا اپنی عبادت سے خلق خدا کو فریب دیتا اور اپنی خلوت و گوشہ نشینی سے لوگوں کو دھوکہ میں ڈالتا ہے۔ شیخ نے فرمایا اس سے دریافت تو کرو اس کو معلوم کیسے ہوا کہ میں نے قتل کیا ہے۔ مرید نے کہا جب تم میرے پاس آئے تھے کیا تمہارے ہاتھوں اور کپڑوں پر خون لگا ہوا نہیں تھا؟ شیخ نے کہا ہاں ٹھیک ہے۔ میں نے بکری ذبح کی تھی۔ مرید نے کہا کہ اگر سچے ہو تو ہم حجرہ کے اندر جاکر دیکھیں گے چنانچہ لوگ اندر گئے تو دیکھا کہ واقعی بکری ذبح ہوئی پڑی ہے مرید نے کہا تم نے مقتول کو کہیں چھپا دیا ہے اور بکری کو ذبح کر کے اسکی جگہ ڈال دیا ہے تاکہ (قصاص میں) قتل نہ کئے جاؤ۔ شیخ نے فرمایا بھلا وہ نوجوان اگر صحیح سالم باہر آجائے تب تو سمجھے گا کہ تو جھوٹا اور بد نصیب ہے؟ مرید نے کہا سچے ہو تو اسے باہر نکالو۔ چنانچہ شیخ نے آدمی بھیجکر اُس نوجوان کو بلوایا اور وہ سامنے کھڑا ہو گیا کہ اس بیچارہ کو اس واقعہ کا کچھ بھی علم نہ تھا۔ لوگوں نے اس کو دیکھا تو شیخ کے پاؤں پکڑ لئے اور اس جھوٹے مرید کو گالیاں دینے لگے۔

اس وقت شیخ نے اس سے فرمایا ارے جھوٹے تو تو دعوے کرتا تھا کہ میں سرِّ الٰہی کی طاقت رکھتا ہوں حالانکہ اتنی سی بات کے چھپائے رکھنے پر قادر نہ ہوا جو درحقیقت کچھ بھی نہ تھی۔ میں نے تو جو کچھ کہا تھا تیرے اس دعویٰ پر کہا تھا کہ میں سرِّ الٰہی کی برداشت کر سکتا ہوں۔ جا ہم نے تجھے وہ سر عطا کیا جو تجھ جیسوں کے لائق اور شایانِ شان ہے۔ اس دن کے بعد اس مرید کی جو حالت ہوئی وہ موجب عبرت تھی اور مدعی کاذب کے لئے ایک عذاب الٰہی تھی۔

ایک شخص کو عجیب واقعہ پیش آیا۔ بلاد مغرب کے باشندے تھے اور ہر سال حج کو جایا کرتے تھے صلحاء سے ملنے کا انکو بڑا اہتمام تھا اور اس تلاش میں تھے کہ کوئی اللہ والا ملے جس کے ہاتھ پر بیعت کر کے وصول الی اللہ نصیب ہو۔ غرض وہ مشرقی ممالک میں جاتے اور آتے اسی طلب وجستجو میں رہتے تھے۔ آخر مصر میں انکی ایک بزرگ سے ملاقات ہوئی اور انہوں نے ایک امانت ان کو دیکر فرمایا کہ جو شخص بھی یہ امانت تم سے طلب کرے بس وہی ہے جس سے تمہارا مطلب حل ہوگا۔ چنانچہ انکے علم میں جتنے بھی بزرگ تھے ایک ایک کر کے وہ سب کے پاس گھوم آئے (مگر کسی نے امانت طلب نہ کی)۔ آخر اپنے شہر میں آئے اور گھر پہونچ گئے۔ کچھ دنوں بعد انکے ہمسایہ نے ایک دن بوقت ملاقات ان سے کہا وہ امانت کہاں ہے جو تم کو مصر میں فلاں شخص نے دی تھی۔ اس وقت اس شخص کو علم ہوا کہ ہمسایہ ہی صاحب وقت ہیں۔ اسلئے ان کے پاؤں میں گر پڑا اور بوسہ دینے لگا۔ اس کے بعد کہا اللہ اللہ حضرت آپ بھی اپنے آپ کو کتنا پوشیدہ رکھتے ہیں۔ میں نے مشرق اور مغرب میں کوئی بزرگ نہ چھوڑا جس کے پاس ہو نہیں آیا اور آپ میرے اتنے قریب اور پڑوس ہی میں ہیں (مگر پتہ نہ چلا) اسکے بعد ان سے سرّ الٰہی طلب کیا۔ شیخ نے فرمایا اسکی تو تم میں طاقت نہیں ہے۔ طالب نے کہا حضرت میں اسکی طاقت رکھتا ہوں اور اس کا متحمل ہو جاؤنگا۔ فرمایا اگر اسکی طاقت رکھتے ہو تو اسکے لئے ایک شرط ہے، اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا فرمایئے وہ کیا شرط ہے؟ فرمایا ایسی شرط ہے کہ اس میں کچھ تمہارا زیادہ نقصان بھی نہیں۔ وہ یہ ہے کہ اپنی اس لمبی داڑھی کو منڈوا ڈالو۔ اس نے کہا حضرت بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی کی وجہ سے تو بلادِ مشرق میں لوگ میری عزت کرتے ہیں، اور مجھ سے مرعوب ہوتے ہیں۔ شیخ نے فرمایا اگر سرّ چاہتے ہو تو جو میں کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ اس نے کہا حضرت یہ تو ایسی بات ہے جس کو میں برداشت نہیں کر سکتا۔ شیخ نے فرمایا مجھ پر پھر کوئی الزام نہیں رہا جبکہ تم نے میری شرط ہی قبول نہیں کی۔ چنانچہ وہ چلے گئے۔ مگر جب شیخ کی وفات ہوئی اور جس نعمت سے محروم رہنا تھا اس سے محروم رہ گئے تو بہت نادم ہوئے اور کہا آج جو عقل آئی اگر وہ شیخ کے زمانے میں آجاتی تو اس سے بھی زیادہ کر گذرتا۔ (کیونکہ یہ داڑھی رکھنا اللہ واسطہ اور اتباعِ سنت میں نہ تھا بلکہ لوگوں میں جاہ حاصل کرنے، ان پر رعب وہیبت ڈالنے اور ان سے اپنی تعظیم کرانے کی غرض سے تھا اور اسی نمود کا استیصال شیخ کو مقصود تھا جس پر نفس نے عمل نہ کرنے دیا۔ بعد میں ہوش آیا کہ داڑھی کا قطع صورۃً ایک معصیت تھی مگر وہ حقیقتہً مادہ ریا کا قطع تھا جس سے تمامی عبادت کی اصلاح تھی بلکہ خود داڑھی کی بھی اصلاح تھی کہ وہ بھی اخلاص کے بغیر بکرے کی داڑھی کے حکم میں ہے لہٰذا اس کی ایسی مثال ہوئی جیسے آکلہ کے مرض میں ہاتھ کٹانا کہ بظاہر ایک کارآمد عضو کی اضاعت ہے مگر درحقیقت سارے بدن کی اصلاح اور حیات کی حفاظت ہے مگر یاد رکھو جس طرح اسکی تشخیص حاذق ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔ اسی طرح کسی کامل البصیرت

شیخ ہی کا منصب ہے کہ باطنی مرض کی رگ پکڑے اور یہ علاج تجویز کرے۔ نہ وہ جن کے خود ہی منہ پر داڑھی نہیں اور اسلئے بصیرت کا تو کیا پوچھنا کیا بصارت بھی اتنی کمزور ہے کہ عینک کے بغیر کتاب کا حرف بھی نہیں دیکھتا ڈاکٹری آپریشن کی نقل اگر بازاری اُتارنے لگے تو مریض کا خدا حافظ ہے بیچارہ کل کا مرتا آج مرجائیگا۔ صورۃً شیر اور شِیر یکساں ہیں مگر حقیقۃً ایک سبب موت ہے اور دوسرا سبب حیات!

مجھے[۱] ایک بزرگ نے جن کو بیداری میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوا کرتی تھی اور اپنے وطن شہر فارس میں بیٹھے ہوئے مدینہ منورہ کی بُو سونگھا کرتے تھے، یہ قصہ سنایا کہ میں نے ایک شیخ کے پاس اندلس کی جامع مسجد میں شب جمعہ گذاری۔ بعد نماز جمعہ جب ہم مسجد سے باہر آئے تو ایک شخص نے شیخ کے ہاتھ پر بوسہ دیا اور کہا حضرت مجھے آپکے ساتھ اللہ واسطہ کی محبت ہے۔ شیخ نے ایک اُوپری و ترچھی نظر سے اس کو دیکھا اور فرمایا کیا تمہیں معلوم نہیں اللہ کو باطن کا اور اس سے بھی مخفی تر کا علم ہے۔ مطلب یہ تھا کہ اگر تم کو میری محبت تھی تو اللہ کو اسکا ضرور علم ہو۔ لہٰذا اسی پر اکتفا کیا ہوتا اور اسی سے اسکا صلہ لے لیا ہوتا۔ مجھے جتانے کی کیا ضرورت تھی یہ کہکر شیخ تو چلے گئے اور مدعی محبت نے رونا شروع کیا۔ میں نے اسکے پاس آکر کہا کہ اے شخص! تونے بڑی بات کا دعویٰ کیا ہے اور شیخ تم کو آزمائے بغیر نہ چھوڑیں گے لہٰذا مردِ بَن رہیو ورنہ پھر شیخ کہاں اور تم کہاں۔ اتفاق سے اس شخص کا باغ حضرت شیخ کے باغ سے ملحق تھا اور درمیانی سرحد پر انجیر کا ایک درخت کھڑا تھا جو درحقیقت شیخ کا مملوکہ تھا مگر یہ شخص ہر سال اسکے پھل توڑ لیا کرتا اور حضرت شیخ صبر کرتے اور اس کے پڑوسی ہونے کے سبب سے چشم پوشی کرتے اور درگذر فرمایا کرتے تھے۔ اب اسکے دعویٰ محبت پر حضرت شیخ نے فرمایا کہ یہ درخت ہمارا ہے اسکا کوئی پھل نہ توڑنا۔ مدعی محبت نے اسکا انکار کیا اور کہا درخت تو میرا ہے۔ غرض اس نے شیخ سے خوب مقدمہ بازی کی حتیٰ کہ میں نے سنا حضرت شیخ کو سب وشتم کیا کرتا تھا اسی شخص کو میں نے یہ کہتے سنا کہ جب میں حج کو گیا اور روضۂ مطہرہ پر حاضر ہوا تو مجھ پر ایک حالت طاری ہوئی اور میں نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میرا یہ گمان نہ تھا کہ آپکے مدینہ میں پہنچکر پھر فاس کو واپس جاؤنگا قبر شریف کی جانب سے مجھے ایک آواز سنائی دی اگر میں اس قبر کے اندر بند ہوں تب تو جو آوے یہیں رہ پڑے اور اگر میں (بصورت فیض روحانی وبشمول انوار وبرکات نورانی) اپنی اُمّت کے ساتھ ہوں جہاں کہیں بھی ہوں تو تم کو اپنے وطن واپس چلا جانا چاہیئے۔ چنانچہ میں وطن واپس آگیا۔

حضرت[۱] ممدوح نے فرمایا ایک مجذوب تھے اور وہ قصداً کوئی مخالف کام کیا کرتے تھے تاکہ لوگ اُن سے نفرت کھاکر بھاگ جاویں۔ چنانچہ ایک دفعہ انہوں نے اپنے کپڑے پر شراب ڈال لی۔ سب لوگ شراب کی بو سونگھ کر چل دیئے اور صرف ایک شخص جو انکے سِرِ باطن کا وارث تھا باقی رہ گیا۔ تب انہوں نے کہا

کہ میں نے اسلئے کیا تھا تاکہ یہ چیونٹیاں (یعنی پیچھے لگنے والی بھیڑ) مجھ سے الگ ہو جائیں کیونکہ ان کی مجھے حاجت نہیں ہے مجھے تو صرف تمہاری ضرورت ہے۔ ف امتِ محمدیہ کی بھی عجیب شان ہے کہ نہ نبی و شارع ہے اور نہ عامی محض۔ علم ظاہر کے حاملین علمائے فقہاء ہوں یا علم باطن کے حاملین صوفیاء و اولیاء مقاصد شریعت و طریقت میں ذرہ برابر ترمیم نہیں کر سکتے کہ یہ منصب ہے صرف مہبط وحی پیغمبر کا مگر وسائل مقصود میں انکو دیکھنا پڑتا ہے۔ اقتضاء وقت اور طبائع اہلِ زمانہ کو کہ اجتہاد و حذاقت اسی کا نام ہے۔ اور کانبیاء بنی اسرائیل کا مقتضا یہی ہے۔ مثلاً کفار سے جنگ جس کا نام جہاد ہے ایک مقصود شرعی ہے کہ غلبہ ہو نور اسلام ہو اور شوکت پست و پامال ہو کفر کی۔ جب تک دنیا قائم ہے اس مقصود کو بدلنا کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے البتہ اس کا طریق باقتضاء زمانہ متغیر و متبدل ہو سکتا ہے کہ بزمانہ نبوت یہ مقصود حاصل ہوتا تھا نیزہ و تلوار اور تیر و کمان سے اور اب حاصل ہوگا توپ و مشین گن بلکہ ہوائی و بحری جنگی جہازوں اور برقی آلات و حرب سے۔ لہٰذا مجاہدین اسلاف کا طریق تیر و تلوار چلانے کا سیکھنا سکھانا تھا مگر غزاۃ اخلاف کا طریق ان جدید آلاتِ حرب کا تعلیم و تعلم ہوگا۔ اور یہ صوری اختلاف عین اتحاد سمجھا جائیگا بلکہ اتحاد صوری بحکم اختلاف قرار دیا جائیگا۔ پیری مریدی ایک ذریعہ ہے باطنی نور حاصل کرنے کا جس سے عظمت و محبت پیدا ہو اللہ و رسول کی اور حلاوت و دلبستگی حاصل ہو اطاعت و عبادات میں، مریض بھی غذا کھاتا ہے مگر با دل ناخواستہ محض طبیب کے حکم اور عزیزوں کی رعایت سے کہ دل نہیں چاہتا مگر امید صحت کی جھلک جبر و قہر کرکے ایک دو نوالہ حلق سے اتار دیتی ہے اور تندرست بھو کا بھی غذا کھاتا ہے مگر سچی طلب اور صادق اشتہا سے کہ کوئی منع بھی کرے تو باز نہیں آتا۔ معرفت اور ایمان کا نور و حلاوت اسی کا نام ہے اور تمامی اذکار و اشغال جنہیں اطباء روحانی مشائخ نے تجویز کیا ہے اسی مقصود بالذات اور روح اعمال کے طریق تحصیل اور وسائط و ذرائع ہیں اور اس لئے مریدین کی طبائع کے اختلاف سے وہ ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ روحانی اصلاح کا سارا مدار طلب صادق اور شیخ کیساتھ توحید مطلب یعنی اس قسم کی یک درگیری پر ہے جیسی بلا تشبیہ بیوی کو اپنے شوہر اور فرزند کو اپنے باپ کیساتھ حاصل ہے کہ بُرا ہو یا بھلا اسی سے صحیح النسب نطفہ لینا ہے اور اسی کی میراث و جاگیر پر قبضہ کرنا ہے اس یکسوئی پر عزم و پختگی کا امتحان کرنے کے لئے شیخ کو ایسی ضرورتیں پیش آتی ہیں۔ جن کی ظاہری صورت ارتکاب معصیت کی اور خلاف شان شیخوخت کے ہوتی ہے جیساکہ شوہر اپنی بیوی کا طرح طرح کی زیادتی کرکے امتحان لیتا ہے اور جب مطمئن ہو جاتا ہے کہ ظلم و تشدد پر بھی میرا دروازہ چھوڑنا اور باپ کے گھر جانا نہیں جانتی تب اسکے دل میں اس کی قدر و منزلت ہوتی ہے کہ باید و شاید۔ پہلے زمانہ میں صلاح کا غلبہ تھا اسلئے مرید

کی یک درگیری کا یہ امتحان بصورت معصیت لیا جاتا تھا کہ بڑے سے بڑے شیخ اور مشہور سے مشہور بزرگ کو بھی خلاف شرع امر کا مرتکب دیکھتے تو اسکو چھوڑ دیتے تھے یکی صرف اتنی بھی اسکی معرفت وولایت کا بھی جس کے برسوں اثرات دیکھتے رہے تھے لحاظ نہ کرتے اور اس غور وفکر کا یا حسن ظن کا بھی موقع نہ دیتے تھے کہ ممکن ہے اسکی کوئی اندرونی وجہ جواز ہو جسکا ہمیں علم نہ ہو یا کم ازکم یہ کہ ولی ہے نبی نہیں ہے اور اسلئے حقیقۃً بھی معصیت کا صدور اس سے محال نہیں ہے مگر اب جبکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لیگئے ہوئے ساڑھے تیرہ سو برس سے زیادہ گذر گئے اور اس خیر القرون پر جو لمحہ بھی گذر رہا ہے وہ نور کو مضمحل اور ظلمت کو غالب کرتا گزر رہا ہے لہٰذا امتحان کی صورت ہی قدرت نے بدل دی ہے۔ عام طبائع میں ظلمت کا غلبہ ہے اور ظلمت ہی کی طرف ان کی کشش ہو رہی ہے اسلئے جتنا کوئی بد دین اور خلاف شرع بنتا جائیگا اتنا ہی بڑا پیر قرار پاتا جائے گا اور مخلوق اس کی طرف لپکتی چلی جائے گی۔ لہٰذا مرید صادق اور اہل طالب حق کا امتحان بھی اس وقت اتباع شریعت ہی میں منحصر ہو گیا ہے۔ اول تو جتنا کوئی شیخ متبع شریعت ہوتا جائیگا۔ مخلوق خود بخود اس سے بھاگتی چلی جائے گی کہ ملّانا ہے یہ کیا جانے تصوف کو اور زاہد خشک ہے اسکے پاس بجز اسکے ہے کیا کہ نماز پڑھو اور روزہ رکھو اور اس پر بھی کوئی مارے باندھے اگر لگا چپٹا رہا تو رسومات رائجہ کا بدعت ہونا یا ایسا کوئی مسئلہ اس کو سنا دو جس کا خلاف عام غلطی وجہالت کے سبب باپ دادا کے زمانہ سے اسکے کانوں میں پڑا ہوا ہے تب تو میدان ہی صاف ہو جائیگا اور یہ کہکر کہ نئے نئے ملّا اور نئے نئے مسئلے ساری بھیڑ چھٹ جائیگی اور بڑا ہی مخلص اور پختہ ہوگا جو یہ سمجھکر جما اور پڑا رہیگا کہ میرے پیر کا علم بہرحال مجھ سے زیادہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں اس کو پیر ہی کیوں بناتا۔ الحاصل غلبۂ ظلمت نے امتحان کے اصلی مقصود یعنی یک درگیری اور احتیاج وطلب کی جانچ کا طریق بدل دیا ہے۔ اس لئے اب کسی شیخ کو بھی یہ گنجائش نہیں کہ وہ اپنی معصیت کو امتحان عزم وارادت کی کملی اڑھائے اور صورت خطا میں بھی کوئی گنجائش نکالے۔ دوم اسی کتاب میں ابھی تم پڑھ چکے ہو کہ شیخ المشائخ حضرت زروق رحمۃ اللہ علیہ نے قدیم طریق کی تربیت کو جو کہ صدہا سال سے اکابر واجلّہ عارفین کا معمول چلا آرہا تھا محض اس دلیل سے یکلخت بدل دیا کہ اہل ظلمت نے اسکی نقل اُتارنا شروع کردی ہے لہٰذا پھر اسی طریق تربیت کی طرف عود کرنا ضروری ہوا جو خیر القرون میں شائع تھا یعنی اتباع سنت اور کتاب اللہ وکتاب الرسول کا مضبوطی کیساتھ تھامنا۔ کہ سہل ترین بھی ہے اور اہل ظلمت کی نقالی سے بھی محفوظ ومامون ہے اور بابرکت بھی ہے کہ جاری کیا ہوا ہے محبوب رب العلمین کا۔ پھر کیا پوچھنا اس زمانہ کا کہ شیخ زروق کو بھی دنیا سے اُٹھے ہوئے کئی صدیاں گذر گئیں اور ظلمت وبددینی والحاد کی گھٹا چھا گئی کہ فی لاکھ بلکہ فی کروڑ بھی ایک قلب نور والا جو کھنچتا ہوا اللہ ورسول کی طرف نکل آئے تو غنیمت ہے۔ کافر تو

کافر بہتیرے مسلمان اس وقت دین کا مخول اور شریعت کا مذاق اُڑا رہے ہیں۔ طاعون و وبار عام کے زمانہ میں تو پھونک پھونک کر قدم رکھنا ضروری اور مشتبہات بلکہ اس جائز و مباح سے بھی احتیاط کرنیکی شدید ضرورت ہے جن سے احتمال پیدا ہو عوام کی بے احتیاطی کا۔ گذشتہ حضرات اولیاء کے ان قصوں ہی سے جن کی صورت معصیت باطنی درجہ میں مؤول اور جواز کی گنجائش رکھتی تھی لوگ استدلال کر کر کے شریعت پر تیر و تفنگ چلا رہے اور معاصی و فسق و فجور میں اتنا کھل کھیلے ہیں کہ علماء و مشائخ کو جواب دینا مشکل پڑ رہا ہے۔ اگر خدا نخواستہ علماء و صوفیہ اہل حق خود اسکا ارتکاب کرنے لگے تب تو کچھ ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اس لئے غور کرو کہ دیگر مشائخ اگر مشائخ تھے تو حضرت زروق بھی مشائخ میں تھے بلکہ شیخ المشائخ تھے کہ حضرت عبدالعزیز دباغ بھی انکے مداح اور ان کو صائب الرائے بتا رہے ہیں۔ اسلئے حکایاتِ مذکورہ کے بھی انکار کی ضرورت نہیں کہ وہ بذریعہ حال اور تصرف کے مریدین کی تربیت کا زمانہ تھا، اور اس وقت اہل فہم اور اہل صلاح کی کثرت اور قرب زمانۂ نبوت کی وجہ سے اسمیں بہت گنجائش تھی مگر اس نازک اور قرب قیامت کے زمانہ میں تو یہ رنگ مریدین ہی کیلئے نہیں بلکہ عامہ مخلوق کیلئے بھی سم قاتل ہے اور حضرت امام زروق کا مذاق جس کو اپنے نور بصیرت سے ادراک فرما کر وہ آج سے کئی سو برس پہلے قائم فرما گئے ہیں بہت ہی زیادہ مضبوطی سے پکڑنا ضروری ہے۔ رہا مذکورہ حکایات کا تذکرہ سو وہ محض اس لئے کیا ہے کہ علماء ظواہر ان اسلاف پر سب و شتم نہ کریں اور متصوفین زمانہ ان سے دلیل نہ پکڑیں کیونکہ حقیقت اور وجہ دونوں پر کھل چکی کہ بعض مصالح دینیہ کی بنا پر محض صورۃً ان سے ایسا ہوا تھا۔ ورنہ معصیت کا بغض اور اپنے اس فعل کی گرانی بدستور انکے قلوب میں موجود تھی کہ احترام شریعت کا یہی مقتضا تھا اور خود حضرت عبدالعزیز فرما چکے ہیں کہ شریعت کی مشعل کو ہاتھ میں لئے بغیر کوئی کبھی عارف نہیں بنے گا۔ حق تعالیٰ اپنی اور اپنے رسول کی محبت نصیب فرمائے کہ شریعت محمدیہ کو اپنا جسم اور طریقت کو کہ محافظ شریعت ہے اپنی رُوح قرار دیکر دونوں نعمتوں سے مالا مال ہوں۔ آمین۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال

حضرت نے فرمایا ایک شخص کسی ولی کے پاس آیا اور سر سے لیکر پاؤں تک بغور ان کو دیکھنے لگا۔ انہوں نے فرمایا اس سے کیا مقصود ہے؟ فرمایا بس حضرت مجھے یہی غنیمت ہے۔ میرا مطلب تھا کہ آپ کو اچھی طرح دیکھ لوں تاکہ آپ کل کو اللہ کے دربار میں میری سفارش فرما دیں۔ اسکے بعد حضرت نے فرمایا اس اخلاص اور بے لوث محبت کے سبب اس شخص نے بڑا نفع کمایا۔ نیز حضرت جب اس قصہ کا تذکرہ کیا کرتے تھے الحمدللہ اس امت میں ابھی آدمی باقی ہیں۔ ایک طالب صادق ایک بزرگ کے پاس آیا اور کہا میں اللہ واسطہ آپ سے محبت رکھتا ہوں یہ وقت صلوٰۃ فجر کا تھا۔ شیخ نے فرمایا اگر نفع اٹھانا چاہتے ہو تو اپنے گھر واپس نہ جاؤ اور ابھی بلاد مشرق (عرب) کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ چنانچہ اس نے حکم کی فوراً تعمیل کی اور بڑا نفع اٹھایا

حضرت ممدوح نے فرمایا لوگوں نے جو کرامات اولیاء میں کتابیں تصنیف کی ہیں اگرچہ اُن سے اتنا نفع ضرور ہوا کہ اُن اولیاء کو لوگوں نے پہچان لیا (اور عقیدت و محبت رکھنے لگے) مگر اس درجہ میں نقصان بھی بہت ہوا

کہ مصنفین نے صرف کرامتوں کے بیان کرنے پر اکتفا کیا اور ان صاحبان کرامت سے جو فانی اُمورِ دنیا ظہور میں آتے تھے انکا تذکرہ نہیں کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کتاب دیکھنے والے کی نظر سے جب کرامت پر کرامت اور کشف پر کشف اور تصرفات پر تصرفات ہی گذرتے رہیں گے تو اسے خیال ہوگا کہ ولی کسی امر میں بھی عاجز نہیں ہوتا۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے اور اس سے کوئی خطا و معصیت صورۃً بھی صادر نہیں ہوسکتی اسلئے جہل عظیم میں پڑ جائیگا اس کا تو یہ مطلب ہوا کہ ولی میں ربوبیت کے بھی اوصاف پائے جاتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ جو چاہتا ہے کرسکتا ہے اور اس کو عجز لاحق نہیں ہوتا۔ اور نبوت کے اوصاف بھی پائے جاتے ہیں کہ معصوم ہو اور غلطی کا اس سے صدور نہیں ہوسکتا۔ حالانکہ اوصاف ربوبیت تو حق تعالیٰ نے اپنے انبیاء و رسل کو بھی عطا نہیں فرمائے چہ جائیکہ اولیاء۔ چنانچہ سید المحبوبین کے لئے ارشاد فرماتا ہے: لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ۔ اے محمد اس کام میں تمہارا کچھ اختیار نہیں یا خدا ان پر مہربانی فرمائے یا ان کو عذاب دے کہ یہ ظالم ہیں اور فرماتا ہے: إِنَّكَ لَا تَهْدِي مَنْ أَحْبَبْتَ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَهْدِي مَن يَشَاءُ۔ اے محمد! تم جس کو دوست رکھتے ہو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ خدا ہی جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ میں نے حق تعالیٰ سے دو باتوں کا سوال کیا تو وہ عطا فرمادیں اور دو باتوں کی درخواست کی تو منع فرمادیا۔ حق تعالیٰ نے نازل فرمایا: قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلَىٰ أَن يَبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّن فَوْقِكُمْ۔ کہہ دو اے محمدؐ! خدا اس پر قادر ہے کہ تم پر عذاب بھیجے اُوپر کی جانب سے، میں نے دعا مانگی یا اللہ آپکی کریم ذات کی پناہ مانگتا ہوں۔ فرمایا۔ اچھا منظور کیا (کہ تمہاری امت پر آسمانی عذاب نازل نہ ہوگا)۔ اس کے آگے ارشاد فرمایا: أَوْ مِن تَحْتِ أَرْجُلِكُمْ۔ یا عذاب نازل فرمائے تمہارے پاؤں کے نیچے سے۔ میں نے عرض کیا آپکی ذات کی پناہ مانگتا ہوں۔ فرمایا۔ اچھا منظور (کہ خسف وغیرہ ارضی عذاب سے بھی اُمّت کو ہلاک نہ کریں گے۔ آگے فرمایا: أَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا۔ یا تمہیں فرقہ فرقہ کردے۔ میں نے عرض کیا۔ پناہ چاہتا ہوں آپ کی ذات کی۔ فرمایا۔ یہ پہلے مقدر ہوچکا ہے (لہٰذا امت میں تفرقہ اور فرقہ وارانہ اختلاف ضرور ہوگا۔ پھر آگے فرمایا) وَيُذِيقَ بَعْضَكُم بَأْسَ بَعْضٍ اور ایک کو دوسرے کی لڑائی کا مزہ چکھادے۔ میں نے عرض کیا پناہ چاہتا ہوں آپکی ذات کی۔ فرمایا۔ یہ پہلے مقدر ہوچکا ہے (لہٰذا باہم جنگ و خونریزی بھی ہوکر رہے گی)۔ نیز حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کے غرق سے بچ جانے کی درخواست کی اور منظور نہ ہوئی۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ وَنَادَىٰ نُوحٌ رَّبَّهُ۔ الآیہ اور پکارا نوح نے اپنے رب کو اور عرض کیا کہ اے میرے پروردگار میرا بیٹا میرے اہل میں شامل ہے اور آپ کا وعدہ (میرے اہل کو غرق سے بچا لینے کا) سچا ہے اور آپ حاکموں کے بھی بڑے حاکم ہیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا۔ اے نوح وہ تمہاری

اہل میں (شامل) نہیں ہے کیونکہ اسکے اعمال اچھے نہیں ہیں (لہٰذا وہ ضرور غرق کیا جائیگا) پس مجھ سے ایسی درخواست نہ کرو جس کا تمہیں علم نہیں۔ میں تم کو نصیحت کئے دیتا ہوں کہ جاہلوں میں سے نہ بنو۔ نیز فرمایا وَضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ۔ الآیہ۔ اور اللہ نے مثال بیان فرمائی کفر کرنے والوں کیلئے" نوح کی بیوی اور لوط کی بیوی کی کہ دونوں ہمارے دو بزرگ بندوں (پیغمبروں) کی زوجیت میں تھیں۔ اور انہوں نے اپنے شوہروں کا خلاف کیا۔ پس وہ (پیغمبر) اللہ کے عذاب کو اُن سے کچھ بھی نہ روک سکے" اور آج لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر کسی ولی کو دیکھیں کہ اس نے کوئی دعا مانگی اور قبول نہ ہوئی، یا اسکے لڑکے کو بدراہی پر دیکھا یا اسکی بیوی کو دیکھا کہ اللہ کا خوف نہیں کرتی تو فوراً کہدیتے ہیں کہ یہ ولی ہی نہیں ہے کیونکہ ولی ہوتا تو اللہ اس کی دعا ضرور قبول کرتا اور ولی ہوتا تو اپنے گھر والوں کی تو صلاح کرتا۔ انکا خیال یہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح ولی کے ہاتھ میں ہے حالانکہ وہ خود اپنی اصلاح پر قادر نہیں۔ چنانچہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ط اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تم پر نہ ہوتی تو تم میں سے کوئی ایک بھی کبھی پاک طینت نہ بن سکتا لیکن اللہ ہی جس کو چاہتا ہے پاک طینت بنا دیتا ہے (غرض اللہ کے کام بس اللہ ہی کے لئے مخصوص ہیں جب اُن میں کوئی نبی بھی شریک نہیں ہو سکتا تو ولی کا کیا پوچھنا)۔ اب رہا امر دوم یعنی معصوم ہونا۔ سو وہ اوصاف نبوت میں سے ہے اور ولایت نبوت کے کبھی ہم پلہ نہیں ہو سکتی نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ولی کے ہاتھ پر (بیعت ہونے سے صلاح وہدایت کی) جو کچھ بھی خیر و خوبی ظاہر ہوتی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی برکت ہے۔ کیونکہ ایمان جو اس خیر کا سبب ہوا ہے وہ ولی تک بواسطہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے پہنچا ہے۔ ورنہ ولی کی ذات (قطع نظر اس کے ایمان کے) عام لوگوں کے مثل ہے۔ برخلاف حضرات انبیاء علیہم السّلام کے کہ انکی آفرینش ہی عصمت پر اور تخلیق ہی اللہ کی معرفت اور تقویٰ پر ہوئی ہے کہ نہ وہ (اس معرفت اور توحید میں) شریعت کے محتاج ہیں کہ اسکا اتباع کریں اور نہ کسی (دنیوی استاد اور) معلم کے محتاج ہیں کہ اس سے مستفید ہوں بلکہ حق جو اُنکی ذوات میں مستقر ہے یعنی حرف نبوت جو کہ ان کا فطری وطبعی ہے وہی ان کو سیدھے اور سچے راستہ پر چلاتا ہے (شریعت محض امت کے لئے یا فروعات وطریق عبادت بتانے کے لئے ہے پس اگر مؤلفین جس ولی کی سوانح لکھ رہے ہیں اگر اس کا مشرح حال اور فتح کے بعد امور باقیہ صالحہ اور امور فانیہ جو کچھ بھی اس سے صادر ہوئے ہیں سب کو درج کتاب کرتے تو بے شک لوگوں کو حقیقی ولی سے واقفیت ہوتی اور ان کو معلوم ہوتا کہ ولی کبھی دعا مانگتا ہے تو قبول ہوتی ہے اور کبھی دُعا مانگتا ہے تو رَدّ ہو جاتی ہے اور

قبول نہیں ہوتی۔ نیز اسکی کوئی مُراد ہوتی ہے مگر کبھی پوری کر دی جاتی ہے اور کبھی پوری نہیں کی جاتی جیساکہ حضرات انبیاء ورسل علیہم الصلوٰۃ والسلام کا حال ہے (کہ وہ بھی دعا اور مراد میں اللہ کے محتاج ہیں، اور لاونعم دونوں کے مظہر بنتے ہیں) اور ولی میں (انبیاء کی بہ نسبت ضعف کی) اتنی بات زائد ہے کہ عام لوگوں کی طرح اسکے اعضاء پر کبھی طاعت کا ظہور ہوتا ہے اور کبھی معصیت کا۔ (برخلاف انبیاء کے کہ وہ معصوم ہیں اور یہ ان کی امتیازی شان ہے کہ قبل نبوت بھی اُن سے معصیت کا صدور نہیں ہوتا) پس اگر ولی کو عوام الناس سے کوئی امتیاز ہے تو صرف ایک ہی بات میں ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کو معارف کیساتھ مخصوص فرمایا اور فتوحات (اور بصیرت کے مشاہدات) نصیب فرمائے ہیں (جن سے عوام محروم ہیں) علاوہ ازیں ولی سے اگر معصیت ظاہر ہوتی ہے تو محض صورۃً اور ہمارے دیکھنے میں ہوتی ہے، درحقیقت نہیں ہوتی۔ کیونکہ مشاہدہ جس میں وہ غرق ہے اس کو معصیت سے روکتا ہے اور خلاف حق کرنے سے باز رکھتا ہے۔ مگر درجۂ عصمت تک نہیں پہنچ سکتا ورنہ نبوت اور ولایت یکساں ہوجائیں۔ کیونکہ یہ مانعِ معصیت انبیاء میں ذاتی وطبعی ہے، اور اولیاء میں عارضی وخارجی ہے۔ لہٰذا اولیاء میں اس کا زائل ہوجانا ممکن ہے مگر انبیاء میں مانع کا زائل ہونا ناممکن ہے اور اسکی حقیقت وہی ہے جو پہلے بیان ہو چکی ہے کہ انبیاء کی خیر وخوبی ان کی ذات کی طرف سے ہے، اور اولیاء کی خیر وخوبی ان کی ذات کی طرف سے نہیں بلکہ قمر کی طرح شمسِ نبوت سے نور ایمان حاصل کرنے کی بنا پر ہے، پس عصمت انبیاء ذاتی ہوئی اور اولیاء کی حفاظت عن الخطاء عرضی ہوئی۔ لہٰذا عارف کامل سے اگر خطا کا ظہور ہوگا تو صوری ہوگا حقیقی نہ ہوگا یعنی دیکھنے والوں کا امتحان اور انکی آزمائش مقصود ہوگی (کہ کون ولی کو نبی کا درجہ دیکر اس سے بھاگتا ہے اور کون اس کو نبی کا نائب اور محل صدور خطا صاحب معرفت سمجھکر جما اور پڑا رہتا ہے۔ نیز اس ظہور صدور خطا میں) اور بھی اسرار ہیں جن کے ذکر کا یہ موقع نہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خورد ونوش اور خواب وبیداری اور گھر میں امور خانہ داری کے متعلق سیرت وعادت معلوم ہوجائیگی اور آپکے حالات جنگ اور غزوات کا علم ہوگا کہ کبھی آپکی جیت ہوتی تھی اور کبھی دوسرے فریق کی۔ نیز یہ کہ آدمی آپ کے پاس آکر صحابہ کو اپنے ساتھ لیجانے کی درخواست کرتے اور آپ بھیجدیا کرتے تھے۔ پھر وہ لوگ ان کے ساتھ بدعہدی وغدر کیا کرتے تھے جیساکہ غزوہ رجیع اور غزوہ بیر معونہ میں ہوا۔ یا دیگر واقعات جو مثلاً غزوہ حدیبیہ وغیرہ میں پیش آئے اور ان امور وحوادث اور سوانح وواقعات میں اسرار ربانی ہیں جن پر حق تعالیٰ نے اپنے نبی کو مطلع فرمادیا تھا۔ ان باتوں کا علم ہوجانے پر اولیاء کا پہچاننا سہل ہوجائیگا اور اولیاء سے (مقتضیات بشریہ اور اکل وشرب، دبول، براز، دادوستد، نفع نقصان، حزن وفرح، موت و

ولادت وغیرہ وغیرہ) امور فانیہ صادر ہوتے ہوئے دیکھکر اس کو تعجب نہ ہوگا۔ پس عاقل پر جس کو صلاح اور اہل صلاح سے محبت ہو لازم ہے کہ سیرۃ محمدیہ علیہ الصلوٰۃ والتحیہ کا مطالعہ کیا کرے کہ اس سے اولیاء سے واقفیت کی رہبری ہوگی اور ولایت وولی کا پہچاننا دشوار نہ رہے گا۔

نیز آپ نے فرمایا ایک شخص دور ہی دور سے کسی ولی کا نام سنتا ہے تو اپنے ذہن میں اس کی صورت ایسی لاتا ہے جو اُن کرامتوں کے مطابق ہوں جنہیں لوگ نقل کر رہے ہیں پھر جب اس کے پاس جاتا ہے اور اپنے متخیلہ کی صورت کے موافق اس کو نہیں پاتا تو اس کو شک ہوجاتا ہے کہ آیا یہ وہی ولی ہے جس کی کرامتیں سن رہا تھا یا وہ نہیں (بلکہ کوئی عامی شخص ہے)۔ چنانچہ جزائر میں ایک شخص تھا اُس نے فاس کے ایک ولی کا تذکرہ سنا۔ اور اس کی بہت کچھ کرامتیں اس کے کان میں پڑیں تو اس کے متخیلہ میں ایک صورت آئی کہ ایک بڑا بوڑھا بارعب شخص ہے (جس سے بات کرتے بھی ہر شخص کو ڈر لگتا ہے) پس وہ بارادہ حصولِ فیضان اپنے وطن سے چلا اور جب شہر فاس میں پہنچا تو اس ولی کا گھر دریافت کیا۔ اس کا خیال تھا کہ ولی کے دروازہ پر دربان بیٹھے ہوں گے آخر جب دروازہ پر پہنچا تو دستک دی۔ خود وہ ولی ہی نکلکر باہر آئے۔ نووارد نے سمجھا کہ یہ دربان ہے۔ اسلئے کہا جناب میں اعلیٰحضرت کے دربار میں باریاب ہونا چاہتا ہوں۔ ولی نے کہا وہ میں ہی تو ہوں جس کے پاس تم آئے ہو۔ چونکہ کرامتیں سنکر جیسی بڑی صورت یہ شخص اپنے ذہن میں لئے ہوئے تھا اس میں اس کا کچھ بھی نمونہ نہ دیکھا تو کہنے لگا جناب میں ایک مہینہ کی مسافت قطع کر کے بہت دُور سے آیا ہوں۔ مسافر ہوں، بے وطن ہوں، اور بڑا شوق لیکر آیا ہوں۔ اللہ کی تم پر رحمت ہو۔ برائے خدا مجھے شیخ تک پہنچادو۔ ولی نے کہا میاں میں ہی ہوں جس سے ملنے کی نیت سے تم آئے ہو کہنے لگا میں آپ سے کہہ رہا ہوں کہ میں ناواقف غریب الوطن ہوں اور درخواست کر رہا ہوں کہ مجھے اعلیٰحضرت تک پہنچنے کی رہبری کرو مگر آپ مجھ سے مذاق کئے جاتے ہیں۔ ولی نے کہا کہ میاں مجھے اللہ ہی سمجھے اگر میں تم سے مذاق کرتا ہوں آنیوالا یہ کہکر کہ تجھے خدا ہی سمجھے، وہاں سے چلدیا۔ یہ صرف اس سبب سے ہوا کہ جو صورت اس نے اپنے متخیلہ میں لے رکھی تھی ولی کو اس کے خلاف پایا اور اس سبب کی بدولت بہتیرے لوگ گر چکے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے کراماتِ اولیاء کی کتابوں کا مطالعہ کر کے ایک صورت (کرامتوں کے شایان شان) متخیلہ میں بٹھالی اور جب اپنے اولیاء زمانہ کو اس صورت پر منطبق نہ پایا تو سب کی ولایت میں شک کرنے لگے۔ کیونکہ ان میں (بشری تقضا اور عوام کے ساتھ اختلاط اور سادگی کی) وہ باتیں دیکھیں جو کتب کرامات میں کہیں لکھی ہوئی دیکھی نہیں تھیں اسلئے واہمہ میں یہ جم گیا کہ ولی کو نہ بول وبراز ہوتا ہے نہ وہ سودا خریدنے بازار جاتا ہے نہ کسی سے بولتا اور بات کرتا ہے۔ ایک بھاری بھرکم بت بنا بیٹھا رہتا ہے اور لوگ اس کو پوجتے اور چڑھاوے اس پہ

چڑھاتے رہتے ہیں) حالانکہ اُن ہی اولیاء کو جن کی کرامتیں جمع کی گئی ہیں اگر کتاب کی تالیف سے پہلے دیکھتا تو ان میں بھی یہی اوصاف بشریہ موجود پاتا جن کو اپنے زمانہ کے اولیا میں اور بری پارہا اور بنظر استعجاب دیکھ رہا ہے۔ اس سے زیادہ ایک جہالت یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ولایت کے لئے بہت کچھ شرائط اور ضوابط تجویز کر لئے ہیں کہ جس میں وہ شرائط نہ پائی جائیں وہ ولی ہی نہیں۔ ان صاحبوں سے کوئی پوچھے کیا رحمتِ الٰہیہ ان ضوابط کے ماتحت ہے؟ اور کیا ضوابط تجویز کرنے والوں سے قبل کوئی ولی نہیں ہوا۔ اس وقت ضوابط کہاں تھے؟ اس کا یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں اب ولی کا وجود ہی نہیں۔ کیونکہ جب لوگ ان ضوابط کو اپنے اولیاء زمانہ پر منطبق کرتے ہیں اور ساری شرائط جو لوگوں نے کتابوں میں لکھدی ہیں۔ ان میں موجود نہیں پاتے تو ان کے ولی ہونے کا انکار کر دیتے ہیں۔ حالانکہ ولایت ایک عطا ہے حق تعالیٰ کی اور اصطفاً من اللہ ہے۔ جس کو بھی نوازلے اور جس حال میں بھی نوازلے (نہ کسی قوم کیساتھ مخصوص ہے نہ کسی پیشہ کیساتھ، نہ کسی ریاضت مخصوصہ کیساتھ شرط ہے نہ کسی مجاہدہ معینہ کی) جب اسکی رحمت ایک کافر کو ایک لمحہ میں ایمان عطا فرما دیتی اور اس کے ایمان لاتے ہی اس کو فتح بصیرت بخشدیتی ہے تو پھر کونسا ضابطہ ہے جس کا ولایت کو پابند اور رحمتِ الٰہیہ کو مقید بنایا جائے (اگر دیکھنے کے قابل ہیں تو علاماتِ ولایت یعنی نفس معرفت اور نور ایمان ہیں کہ قلب میں اس کی حقیقت موجود ہے یا محض مکاری اور جھوٹا دعویٰ ہے۔ باقی یہ کہ وہ عالِم ہے یا اُمّی اور عزلت نشین ہے یا کسی تجارت و صنعت میں مشغول، اور مجرد محبوسِ خانقاہ ہے یا متاہل اور بیوی بچوں والا، کچھ بھی قابلِ لحاظ نہیں) لوگ کہا کرتے ہیں، جی ہماری نظروں نے فلاں بزرگ کو دیکھا ہے۔ اب وہ بات ہی کہیں نظر نہیں آتی، ان باتوں کو اور اس رنگ کو نظریں ڈھونڈتی ہیں مگر اب وہ کسی بھی شخص میں دکھائی نہیں دیتیں۔ بس جی دنیا ہی خالی ہو گئی۔ پیر بہتیرے ہیں مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ ان صاحبوں کو سمجھنا چاہیئے کہ دنیا تا قیامت اللہ والوں سے خالی نہیں ہو سکتی اور سارے پھول ایک رنگ کے اور تمامی پھل ایک مزہ اور ذائقہ کے نہیں ہوا کرتے۔ ایک مرتبہ موسم بہار میں مجھے حضرت ممدوح کے ساتھ ایک باغ میں جانے کا اتفاق ہوا جس میں رنگ برنگ کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ حضرت نے فرمایا جس کو اولیاء اللہ کے حالات کا اختلاف اور اُن کے مقامات کا تباین دیکھنا ہو تو وہ ان گوناگوں اور قسم قسم کے پھولوں کو دیکھے کہ سب ہی جاذبِ قلوب اور دلوں کے لئے خوش کن و فرحت بخش ہیں مگر رنگ سب کا الگ الگ اور خوشبو سب کی جُدا جُدا ہے (پس کسی ولی پر زہد کا غلبہ ہے کسی پر خوف و خشیہ کا، کوئی کثرت صلوٰۃ سے مانوس ہے کوئی کثرت صوم سے، کسی پر توکل غالب ہے کسی پر کسب حلال۔ کسی پر رجا و سکون طاری ہے کسی پر گریہ و اضطراب۔

کوئی درس و تدریس میں فنا ہے کوئی وعظ و تبلیغ یا تالیف و تصنیف میں۔ غرض کوئی خاص ضابطہ نہیں جس کے سب مقید ہوں۔ اصل شے ہونی چاہیئے یعنی تعلق مع اللہ اور اتباع رسول، استحضار سطوتِ ربوبیت و استقرار عظمتِ رسالت، ہر عمل میں اخلاص ہو اور جو بھی حرکت و سکون ہو وہ لوجہ اللہ الکریم ہو خواہ کسی رنگ اور کسی شغل میں کیوں نہ ہو۔ بادشاہ اپنے تخت پر ولایت پا سکتا ہے اور تاجر اپنی دکان پر، کاشتکار اپنے کھیت میں ولی بن سکتا ہے اور نوکر اپنی خدمتگاری و دربانی میں)۔ پس اس شخص کا کہنا کہ اپنے پیر کو دیکھکر کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا ہے۔ گویا اللہ کی رحمتِ متناہیہ کو صرف ایک فرد میں حصر کر دینا ہے جیساکہ ایک اعرابی نے دعا مانگی تھی۔ اللھم ارحمنی وارحم محمداً ولا ترحم معنا احداً یا الٰہی مجھ پر رحم فرما اور محمد (صلے اللہ علیہ وسلم) پر رحم فرما، باقی ہمارے ساتھ اور کسی پر رحم نہ فرما۔ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ اے شخص تو نے بہت ہی وسیع شے کو بہت ہی تنگ کر دیا۔ نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ولی کا ظاہر نہ دیکھا جائے (کہ صوفیانہ طرز ہے یا امیرانہ اور امیر جاگیردار ہے یا بوسیدہ حال اور نادار) اس ترازو میں وزن کرنے والا دنیا و آخرت دونوں کا خسارہ پاتا ہے۔ اسلئے کہ ولی کے باطن میں (محبتِ خدا اور رسول کے) عجائب و غرائب بھرے ہوتے ہیں اس کی مثال ایسی ہوتی ہے جیسے گدڑی میں چھپا ہوا لعل اور (کمبل کی چادر جس کے اندر ریشم بھرا ہوا ہے جس کا ظہور آخرت ہی میں ہوگا اور جو ولی نہیں ہوتا (بلکہ مکّار اور اپنے کو پیر بنائے ہوتا ہے) اس کی حالت برعکس ہوتی ہے کہ ریشم کے کپڑے میں کمبل لپٹا ہوا ہے۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایک ولی صدیق کا ایک سچا مرید تھا اس کو اپنے شیخ سے بہت محبت تھی اور جب حق تعالیٰ نے اس کو شیخ کے اسرار ولایت پر مطلع فرمایا تب تو اس کی محبت حد سے بڑھ گئی اور قریب تھا کہ شیخ کو مقامِ نبوت سے بھی آگے بڑھا دے۔ پس حق تعالیٰ نے مرید پر لطف و کرم کی غرض سے شیخ پر معصیتِ زنا کا صدور فرمایا کہ مرید نے جب یہ دیکھا تو غلو عقیدت سے باز آگیا اور شیخ کو ان کے مرتبہ (شیخوخت پر) لا اُتارا۔ (کہ ولی غیر معصوم ہیں نبی نہیں ہیں) اسی وقت حق تعالیٰ نے مرید کو فتح نصیب فرمادی (یہ بھی صلاح ہی کا اثر تھا کہ اس کو ضعف اور نقص سمجھا ورنہ اس زمانہ میں تو عجب نہیں اس کو کمال سمجھ کر عقیدت میں اور ترقی ہوتی) حضرت ممدوح نے فرمایا۔ یہ بھی ایک راز ہے منجملہ ان اسرار کے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ایسے ظاہر ہونیوالے معاملات میں مضمر تھا جیسے کھجور کی تابیر کے متعلق آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اگر تابیر نہ کرو تو کیا حرج ہے۔ چنانچہ صحابہ نے تابیر سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس سال درختوں میں کھجور ناقص آئی یا مثلاً آپ نے فرمایا میں نے خواب دیکھا ہے کہ ہم سب مسجد الحرام

میں باطمینان داخل ہوئے اور (عمرہ پورا کرکے) کوئی سرمنڈوا رہا ہے کوئی بال کتروا رہا ہے۔ چنانچہ آپ مع صحابہ کے بسوئے مکہ مکرمہ روانہ ہوگئے۔ مگر حدیبیہ پر کفار مکہ نے روک دیا (اور اس سال آپ عمرہ پورا نہ فرماسکے) آئندہ سال اس عمرہ کی قضا فرمائی۔ ایسے اُمور کا ظہور آپ پر حق تعالیٰ نے اسی مصلحت سے فرمایا کہ حضرات صحابہ آپ میں (حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کی طرح) الوہیت کا اعتقاد نہ کرلیں۔ (خصوصاً جبکہ آپ کی محبوبیت کے سبب دیکھتے تھے کہ آپ کی ہر خواہش وتمنّا عموماً پوری ہوتی ہے) اور اسی بناپر ارشاد فرمایا۔ اِنَّکَ لَاتَھْدِیْ مَنْ اَحْبَبْتَ وَلٰکِنَّ اللہَ یَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ ط اے محمد تم جس کو محبوب سمجھو اُسے ہدایت نہیں دے سکتے بلکہ اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے یا مثلاً فرمایا۔ لَیْسَ لَکَ مِنَ الْاَمْرِ شَیْئٌ۔ تمہیں اس معاملہ میں کوئی اختیار نہیں۔ ان اُمور سے مقصود صحابہ کو اللہ کے آستانہ پر لا جمع کرنا تھا (کیونکہ محبوبیت کی وجہ سے آپ کی امتِ مرحومہ کی تکمیل وتربیت حق تعالیٰ نے اپنے ذمّہ لی تھی اسلئے گوارا نہ فرمایا کہ عیسائیوں کی طرح نبی تک رک جائیں اور نبی کا جو کارنامہ ہے کہ مخلوق کو سمیٹ سمیٹ کر آستانۂ خدا پر لا اکٹھا کرے اس میں کسی قسم کی کمی آجائے۔ جب ان امور مذکورہ سے عشاق محمدی نے سمجھ لیا کہ آپ محبوبِ خدا ہیں خدا نہیں تو مقصود رسالت حاصل اور حضرات صحابہ کمالِ عبدیت اور قربِ حق سے واصل ہوگئے)

نیز آپ نے فرمایا کہ ولی کے پاس آنے والے لوگ چار قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک[۱] وہ جن کا ظاہر اور باطن دونوں اعتقاد میں برابر ہوتے ہیں۔ یہ تو نہایت خوش نصیب اور بامُراد لوگ ہیں۔ دوسری[۲] قسم جن کا ظاہر و باطن دونوں انتقاد میں برابر ہوتے ہیں (کہ دل بھی انکا ہر وقت جانچ اور پرکھ میں لگا رہتا ہے اور زبان بھی اسی میں مشغول) اور یہ سب میں زیادہ بدنصیب ومحروم قسم ہے۔ تیسری[۳] قسم وہ جن کا بیرون معتقد ہے مگر اندرون ان کا منتقد اور یہ سب میں زیادہ ولی کیلئے مضرت رساں قسم ہے جیسے نبی کے لئے منافق (کہ انکی ظاہری عقیدت سے پیر بھائی الگ دھوکا کھاتے ہیں اور شیخ صاحب بصیرت کو یہ ضیق وکلفت جُدا رہتی ہے کہ اس کی ظاہری عقیدت پر نظر کرکے کچھ نفع پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی باطنی حالت اس کو روکتی (اور منع کرتی ہے کہ یہ اس کا اہل نہیں ہے) اور اگر اس کے باطن پر نظر ڈالتا اور اس سے دُور رہنا چاہتا ہے تو اس کا ظاہر طمع اور توقع دلاتا ہے (کہ شاید یہ اثر اندرون میں اتر جائے اور اصلاح ہوجائے) اس نوع کی مثال شیخ کے نزدیک ایسی ہوتی ہے جیسے ایک شخص کے پیٹ میں دوسرا شخص بیٹھ جائے اور دونوں اس کے سامنے آویں۔ اُوپر کا آدمی کہے ہاں آپ کا غلام وتابع فرمان ہوں اور ہر امرو نہی کی تعمیل کے لئے حاضر ہوں اور اندر بیٹھا ہوا شخص کہے کہ تم ولی نہیں ہو اور جن لوگوں نے تم کو شیخ اور ولی سمجھ رکھا ہے سب غلطی پر ہیں۔ مجھے تمہارے متعلق بھی شک ہے اور تمہارے معتقدین کے بارہ میں

بھی شک ہے۔ پس ناواقف جسے اندرون کا پتہ نہیں وہ تو پہلی قسم (مخلصین) کو اور اس تیسری قسم (منافقین) کو یکساں سمجھے گا (کہ ظاہر دونوں کا اظہار محبت وعقیدت کر رہا ہے) مگر عارف کے پاس جب پہلی قسم والا (مخلص) بیٹھے گا تو بھرپور نفع اٹھائیگا لیکن جب دوسری قسم والا (منافق) بیٹھے گا تو باوجودیکہ پیر کا ادب واحترام اور امر ونواہی کا امتثال پہلی ہی قسم کے مثل سے کر رہا ہے مگر کوئی نفع نہ اٹھائیگا اور (اس محرومیت پر بھی اپنے باطنی خبث پر تنبہ نہ ہوگا بلکہ) اپنے دل میں بھی کہے گا کہ نفع نہ ہونے کا سبب اس ولی کی کمزوری اور عیب و خلل ہے، اور یہ ایک بڑا سبب ہوتا ہے مشائخ پر اعتراض وگرفت کا اور ان کے بارہ میں (دوسروں کو بھی طرح طرح کے) وساوس وشبہات پیدا ہونے کا اور چوتھی قسم وہ ہے جن کا باطن معتقد ہوتا ہے مگر ظاہر انتقاد میں لگا رہتا ہے اور اس کا سبب محض حسد ہوا کرتا ہے (کہ دل کلستا ہے مجھے یہ مسند کیوں نہ ملی اور شیخ میں ایسی کونسی خوبی ہے جو مجھ میں نہیں اس لئے زبان اس جلن کے پھپھولے پھوڑنے لگتی ہے)

ایک دن میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ معارف وعلوم جو آپکی زبان مبارک سے نکلتے ہیں اس میں آپکو قصد وارادہ سے کام لینا پڑتا ہے یا بے اختیار از خود اُبلنے لگتے ہیں؟ فرمایا ولی کامل ہر وقت مشاہدۂ حق میں غائب ومحو رہتا ہے۔ ایک لمحہ بھی محجوب نہیں ہوتا۔ ہاں اس کا ظاہر (اور جسم) مخلوق کیساتھ ہوتا ہے اور اس سے حق تعالیٰ کام لیتا ہے کہ اس کے پاس آنے والے اپنے اپنے مقسوم کے موافق اس سے نفع اٹھاتے رہتے ہیں جس کی قسمت میں خیر وفلاح لکھی ہے حق تعالیٰ ولی کے ظاہر کو اس پر آزاد اور اس کو علوم کا ناطق بنا دیتا ہے (کہ منبسط ہو کر اسکی زبان سے علوم لدنیہ نکلنے اور برسنے لگتے ہیں) اور جس کی قسمت میں سچے ہاتھوں کچھ ملنا نہیں لکھا تو اس پر ولی کو روک لیتا اور معارف والی زبان کو بند کر دیتا ہے (کہ شیخ کے دل میں انقباض آتا اور زبان علمی بات نکالنے سے رُکتی ہے)۔ ولی کی مثال بنی اسرائیل کے پتھر کی سی ہے کہ جب وہ اولیاء اللہ (یعنی سیدنا موسیٰ کے صحابہ) کے سامنے آیا تو اس سے (ایک دو نہیں بلکہ خاندانہائے بنی اسرائیل کی شمار کے موافق) بارہ چشمے جاری ہو گئے اور جب اعداء اللہ (قوم فرعون کے سامنے تھا تو ایک قطرہ بھی اس سے کبھی نہ ٹپکا۔

جامع کتاب کہتے ہیں واقعی ہم نے بارہا تجربہ کیا جب کبھی کوئی غیر معتقد (معترض) حضرت ممدوح کے پاس آکر بیٹھا تو مفید وعارفانہ بات ایک بھی آپکی زبان سے نہ نکلتی بلکہ جب تک وہ اُٹھ کر چلا نہ جاتا آپ کو علمی بات کرنے پر قدرت ہی نہ رہتی تھی اور ہمیں نصیحت بھی فرمایا کرتے تھے کہ ایسا کوئی شخص آکر بیٹھا کرے تو جب تک وہ اُٹھ کر رخصت نہ ہو جائے مجھ سے کوئی بات نہ پوچھا کرو۔ اس سے قبل چونکہ ہمیں اس راز کی خبر نہ تھی اس لئے ہم اس خیال سے اور بھی پوچھا کرتے تھے کہ اچھا ہے اسرار ومعارف

اس معترض کے کان میں پڑیں تو عجب نہیں توبہ کرلے مگر ہم دیکھتے تھے کہ اس کی موجودگی میں سوال کرنے سے حضرت ایسے بن جاتے تھے گویا آپ ہیں ہی نہیں کوئی دوسرا شخص ہے جو نہ ہم سے واقف ہے اور نہ ہم اس سے واقف ہیں حتیٰ کہ جب آپ نے اس کا سبب ظاہر فرمایا تب ہم کو حقیقت راز پر آگاہی ہوئی۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ولی پر کبھی شہود کا غلبہ ہوتا ہے تو اس کو اپنی ذات کے متعلق اندیشہ ہوتا ہے کہ ہلاک اور پارہ پارہ نہ ہو جائے۔ اسلئے اس کو ضرورت ہوتی ہے ایسے کام کرنے کی جن سے وہ اپنے حس وشعور کی طرف لوٹ آوے۔ اگرچہ وہ کام صورۃً عیب ونقص ہی کیوں نہ ہوں اور یہ اس قاعدے کے موافق ہے کہ جب کسی کو دو ضرر پیش آویں تو جو ان میں ہلکا ہو اسے اختیار کرے۔ پس جب کوئی شخص ولی کو اس (عیب کے) کام کا مرتکب دیکھتا ہے اور وجہ جس کی بنا پر مرتکب ہوا ہے اسے معلوم ہوتی نہیں تو بہت جلد اعتراض کر بیٹھتا ہے اور اسلئے شیخ کی برکات سے محروم رہ جاتا ہے حالانکہ شریعتِ مطہرہ کا قانون ہے کہ کسی عضو کو مرض آکلہ لاحق ہو جائے (کہ گوشت کو کھاتا ہوا آگے بڑھتا چلا جاتا ہے) اور ذات کے ہلاک ہونے کا خطرہ ہو تو اس عضو کو کاٹ دینا چاہیئے۔ حالانکہ عضو انسانی معصوم ہے مگر ذاتِ انسانی کی حفاظت کے لئے اسکا قطع کر دینا (حقیقۃً عیب وظلم نہ ہوا بلکہ) مباح قرار پایا۔ اسی طرح بھوک کی شدت اگر اضطرار کی حد کو پہنچ جائے) اور ہلاکت کا اندیشہ ہو تو مردار کا کھانا (حالانکہ عیب اور معصیت ہے مگر مباح) حلال ہے۔ ایسے مسائل جو اس قاعدہ کے تحت میں آئیں گے شریعت میں بہت نکلیں گے (اسی قبیل سے بعض دفعہ ولی پر صورت معصیت کا ارتکاب ہوتا ہے کہ یہ اخف ہے اور ہلاکت ذات اشد ہے اور خطرۂ جان کی وجہ سے اس کو اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ سماع وغیرہ امور منہیہ کے بعض اجلّہ عارفین سے مرتکب ہونے کی یہی وجہ منقول بھی ہوئی ہے) اور یہ امور جو ذات ولی کو اس کے حس کی طرف واپس لے آتے ہیں وہی ہیں جن کی اس کو فتح نصیب ہونے سے قبل عادت پڑی ہوئی تھی اور ظاہر ہے کہ عادت کو بدن میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ غیر ولی اگر اپنی شرمگاہ کو کھولتا ہے تو فرشتے اس سے بھاگتے ہیں کیونکہ ملائکہ میں حیا کا غلبہ ہے۔ یہی حال ہزلیات اور بیہودہ الفاظ زبان سے نکالنے کا ہے کہ وہ معنوی شرمگاہ ہے مگر ولی جب اپنا کشف عورت کرے یا زبان سے ہزلیات نکالے تو ملائکہ نفرت نہیں کھاتے اسلئے کہ وہ جب اسکا ارتکاب کرتا ہے تو اس سے بہتر وافضل مصلحت کی وجہ سے کرتا ہے اور اقوی مصلحت کا ارتکاب واجب ہے لہٰذا اس کو کشفِ عورت پر بھی سترِ عورت ہی کا اجر ملتا ہے کیونکہ اس نے واجب پر عمل کیا ہے۔ اگر وہ اقوی مصلحت نہ ہوتی تو کبھی ستر نہ کھولتا۔ میں نے پوچھا کہ وہ اقوی مصلحت کیا ہے جس کی بنا پر اس نے سترِ عورت کو چھوڑ دیا یا کوئی ناشائستہ لفظ زبان سے نکالا ہے؟ فرمایا ہر وہ چیز جو ذات کو اس

کے حسی عالم کی طرف لائے اور اس پر اس کے ہوش و حواس واپس کرے (وہ آقوی ہے کہ تحفظ ذات واجب ہے اور یہ اس کا سبب ہوا ہے) پس اگر کشفِ عورت اس کو واپس لانے کا موجب ہو گا تو یہ ارتکاب کرے گا (مثلاً بیوی سے مجامعت میں مشغول ہو گا) اور اگر بیحیائی کے الفاظ اس کا سبب ہوں گے تو انکا مرتکب ہو گا (مثلاً بیوی سے ملاعبت اور ایسے الفاظ کا تکلم کریگا جن کا مجمع میں زبان سے نکالنا بے شرمی ہی) اور اگر کوئی اور دنیا کا کام (مثلاً ہنسنا بولنا لذیذ غذا کھانا وغیرہ) اسکا سبب بنے گا تو اسکا ارتکاب کریگا (اور سب پر باوجودیکہ دنی کام ہیں مگر امتثال واجب کا اجر پائے گا) میں نے عرض کیا ذات کو ایسی چیز کی حاجت کیوں ہوتی ہے جو اس کو حس و شعور کی طرف واپس لائے، اور کیا ذات اپنے حس و شعور سے غائب بھی ہو جاتی ہے فرمایا ہاں غائب ہو جاتی ہے اور اس کی مثال ایسی سمجھو کہ ایک شخص کے پاس چھ لاکھ روپیہ ہو، اور بوڑھا بھی ہو گیا ہو، اور اندھا بھی ہو گیا ہو کہ کسی کام کاج کے قابل بالکل نہ رہا ہو۔ طرہ برآن اسکے بکثرت بچے بھی ہوں اور سب چھوٹے چھوٹے ہوں، کہ ابھی کسی کام کرنے کے قابل ایک بھی نہیں ہوا۔ پھر اس شخص نے یہ سارا روپیہ لبغرض تجارت چند لوگوں کے حوالہ کر دیا ہو جو ایسے وقت میں جہاز میں سوار ہو کر روانہ ہوئے کہ سمندر میں سخت طوفان و تلاطم ہو رہا ہو، اور جہاز کی تباہی اور اسباب و سواریوں کی ہلاکت و اضاعت کا قوی خطرہ اور غالب گمان ہو۔ نیز اس نے اپنے لئے یا اپنے بچوں کے لئے ایک پیسہ بھی نہ رکھا ہو۔ اب بتاؤ اس شخص کی عقل اور ہوش و حواس کا کیا حال ہو گا؟ اسکی عقل و ہوش بس اہلِ جہاز کے ساتھ ساتھ ہو گی اور ذات سے بالکل منقطع ہو جائیگی (کہ بات بھی کریگا تو دیوانوں اور پاگلوں کی طرح) اب اس کو دو مصیبتیں پیش آئیں گی۔ ایک یہ کہ اس کی رگوں کے منہ بند ہو جائیں گے جن سے جسم کو غذا پہنچا کرتی ہے کیونکہ جہاز کے بارہ میں فکر کے منہمک ہو جانے کے وقت حرارت میں جو ہیجان اور اشتعال پیدا ہو گا وہ رگوں کو جلا دیگا چنانچہ میں نے ایک حافظِ قرآن عالم کو دیکھا کہ اس کی عقل میں فتور آگیا اور پاگل بن گیا تھا اس کو کیمیا کی دھت ہو گئی تھی اور ہمہ وقت اسی فکر اور اسی تدبیر اور خزانے جمع کرنے میں منہمک رہتا تھا۔ آخر اسکا رنگ زرد پڑ گیا، آدمیوں کے پاس بیٹھنا اٹھنا بہت کم ہو گیا، خوراک بہت کم رہ گئی تھی۔ پھر دن بدن یہ لت اُسکی بڑھتی ہی رہی حتی کہ چند روز بعد مر گیا۔ اسکی حقیقت یہی تھی کہ جسمانی غذا کی عروق کے منہ بند ہو کر جسم کو نقصان پہنچنے لگا، بدن کی تازگی زائل ہو گئی، اور زردی و لاغری بڑھتی چلی گئی، جو اسکی جان ہی لیکر گئی۔ فَاِنَّا لِلّٰهِ وَ اِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ ط دوسری مصیبت یہ پیش آئیگی کہ عقل جب اہلِ جہاز کے ساتھ چلی جائے گی اور ذات سے جدا ہو جائیگی اور اس پر طویل مدت گزرے گی تو روح جسم ذات سے نکل جائیگی اور پھر کبھی واپس نہ ہو گی۔ کیونکہ شروع ہی میں ذات کے اندر اسکا داخلہ جبراً و قہراً ہوا تھا طوعاً

درغلبۃً نہیں ہوا تھا پس جب اس کو نکلنے کیلئے کوئی راستہ ملا اور وہ نکلی تو پھر واپس ہرگز نہ آئیگی۔ پس اگر حق تعالیٰ نے اسکی موت کا یہی وقت مقدر فرمایا تھا تب تو یہ صورت اس کے مرض کی ابتداء اور یہ عوارض اسکے لئے اسباب موت بنکر اس کو ختم ہی کردیں گے اور اگر حق تعالیٰ سبحانہٗ کا وعدہ ابھی کچھ دنوں اس کو دنیا میں رکھنے کے متعلق ہے تو روح کا نکلنا بذریعہ عقل نکل جانے کے ہوگا کہ عقل ہی اس کی اصل تھی اور اسی کے ہاتھ میں اسکی تدبیر و نظم تھا (پس جب عقل نکل گئی گویا روح نکل گئی اور اسی لئے پاگل کی زندگی اہلِ دنیا کے نزدیک بھی موت کے برابر ہے بلکہ بدتر۔ اور عند اللہ بھی وہ مُردوں کے حکم میں ہے کہ نہ شرع کا مکلف ہے نہ اسکے اقوال وافعال پر مواخذہ) پس اگر اس شخص کو کوئی سبب ایسا ہاتھ آجائے جو اسکو پہلی حالت پر واپس لائے اور اہلِ جہاز کو اسکی عقل اور فکر سے باہر نکالدے تو بیشک ان دونوں مصیبتوں سے بچ جائیگا۔ یہی حالت اولیاء اللہ کی ہے کہ انکو (مشاہدۂ حق میں) غیبوبت و محویت حاصل ہوتی ہے پس جب تم ان کو دیکھو کہ کلمات واہیہ یا ہنسی مذاق وغیرہ ایسے امور کے عامل ہو رہے ہیں جو انکی عقول کو ان پر واپس لا رہے اور انکی بقاءِ ذات کو محفوظ کر رہے ہیں تو ان پر اعتراض میں عجلت نہ کیا کرو کیونکہ یہ افعال ایک غرضِ صحیح کے لئے کر رہے ہیں تاکہ جب تک ذات باقی رہے مخلوق ان سے منتفع ہوتی رہے!

بارہا ایسا ہوا کہ حضرت نے ہم سے فرمایا کہ میاں خوش طبعی و دل لگی کی باتیں کرو کہ اس سے تم پر خیر کثیر ظاہر ہوگی حتی کہ ایک مرتبہ فرمایا صاحب مشاہدہ کی مثال ایسی ہے جیسے کرگس ہوا میں اُڑ رہا اور بہت اونچا چڑھ گیا ہو اور حالت یہ ہو کہ ہوا بہت تند اور آندھی چل رہی ہو، اور ایک شخص کے ہاتھ میں پتلی سی ڈور ہو جس میں کرگس بندھا ہوا ہو۔ جب یہ شخص دیکھے کہ وہ بہت اونچا چڑھ گیا اور ہوائیں چاہتی ہیں کہ اس کو اتنا اُوپر کھینچیں کہ اب وہ زمین پر کبھی نہ جاسکے تو یہ شخص اس اندیشہ سے کہ ٹوٹ نہ جائے ڈور کو آہستہ آہستہ کھینچنے لگے اور کرگس آہستہ آہستہ نیچے اترتا چلا آئے حتی کہ اپنے مالک کے ہاتھ پر آبیٹھے۔ بس یہی حال ان دنیوی اُمور فانیہ کا ہے کہ ذات ترابی انکی عادی و خوگر ہے اور وہ ذات کو اس کے عالم حسّی کی طرف لاتے ہیں۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ولی اللہ کے ہاتھ پر بیعت ہونے سے غرض اللہ کی طرف رہبری، ماسوی اللہ سے بے نیاز بنانا اور اللہ کے آستانہ پر لاڈالنا ہے پس اگر ولی کے پاس آنیوالا اس سے یہی بات طلب کرے تب تو نفع پائیگا اور اگر اس سے قضاءِ حاجات کا طالب ہو اور رب کی بابت کوئی بات دریافت ہی نہ کرے تو ولی کو اس سے ناراضی و بغض ہوجائیگا اور (نفع تو کیا) اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہونے ہی سے بچ جائے تو بڑی بات ہے اور اسکی کئی وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ ولی کیساتھ اس کی محبت لوجہ اللہ نہ ہوئی (خود غرضی و مطلب براری کی اور) اُوپری ہوئی اور اوپری محبت کھلا خسارہ ہے کہ اس پر نورِ حق کا نزول ہرگز نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ ولی اس کو غیر اللہ کیساتھ تعلق

کی بنا پر منقطع عن اللہ دیکھکر چاہتا ہے کہ باہر نکالے (اور اللہ کے ساتھ متعلق کرے) اور یہ چاہتا ہے کہ (پیر کو بھی آلۂ حصول دنیا بناکر) اس بے تعلقی کو بڑھائے۔ ولی اس کو دیکھ رہا ہے کہ اس نے انار کو چھوڑا اور انگار کو تھاما کہ معرفتِ الٰہیہ اور اسکے آستانہ پر پڑ رہنا گویا انار تھا جسے اس نے ترک کر دیا، اور اللہ سے توڑنا اور غیر اللہ سے جوڑنا اور دنیا کی طرف جھکنا اور مصنوعی آرائش سے دل لگانا گویا انگار ہے جس کو اس نے اختیار کیا (لہٰذا یہ ضدیت سبب بُغضِ ولی بنجائیگی) سوم یہ کہ اگر ولی اسکی کسی حاجت براری میں موافقت کریگا (اور اسکی دُعا سے اسکی دنیوی مُراد بر آئیگی) یا کسی کشف وغیرہ کا ظہور ہوگا تو بہت ممکن ہے کہ مرید کو خیال ہو کہ اسی کا نام معرفت و ولایت ہے اور اسی کی لوگوں کو رغبت ہوا کرتی ہے، اور اسکے سوا ولی سے اور کوئی مطلب و غرض ہی نہیں ہے، اور یہ سب باتیں کھلی گمراہی اور ولی کی ناراضی و غصہ کا سبب ہیں (جن پر اللہ کی طرف سے کوئی بلا اور مصیبت نازل ہوجانا بعید نہیں)۔

نیز آپ نے فرمایا کہ (عشقیہ مضامین کا) سننا اہل عرفان کیلئے بمنزلہ کشتی کے ہے جسکے ذریعہ وہ مشاہدہ کا سمندر عبور کرتے اور وہ وہ عجائبات دیکھتے ہیں جنکی کیفیت بھی ناقابل بیان ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ جس کا مشاہدہ مطلوب ہے یعنی اللہ سبحانہ وہ وحی و قدیم ہے جس کی نہ کوئی نظیر ہے نہ کوئی مثال۔ اسلئے طالب کی ذات ترابی کے لئے بجز حادث الفاظ اور ہیجان والی عبارت کے اور ہے کیا جس کا سہارا پکڑے، کہ ذات ترابی اسی کی عادی ہے اور اسی پر پیدا کی گئی ہے (جیسے بلا تشبیہ جس معشوق تک رسائی اور اس کا نظارہ ناممکن ہو اسکا عاشق والہانہ الفاظ اور جوش و خروش کی آہ و بکا والے اشعار ہی سے آتشِ عشق کو ٹھنڈا کیا کرتا ہے) اور جب مشاہدہ وسیع ہوجاتا اور کبار اولیاء میں سے بن جاتا ہے تو اس کا عشق صورتاً قریب قریب مجازی عشق اور (فرہاد و مجنوں جیسے) اہل ہزل عشاق کی طرح ہوجاتا ہے۔ کیونکہ وہ مخلوقات میں حق تعالیٰ کے فعل کا مشاہدہ کرتا ہے تو روح کو ایک عجیب سرور اور بے کیف طرب حاصل ہوتا ہے حتیٰ کہ ایک (ایسے ہی اہل وجد و حال ولی) نے ایک بلّی کو دیکھا کہ اپنے پنجہ سے اپنی گردن کھجا رہی ہے تو گریہ طاری ہوگیا، اور آنسو بہنے لگے اور بلّی کے سامنے سجدہ پر سجدہ شروع کر دیا اور اتنا رویا کہ سامنے کی سب زمین بھیگ گئی۔ میں نے عرض کیا کہ اسکی حقیقت کیا تھی؟ فرمایا روح نے دیکھا کہ حق تعالیٰ اس حرکت کا فاعل ہے، اسلئے روح نے اس کے سامنے جھکنا اور رونا اور سجدہ کرنا شروع کر دیا اور ذات چونکہ روح کی موافقت کیا کرتی ہے اسلئے جسم بھی اسکی نقل اُتارنے اور وہی کام کرنے لگا جو روح کر رہی تھی مگر لوگوں پر ظاہر ہو رہا تھا کہ بلی کو سجدہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ولی نے اپنے رونے اور سجدہ کرتے وقت بجز اللہ سبحانہ، کے کسی کو دیکھا ہی نہیں اسلئے وہ اسی کے سامنے جھک رہا اور زار زار رو رہا تھا۔ نیز فرمایا کہ یہ کیفیت اولیاء کو حاصل تو ہر وقت رہتی ہے مگر اتنا فرق ہے کہ ذات جب اپنی عقل سے غائب اور محویت و بیہوشی طاری

ہو جاتی ہے تب تو وہ روح کی موافقت کرنے لگتی ہے لیکن جب غائب نہیں ہوتی (اور عقل اپنے ٹھکانہ قائم رہتی ہے) تو عقل اس کو اس سے روکتی ہے تاکہ ظاہر محفوظ رہے۔ تم دیکھو گے کہ ولی درخت کی ٹہنیاں جھومتی ہوئی دیکھکر جھومنے لگے گا اور اس پر وجد طاری ہو جائیگا چنانچہ ان کا قول ہے کہ اگر مولیٰ پتھر مارے تو مجھے شکر سے زیادہ شیریں اور پیارے ہیں (اسلیئے کہ ان کو اللہ کی طرف سے جو بھی فعل ہو اُسکے مشاہدہ میں لذت و سرور آتا ہے)

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت　　سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی

نیز آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ جب کسی بندہ کو فتح نصیب فرماتا ہے تو اس وقت جس حالت پر بھی وہ ہوتا ہے اسی پر قائم رہتا ہے اگرچہ وہ طبعاً مذموم ہو مثلاً قصاب یا حجام یا حلاق وغیرہ کا کوئی بھی پیشہ کیوں نہ ہو اس سے منتقل نہیں ہوتا کیونکہ وہ انتقال و تبدیلِ حال کو تصنع اور بناوٹ سمجھتا ہے اور صاحب فتح کے نزدیک تصنع و بناوٹ شراب نوشی وغیرہ کبائر گناہوں سے بھی زیادہ ہے۔ چنانچہ میں ایک صاحب سے واقف ہوں جو ملک شام کے شہر رملہ میں رہتے ہیں جس وقت انکو فتح نصیب ہوئی تو وہ ایسی حالت میں تھے کہ لوگ ان کا مخول اُڑاتے اور ان پر ہنسا کرتے تھے بالکل یہ حالت تھی جو ہمارے شہر فاس میں اُس شخص کی ہے جسے معیزو کہتے ہیں۔ چنانچہ فتح کے بعد بھی وہ اُسی حالت پر رہے اور انہوں نے اپنی حالت کو بدلا نہیں۔ معیزو کی حالت یہ تھی کہ بچے اور کم عقل بڑے آدمی بھی تمام دن اسکے پیچھے پڑے رہتے اور اس پر ہنستے اور اس کا مخول اڑاتے رہتے تھے۔ نیز حضرت نے فرمایا ایک اور شخص سے میں واقف ہوں کہ حق تعالیٰ نے انکو فتح نصیب فرمائی۔ اس سے قبل وہ نقارہ پیٹا کرتے تھے اور اب بھی اسی حال میں ہیں اس کو چھوڑا نہیں۔ واللہ اعلم۔

چھٹا باب: شیخ تربیت تلقین ذکر کا نفع اسماء حسنیٰ اور حلقہ درویشان

امام طریقت حضرت ابو العباس احمد بن محمد قرشی صدیقی قدس سرہ کا تصنیف کردہ ایک قصیدہ ہے جس میں مربی شیخ کے اوصاف اور مریدین کے آداب کہ شیخ کیساتھ کیا برتاؤ رکھنا چاہیئے مذکور ہیں۔ چونکہ حضرت ممدوح نے ان اشعار کی شرح بھی اکثر بیان فرمائی اور عموماً اہل طریقت نے اس کو پسند فرمایا، اور اپنے مریدین کو نصیحت فرمائی کہ اس کو حفظ کرلیں اور اس پر عمل کا خاص خیال رکھیں۔ اسلیئے ہم اول اسکو بیان کرتے ہیں کہ اس کی شرح حضرت ممدوح ہی کے ارشادات میں داخل ہے۔ امام ابو العباس ۵۸۱ھ میں موضع سلامتین پیدا ہوئے، مراکش میں نشو و نما پایا۔ علاقہ مصر کے شہر فیوم کو وطن بنایا اور ماہ ربیع الاول ۶۴۱ھ میں بعمر ۶۰ سال وہیں وفات پائی۔ آپکا لقب تاج الدین تھا، نحو و ادب، علم فقہ، و علم کلام وغیرہ تمامی علوم میں بحر ذخار تھے اور علم تصوف میں دریائے ناپید اکنار۔ ابتدائی فنون و علوم آپ نے مراکش میں پڑھے اور طلب علم میں سفر

کرتے ہوئے شہر فاس میں آکر امام الاصول مولانا ابو عبداللہ محمد بن علی، امام النحو ابوذر معصب بن محمد خشنی، اور شیخ ابوالعباس ابی العباس بن القفال رحمہم اللہ سے علوم کا استفاضہ فرمایا۔ پھر اندلس تشریف لے گئے اور وہاں کے علمائے مستفید ہوئے۔ اس کے بعد حجاز تشریف لائے اور حج و زیارت سے فارغ ہو کر بغداد گئے وہاں قطب الصدیقین حضرت محبوب سبحانی شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کے صاحبزادہ مولانا ابو محمد عبدالرزاق، امام التاریخ مولانا ابوالحسن محمد بن احمد قطیعی، اور مولانا ابو محمد قمیص بن فیروز حنبلی رحمۃ اللہ علیہم سے اکتساب علوم فرمایا۔ علم کلام امام تقی الدین ابوالعز مظفر بن عبداللہ شافعی سے، اور اصول فقہ اسکندریہ میں امام شمس الدین ابوالحسن علی بن اسمٰعیل مالکی سے، اور تصوف قدوۃ الزمان شیخ الشیوخ سلطان طریقت امام شہاب الدین سہروردی قدس سرہ سے اخذ فرمایا جن کی تصانیف میں عوارف المعارف مشہور کتاب ہے۔ اور اس قصیدہ کا اصل ماخذ بھی وہی ہے۔ حضرت ابوالعباسؒ نے اپنے اثنار سلوک میں یہ قصیدہ تصنیف فرمایا اور خود ہی اس کا نام انوار السرائر و سرائر الانوار رکھا تھا حضرت شیخ ابوعبداللہ محمد ہزمیریؒ سے منقول ہے کہ وہ اپنے مریدین و تلامذہ کو خاص طور پر اس کی ترغیب دیتے اور خواص اصحاب کو تاکید فرمایا کرتے تھے کہ اس کو اکثر پڑھا کریں کیونکہ نہایت مختصر ہے اور اسکے مضامین کو مستحضر رکھیں کہ نہایت جالب خیر ہے اور وہ قصیدہ یہ ہے:-

وَلِلشَّیْخِ اٰیَاتٌ اِذَا لَمْ تَکُنْ لَہٗ		فَمَا ھُوَ اِلَّا فِیْ لَیَالِی الْھَوٰی یَسْرِیْ	

ترجمہ: شیخ کی علامتیں واضح ہیں (اہل فہم پر پوشیدہ نہیں) اگر اس میں وہ علامتیں موجود نہ ہوں، (تو دوسرے کی اصلاح کیا کریگا) خود ہی خواہشات نفس کی راتوں (اور تاریکیوں) میں چل رہا ہے۔ حضرت ممدوح نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ ہر باطنی شے کا پتہ اسکی علامتوں سے چلا کرتا ہے (جب کسی کے چہرہ پر زردی اور بدن میں لرزہ پائینگے تو معلوم کر لینگے کہ اسکے دل میں خوف اور دہشت ہی) اسی طرح مرید کی تربیت و اصلاح کے اہل ہونے کی علامتیں ہیں جو بالکل واضح ہیں۔ اور وہ یہ ہیں کہ مخلوق کی طرف سے سلیم الصدر ہو یعنی امت محمدیہ میں کسی شخص کی عداوت اس کے دل میں نہ ہو، سخی ہو کہ کوئی چیز مانگو تو دینے میں بخل نہ کرے۔ اس کے ساتھ جو شخص بدسلوکی کرے وہ اسکے ساتھ محبت رکھے۔ مریدوں کی غلطیوں سے تغافل برتے (اور ایسی گرفت نہ کرے جس سے انکو وحشت ہو جائے) جس شخص میں یہ علامتیں نہ ہوں وہ پیر بنائے جانے کے قابل نہیں۔

اِذَا لَمْ یَکُنْ عِلْمٌ لَدَیْہِ بِظَاھِرٍ		وَلَا بَاطِنٍ فَاضْرِبْ بِہٖ لُجَجَ الْبَحْرِ	

ترجمہ: اگر اس کو ظاہری و باطنی علم حاصل نہ ہو تو اسے قعر دریا میں دے مارو۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ علم ظاہر سے مراد بقدر ضرورت علم فقہ اور علم توحید ہے (کہ فرض کی مقدار مسائل شرعیہ اور عقائد صحیحہ معلوم

ہوں) اور علم باطن سے مراد علم معرفت ہو کہ یہ دونوں علم جسے حاصل نہ ہوں وہ شیخ بننے کے قابل نہیں۔

وَاِنْ کَانَ اِلَّا اَنَّہٗ غَیْرُ جَامِعٍ	بِوَصْفَیْہِمَا جَمْعًا عَلَی اَکْمَلِ الْاَمْرِ
فَاَقْرَبُ اَحْوَالِ الْعَلِیْلِ اِلَی الرَّدٰی	اِذَا لَمْ یَکُنْ مِنْہُ الطَّبِیْبُ عَلٰی خُبْرٍ

ترجمہ: اور اگر شیخ ملے مگر ہر دو علم کا بطریق کمال جامع نہ ہو (تو اس سے بجائے نفع کے نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے) کیونکہ مریض کی حالت ہلاکت کے زیادہ قریب ہوتی ہے جبکہ طبیب اسکے مرض (کی ضروریات) سے باخبر نہ ہو۔ حضرت فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شیخ اگر علم کے ناقص ہونے کی وجہ سے جامع شریعت وطریقت نہ ہوا تو وہ سمجھ ہی نہ سکے گا کہ مرید کو کون (فعل اور کون عقیدہ) مضرت پہنچائیگا لہٰذا اس کی حالت (اس مریض کی طرح جس کے معالج کو پتہ نہ ہو کہ کس کس چیز سے اس کو پرہیز کرنا ضروری ہے) صحت کی بہ نسبت موت کے زیادہ قریب ہوگی۔ حضرت منصور قطب فرمایا کرتے تھے اگر شیخ کامل کی صحبت نصیب ہوجائے تو حرص کرنی چاہیئے کہ اپنا ارادہ اُس کے ارادہ میں فنا ہوجائے اور تمنا ہونی چاہیئے کہ (اسکی زندگی ہی میں مرنا نصیب ہو اور اس کے بعد زندہ رہنا نہ پڑے (پھر دوسرا اس جیسا ملنا مشکل ہے اور) دوسرے کیساتھ ہو کر تندرست رہنا ہی تعجب ہے چہ جائیکہ وصول اللہ نصیب ہو۔

وَمَنْ لَّمْ یَکُنْ اِلَّا الْوُجُوْدُ اَقَامَہٗ	وَاَظْہَرَہٗ مَنْشُوْرُ اَلْوِیَۃِ النَّصْرِ
فَاَقْبَلَ اَرْبَابُ الْاِرَادَۃِ نَحْوَہٗ	بِصِدْقٍ یَحُلُّ الْعُسْرَ فِیْ جَلْمَدِ الصَّخْرِ
وَاٰیَتُہٗ اَنْ لَّا یَمِیْلَ اِلَی الْھَوٰی	فَدُنْیَاہُ فِیْ طَیٍّ وَّاُخْرَاہُ فِیْ نَشْرٍ

ترجمہ: اور جس شیخ کو صرف وجود نے قائم کیا ہو (یعنی اس کو شیخ کی طرف سے اجازت نہ ملی ہو اور تکمیل سے پہلے ہی شیخ کی وفات ہوگئی ہو مگر لوگوں کا رجوع اس کی طرف ہونے لگا ہو) اور نصرت وکامیابی کے پھریرے لہرانے لگے ہوں (کہ اسکے پاس آنیوالوں کی خواہشات نفسانیہ اور شیاطین کی ہزیمت) ظاہر ہونے لگی ہو اور اس بناء پر قرب الٰہی کے طالبین مرید ہونیکی غرض سے ایسی سچی ارادت لیکر جو سخت پتھر کے اندر اُتر جائے اس کی طرف آنے لگے ہوں (تو اسکی شیخوخت بھی مسلم اور قابل اعتبار ہے۔ کیونکہ ممکن ہے اسکی تکمیل مردان غیب کے ذریعہ ہوئی ہو یا حضرت خضر علیہ السّلام کے ہاتھ پر بیعت ہوا ہو۔ مگر) اس کی شناخت (اور اسکے استحقاق مرتبہ شیخوخت کی کھلی علامت) یہ ہے کہ اس کی دنیا تہہ ہوچکی ہو اور آخرت مفتوح ہوچکی ہو (یعنی تربیت میں کسی قسم کی طلب دنیا اور غرض نفسانی ظاہر نہ ہو اور اس کا دنیا سے زہد اور آخرت کی طرف رغبت وتوجہ واضح اور آشکارا ہو۔

وَاِنْ کَانَ ذَا جَمْعٍ لِکُلِّ طَعَامِہٖ	مُرِیْدٌ فَلَا تَصْحَبْہُ یَوْمًا مِّنَ الدَّھْرِ

ترجمہ: اور اگر وہ شیخ صرف روٹیاں کھلانے کیلئے لوگوں کو اکٹھا کر رہا ہے تو اے مرید ایک دن کے لیے بھی اسکی صحبت اختیار نہ کر۔ حضرت فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کا جمع ہونا محض اسلئے ہے کہ (لنگر کا) کھانا کھادیں اور فتح (و توجہ الی اللہ) کا کوئی اثر ان پر پیدا نہیں ہوتا تو یہ اجتماع لوجہ اللہ نہوا بلغرض خورد و نوش ہوا ہے لہٰذا اسکی صحبت اور اسکے اتباع سے طالب کو دور رہنا چاہیئے۔ البتہ اگر وہ لوگوں کو جمع کرتا ہے اللہ والا بنانے کیلئے اور اسکے ساتھ کھانے کا لنگر بھی جاری ہے تو اس میں مضائقہ نہیں اور اس کے ہاتھ پر بیعت صحیح ہے۔

وَلَا تَسْأَلَنْ عَنْهُ سِوٰى ذِیْ بَصِیْرَةٍ ؛ خَلِیٍّ مِّنَ الْاَھْوَاءِ لَیْسَ بِمُغْتَرٍّ

ترجمہ:۔ اور شیخ کا پتہ کسی سے دریافت نہ کر بجز اس کے جو صاحب بصیرت ہو، خواہشات نفس سے خالی ہو، اور دھوکہ میں پڑا ہوا نہ ہو۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ شیخ تربیت کو دریافت کرنا ہو تو ایسے شخص سے دریافت کرو جس میں تین شرائط پائی جاتی ہوں۔ اول یہ کہ اہل بصیرت ہو محض سالک نہ ہو کہ قلوب کے معاملہ سے ناواقف ہو اس لئے کہ اس سے دریافت کروگے تو ایسے سالک کا پتہ بتائیگا جو وظائف کا شیدا اور کثرت اوراد کا گرویدہ ہوگا کہ اُس کے نزدیک سلوک کا منتہائے مقصود یہی ہے اور اسکے نزدیک اہل طریقت میں فرق مراتب اسی کی کمی بیشی پر موقوف ہے حالانکہ سالک محض نہ شیخ ہونیکا اہل ہے اور نہ درجہ شیخوخت پر پہنچ سکتا ہے (بلکہ شیخ وہ ہے جسکا قلب ہمہ وقت اللہ کے سامنے جھکا ہوا ہو کہ اوراد سے بھی مقصود یہی ہے اور تربیت کرنا اسی کا کام بھی ہے) دوسری شرط یہ کہ ہوائے نفس سے خالی ہو یعنی متعصب نہ ہو کہ اس سے دریافت کروگے تو تعصب کی وجہ سے اہلیت والے شیخ کا پتہ نہ دیگا (اور کسی نااہل کی تعریف کرکے اُدھر لیجائیگا) تیسری شرط یہ ہے کہ مغرور نہ ہو یعنی شیخ تربیت کے اوصاف میں اصطلاح صوفیہ سے ناواقف نہ ہو کہ اگر اس سے پوچھوگے تو مجذوب محض کا پتہ بتائیگا اس لئے کہ اسکے نزدیک معرفت الٰہیہ میں قوت اور فنائیت اسی کو حاصل ہے حالانکہ مجذوب محض (سے سلسلہ تربیت نہیں چلتا اور) وہ نہ شیخ بننے کا اہل ہے اور نہ اس مرتبہ پر پہونچ سکتا ہے۔

فَمَنْ صَدَئَتْ مِرْاٰةُ فَھْمِہٖ اَرَتْــــہُ بِوَجْہِ الشَّمْسِ مِنْ کَلَفِ الْبَدْرِ
وَمَنْ لَمْ یَکُنْ یَدْرِ الْعُرُوْضَ فَرُبَّمَا ؛ یَرَی الْقَبْضَ فِی التَّطْوِیْلِ مِنْ اَقْبَحِ الْکَسْرِ

ترجمہ: کیونکہ جس کا آئینۂ فہم غبار آلود ہوگا وہ چاند کا سیاہ دھبہ سورج میں دکھلانے لگے گا (حالانکہ اس میں سیاہی نام کو بھی نہیں) اور جو فن عروض نہ جانتا ہو وہ (شعر کا وزن نہ سمجھ سکے گا اور) بحر طویل کے پانچویں حرف کا گرنا بدترین عیب سمجھیگا حالانکہ وہ شعراء کے نزدیک مطلق عیب نہیں ہے) حضرت نے فرمایا مطلب یہ

ہے کہ جس طرح غبار آلود شیشہ میں شے کی حقیقت بدل جاتی ہے اسی طرح جو شخص اہل بصیرت نہ ہوگا اسکی فہم میں حقیقی شیخ تربیت کی حقیقت معکوس ہو جائیگی اور وہ بجائے اہل دل عارف کے صاحب اوراد سالک کو بہتر سمجھے گا۔ حالانکہ عارف بمنزلہ آفتاب کے ہے کہ مستقل اور ذاتی نور رکھتا ہے، اور صاحب اوراد بمنزلہ قمر کے ہے کہ نور حاصل کرنے میں دوسرے کا محتاج ہے اور اسکا نور مستعار ہے مگر اس کو قمر کا سیاہ دھبہ یعنی صاحب اوراد کا نقص وضعف آفتاب کے چہرہ یعنی اہل دل کی ذات پر دکھائی دیگا اور اصل کو فرع سمجھے گا اور فرع کو اصل۔ غرض شیخ کامل میں اس کو عیب نظر آئیگا لہٰذا اس سے نفرت کھائیگا اور سالک محض میں کمال نظر آئیگا لہٰذا دوسروں کو بھی اسی کا پتہ بتائے گا۔ نیز اصطلاح شعراء فن عُروض سے ناواقف شخص کو جیسے اہل فن کے نزدیک بے عیب چیز عیب دار نظر آتی ہے اسی طرح اصطلاح صوفیہ یعنی فن اصلاح و تربیت سے ناواقف شخص کو مجذوب شخص کامل اور منتہی نظر آئے گا اور صاحبدل عارف ناقص اور مبتدی معلوم ہوگا۔ لہٰذا وہ مجذوب کی طرف رہبری کرے گا جس کو شیخ بننے کا استحقاق نہیں ہے۔ ابیات مذکورہ کا خلاصہ یہ ہے کہ شیخ اگر علم ظاہر اور علم باطن سے بالکل کورا ہو، یا دونوں علم رکھتا ہو مگر بدرجہ کمال نہ رکھتا ہو تو اسکی صحبت سے کوئی نفع نہیں، اور اگر دونوں علم بدرجۂ کمال رکھتا ہو اور (زہد وسخاوغیرہ کی) علامات مذکورہ اس میں پائی جاتی ہوں تو اس کو بیشک شیخ بنایا جائے (اور اسکی بیعت اور صحبت کو غنیمت سمجھا جائے۔) بشرطیکہ اس کے شیخ نے اس کو مسند تربیت پر بٹھایا ہو اور اپنی حیات میں اس کو مجاز بنایا ہو۔ لیکن اگر شیخ کا وصال اس سے قبل ہو چکا ہو اور اپنے شیخ کی زندگی میں اس کی (روحانی تعلیم وتربیت) پوری نہ ہوئی ہو تو (اس میں غور وفکر کرنا چاہیئے) اگر فتح وبصیرت کی علامات اور خیر وصلاح کے آثار اس پر نمایاں ہوں۔ دنیا سے منہ پھیرے ہوئے ہو، آخرت کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو، اسکے ہاتھ پر (بیعت ہوکر) مریدوں کو فتح وبصیرت حاصل ہوتی ہو، تو اس کو بھی شیخ بنایا جاسکتا ہے۔ لیکن اگر یہ بھی نہ ہو بلکہ لوگوں کو محض روٹیوں پر جمع کرتا ہو تو اس سے روشناسی بھی مناسب نہیں ہے اور شیخ تربیت کے متعلق کسی سے مشورہ کرنا ہو تو ایسے شخص سے دریافت کرنا چاہیئے جس میں ہر سہ اوصاف مذکورہ پائے جاتے ہوں ورنہ ممکن ہے کہ نتیجہ برعکس نکلے۔ اب آگے اُن آداب کا ذکر ہے جن کی رعایت شیخ تربیت کی صحبت میں رہ کر مُرید پر واجب ہے۔

وَلَا تَقْدِمَنْ قَبْلَ اِعْتِقَادِكَ اَنَّهٗ	مُرَبٍّ وَلَا اَوْلٰى بِهَا مِنْهُ فِي الْعَصْرِ
فَاِنَّ رَقِيْبَ الْاِلْتِفَاتِ لِغَيْرِهٖ	يَقُوْلُ لِمَحْبُوْبِ التِّرَايَةِ لَا تَسْرِ

ترجمہ: اور (بیعت ہونے کیلئے) قدم نہ بڑھا جب تک تیرا یہ اعتقاد (پختہ) نہ ہو جائے کہ وہ مربی ہے

اور تربیت کے لئے زمانہ بھر میں اس سے بہتر کوئی نہیں ہے کیونکہ دوسرے کی طرف التفات کو دیکھنے والا (شیخ) جس کا چلانا پسند کر رہا تھا اس سے کہہ دیا کرتا ہے کہ مت چل۔ حضرت ممدوح نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ جب تک شیخ کے متعلق طالب کا یہ ارشاد نہ ہو جائے کہ واقعی وہ تربیت کا اہل ہے، نیز یہ کہ اس زمانہ میں اس سے بہتر کوئی مربّی نہیں ہے اس وقت تک دخول سلسلہ اور حصول صحبت کی نیت سے قدم بڑھانا صحیح نہیں اور اس توحید مطلب کی ضرورت اس لئے ہے کہ شیخ جب دیکھے گا مُرید کی توجہ دوسرے کی طرف ہے تو وہ مرید سے (قبولیت فیضان کا) مادہ سلب اور قطع کر دے گا کیونکہ جو مُرید باوجود شیخ سے بیعت ہو جانے کے دوسرے کو اس سے اکمل سمجھے گا تو لامحالہ اس کی طبیعت اس کی طرف کھنچے گی جس کے لئے اکمل ہونے کا یقین کئے ہوئے ہے۔ اور جب شیخ کو (فراست وبصیرت سے) اس کا علم ہوگا تو وہ مرید سے اس مادّہ ہی کو قطع کر دے گا۔ (جو فیضان کو جذب کیا کرتا ہے لہذا مرید نہ پہلے شیخ سے منتفع ہو سکے گا نہ دوسرے شیخ سے اور اس زمانہ میں ایسے لوگ بکثرت نظر آرہے ہیں اللہ ہدایت وتوفیق نصیب فرمائے۔ آمین۔ واللہ اعلم۔

وَمِنْ بَعْدِہٖ الشَّیْخُ الَّذِیْ ھُوَ قُدْوَۃٌ ٭ یُلَقِّیْ مُرَادَ الْحَقِّ فِی السِّرِّ وَالْجَہْرِ

ترجمہ۔ اور اس کے بعد وہ شیخ جو مقتدا قرار پایا ہے ظاہراً وباطناً مقصودِ حق سے آگاہ کرے گا۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ مقام تربیت (اور ضرورت سلوک) حاصل کرنے کے بعد ایسے شیخ کی طلب ہونی چاہیئے جو مقتدا اور مربی بنے اور یہ بتائے کہ اس کے پیدا کرنے سے حق تعالیٰ کا مقصود کیا ہے۔ اور اس کے ظاہر سے کیا کام لینا مطلوب ہے اور باطن سے کیا کام لینا مقصود ہے۔ کیونکہ شیخ ہی کے ذریعہ شیخ کی معرفت حاصل ہوگی اور وہی آداب مریدین تعلیم کرے گا کہ شیخ سے کیوں کر ملنا چاہیئے اور کس طرح اس کے پاس بیٹھنا چاہیئے۔ (نہ یہ کہ شروع سے ہی ذکر د مراقبہ میں چلا دے) اگر شیخ ایسا نہ ہو کہ (ضرورت سلوک اور آداب شرعیہ سکھائے) تو سمجھ لے کہ تو ایسا مریض ہے۔ جس کا کوئی طبیب نہیں اور پھر کتنی ہی ریاضت ومحنت کیوں نہ کرے کچھ نفع نہ ہوگا۔

فَقُمْ وَاجْتَنِبْ مَا ذَمَّہُ الْعِلْمُ وَاجْتَلِبْ ٭ لِمَا ذَمَّہُ بِالْمَدْحِ ھُوَ جَنَی الدُّرِّ

ترجمہ:۔ پس کھڑا ہو اور بچ اس سے جس کو علم نے مذموم بتایا ہے اور لے اس کو جس کی اس نے مدح فرمائی ہے کہ یہی موتیوں کا چننا ہے حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ جل شانہٗ تجھ کو شیخ مربی نصیب فرما دے تو اس کی خدمت کے لئے مردانہ وار کھڑا ہو جا اور اس کے حق صحبت سے آگاہ ہو اور اس کو اللہ تک پہنچنے کا وسیلہ قرار دے کہ عجب نہیں تجھے معرفت الٰہیہ نصیب ہو جائے مگر اس کے ساتھ ہی تجھ پر واجب ہے کہ (شریعت محمدیہ کا پابند ہو اور) افعال ذمیمہ جن کو شریعت بُرا بتاتی ہے چھوڑ دے اور افعال حمیدہ جن کو شریعت اچھا کہتی ہے اختیار کرے کہ تقویٰ اسی سے حاصل ہوگا جو بمنزلہ بیش قیمت موتی کے ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ تصوف کے تمامی احوال ومقامات کی بنیاد یہی تقویٰ ہے جو

اتباعِ شریعت یعنی امتثالِ اوامر و اجتناب نواہی سے نصیب ہوگا۔

وَاِنْ تَسْمُ نَحْوَ الْفَقْرِ نَفْسُکَ فَاطَّرِحْ هَوَاهَا وَجَانِبْهُ مُجَانَبَةَ الشَّرِّ

ترجمہ: اور اگر راہ فقر کی جانب تیرا نفس متوجہ ہو تو خواہش نفس کو پھینک اور اس سے ایسا علیحدہ ہو جیسا شر سے علیحدہ ہوا کرتے ہیں۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ اگر طریق تصوف کی طرف چلنے کی ہمت اور رغبت تجھ کو حق تعالیٰ نصیب فرمائے تو نفس کی تجویز کردہ نفل عبادتوں سے بھی پرہیز کر اور جب تک شیخ ان کا حکم نہ دے ان سے اتنا دور رہ جتنا شر سے دور رہا کرتے ہیں مقصود یہ ہے کہ مرید کی بہبودی اسی میں ہے جس کو شیخ تجویز فرمائے نہ کہ اس میں جس کو اپنا نفس تجویز کرے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ نور بصیرت حاصل ہونے سے قبل جب مرید کا نفس نوافل اور قیام و صیام کی کثرت کو اختیار کرتا ہے تو اکثر اس کا محرک نمود اور شہرت کی تمنا ہوا کرتی ہے اس لئے اس کے اعمال لغیر اللہ بن جاتے ہیں اور جب حق تعالیٰ مرید کو شیخ نصیب فرما دیتا ہے تو وہ اس مرض کا ادراک کرتا اور اخلاص کی طرف منتقل کرنا چاہتا ہے پس اگر مرید اپنے شیخ کی موافقت کرتا اور حق تعالیٰ کی عنایت اس کے شامل حال ہوتی ہے تو شیخ اس کے حسب حال اس کو وظائف تعلیم کرتا اور عند اللہ پسندیدہ حالت کی طرف اس کو لے آتا ہے اور اگر مرید موافقت نہیں کرتا اور کہتا ہے کہ میں تو ابھا زیادتی کی طلب میں اور شیخ کرنے لگی تو سمجھ لو کہ اس پر شیطان کا تسلط ہو گیا۔ اور مرض ریا میں استحکام آگیا۔ ایک مرتبہ صحابہ نے بعض ازواج مطہرات سے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی شب بیداری کا حال معلوم کیا (کہ خواب استراحت بھی فرماتے ہیں اور تہائی شب نوافل میں گذارتے ہیں) تو اپنے خیال میں اس کو قلیل سمجھ کر کہنے لگے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے تو اگلے پچھلے سب گناہ معاف ہو چکے ہیں (اس لئے نوافل نہ پڑھیں تب بھی کوئی حرج نہیں مگر ہمیں ریاضت و مجاہدہ میں کمی نہ کرنی چاہیئے)۔ چنانچہ ایک نے کہا کہ میں تو ہمیشہ روزے رکھا کروں گا اور ایک دن کا بھی روزہ نہ چھوڑوں گا۔ دوسرے نے کہا میں تمام رات عبادت میں گذاروں گا ایک منٹ نہ سوؤں گا۔ تیسرے نے کہا میں تجرد اختیار کروں گا اور کبھی عورت کے پاس نہ جاؤں گا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکان پر تشریف لائے تو حضرت عائشہؓ نے ان تینوں کی رائے اور مقولہ حضرتؐ سے عرض کیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے تینوں کو بلوایا اور فرمایا کہ مجھے اللہ کا خوف خشیہ اور اس کی معرفت تم سب میں زیادہ حاصل ہے۔ (اور باوجود اس کے کبھی) روزہ رکھتا ہوں اور کبھی نہیں رکھتا۔ رات کو تہجد بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے ہمبستری بھی کرتا ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق عبودیت اور مقتضائے عبدیت یہی ہے۔ پس جو شخص میرے طریقے سے علیحدہ ہو جائے گا وہ میرا نہیں ہے۔ نیز حق تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُحَرِّمُوا طَيِّبَاتِ مَا
أَحَلَّ اللَّهُ لَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ
لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ۝

اے ایمان والو اللہ کی حلال کی ہوئی صاف ستھری چیزوں

کو حرام نہ بناؤ اور حد سے آگے نہ بڑھو کہ حد سے بڑھنے والوں کو اللہ پسند نہیں کرتا۔ محدثین میں اختلاف ہوا ہے کہ یہ تین حضرات کون تھے؟ بعض نے حضرت عثمان بن مظعون، عبداللہ بن مسعودؓ اور ابوہریرہ رضی اللہ عنہم کو بیان کیا ہے اور بعض نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو انہیں شمار کیا ہے اور بعض نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اور بعض نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کو اور بعض نے حضرت ابوبکر صدیق کو رضی اللہ عنہم اجمعین۔ بہر حال (اجلّہ صحابہ کو نوافل میں زیادتی کا خیال ہوا مگر) دیکھو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسکے متعلق ان کی ذاتی تجاویز کو کیسا رد فرمایا اور عنداللہ محبوب (اور معتدل) طریق کی کیسی عجیب رہبری فرمائی۔ یہ بڑی دلیل ہے مشائخ کے اس برتاؤ کی جو (تقلیل وظائف میں) وہ مریدین کے ساتھ کیا کرتے ہیں کہ ہر امر میں توسّط و میانہ روی کو پسندیدہ سمجھتے ہیں۔ ایک شخص بغرض بیعت ایک بزرگ کے پاس آئے جو کثیر العبادت تھے۔ ہر شب میں ایک قرآن مجید ختم کیا کرتے اور دن میں کئی مرتبہ پوری دلائل الخیرات پڑھا کرتے تھے اور ہمیشہ روزہ رکھا کرتے تھے رنگ زرد پڑ گیا تھا اور مُردوں کی سی حالت ہو گئی تھی۔ شیخ نے ان کو آہستہ آہستہ نیچے اتارنا اور ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل کرنا شروع کیا۔ حتی کہ توسّط و اعتدال پر لے آئے اور اس کے بعد ایک دن فرمایا۔ کہو میاں تمہیں حق تعالیٰ نے تعب و مشقت سے کتنی راحت نصیب فرمادی۔ انہوں نے عرض کیا حضرت آپ کو حق تعالیٰ جزاءِ خیر دے۔ واقعی میرے اعمال نمود کے لئے تھے کہ غیر اللہ کے لئے عبادت کیا کرتا تھا۔ آپ کی برکت سے حق تعالیٰ نے مجھے اس سے راحت بخشدی۔ ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ نفل عبادتوں کی حالت تو یہ ہے کہ کوئی نہ کرے گا تو (کچھ عیب نہیں اس لئے کہ) قیامت کے دن باز پرس نہ ہو گی۔ لیکن اگر نمود کی غرض سے اور اس نیت سے کہ لوگ میری مدح اور عزت کریں ان کو کیا تو (خطرناک ہے اس لئے کہ) آخرت میں اُن پر سزا دی جائے گی (کیونکہ ریا معصیت ہے) نیز فرمایا کہ نمود و شہرت کے اثر سے کوئی خالی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اپنے تمامی افعال کو حق تعالیٰ کا مخلوق (اور اپنے آپ کو محل اجرا) نہ سمجھے اور بحالت فعل ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے غفلت نہ ہو۔ اگر ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے ذہول ہو گیا تو اسی وقت ریا و سمعہ اور عجب و خودستائی کا دخل ہو جائیگا۔

وَضَعُهَا بِحِجْرِ الشَّيْخِ طِفْلًا فَمَا لَهَا	خُرُوجٌ بِلَا فَطْمٍ عَنِ الْحِجْرِ وَالْحَجْرِ

ترجمہ: اپنے نفس کو طفلِ شیر خوار بنا کر شیخ کی گود میں ڈال دے کہ جب تک دودھ نہ چھوٹ جائے گود سے اور روک ٹوک سے باہر نہ نکلے۔ حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ شیخ بمنزلہ ماں کے ہے کہ جس طرح بچہ پرورش میں اپنی ماں کی گود کا محتاج ہے۔ اسی طرح مرید کو تربیت میں شیخ

کی نظرِ شفقت درکار ہے۔ توجہ و تصرف سے بھی کام لے اور روک ٹوک بھی رکھے کہ ناشائستہ کاموں سے روکتا رہے اور اصلاح و فلاح کے کاموں کی نصیحت و تاکید کرتا رہے۔ ہاں جس وقت صاحب نسبت ہو جانے کی وجہ سے تربیت کا محتاج نہ رہے اور اپنا برا بھلا خود سمجھنے لگے تو گویا دودھ چھوٹ گیا اور اب اپنا گذر خود کر سکتا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَكُنْ سَلْبُ الْاِرَادَةِ وَصْفَهٗ	فَلَا يَطْمَعَنْ فِيْ شَمِّ رَائِحَةِ الْفَقْرِ

ترجمہ: اور جس کو سلب ارادہ نصیب نہ ہو اس کو فقر کی خوشبو سونگھنے کی ہوس نہ کرنی چاہیئے حضرت نے فرمایا مطلب یہ ہے کہ مرید کو اپنے شیخ مربی کے ارادہ کے سامنے اپنے ارادہ کو فنا کر دینا چاہیئے کہ جو وہ تجویز کرے بس اسی کو واجب العمل سمجھے اور جس کی یہ شان نہ ہوئی ہو اسے تصوف کی بو سونگھنے کی بھی ہوس کرنا فضول ہے۔

وَهٰذَا وَاِنْ كَانَ الْعَزِيْزُ وُجُوْدُهٗ	وَلٰكِنَّهٗ فِي الْعَزْمِ خَالٍ مِّنَ الْعُسْرِ

ترجمہ: اور یہ (یعنی مرید کا مسلوب الارادہ ہونا) اگرچہ نادر الوجود ہے لیکن اگر ارادہ میں پختگی ہو تو اس کا حصول ناممکن اور دشوار بھی نہیں ہے لہٰذا ہمت نہ ہارنی چاہیئے۔

وَلَا تَعْتَرِضْ يَوْمًا عَلَيْهِ فَاِنَّهٗ	كَفِيْلٌ بِتَشْتِيْتِ الْمُرِيْدِ عَلٰى هَجْرِ

ترجمہ: اور شیخ پر کسی وقت (اور کسی بات پر) بھی اعتراض نہ کرے کہ یہ فراق کے علاوہ مرید کو رب سے علیحدہ کر دینے کی ضامن ہے۔ حضرت نے فرمایا کہ مطلب یہ ہے کہ شیخ پر اعتراض کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ شیخ اس کو اپنی صحبت سے بھی دور کر دے گا۔ اور مرید آستانہ الٰہیہ اور دین سے بھی ہٹ جائیگا اس لئے اس سے بچنا چاہیئے۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ یہاں تک میں نے اشعار مذکور کی شرح خود حضرت شیخ کے ہاتھ کی لکھی ہوئی دیکھی جس کو میں نے درج کر دیا۔ مگر مجھے موقع نہ ملا کہ پورا قصیدہ حضرت سے پڑھتا اور اس کی شرح زبان مبارک سے سنتا۔ اس لئے بقیہ اشعار کی شرح خود کرتا ہوں۔

وَمَنْ يَّعْتَرِضْ وَالْعِلْمُ عَنْهُ بِمَعْزِلٍ	يَرَى النَّقْصَ فِيْ عَيْنِ الْكَمَالِ وَلَا يَدْرِيْ

ترجمہ: کیونکہ جو شخص علم سے بے بہرہ ہوتے ہوئے شیخ (یا دوسرے اولیاء) پر اعتراض کیا کرتا ہے اسکی نظر میں عین کمال بھی نقص معلوم ہوتا ہے اور اسے پتہ بھی نہیں چلتا (کہ میں نے کمال کو نقصان سمجھ لیا ہے)۔ یہ مضمون عوارف المعارف سے ماخوذ ہے کہ اسکے مؤلف حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ نے تحریر فرمایا ہے " مرید کو مناسب ہے کہ جب شیخ کا کوئی ایسا فعل دیکھے جس کی حقیقت سمجھ میں نہ آوے تو سیدنا موسیٰ اور سیدنا خضر علیہما السلام کا قصہ یاد کرے کہ حضرت

خضر علیہ السلام سے ایسے افعال سرزد ہوئے جن پر سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے اعتراض فرمایا۔ مگر جب آپ کو اُن افعال کی حقیقت معلوم ہو گئی تو آپ نے رجوع فرمایا۔ **ف** ۔ چونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر عؑ کے مُرید نہ تھے بلکہ ان سے افضل اور صاحب شریعت پیغمبر تھے ۔ اس لئے ان کے اعتراض میں کوئی خرابی نہ تھی اور وہ معذور تھے مگر مرید سے بہرحال اس کا شیخ علم میں افضل ہوگا اس لئے مرید کو شیخ پر اعتراض کا حق نہیں ہے ۔اسی سے یہ نتیجہ بھی نکلا کہ اگر شریعت میں کوئی مُرید اپنے شیخ سے بڑھا ہوا ہو تو اس کو ادباً اعتراض کا تو حق نہیں ۔ مگر خلاف کرنے کا حق ضرور ہے کہ خلاف شرع امر میں اتباع جائز نہیں ہے غرض عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ شیخ عالم ہوتا ہے اور مُرید غیر عالم یا طالب علم یا ناقص العلم اسلئے عام قاعدہ عدم اعتراض کا ہے ۔لیکن مستثنیات اکثر قواعد میں ہوتے ہیں اسلئے ممکن ہے کہ علوم باطنیہ میں شیخ بڑھا ہوا ہو مگر علم ظاہری میں مرید زیادہ ہو۔ لہذا اسکو دونوں پہلو سنبھالنا پڑیں گے کہ نہ اعتراض و سوء ادب ہونے پائے اور نہ خلاف شرع امر میں اتباع ۔خصوصاً جبکہ صاحب نسبت ہو کر شیخ بن چکا ہو ۔ واللہ اعلم

وَمَنْ لَمْ يُوَافِقْ شَيْخَهُ فِي اعْتِقَادِهِ	يَظَلُّ مِنَ الْإِنْكَارِ فِي لَهَبِ الْجَمْرِ

اور جو شخص اعتقاد میں شیخ کی موافقت نہ کریگا وہ اعتراض کی وجہ سے شعلہ نار میں جائیگا یعنی شیخ سے کوئی فعل صورۃً مذموم اگر صادر ہو اور مرید نے یہ سمجھا کہ ضرور اسمیں کوئی راز ہوگا جس کا مجھے علم نہیں تب تو مرید کو شیخ سے نفع پہونچے گا ۔ اور اگر مرید نے سمجھا کہ شیخ نے غلطی کھائی تو پھر شیخ سے جدائی نصیب ہو گی اور شیخ کی نظروں سے گر کر مفارقت میں پڑیگا جو بمنزلہ شعلۂ آتش کے ہے ۔حضرت شیخ محی الدین بن عربی سے منقول ہے کہ مرید پر لازم ہے اپنے شیخ کو راستہ کا دیکھا بھالا اور عَلٰی شریعۃٍ مِّن رَّبِّہٖ سمجھے اور اپنے (ناقص علم و فہم کی) ترازو میں اسکے حالات کو وزن نہ کرے ۔ کہ بعض دفعہ شیخ سے ایسی صورت ظاہر ہوتی ہے جو بظاہر مذموم ہوتی ہے مگر باطن اور حقیقت میں محمود ہوتی ہے ۔ لہذا اسے سمجھنا ضروری ہے ۔ **ف** یہ سب کچھ اس شیخ مربی کے حقوق لازمہ میں ہے جس کی علامات پہلے بیان ہو چکی ہیں کہ جامع شریعت و طریقت ہو دنیا سے زاہد و بے رغبت ہو، کسی مسلمان سے حسد و بغض نہ رکھتا ہو سخی اور مال دنیا کی محبت سے خالی ہو ۔ کہ یہ علامات اس کے کمال تبحر کا یقین دلائیں گی اور اسکے افعال ایک درجہ میں حضرت خضر علیہ السلام کے افعال کی نظیر بن سکیں گے ۔ کہ حضرت خضر کا مقبول عند اللہ ہونا خود حق تعالیٰ کے ارشاد سے ظاہر ہوا ہے ۔ ورنہ مطلق شیخ کو خصوصاً اس زمانہ میں کہ جس کو چاہا پیر بنالیا یہ منصب حاصل نہیں ہو سکتا ۔ خلاصہ یہ ہے کہ مرید کو حسن ظن اور اتباع کامل کی یہ ہدایتیں شیخ عارف کیلئے ہیں نہ کہ ہر پیر کیلئے کہ غیر عارف کا تو پیر بنانا ہی مناسب نہیں ۔ آداب شیخ کا محل تو کیسے ہو سکتا ہے ۔ اس لئے عوام اس سے دھوکہ نہ کھا دیں ۔ واللہ اعلم

فَذُو الْعَقْلِ لَا يَرْضٰى سِوَاهُ وَاِنْ نَاىٰ	عَنِ الْحَقِّ نَأْيَ اللَّيْلِ عَنْ وَاضِحِ الْفَجْرِ

صاحب عقل اپنے (عارف و جامع) شیخ کے سوا دوسرے کو پسند نہیں کرتا اگرچہ وہ بظاہر حق سے اتنا بعید ہو جتنی صبح سے رات بعید ہے۔ حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ جب مرید اپنے شیخ کے ساتھ حسن ظن رکھتا ہے تو صاحب بصیرت ہو جانیکے بعد حق تعالیٰ اسکو ان اسرار پر مطلع فرما دیتا ہے جو شیخ کے افعال میں مضمر تھے۔ ف اسی طرح اگر احکام شرعیہ کے اسرار و حکم معلوم کرنے کی ہوس ہو تو اس کا طریق یہی ہے کہ اول ان پر عمل کرو۔

وَلَا تَعْرِفَنْ فِيْ حَضْرَةِ الشَّيْخِ غَيْرَهٗ	وَلَا تَمْلَأَنْ عَيْنًا مِنَ النَّظْرِ الشَّزْرِ

ترجمہ۔ اور دربار شیخ میں حاضری کے وقت دوسرے سے آشنا ہی نہ ہو اور نہ نظر بھر کر کسی دوسرے کو دیکھ۔ حضرت ممدوح فرمایا کرتے تھے کہ جو حُسنِ ادب اور یک درگیری کا برتاؤ مرید اپنے شیخ کے ساتھ کریگا اسکے صلہ میں اُسی جیسا برتاؤ اسکو اپنے اللہ کے ساتھ نصیب ہوگا۔ یہ بھی سمجھ لو کہ یہ ادب اور یکسوئی مرید کو نصیب نہیں ہو سکتی جب تک کہ خود شیخ کی طرف سے باطنی جاذب اسکو نہ کھینچے۔ شیخ کو جب اپنے مرید کے ساتھ محبت ہوتی ہے تو اس کی شعاعیں مرید پر پڑتی ہیں اور اسکے چار طرف محیط ہو کر اس کو شیخ کی طرف کھینچتی ہیں کہ ہر شے سے تعلق قطع کرا کے خالص اپنا بنا لیتی ہیں۔ جب تک وہ محبت اور اسکی شعاعیں قائم رہتی ہیں تو شیخ اور مرید میں تعلق قائم رہتا ہے، اور جب وہ منقطع ہو جاتی ہیں تو تعلق بھی منقطع ہو جاتا ہے۔ ایک مرید ہر وقت اپنے شیخ کے ساتھ رہا کرتا اور کسی وقت بھی انکی خدمت سے غیر حاضر نہ ہوتا تھا۔ اور اس کو اپنی محبت کا ثمرہ سمجھتا تھا نہ کہ شیخ کی محبت کا ایک دن شیخ نے فرمایا کیوں جی کیا تم کو میرے ساتھ محبت ہے؟ مُرید نے کہا حضرت اگر مجھے محبت نہ ہوتی تو ہر وقت حاضر باش کیسے رہتا۔ فرمایا اچھا معلوم ہو جائیگا۔ اسوقت سے اس کا شیخ کے پاس آنا ہی بند ہو گیا اور ایک سال کامل گذر گیا کہ صحبت شیخ تو درکنار زیارتِ شیخ بھی نصیب نہ ہوئی۔

وَلَا تَنْطِقَنْ يَوْمًا لَدَيْهِ فَاِنْ دَعَا	اِلَيْهِ فَلَا تَعْدِلْ عَنِ الْكَلِمِ النَّزْرِ

ترجمہ۔ اور شیخ کے سامنے بلا ضرورت کوئی بات نہ کر اور اگر وہ خود کوئی بات دریافت کرے تو بقدر ضرورت مختصر جواب دے۔ مطلب یہ ہے کہ زیادہ باتیں کرنا بے ادبی میں داخل ہے۔ ہاں اگر شیخ ہی اس کا خواہشمند ہو تو اس وقت تطویل کلام پسندیدہ ہے۔ شیخ کی مجلس میں مرید کی یہ شان ہونی چاہئے جیسے کوئی سمندر کے کنارہ بیٹھا روزی کا منتظر ہو کہ اب اللہ بھیجے گا۔ اسی طرح مرید منتظر رہے کہ حق تعالیٰ بزبانِ شیخ روحانی معاش اُتاریگا۔ (اور میں اس سے شکم سیر اور سیراب ہو جاؤں گا)۔

وَلَا تَرْفَعُوْا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِهٖ	وَلَا تَجْهَرُوْا جَهْرَ الَّذِيْ هُوَ فِيْ قَفْرِ

ترجمہ۔ اور شیخ کی آواز سے اپنی آواز کو اونچا نہ کر۔ ایسے الفاظ سے اسکو نہ پکار جیسے جنگلی آدمی پکارا کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے شیخ کی آواز سے اپنی آواز کو بلند کرنا سوء ادب میں داخل ہے۔ اور اسی طرح بدویانہ لہجہ میں گفتگو کرنا اسکے احترام کے خلاف ہے تعظیم کے ساتھ مخاطبت کرنی چاہئے۔ مثلاً یا ولی اللہ۔ اے میرے سردار یا حضرت وغیرہ۔ جب کسی کا وقار و احترام قلب میں ہوتا ہے تو وہ انسان کی زبان کو سنبھالے رہتا ہے اور گفتگو میں جری و بیباک نہیں ہونے دیتا۔ نہ آواز اونچی ہونے پاتی ہے، نہ زیادہ ہنسی آتی ہے، نہ بلا ضرورت بات ہو سکتی ہے۔ اور بعض کی تو یہ حالت ہوتی ہے کہ نظر بھر کر شیخ کو دیکھ بھی نہیں سکتے۔

وَلَا تَرْفَعَنْ بِالضِّحْكِ صَوْتَكَ عِنْدَهٗ
فَلَا قُبْحَ اِلَّا دُوْنَكَ فَاسْتَقِرْ

ترجمہ۔ اور شیخ کے پاس اونچی آواز سے مت ہنس کہ تلاش کرنے سے جتنے عیوب کا پتہ چلتا ہے وہ سب اس سے کم درجہ پر ہیں۔ اوّل تو زیادہ ہنسنا ہی عیب ہے اور قلب میں مُردنی لاتا ہے کیونکہ رعونت اور حماقت کا اثر ہے خصوصاً شیخ کے سامنے ہنسنا اور وہ بھی کھل کھلا کر کہ آواز نکلے۔ یہ علامت ہے کہ قلب میں شیخ کا احترام نہیں اس لئے حرمان اور خسران کا موجب ہے۔

وَلَا تَقْعُدَنْ قُدَّامَهٗ مُتَرَبِّعًا
وَلَا بَادِيًا رِجْلًا فَبَادِرْ اِلَى السَّتْرِ

ترجمہ۔ اور شیخ کے سامنے پالتھی مار کر یا پاؤں پھیلا کر مت بیٹھ (کہ یہ متکبرین کی نشست ہے) اور اگر پاؤں پھیل جائے تو جلدی سمیٹ لے۔ تواضع کی نشست یہ ہے کہ دونوں گھٹنے کھڑے کرکے ہاتھوں کا حلقہ کرلے یا ایک پاؤں سُکیڑ کر بیٹھ جائے اور دوسرا گھٹنا کھڑا کرلے۔ یا دوزانو بیٹھے اور دونوں ہاتھ اپنے گھٹنوں پر رکھ لے۔

وَلَا بَاسِطًا سَجَّادَةً بِحُضُوْرِهٖ
وَسَجَّادَةُ الصُّوْفِيِّ بَيْتُ سُكُوْنِهٖ
فَلَا تَقْصُدَ اِلَّا السَّعْيُ لِلْخَادِمِ الْبَرِّ
وَلَا وَكْرَ اِلَّا اَنْ يَّطِيْرَ عَنِ الْوَكْرِ

ترجمہ۔ اور شیخ کی خدمت میں حاضری کے وقت مصلّے نہ بچھا (اور پیر بنکر اس پر نہ بیٹھ) کہ یہ مقصود کے خلاف ہے (شیخ کے پاس تیرا آنا خدمت گذاری کیلئے ہوا ہے اور) خادم کا کام خدمت میں دوڑ دھوپ کرنا ہے (نہ کہ مقتدا و مخدوم بنکر جا نماز پر بیٹھنا) صوفی کا مصلّا اپنی رہائش کے حجرہ میں ہونا چاہیئے۔ اور جب تک آشیانہ سے پرواز نہ کر جائے خود آشیانہ نہ بننا چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح گھونسلہ پرند کا ماوی و مسکن ہے کہ دانہ پانی کی تلاش میں چار طرف گشت لگاتا ہے مگر بسیرا کرنے کے لئے گھونسلہ ہی کی طرف آتا ہے اسی طرح شیخ کا آستانہ گویا مریدوں کا آشیانہ ہے کہ سکون قلب اور ٹھکانہ کا روحی آرام یہیں ملتا ہے۔ اس لئے جب تک تربیت میں آستانہ شیخ کا محتاج ہے اُسوقت تک اپنے آپکو مریدوں کا آشیانہ نہ بنا اور پیر بنکر

نہ بیٹھ۔ ہاں جس وقت بال و پر نکل آویں اور آشیانہ سے پرواز کر جائے کہ تربیت و نگرانی شیخ کی ضرورت نہ رہے اور صاحب نسبت ہو کر اپنی حالت کو خود سنبھالنے کا اہل بنجائے تب پیر بنکر مصلّٰے پر بیٹھیو کہ اب تیرا آستانہ دوسروں کا آشیانہ بنے گا۔ مگر اس حالت میں بھی پیر کے سامنے پیرانہ شان سے نہ آئیو بلکہ وہی خادمانہ طرز قائم رکھیو، اور اپنا مصلّٰے اپنے گھر میں بچھائیو، نہ کہ شیخ کے مقابل کہ یہ سوء ادب اور عقوق میں داخل ہے۔ سعادتمند بچہ صاحب اولاد بنکر بھی اپنے باپ کے برابر کرسی پر نہیں بیٹھا کرتا اور صف خدام میں اپنا کھڑا ہونا فخر سمجھا کرتا ہے۔

وَمَا دُمْتَ لَمْ تُفْطَمْ فَلَا تَرْجُ نِيَّةً	عَلَيْكَ وَلَا تُلْقِي عَلَيْهَا بِمُسْتَجِرٍ

اور جب تک تیرا دودھ نہ چھوٹ جائے (یعنی تربیت شیخ کی مدت جو گویا مدت رضاعت ہے پوری نہ ہو جائے) اسوقت تک نہ تجھ پر جبّہ ہونا چاہئے اور نہ اسکی جرأت تجھ میں پائی جانی چاہئے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تک شیخ بننے کا اہل نہ بنجائے اسوقت تک مشائخ کا لباس پہننا اور ان کی وضع اختیار کرنا مناسب نہیں کہ تصنّع اور تکبر میں داخل ہے اور سبب خسران و حرمان ہے۔

وَلَا تَرَيَنْ فِي الْأَرْضِ دُونَكَ مُؤْمِنًا فَإِنَّ خِتَامَ الْأَمْرِ عَنْكَ مُغَيَّبٌ	وَلَا كَافِرًا حَتّٰى تَغِيبَ فِي الْقَبْرِ وَمَنْ لَيْسَ ذَا خُسْرٍ يَخَافُ مِنَ الْمَكْرِ

ترجمہ۔ اور دنیا میں کسی مومن یا کافر کو اپنے سے کمتر نہ سمجھ جب تک کہ تو قبر میں نہ چھپ جائے۔ کیونکہ انجام تیری نظروں سے غائب ہے۔ اور جو خسارہ میں مبتلا نہیں اسکو شان بے نیازی کا خوف لگا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی میں چونکہ کسی کو معلوم نہیں کہ میرا انجام کیا ہوگا اور دوسروں کا انجام کیا ہوگا۔ یہ تو قبر میں جانے ہی پر پتہ چلے گا کہ ایمان پر مرا اور مومن قرار پایا یا عیاذ باللہ کفر پر مرا و عند اللہ کافر قرار پایا۔ اسی لئے مومن تو مومن کسی کافر کو بھی بہ نگاہ حقارت نہ دیکھ اور اپنے سے کمتر نہ سمجھ۔ کیا خبر ہے کہ اسکو ایمان پر مرنا نصیب ہو جائے اور تجھے اسکے خلاف۔ پس موجودہ حالت کا کیا اعتبار۔ اور مان لے کہ اسوقت کوئی شخص خسارہ میں نہیں اور مومن صالح بنا ہوا ہے مگر اس کو بھی ہر وقت یہ اندیشہ لگا ہوا ہے کہ اللہ کی تجویز اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ مقلوب القلوب والاحوال ہے۔ نہ معلوم دم بھر میں کیا کا کیا بنا دے۔ عالم میں اسی کا تصرف چلتا ہے اور وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ کسی کو مجال دم زدن نہیں۔ عوارف المعارف میں مذکور ہے کہ حضرت یوسف بن اسباط سے کسی نے دریافت کیا کہ تواضع کی حقیقت کیا ہے؟ فرمایا اپنے گھر سے نکل کر جس سے بھی ملے اسے اپنے سے بہتر سمجھے۔ میں نے اپنے شیخ ابو النجیب ضیاء الدین کو دیکھا جبکہ میں ملک شام کے سفر میں آپ کا ہم رکاب تھا کہ ایک دنیا دار نے انگریز قیدیوں کے سروں پر خوان رکھ کر آپ کے لئے کھانا بھیجا۔ جب دستر خوان بچھایا گیا

تو آپنے دیکھا کہ قیدی برتنوں کے خالی ہونے کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ خادم سے فرمایا ان کو بھی بلاؤ کہ فقیروں کے ساتھ کھانے میں شریک ہوں۔ چنانچہ ان کو تمامی مجمع فقراء کے ساتھ ایک صف میں دستر خوان پر بٹھایا گیا اور حضرت اپنے مصلےّ سے اٹھکر انمیں ایسے جا بیٹھے گویا ان ہی میں سے ایک آپ بھی ہیں۔ اور انکے ساتھ کھانا تناول فرمایا اس وقت آپ کے باطن سے جو تواضع وانکسار آپ کے ظاہر پر برس رہا تھا وہ ہم کو محسوس ہو رہا تھا اور اپنے ایمان اور علم وعمل کا تکبر آپ میں نام کو بھی نہیں تھا۔ شیخ ابوالحسن نقیہ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ ابو محمد عبداللہ کو کہ فقہاء میں سے تھے ایک شدید سردی کے دن کثیر بارش اور کیچڑ میں سڑک پر چلتے ہوئے دیکھا سامنے سے ایک کتا آگیا جو اسی راستہ پر چل رہا تھا جس پر آپ جا رہے تھے۔ آپنے اس کے لئے راستہ چھوڑ دیا اور دیوار سے لگ کر اس انتظار میں کھڑے ہو گئے کہ یہ گذر جائے تب میں چلوں۔ حتےٰ کہ جب کتا قریب آگیا تو میں نے دیکھا کہ آپنے اپنی اس جگہ کو بھی چھوڑ دیا اور اوپر کا حصہ کتےّ کے لئے چھوڑ کر خود حصہ زیرین میں اُتر گئے تاکہ کتاّ آپسے اونچا ہو کر گذرے۔ جب کتا وہاں سے گذر گیا اور میں آپ کے پاس پہونچا تو میں نے آپ کے چہرہ پر ایک کلفت اور پریشانی محسوس کی۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت آج تو میں نے آپسے ایک عجیب بات صادر ہوتے دیکھی آپ نے یہ کیا کیا کہ خود تو کیچڑ میں اُتر گئے اور کتے کے لئے صاف جگہ چھوڑ دی کہ وہ سڑک کے اوپر چلے۔ فرمایا جب میں اس کے لئے نیچے کا حصہ چھوڑ کر دیوار سے لگ گیا تو مجھے خیال آیا کہ میں نے تو تکبر کیا اور اپنے آپ کو کتے سے بہتر اور اونچا قرار دیا۔ حالانکہ اونچا وہ ہے۔ کیونکہ میں تو اللہ کا خطا وار بندہ ہوں اور میں نے بہتیرے گناہ کئے ہیں۔ اور یہ بے گناہ ہے (کیونکہ مکلف ہی نہیں ہے) اس لئے میں فوراً نیچے اتر گیا اور اس کے لئے اوپر کا حصہ چھوڑ دیا۔ مگر اب بھی مجھے عذاب الٰہی کا ڈر ہے اگر معاف نہ فرمائے تو مستحق سزا ہوں۔ کیونکہ اپنے سے بہتر کو (ذرا دیر کیلئے) کمتر سمجھ چکا ہوں۔ علامہ حاتمی فرماتے ہیں کہ ہر لمحہ اور ہر زمان حق تعالیٰ کی اپنے بندوں کے قلوب پر توجہات ہوتی ہیں اور انمیں جس کو جتنا چاہے اپنے معارف و انعامات عطا فرماتا ہے۔ پس عارف کے پاس بیٹھا ہوا کوئی شخص اگر لمحہ کے لئے بھی جدا ہوتا اور پھر واپس آتا ہے تو یہ اس کی تعظیم وخدمت کیلئے طیار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سمجھتا ہے ممکن ہے اس پر مولیٰ کی نظر کرم پڑ گئی ہو اور ہمیشہ کیلئے مالا مال ہو گیا ہو۔ پس اگر واقعی نظر پڑ گئی ہے تب تو وہ تعظیم وخدمت کا مستحق ہی ہے۔ اور عارف نے اس کا حق ادا کیا۔ اور اگر نہیں پڑی تب بھی اس نے اپنے اللہ کے ساتھ حسن ادب برتا کہ حق تعالیٰ کی شان اکرم گستری جس برتاؤ کو مقتضی ہے (کہ اس کی کرم کا احترام کیا جائے) اس پر عمل کیا۔ نیز اہل اللہ اگر کسی کو معصیت کرتے ہوئے بھی دیکھ لیتے ہیں تو معصیت ختم ہو جانے کے بعد اس پر اڑ اور اصرار کی بدگمانی نہیں کرتے۔ بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ ممکن ہے مخفی طور پر اس نے توبہ کر لی ہو، یا عجب نہیں حق تعالیٰ نے اس کی خطا کو نظر انداز فرما دیا ہو۔ پس

جس شخص نے اپنے آپ کو کسی سے بہتر سمجھا اور حالت یہ ہے کہ انتہا و انجام نہ اپنا معلوم ہے نہ اس کا تو وہ شخص بڑے دھوکہ میں مبتلا ہے کتنے ہی علوم و معارف اس کو حاصل کیوں نہ ہوں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں تمامی معاملات اللہ کی مشیت اور ارادہ سے وابستہ و مربوط ہیں جس کا علم یقین کے درجہ میں تو کیا گمان و قیاس کے درجہ میں بھی کسی کو حاصل نہیں۔ اور یہی ایک بڑی چیز ہے جو عارفین کے قلوب کے ٹکڑے کئے ڈالتی ہے کہ ہر شخص کا معاملہ اُس ذات کے ہاتھ میں ہے جو بے نیاز و بے پرواہ ہے۔ چنانچہ ایک عارف کا قول ہے ایک شخص کا موحد ہونا مجھے پچاس برس سے معلوم ہو اور وہ مجھ سے ہٹ کر ستون کی آڑ میں جاکر انتقال کر جائے تو میں اس کی توحید پر یقین کے درجہ میں شہادت نہیں دے سکتا۔ کیونکہ نہ معلوم (اسی ادجھل ہونے کے ایک لمحہ میں) اللہ کی شانِ تقلیب کا اُس پر کیا ظہور ہوا ہو۔ دوسرے عارف فرماتے ہیں اگر درجہ شہادت میرے گھر کے دروازہ پر ہو اور محض اسلام پر مرنا میری کوٹھری کے دروازہ پر ہو تو میں اسلام پر مرنے کو اختیار کروں گا (اور شہادت کی ہوس نہ کروں گا) کیونکہ نہ معلوم کوٹھری سے گھر کے دروازہ تک پہونچنے (کے چند قدم) میں میرے قلب کو کیا انقلاب پیش آوے (اور اسلام ہی کہیں ہاتھ سے نہ جاتا رہے)

حضرت سہل رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ صدیقین کو ہر حرکت و سکون میں سوء خاتمہ کا اندیشہ لگا رہتا ہے۔ اور یہی ہیں جن کی حالت حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے وَقُلُوبُهُمْ وَجِلَةٌ کہ ان کے دل لرزتے رہتے ہیں۔ نیز فرمایا کرتے تھے کہ مرید کو تو معصیتوں کا خوف رہتا ہے۔ مگر عارف کو یہ ڈر رہتا ہے کہ کفر میں مبتلا نہ ہو جائے۔ حضرت ابویزید فرماتے تھے کہ جب مسجد کی طرف چلتا ہوں تو میری کمر میں زنار ہوتا ہے اور میں قدم قدم پر ڈرتا ہوں کہ کہیں مجھے (نصاریٰ کے) کنیسہ یا (مجوس کے) آتش خانے میں نہ لیجائے۔ جب مسجد میں پہونچ لیتا ہوں تب (اطمینان ہوتا اور) یہ زنار میری کمر سے جدا ہوتا ہے۔ روزانہ پانچ وقت میری یہی حالت ہوتی ہے۔

اسی قسم کا ایک عجیب قصہ میں نے اپنے حضرت سے سنا کہ فرمانے لگے مکہ مکرمہ میں ابوالحسن علی ہندی سے میری ملاقات ہوئی۔ ان کی عجیب و غریب حالت تھی کہ جب چلنے کا ارادہ کرتے اور پاؤں اٹھاتے تو وہ لرزتا تھا اور فوراً ہی اس کو واپس لے آتے اور پھر وہ کانپتا تھا۔ اس کے بعد پھر اُٹھاتے اور قدم بڑھانا چاہتے تو لرزتا تھا اور پھر واپس لے آتے اور وہ کانپتا تھا۔ غرض ایک قدم پورا نہیں اُٹھا سکتے تھے کہ دیکھنے والا ان کو مجنوں کہتا تھا۔ پھر قدم ہی پر منحصر نہیں۔ کھانے کے لئے منہ کی طرف نوالہ اُٹھاتے تب بھی یہی حال ہوتا تھا کہ منہ کے پاس تک لے گئے اور ہاتھ لرز رہا ہے۔ اور پھر ہٹالیا ہے اور ہاتھ کانپ رہا ہے۔ غرض نوالہ منہ میں ڈال نہ سکتے تھے کہ دیکھنے والے کو ترس آتا تھا۔ لیٹنے کا ارادہ کرتے تب بھی یہی حال

تھا کہ اٹھتے بیٹھتے غرض ہر اختیاری حرکت وسکون میں حتی کہ آنکھ کھولنے اور پلک کے جھپکانے تک میں ان کی یہی کیفیت تھی مجھے ان کی یہ حالت دیکھ کر بیحد رنج ہوا اور بہت ترس آیا۔ میں نے ان سے کہا اے ابوالحسن یہ تمہاری کیا حالت ہے حالانکہ حق تعالیٰ نے تم کو اپنے اولیاء اور خواص اصفیاء اور کبار عارفین اور اہل دیوان میں سے بنایا ہے (کہ قطب وقت ہو) اور تمہارا جسم بھی صحیح سالم ہے کوئی بیماری نہیں ہے فرمانے لگے تمہارے سوا اب تک میں نے اپنی حالت کا کسی پر اظہار نہیں کیا۔ ہاں تم سے بیان کرتا ہوں کہ الحمدللہ حق تعالیٰ نے مخلوقات میں اپنے فعل کا مجھے مشاہدہ نصیب فرمایا، اور میں آنکھوں سے دیکھتا ہوں کہ اسکا فعل اس کی تمامی مخلوقات میں ساری وجاری ہے۔ ایک چیز بھی مجھ پر پوشیدہ نہیں۔ پھر اللہ کا شکر ہے کہ اس نے مخلوقات میں اپنے فعل اور قضاء وقدر کے اسرار پر بھی مجھے مطلع فرمایا کہ افعال الٰہیہ بھی مجھے نظر آتے ہیں، اور یہ بھی مجھے معلوم ہے کہ ان میں مصلحت کیا ہے۔ اور ان کے امور مقدرہ کے راز سے بھی آگاہی ہے کہ ان اسرار میں کوئی بات بھی مخفی نہیں۔ اسکے بعد میں نے اپنی ذات میں فعل الٰہی پر نظر ڈالی تو میں نے اپنے آپ کو اس مشاہدہ سے اور ان کے اسرار کے مشاہدہ سے محروم پایا۔ اس لئے میرا خیال یہ ہوا کہ اس مشاہدہ سے مجھے محروم رکھنا عجب نہیں اس لئے ہو کہ میرے کسی فعل پر حق تعالیٰ نے اپنا غصہ مرتب فرمانا تجویز کیا ہے، اور اسلئے تمامی افعال کا مشاہدہ مجھ سے روک دیا ہے تاکہ مجھے یہ پتہ نہ چل سکے کہ وہ کونسا فعل ہے جس میں میری ہلاکت مقدر ہے اور میں اس سے پرہیز کر جاؤں۔ اس بنا پر مجھے ہر اختیاری فعل پر جو میری طرف منسوب ہے خوف لاحق ہوتا ہے کہ میں ڈرتا ہوں (کہ ممکن ہے یہی وہ فعل ہو جس پر میری ہلاکت مقدر ہو) لہٰذا میں اپنے ظاہر وباطن دونوں سے اللہ کے حضور گڑگڑاتا ہوں۔ اور جب بھی کسی فعل کا ارادہ کرتا ہوں تو وہ خوف میری نظر کے سامنے ہوتا ہے۔ اس لئے اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس کو میرے لئے سبب ہلاکت نہ بنائے۔ چونکہ چلنے کے لئے قدم اٹھانا یہ بھی ایک فعل اختیاری ہے اس لئے اس پر کانپ جاتا ہوں اور خوف کے مارے اس کو پیچھے ہٹاتا ہوں۔ مگر پیچھے ہٹانا بھی میرا فعل اختیاری ہے اسلئے پھر لرز جاتا ہوں۔ غرض ہر فعل میں یہی حال ہوتا ہے۔

شیخ فرماتے تھے کہ میں نے ان کو بہت کچھ سمجھایا، اللہ کی وسعت رحمت یاد دلائی، اور حدیث قدسی سنائی انا عند ظن عبدی بی فلیظن بی ما شاء فان ظن بی خیرا اعطیتہ خیرا الحدیث حق تعالیٰ فرماتا ہے میں بندہ کے گمان کے ساتھ ہوں، جیسا بھی وہ میرے ساتھ گمان رکھے گا ویسا اسکے ساتھ برتاؤ کروں گا، لہٰذا اب اسے اختیار ہے جیسا چاہے میرے ساتھ گمان رکھے۔ پس اگر میرے ساتھ اچھا گمان رکھے گا تو میں اس کو خیر ہی عطا کروں گا۔" غرض سب کچھ کہا اور وہ غور سے میری بات کو

سنتے بھی تھے حتیٰ کہ میرا خیال ہوتا تھا کہ اب سنبھل جائیں گے اور یہ حالت جاتی رہے گی۔ مگر پھر وہی انکا خیال عود کرتا اور ان کی وہی حالت ہو جاتی تھی کہ ہر دیکھنے والے کو ان پر ترس آتا اور دعا مانگا کرتا تھا کہ یا اللہ ان کو جلد آرام نصیب فرما خواہ ادھر یا ادھر (کہ زندگی ہو تو سکون نصیب ہو ورنہ موت آجائے اور آرام ملے) ہاں مجھے یہ تمنا ضرور ہوئی کہ کاش اہل غفلت اور اہل حجاب ان کو دیکھیں اور ان کی حقیقت حال سے آگاہ ہوں اور ان کا اللہ جل جلالہٗ سے شدت خوف اور ہر حرکت و سکون میں اس کا مراقبہ و دھیان معلوم کریں تو ان کو عبرت ہو اور اپنے انہماک شہوت اور اللہ سے بے تعلقی کا ان کو احساس ہو۔ نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حالانکہ درحقیقت اپنی ذات میں فعل الٰہی کے مشاہدہ سے محروم رکھنا اللہ کی نعمت تھی (جس کو شیخ ابوالحسن نے غلبہ خوف کے سبب برعکس سمجھ لیا تھا) کیونکہ اگر حق تعالیٰ اس پر ان کو مطلع فرما دیتا اور وہ اپنی ذات میں فعل الٰہی کا مشاہدہ کرتے تو ان کی ذات پارہ پارہ ہو جاتی۔ مگر حق تعالیٰ نے چونکہ ان کی بقار اور ایک وقت معین تک زندگی تجویز فرمائی تھی اس لئے اس مشاہدہ کو مخفی فرما دیا۔ اور دیگر اشیائیں فعل الٰہی کا مشاہدہ جیسا ان کو نصیب ہوا دیگر اولیاء و انبیاء کو بھی نصیب ہوا ہے۔ البتہ حادث و فانی شے کوئی بھی کیوں نہ ہو اپنی ذات کے اندر فعل الٰہی کا مشاہدہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتی۔ اگر یہ مشاہدہ ہو تو (کوہ طور کی طرح) فوراً ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔ ہاں دوسری چیز میں فعل الٰہی کے مشاہدہ کی طاقت حادث شے کو حاصل ہے۔ واللہ اعلم

وَلَا تَنْظُرَنْ يَوْمًا إِلَى الْخَلْقِ إِنَّهُ	يُخَلِّي طَلِيقَ الصَّفْوِ فِي كَدَرِ الْأَسْرِ

ترجمہ۔ اور کسی وقت بھی مخلوق پر نظر نہ کر کہ وہ صاف اور آزاد کو مکدر اور مقید بنا چھوڑیگی۔ پہلے شعر میں تکبر اور مخلوق کو حقیر سمجھنے کی ممانعت کی تھی اور اس شعر میں اسکی دوسری جانب یعنی افراط سے بچایا ہے کہ اتنا انکو معظم و محترم بھی نہ بنا کہ قبلہ و کعبہ ہی قرار دے لے اور اپنے احوال، اقوال، افعال، عبادات، عادات، غرض تمام حالتوں میں انکا لحاظ اور ان کی رعایت رکھنے لگے۔ کہ اس کا نام ریا و تصنع ہے اور اس سے حالات صافیہ مکدر و عیب دار بن جاتے ہیں۔ اور آزادی مبدل بہ غلامی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ جہاں جہاں بھی مخلوق کی نظر جاتی ہے اس کے بناؤ سنگھار اور آراستہ کرنے کی اس کو فکر لگ جاتی ہے اور اسی لئے شیخ عبداللہ قرشی فرماتے ہیں کہ جو شخص اپنے اقوال اور افعال میں حق تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے پر اکتفا نہیں کرتا لامحالہ اس پر نمود کا دخل ہو جاتا ہے (کیونکہ لوگوں کے دیکھنے اور سننے کی خواہش ہی کا نام نمود اور دکھاوا ہے) اور حضرت بشر حافیؒ فرماتے ہیں جس نے اپنی شہرت کو محبوب سمجھا ہے وہ ضرور ذلیل و رسوا ہوا ہے۔ نیز فرمایا کہ اس کو آخرت کی حلاوت کبھی نصیب نہ ہوگی۔

جس کی خواہش ہوگی کہ لوگوں میں اس کی شہرت ہو۔ نیز فرمایا اگر لوگوں میں قدر و منزلت کی طلب ہے تو اللہ کے نزدیک قدر و منزلت کی امید نہ رکھ۔ عوارف میں مذکور ہے کہ یہ جڑ ہے جس کا لحاظ رکھنے سے اعمال درست ہو جاتے ہیں، اور غفلت کرنے سے اعمال بگڑ جاتے ہیں۔ میں ایک دن باب الحدید پر اپنے حضرت کے ساتھ تھا کہ آپ نے مجھ پر نگاہ ڈالی اور فرمایا جب تک رسول کی معرفت حاصل نہ ہو جائے کسی کو اللہ کی معرفت کی ہوس نہ کرنی چاہیئے اور جب تک اپنے شیخ کی معرفت حاصل نہ ہو جائے کسی کو رسول کی معرفت کی ہوس نہ کرنی چاہیئے اور شیخ کی معرفت نصیب نہیں ہوتی جب تک کہ لوگوں پر نماز جنازہ نہ پڑھ لے (اور اُن کو مُردہ کی مثل سمجھ کر اپنی نظر نہ ہٹالے) اور جب مخلوق اس کی نظر سے خارج ہو جاتی ہے اور یہ کسی کی بھی پروا نہیں کرتا کہ دیکھ لیں تب کیا نفع اور نہ دیکھیں تب کیا نقصان) تو اس وقت اللہ کی رحمت ایسی طرح آتی ہے جہاں اس کا خیال و گمان بھی نہیں جاتا۔ اور شیخ کو بھی وہی مرید بھاتا ہے جو لوگوں کے دیکھنے نہ دیکھنے کی پروا نہیں کرتا۔ ف کاغذ میں جب شکن پڑ جاتی ہے تو اس کو جس وقت تک اتنا ہی دوسرے رُخ پر نہ موڑو اُس کی شکن دور نہ ہوگی۔ یہی حال اخلاق کا ہے کہ افراط و تفریط کے ہر دو پہلو سے بچنے کا نام اعتدال ہے، اور اطبار روحانی یعنی مشائخ کی حذاقت و تربیت کا اسی پر مدار ہے۔ کہ مرید کے جس پہلو کو جھکا ہوا دیکھتے ہیں اس کی اصلاح کے لئے اتنا ہی مبالغہ کے ساتھ اسکو دوسرے پہلو اختیار کرنے کی تاکید کرتے ہیں کہ اس غلو کے بغیر موجودہ شکن کا جھکاؤ رفع نہیں ہوسکتا۔ چونکہ عام طور پر طبائع میں کبر کا غلبہ ہے اور نخوت و بڑائی مرکوز خاطر ہے، اس لئے حد سے زیادہ تواضع پر زور دیا جاتا ہے تاکہ اعتدال محمود پیدا ہو جائے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ تذلل بھی مذموم ہے، اور اسی لئے شریعت نے بھیک مانگنا حرام قرار دیا ہے۔ اسی طرح نمود اور شہرت گویا اعمال کی موت ہے کہ ساری عبادتیں حبط و ضبط ہو جاتی ہیں اور اس لئے ضروری ہے کہ مخلوق کو مثل مُردہ کے سمجھے جو نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔ غرض منصفانہ فیصلہ وہی ہے جو فریقین کی پوری شہادتیں سننے کے بعد دیا جائے۔ اسی طرح ہر امر میں پسندیدہ وہ اعتدال ہے جس کے دونوں پہلو کی بدرجہ مساوی رعایت ہو۔ لہٰذا مصلحین امت کی تحریر یا تقریر میں کسی ایک پہلو میں اگر مبالغہ دیکھو تو ابھی فیصلہ نہ دو کہ یک طرفہ شہادت ہے۔ دوسرے فریق کی شہادت سننے کا انتظار دیکھو اور اسکے بعد علماً و عملاً باآسانی صحیح نتیجہ پر پہونچ سکوگے مخلوق کو مُردہ سمجھنے میں دونوں پہلو کی پوری رعایت ہے۔ کہ مردہ پر نہ تکبر ہوتا ہے اور نہ اس کے سامنے تذلل۔ اس پر شفقت کی نظر اور نفع پہونچانے کی گرویدگی بھی ہوتی ہے اور اس سے خود نفع چاہنے کی نہ توقع ہوتی ہے کہ احتیاج۔ نہ وہ اتنا حقیر ہے کہ جانوروں کی طرح گدھ کو دن کو کھلا دیا جائے اور نہ اتنا محترم ہے کہ قبلہ حاجات بنایا جائے اور اس سے مُرادیں مانگی جائیں۔ خود اس کی خدمت کرتے اور اپنے اللہ سے اس کی فلاح کی دعائیں مانگتے ہیں اور اپنی ضروریات میں اس سے بے نیاز بھی ہیں کہ یہ نہ دیکھتا ہے نہ سنتا ہے۔

وَاِنْ نَظَمَ الْحَقُّ الْکَرَامَاتِ اَسْطُرًا	فَلَا تُبْدِیَنْ حَرْفًا لِغَیْرِکَ مِنْ سَطْرٍ
سِوَی الشَّیْخِ لَا تَکْتُمْہُ سِرًّا فَاِنَّہٗ	بِسَاحَۃِ کَشْفِ السِّرِّ یَجْرِیْ عَلَی بَحْرٍ

ترجمہ۔ اگر حق تعالیٰ (تیری نظر کو مخلوق سے ہٹا کر اپنے اوپر قاصر فرمالے اور اس بنا پر تجھ پر رحمت الٰہیہ ہو کہ) کرامتوں کی سطریں منظوم ہو جائیں (اور مختلف قسم کے کشف اور خوارق عادات امور کا ظہور ہونے لگے تو اب ادب یہ ہے کہ اس کو مخفی رکھ اور) کسی ایک سطر کا ایک حرف بھی کسی دوسرے پر ظاہر نہ کر۔ بجز شیخ کے کہ اس سے البتہ کوئی راز بھی مت چھپا۔ کیونکہ وہ کشف اسرار کے مقام میں گویا دریا پر چل رہا ہے۔ یعنی انکی حقیقت سے آگاہ اور دریائے کشف کا پیراک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیخ چونکہ تیرے ان روحانی امراض سے جو راستہ قطع کرنے سے تجھ کو روک رہے تھے واقف ہے اور روحانی طبیب ہے اس لئے بری ہو یا بھلی کوئی حالت بھی اس سے چھپانی نہ چاہئے۔ عوارف میں لکھا ہے کہ مرید کو اپنے شیخ سے اپنا کوئی حال بھی مخفی نہ رکھنا چاہئے۔ جو بھی اس پر حق تعالیٰ کا انعام ہو خواہ کرامت کا ظہور ہو، یا قبولیت دعا ہو، یا کشف صادر ہو، سب بیان کر دینا چاہئے اور اگر کوئی بات ایسی جس کے ذکر کرنے میں شرم آتی ہو تو اشارۃً وکنایۃً اس کا اظہار کر دے۔ کیونکہ مرید جب کوئی بات اپنے دل میں رکھتا ہے اور شیخ پر ظاہر نہیں کرتا تو اس کے باطن پر ایک گرہ لگ جاتی ہے۔ اور جب شیخ سے کہہ دیتا ہے تو وہ گرہ کھل جاتی ہے۔ اور شیخ کو یہ مناسب ہے کہ مریدین کے اسرار کو اور کشف وکرامت وغیرہ جو کچھ بھی حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوا ہے ان کو محفوظ رکھے (اور کسی پر اس کا اظہار نہ کرے) کہ مرید کے اسرار پروردگار اور شیخ سے آگے نہ بڑھنے چاہئیں۔ اس کے بعد مرید کو بتائے اور آگاہ کرے کہ یہ چیزیں مقصود نہیں ہیں۔ اور ان سے دل بستگی اللہ سے غافل بنانے والی چیز ہے۔ ہمارے حضرت فرمایا کرتے تھے کہ دین کے متعلق ہو یا دنیا کے، جو کوئی بات بھی تم کو پیش آیا کرے اس کا مجھ سے ذکر کر دیا کرو۔ حتیٰ کہ کوئی معصیت ہو جائے تو اس کو بھی نہ چھپایا کرو۔ اس رفاقت سے نفع کیا جس میں ایک کا حال دوسرے سے چھپا رہا۔ دیکھو میں بھی تو اپنا کوئی حال تم سے نہیں چھپاتا۔ اس کے بعد اپنے واقعات کا ہم سے تذکرہ کیا کرتے حتیٰ کہ بچپن کے واقعات اور امور متعلقہ بالعادت تک کو بیان فرما دیا کرتے اور کہا کرتے تھے کہ اگر میں اپنے حالات پر تم کو مطلع نہ کروں تو اللہ مجھ سے باز پرس فرمائے گا اور مجھے سزا دے گا۔ اس لئے کہ تم میرے ساتھ حسن ظن رکھتے ہو۔ پس ذرا ٹھیرو اور میرے اندرونی حالات بھی سن لو جو تم کو معلوم نہیں اسکے بعد اختیار ہے جس کا جی چاہے وہ میرے ساتھ رہے اور اب مجھے اس کا ہدیہ لینا اور اس کا لایا ہوا طعام کھانا بھی جائز ہو گا۔ اور جس کا جی چاہے چلا جائے کہ اندرونی حالات سے میرا سکوت کرنا گویا تم کو دھوکا دینا اور حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے (جو کہ حرام ہے۔ اور مرید کو تو اصلاح حال کی ضرورت ہے پھر اسکو اپنے کسی مرض کا طبیب روحانی سے چھپانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

وَفِی الْکَشْفِ اِنْ کُوْشِفْتَ رَاجِعْہُ اِنَّہٗ	لِتَوْضِیْحِ مَاکُوْشِفْتَ مُبْتَسِمُ الثَّغْرِ

ترجمہ۔ اور اگر تجھ کو کوئی بات مکشوف ہو تو اپنے شیخ سے مراجعت کر یعنی جو بات پوچھنی ہو وہ بے تکلف پوچھ۔ کہ تیرے امر مکشوف کی حقیقت واضح کرنے میں شیخ کو گرانی و ناراضی نہ ہوگی) بلکہ مسرور رہوگا۔

وَلَاتَنْفَرِدْ عَنْہُ بِوَاقِعَۃٍ جَرَتْ	فَفِیْ غِشَا عَیْنَاکَ وَالسَّمْعُ فِیْ وَقْرٍ

ترجمہ۔ اور اگر کوئی واقعہ جاری ہو تو اس کو بھی شیخ سے مخفی مت رکھ۔ کیونکہ (شیخ بصارت صحیحہ اور سماعت حقہ رکھتا ہے اور (تیری آنکھوں میں کمزوری ہے اور سماعت میں ثقل ہے۔ عوارف المعارف میں لکھا ہے کہ سالک ذاکر کو آیندہ ہونے والا کوئی معاملہ کبھی صورت مثالیہ میں نظر آتا ہے' اور اسکا نام (اصطلاح صوفیہ میں) واقعہ ہے۔ اور کبھی بغیر صورۃ مثالیہ کے نفس حقیقت نظر آتی ہے، اور اس کا نام کشف ہے۔ مثلاً خواب میں ایک شخص نے دیکھا کہ دشمن پر حملہ کیا اور اس کو داب لیا۔ اسکو تعبیر کی ضرورت نہ ہوگی۔ اور اگر خواب دیکھا کہ سانپ پر حملہ کیا اور اسکو مار دیا۔ اس کو تعبیر کی ضرورت ہوگی۔ اور تعبیر یہ ہے کہ سانپ صورۃ مثالیہ ہے دشمن کی، اور اس کو مار ڈالنا صورت مثالیہ ہے فتح و غلبہ کی۔ پس جس طرح خواب میں ایک شے کا ظہور کبھی بصورت مثال ہوتا ہے اور کبھی نفس حقیقت کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ اسی طرح بحالت بیداری ایک شے کا ظہور کبھی پردہ مثال میں ہوتا ہے اور کبھی اصل واقعہ بجنسہٖ نظر آتا ہے۔ پہلے کا نام واقعہ ہے، اور دوسرے کا نام کشف ہے۔ پھر کشف کبھی بواسطۂ نظر ہوتا ہے، اور کبھی بواسطہ سماعت، اور کبھی (ظاہری کان سے نہیں بلکہ) اپنے باطن و اندرون میں ایک شے مسموع ہوتی ہے اور کبھی باطن میں بھی نہیں بلکہ ہوا میں آواز سنائی دیتی ہے جیسے ہاتف غیبی کی آواز۔ یہ سب صورتیں حق تعالیٰ کی طرف سے پیش آنے والے معاملہ کی اطلاع ہے اور خواہ اسکے متعلق ہو یا کسی دوسرے کے ارادہ الٰہیہ اور امر مقدر کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر ان سب سے بالا وہ مکاشفہ ہے جو خالص یقین کے ذریعہ حاصل ہو (کہ نور ایمان کی وجہ سے قلب پر کسی امر کا جزم و یقین وارد ہو جائے) کیونکہ دیگر مکاشفات ملحدین فلاسفہ دہریہ اور جوگیوں کو بھی حاصل ہو سکتے ہیں۔ اور ان کے لئے استدراج بنتے ہیں کہ ان کو کشف سمجھ کر اپنی حالت کے مستحسن ہونے کا یقین کر لیتے اور اپنے کفر و ضلال پر جمے رہتے ہیں۔ حتےٰ کہ اسی پر مرتے اور وبال و عذاب میں مبتلا ہوتے ہیں۔ لہٰذا سالک کو کشف پر مغرور نہ ہونا چاہئے۔ اور یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک اللہ جل جلالہٗ کے خوف خشیۃ اور زہد و تقویٰ کا حق ادا نہ کرے گا نہ ہوا میں اڑنا کچھ نفع دے گا نہ پانی پر چلنا کچھ مفید ہوگا۔ اور اسی لئے کشف ہو یا واقعہ اپنے شیخ پر ظاہر کرنا ضروری ہے کہ وہ حقیقت شناس اور محسن مشفق ہے۔ اصل حقیقت پر آگاہ و متنبہ کرے گا اور اس پر قاصر اور قائم نہ رہنے دے گا۔ نیز کبھی صورت مثالیہ بھی نتیجہ سے خالی اور ایسی بے سود ہوتی ہے جیسے اضغاث احلام اور تخیلات مخفیہ۔ کیونکہ واقعہ کے لئے بھی شرط ہے کہ ذکر اللہ میں اخلاص ہو

(نمود و شہرت کا دخل نہ ہو) پھر اثنار ذکر میں استغراق ہو (ماسوی اللہ کی طرف التفات و توجہ نہ ہو) اور اخلاص و استغراق کی علامت یہ ہے کہ دنیا سے زہد و بے نیازی ہو، اور تقوی کی (جس کا درجہ فتوی سے بھی بالا ہے کہ شرعی مشتبہات سے بھی مثل محرمات کے پرہیز کرے) ہر وقت و ہر لحظہ پابندی ہو۔ بس یہ امر آداب مریدین میں داخل ہے کہ کوئی شے بذریعہ کشف معلوم ہو یا بذریعہ واقعہ، اس کو شیخ سے پوشیدہ نہ رکھے۔ کہ اس کا دروازہ بسوی خالق چونکہ مفتوح ہے اس لئے اگر واقعہ اور کشف صحیح ہوگا تو اس کو نافذ کرے گا اور اگر اس میں کوئی شبہ ہوگا تو اس کو زائل کرے گا۔

وَفِرَّ اِلَيْهِ فِي الْمُهِمَّاتِ كُلِّهَا	فَاِنَّكَ تَلْقَى النَّصْرَ فِي ذٰلِكَ الْفِرّ

ترجمہ۔ اور اپنی تمام ضروریات میں (خواہ وہ دینی ہوں یا دنیوی) اپنے شیخ ہی کی طرف بھاگ کہ اس بھاگنے ہی میں تجھ کو نصرت ملے گی۔ حضرت سہروردی قدس سرہ لکھتے ہیں مرید کو یہ سمجھنا چاہئے کہ شیخ ایک دروازہ ہے جس کو حق تعالیٰ نے اپنی بارگاہ رحمت کی طرف کھول رکھا ہے کہ اسی کے واسطہ داخلہ و وصول ہوگا رحمت الٰہیہ تک اور اسی کے ذریعہ نزول ہوگا رحمت الٰہیہ کا مرید پر۔ اور شیخ پر لازم ہے کہ مرید کو اللہ کی امانت سمجھے اور جس طرح رجوع الی اللہ کرتا ہے اپنی ضروریات دینیہ و دنیویہ میں اسی طرح اللہ کی طرف رجوع کرے مرید کی ضروریات دینیہ و دنیویہ میں۔ نیز مرید پر لازم ہے کہ شیخ پر اپنی ضروریات پیش کرنے میں ادب و احترام اور وقت و موقع کی رعایت رکھے کہ جب شیخ کو اپنی طرف متوجہ اور بات سننے کے لئے آمادہ و مستعد پائے اس وقت ذکر کرے۔ ورنہ خاموش رہے اور عجلت نہ کرے۔

وَلَا تَكُ مِمَّنْ تَحْسُنُ الْفِعْلُ عِنْدَهُ	فَيَفْسُدُ اِلَّا اَنْ يَفِرَّ اِلَى الْكَسْرِ

ترجمہ۔ اور ان لوگوں میں سے نہ بن جو اپنے عمل کو اچھا سمجھتے ہیں کہ (یہ عجب و خود ستائی ہے جس سے اچھا عمل بھی) فاسد و خراب ہو جایا کرتا ہے۔ ہاں البتہ شکستگی کی طرف لپکے اور یوں سمجھے کہ میں کیا اور میرا عمل کیا میں خود بھی اللہ کا پیدا کیا ہوا بندہ ہوں، اور اعمال بھی سارے اسی کی مخلوق ہیں۔ اس نے اپنے لطف و کرم سے مجھ کو واسطہ اور محل بنا دیا اعمال حسنہ کا۔ پس اس رجوع الی اللہ سے عجب اور اپنے افعال کا مستحسن سمجھنا جو کہ مفسد اعمال تھا جاتا رہے گا اور اعمال اب حسنہ بن جائیں گے۔ بلکہ عجب کے بدلہ حق تعالیٰ سے حیا و شرم، ناراضی کا خوف، اور نعمت پر شکر، مرتب ہوگا۔ عارفین کا قول ہے کہ عجب اور اپنے فعل و عمل پر ناز علامت ہے عمل کے مقبول نہ ہونے کی۔ حتیٰ کہ بعض کا قول ہے کہ عمل کے مقبول ہونے کی علامت یہ ہے کہ اسکو بھول جائے اور اس سے بالکل ہی نظر ہٹ جائے (چہ جائیکہ اس کو اچھا سمجھنا) اور اس کی دلیل یہ ہے کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ عمل نیک کو حق تعالیٰ اٹھا لیا کرتا ہے۔ یعنی بندہ کے

پاس اس کی یادداشت بھی باقی نہیں رہتی۔ اور جب اس کی نظر اس پر پڑ رہی ہے تو معلوم ہوا وہ اسی کے پاس موجود ہے۔ حق تعالیٰ کی طرف اٹھا نہیں۔ اور جب نظر سے غائب ونسیاً منسیا ہوگیا تو معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی طرف اُٹھ گیا اور مقبول ہوگیا ہے۔

وَمَنْ حَلَّ مِنْ صِدْقِ الْاِنَابَۃِ مَنْزِلًا	یَرَی الْعَیْبَ فِی الْاَفْعَالِ وَھُوَ مُسْتَبْرِیٔ

ترجمہ۔ اور جس کو سچی توجہ الی اللہ کا مرتبہ نصیب ہو جاتا ہے وہ باوجود (عیب سے) بری ہونے کے اپنے اعمال میں عیب پایا کرتا ہے۔ یعنی رجوع الی اللہ کا مقام جن کو حاصل ہوتا ہے وہ باوجودیکہ صورۃً وسیرۃً ظاہراً و باطناً ہر طرح اپنے اعمال کو شریعت کے موافق ادا کرتے اور ارکان وشرائط ہی نہیں بلکہ سنن وآداب بھی کما ینبغی پورا کر لیتے ہیں۔ مگر پھر یوں سمجھتے ہیں کہ حق ادا نہیں ہوا اور اعمال ناقصہ صادر ہوئے۔ کہ ممکن ہے کوئی ایسا عیب اس میں موجود ہو جس کا ہمیں علم نہیں ہوا۔

شیخ ابو یعقوب اسحاق بن محمد نہرجوری فرماتے ہیں اس کی علامت وشناخت کہ حق تعالیٰ تمامی احوال میں بندہ کا کفیل وکارساز بن گیا ہے، یہ ہے کہ بندہ کو اپنے اخلاص میں کوتاہی نظر آئے، اور ذکر میں غفلت' اور صدق میں کمی' اور مشاہدہ میں فتور' اور اظہار فقر واحتیاج میں قلت مراعاۃ وبے احتیاطی محسوس ہو کہ اپنے تمامی احوال ناقص وناپسندیدہ دکھائی دیں' اور بہر حال اللہ کی طرف افتقار واحتیاج زیادہ ہوتی رہے۔

حضرت ابو عمر اسمٰعیل بن نجید فرماتے ہیں عبودیت میں قدم نہیں پڑ سکتا جب تک کہ اپنے تمامی افعال ریا ونمود اور تمامی احوال دعویٰ بلا دلیل نظر نہ آ دیں۔ کیونکہ نفس کو محبوب ہی وہ چیز ہے جو خیر کی ضد ہو' اسلئے اگر نفس نے عمل کو اچھا اور خیر سمجھا تو اس کے فطری اقتضاء کے موافق وہ درحقیقت بد اور شر ہوا' حق تعالیٰ فرماتا ہے وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکُمْ وَرَحْمَتُہٗ مَازَکٰی مِنْکُمْ مِنْ اَحَدٍ اَبَدًا اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہو تو کوئی بھی تم میں کبھی اچھا نہیں بن سکتا۔ نیز فرمایا ہے وَمَآ اُبَرِّیُٔ نَفْسِیْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ (سیدنا یوسف پیغمبر فرماتے ہیں) میں اپنے نفس کو (عیب سے) بری نہیں کہہ سکتا بے شک نفس کی تو طبیعت ہی ہے بدی کا حکم دینا۔ ایک بزرگ فرماتے ہیں بجز اس کے فضل کے ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ اور اس کی پردہ پوشی کے سہارے ہم تو جی رہے ہیں۔ اگر کہیں پردہ اُٹھا دے تو وہ ہماری گندی حالت ظاہر ہو کہ الامان الحفیظ۔ اس بناء پر اکابر نے اپنے صحیح عمل سے بھی بیزاری کا اظہار کیا ہے، چہ جائیکہ جن اعمال میں نقص ہو۔ چنانچہ حضرت ابو یزیدؒ فرماتے ہیں ایکبار کی تہلیل اور کلمہ لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ پڑھنا بھی اگر (عیب سے) سالم وصاف ثابت ہو جائے تو میرے لئے بسا غنیمت ہے اور پھر مجھے دیگر اعمال کی بھی پروانہ ہو۔ حضرت ابو سلیمان دارانی فرماتے ہیں کہ مجھ سے ایک عمل بھی ایسا نہیں ہوا جس پر

مجھے اجر و ثواب کی توقع ہو۔ واللہ اعلم۔

(حضرت ممدوح کے مشائخ) ارشاد فرمایا کہ مجھے دس اولیاء اللہ کی میراث نصیب ہوئی ہے۔ اوّل حضرت عمر بن محمد ہواری رحمۃ اللہ علیہ۔ کہ روضہ علی بن حرزہم کے متولی و سجادہ نشین تھے اور ہم مزار کے اوقاف اور لنگر خانہ کے مصرف تھے۔ میں متعدد لوگوں کو شیخ بنا چکا تھا۔ مگر ان میں سے ایک بھی سرّ الٰہی کا حامل نہ تھا۔ کھانا لینے کے لئے روضہ پر جاتا تو سجادہ صاحب کو دیکھا کرتا تھا۔ ان کی حالت مجھے اچھی معلوم ہوئی اور میں نے ان سے تلقین اوراد کی درخواست کی مگر انہوں نے ٹال دیا۔ جوں جوں وہ تغافل برتتے رہے ووں ووں میرا شوق بڑھتا رہا۔ آخر ایک شب میں روضہ ہی پڑ رہا۔ اور صبح کو حضرت خضر علیہ السلام سے ملاقات کا وہ واقعہ پیش آیا جو شروع کتاب میں درج ہو چکا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام چونکہ سجادہ صاحب کو میرے متعلق وصیت فرما چکے تھے اس لئے انہوں نے مجھ پر خاص توجہ فرمائی اور میں نے ان سے اکتساب کیا۔ حتیٰ کہ ان کی وفات پر (ان کے روحانی انوار و سرّ الٰہی کا) وارث ہوا۔ ایک مرتبہ میں حاضر تھا کہ حضرت سجادہ صاحب سے کسی شخص نے سوال کیا اوراد جو مشائخ تلقین کیا کرتے ہیں ان کا کیا فائدہ ہے۔ (جبکہ سب کتابوں میں درج ہیں اور ہر شخص از خود پڑھ سکتا ہے؟) فرمایا سچوں کی تلقین کا فائدہ دریافت کرتے ہو یا جھوٹوں کی تلقین کا؟ سائل نے کہا کہ سچے اولیاء کی تلقین کا فائدہ دریافت کرتا ہوں۔ فرمایا حق تعالیٰ نے امت محمدیہ کے دین (اور ایمان) کی حفاظت فرمائی ہے بذریعہ شریعت ظاہریہ کے۔ کہ اس پر عمل کریگا تو ایمان جو باطنی شے ہے محفوظ رہے گا۔ (پس اگر ظاہری اعمال پورے کئے مگر قلب نور ایمان سے خالی رہا تو ایسا ہے جیسے پوست موجود ہے مگر گری نہیں۔ حالانکہ پوست سے مقصود گری ہی کی حفاظت تھی) اور سچے ولی کا باطن چونکہ مشاہدۂ الٰہیہ سے معمور ہوتا ہے۔ اس لئے عامی آدمی جب شیخ کامل سے ملے بغیر از خود مثلاً کلمۂ توحید پڑھتا ہے تو محض اس کی زبان ہی لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہُ کہتی ہے اگر دل اس کی غافل ہوتا ہے۔ اور ولی جب کلمہ پڑھتا ہے تو باطن سے پڑھتا ہے تو باطن سے پڑھتا ہے۔ کیونکہ اس کو بڑے درجہ کا مشاہدہ حاصل ہے (اور وہ وحدانیت حق تعالیٰ کو گویا آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے ایک شخص پیاس میں گرم پانی پئے اور کہے الحمد للہ۔ دوسرا پیاسا سا برف کا ٹھنڈا پانی پئے اور کہے الحمد للہ۔ اس کا دل اور زبان دونوں نے شکر خدا ادا کیا۔ اور پہلے نے صرف زبان سے کہا ہے مگر دل نے نہیں کہا) اس لئے جب شیخ اپنے مرید کو (اسی کلمہ توحید یعنی ذکر نفی اثبات کی) تلقین کرتا ہے تو اس کی حالت مرید کے اندر سرایت کرتی ہے اور وہ (نور ایمان میں) برابر ترقی پاتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مقدر ہوتا ہے تو اپنے شیخ کے مرتبہ پر پہونچ جاتا ہے (جیسے آہن متواتر و بار بار مقناطیس سے متاثر ہو ہو کر خود مقناطیس

متاثر ہو ہو کر خود مقناطیس بنجاتا اور دوسرے لوہے کو اپنی طرف کھینچنے لگتا ہے) اس کے بعد آپنے مثال کے درجہ میں یہ مشہور حکایت نقل فرمائی کہ ایک بادشاہ تھا اس کو اپنے لڑکے کے ساتھ بہت محبت تھی۔شاہزادہ بیمار ہو گیا تو بادشاہ نے پریشان ہو کر طبیبوں کو جمع کیا اور دھمکایا کہ میرا بچہ اگر تندرست نہ ہوا تو تمہارے لئے اچھا نہ ہوگا۔طبیبوں کی بالاتفاق رائے یہ ہوئی کہ شاہزادہ کو گوشت کھانے سے پرہیز کرنا ضروری ہے چنانچہ شاہزادہ سے کہا گیا کہ گوشت کھانا چھوڑ دیں۔ مگر شاہزادہ نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ چاہے دم نکل جائے مگر گوشت نہیں چھوڑ سکتا۔ اطباء حیران و پریشان ہو گئے (کہ جو اصل علاج ہے وہ قبول نہیں ہوتا اور عدم صحت پر سزا و ذلت کا سامنا ہے) اس لئے بار بار الحاح کے ساتھ التجا کی اور چاہا کہ کسی طرح شاہزادہ اس پر عمل کرے مگر وہ نہ مانا اور ان کی نصیحت سے اس کی نفرت ہی بڑھتی رہی۔ آخر ایک طبیب نے گھر آکر غسل کیا اور اللہ جل جلالہ کے حضور میں گڑگڑایا اور نیت کی کہ جب تک بیمار شاہزادہ گوشت چھوڑے رکھے گا اس وقت تک میں بھی چھوڑے رکھوں گا اور گوشت نہ کھاؤں گا۔اس کے بعد شاہزادہ کے پاس آکر عرض کیا کہ تا صحت چند روز کے لئے گوشت کھانا چھوڑ دیجئے۔(اب چونکہ نصیحت محض زبان سے نہ تھی بلکہ دل سے تھی کہ قول اور عمل باہم موافقت کھا رہے تھے اس لئے) شاہزادہ نے فوراً کہنا مان لیا اور بہت جلد تندرست ہو گیا۔ دوسرے طبیبوں کو اس پر بڑی حیرت ہوئی کہ کیا جادو کر دیا۔ مگر جب اس نے بتایا کہ میں نے یہ صورت اختیار کی تب ان کی سمجھ میں آیا۔ اسی طرح شیخ چونکہ کلمہ توحید کا قائل بھی ہے اور عامل بھی لہٰذا اس کی تعلیم موثر ہو کر دوسرے کو بھی عامل بنا دیتی ہے۔ نیز حضرت نے فرمایا کہ اہل معرفت اولیا رجب اہل حجاب (اور غافل قلوب والی) ذوات پر نظر ڈالتے اور ان میں کسی ایک ذات کو طہارت اور سر الٰہی کی طاقت رکھنے والی دیکھتے ہیں تو اس کی تربیت اور ذکر وغیرہ کی تلقین میں ہر وقت لگے رہتے ہیں کہ شیخ کا مقصود صرف وہ ایک ہی شخص ہوتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی کوئی دوسرا اگرچہ حمل سر الٰہی کے ناقابل ہوتا ہے لیکن تلقین ذکر کا طالب ہوتا ہے تو اس سے بھی انکار نہیں کرتے کیونکہ کسی کو مایوس کرنا ان کو پسند نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مشائخ کے پاس جو کوئی بھی آتا ہے خواہ وہ سر الٰہی کو اٹھا سکے یا نہ اٹھا سکے ذکر کی اس کو تلقین کر دیتے ہیں (جیسے مدرسہ کے طلبا کہ ہونہار اور عالم بن کر نور چمکانے والا انمیں ایک دو ہی ہوتا ہے اور اسی لئے اس پر استاد کی خاص نظر ہوتی ہے۔ مگر جماعت میں داخلہ جو کوئی بھی آوے اسکا ہو جاتا اور درس میں بیٹھنے اور تقریر سننے کی اجازت اس کو ملجاتی ہے) نیز ایک فائدہ اور بھی ہے جو آخرت میں ظاہر ہوگا۔ وہ یہ کہ قیامت کے دن سرور عالم دو عالمیان کے ہاتھ میں لواء حمد ہوگی جو نور ایمان (کی صورۃ مثالیہ) ہے اور تمامی مخلوق خواہ آپ کی امت ہو یا غیر امت حتیٰ کے انبیاء و رسل بھی سب آپ کے پیچھے ہوں گے۔ کہ ہر امت اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی

اور (چونکہ ہر نبی کے ایمان کا افاضہ نور ایمان محمدی سے ہوا ہے لہٰذا) ان کے نبی کا جھنڈا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جھنڈے سے مستفید و مستمد ہوگا۔ اس طرح پر تمامی انبیاء مع اپنی امتوں کے آپ کے ایک شانہ کی جانب ہوں گے۔ (کہ انکا استفاضہ عالم ارواح میں ہوا تھا) اور آپ کی امت مطہرہ آپ کے دوسرے شانہ کی جانب ہوگی (کہ ان کے استفاضہ کا تعلق عالم دنیا اور روح مع الجسد ہے) اور امت محمدیہ میں حضرات انبیاء کی شمار کے موافق اولیا ہوں گے جن کے ہاتھوں میں انبیاء کے جھنڈوں کی مثل جھنڈے ہوں گے، اور ان کے تابعین مثل ان کے تابعین کے ہوں گے۔ کہ یہ اولیاء مستفید و مستمد ہونگے ذات محمدی سے اور ان کے اتباع مستفید ہوں گے خود اُن سے، جیسا کہ حضرات انبیاء کا حال ہوگا (کہ وہ نور لیں گے ذات محمدی سے اور ان کی امتیں نور حاصل کریں گی اپنے اپنے نبی سے) پس مرید اگر سر الٰہی کی طاقت نہیں بھی رکھتا تھا (تب بھی تعلق بیعت اور اتباع شیخ کی وجہ سے) اپنے اس شیخ سے نفع پائے گا جس نے اس کو ذکر تلقین کیا تھا۔ مگر یاد رکھو کہ شیخ کے محض ذکر تلقین کر دینے اور مرید کے محض زبان سے ذکر کر لینے سے کوئی نفع نہ ہوگا جب تک کہ اللہ، اور اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لانے کی کیفیت شیخ سے نہ سیکھے اور فی الجملہ کسی درجہ کا باطنی نفع حاصل نہ کرلے۔ (ورنہ محض زبانی تلقین اور لسانی ذکر تو ایسا ہے جیسا کتاب میں دیکھ کر معلوم کرلیا اور پڑھنا شروع کر دیا) طبیبوں ہی کے مذکورہ قصہ کی طرح ایک یہ واقعہ ہے کہ ایک مملوک غلام نے ایک بزرگ سے خواہش کی کہ میرے آقا سے سفارش فرما دیجئے مجھے آزاد کر دے۔ چونکہ وہ آپ کی بات بہت مانتا ہے اس لئے آپ کی ذرا زبان ہلانے سے میرا کام بن جائے گا۔ شیخ چپ ہوگئے اور کچھ جواب نہ دیا۔ حتٰی کہ ایک سال سے زائد گذر گیا۔ آخر ایک دن غلام کو ساتھ لیکر اس کے آقا کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا کہ اس کو آزاد کر دو۔ چنانچہ اس نے فوراً قبول کیا اور غلام کو آزاد کر دیا۔ غلام بہت خوش ہوا اور شیخ سے کہنے لگا کہ حضرت نے اتنی تاخیر فرمادی۔ اگر اسی وقت سفارش فرما دیتے تو میں سال بھر پہلے ہی آزاد ہو جاتا۔ شیخ نے فرمایا کہ میں کسی سے کوئی بات نہیں کہا کرتا جب تک کہ خود اس پر عمل نہ کروں۔ اور جب تم نے مجھ سے سفارش کی خواہش کی تھی تو اس وقت میرے پاس کوئی غلام نہ تھا جسے آزاد کر دیتا (اور خود عامل بن کر تمہاری آزادی کیلئے تمہارے آقا سے کہتا) مگر میں اس وقت سے برابر کماتا اور جوڑتا رہا حتٰی کے (سال بھر میں) ایک غلام خریدنے کی رقم میرے پاس جمع ہوگئی۔ تب میں نے غلام خریدا اور اس کو آزاد کیا اور اس کے بعد میں نے تمہارے آزاد کرنے کی سفارش کا لفظ تمہارے آقا کے سامنے زبان سے نکالا۔ چنانچہ اس نے قبول کرلیا۔ اور اگر میں خود غلام آزاد کرنے سے قبل تمہارے آقا سے سفارش کرتا تو میرا خیال یہ ہے

کہ وہ ہرگز نہ مانتا۔ ف بس یہ ہے ضرورت بیعت کی کہ بہت فرق ہے خدا کو ایک کہنے میں اور خدا کو ایک سمجھنے میں ؎

مغرور سخن مشو کہ توحید خدا　　واحد دیدن بود نہ واحد گفتن

غیر عامل واعظ کا وعظ بھی مؤثر نہیں ہوتا۔ بیکار جاتا ہے۔ پھر کیا پوچھنا باطنی عمل اور حب خدا و رسول کا کہ جس کے قلب کی انگیٹھی میں خود عشق کی چنگاری نہ سلگ رہی ہو وہ دوسرے کے قلب میں آتش محبت کیسے سلگا سکتا ہے۔ اس لئے جہاں بیعت ہونے کی ضرورت ثابت ہوئی وہیں یہ بھی محقق ہوا کہ جب تک شیخ صاحب حال اور اہل دل نہ ہو اس وقت تک بیعت کو رسم سمجھ کر ادا کرنا بے سود ہے۔ واللہ اعلم

دوسرے شیخ عبداللہ برناوی ہیں جو اقطاب میں سے تھے اور ان سے ملاقات اور اکتساب کا تذکرہ شروع کتاب میں ہو چکا ہے۔ آپ نے فرمایا حضرت برناوی قدس سرہ حق تعالیٰ کے اسمائے حسنےٰ میں ستر ناموں کے انوار سے سیراب کئے گئے تھے۔

سوم حضرت یحییٰ صاحب الجرید۔ کہ اقطاب میں سے تھے اور شریعت محمدیہ کے ظاہراً و باطناً بہت زیادہ متبع تھے۔ مزارات صالحین کے زائرین کی حاجات ان کے تحت تصرف ہیں کہ ان کی جن مرادوں کا پورا ہونا مقدر ہو چکا ہے وہ انُ کے ہاتھوں پوری ہوتی ہیں۔ میں نے ایک دن مزارات صلحاء کے متعلق آپ سے گفتگو کی کہ اکثر لوگ مرادیں مانگنے کے لئے مزاروں پر جاتے ہیں۔ کوئی اولاد مانگنے، اور کوئی اپنے بیمار عزیز کی شفاء صحت کے لئے، اور کوئی وسعتِ رزق کے لئے، اور کوئی دفع ہم و مصیبت کے لئے، اور اکثر کامیابی ہوتی ہے اس کا کیا سبب ہے؟ فرمایا امت محمدیہ کے قلوب کی عنداللہ بڑی شان ہے۔ اگر کسی ایسی جگہ کے متعلق جہاں کوئی بھی دفن نہ ہوا ہو قلوب امت محمدیہ کا مجتمعاً یہ گمان قائم ہو جائے کہ یہ ولی کا مزار ہے اور وہاں آکر وہ اللہ کے سامنے گڑگڑانے اور دعائیں مانگنے لگیں تو ان کی دعائیں بھی جلد قبول ہونے لگیں گی (چہ جائیکہ کسی جگہ اللہ کا کوئی ولی واقعی مدفون ہو۔ کہ یہ اثر اجماع قلوب امت کا ہے۔ صاحب مزار کو اس میں کوئی دخل نہیں) اور آج کل اس خدمت کے متولی و متصرف ہمارے حضرت مولانا یحییٰ صاحب الجرید ہیں۔ اور اولیاء اموات کی خصوصیت نہیں۔ زندہ اولیاء میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص لوگوں کے نزدیک مشہور ولی سمجھا جاتا ہے حالانکہ اس کو ولایت کی ہوا بھی نہیں لگی۔ مگر اس کا توسل پکڑ کر اللہ سے دعائیں مانگی جاتی ہیں اور وہ جلد قبول ہوتی ہیں اس کی حقیقت یہی ہے (کہ حق تعالیٰ نے قلوب امت کے اجتماعی خیال کا احترام فرمایا) اور اہل تصرف (اقطاب) کے ہاتھوں (حسب مشیت) ان کی مرادیں پوری فرمائیں (مگر لوگوں نے سمجھا کہ یہ اس مشہور ولی کی بزرگی اور مقبولیت کا اثر ہے) حالانکہ حضرات اہل تصرف نے اس (نام کے ولی) کو ایک گڈا بنا کر کھڑا کر دیا ہے جیسے کاشتکار اپنے

کھیت میں پرند اڑانے کے لئے آدمی کا ڈھانچہ بنا کر کھڑا کر دیتا ہے کہ چڑیاں اُس کو آدمی سمجھ کر پاس نہیں آتیں اور دور بھاگتی ہیں۔ حالانکہ یہ فعل درحقیقت کاشتکار کا ہے نہ کہ اس مورت کا (اسی طرح تحت مشیت الٰہیہ مرادیں پوری کرنا اقطاب زمین صاحبان خدمت کا کام ہے۔ مگر عوام سمجھتے ہیں کہ یہ فعل اس کا ہے جس کو ولی کامل سمجھ رہے ہیں) اور اس نام کے ولی کو کھڑا اس لئے کیا ہے کہ اس جیسے اہل ظلمت اس کے پاس جمع اور اسی کے معتقد بنے رہیں اور اہل تصرف خود مخفی و مستور رہیں ان پر ظاہر نہ ہوں۔ کیونکہ وہ اہل حق ہیں اور اہل ظلمت میں حق کو سمجھنے (اور قبول کرنے) کی طاقت نہیں ہے۔ (جب دنیا داروں اور ضعیف العقیدہ مسلمانوں کے قلوب کا محض اس وجہ سے کہ ان میں فی الجملہ اثر ہے تعلیم محمدی کا اور وہ منسوب ہیں ذات محمدی کی طرف کہ اُمت کہلاتے ہیں محبوب رب العالمین کی عنداللہ یہ احترام ہے کہ دین نہ سہی دنیا ہی کی مُرادیں مل جائیں تو کیا پوچھنا صلحاء علماء و اولیاء امت کے قلوب کا کہ وہ مجتمعاً کسی امر مثلاً تقلید ائمہ یا تربیت مشائخ و تعلیم تصوف کو حق سمجھ لیں جس کا نام اجماع امت ہے تو اُس کی عنداللہ کیا شان ہوگی اور منافع دینیہ کا اس پر من جانب اللہ کیا ترتب ہوگا)

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایک مسافر راستہ میں بعد مغرب ایک خطرناک مقام پر پہونچا کہ پہاڑ کی گھاٹی تھی اور درحقیقت دو ڈاکو اس کو لوٹنے کی نیت سے یہاں بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ورلے ہی کنارہ پر اور دوسرا وسط میں۔ یہ شخص کسی ایسے پیر کا مرید تھا جس کے پاس کچھ بھی نہ تھا۔ جب اس نے گھاٹی میں داخل ہونے کا ارادہ کیا تو پیر کا نام لے کر کہنے لگا اے میرے فلاں حضرت، میں سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ کا آپ کے سامنے واسطہ پیش کر کے التجا کرتا ہوں کہ اس گھاٹی سے مجھے باامن وامان پار کرادو۔ اور وعدہ کرتا ہوں کہ حاضری کے وقت آپ کی نظر پیش کروں گا۔ ایک اہل تصرف نے اس کی فریاد کو سنا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جاہ شریف کا توسُّل جو اس نے اپنے نا اہل پیر کے سامنے پیش کیا تھا ان کے کانوں میں پڑا تو اس کی عظمت واحترام کے سبب اُس مسافر کی حاجت پوری کئے بغیر چارہ نہ دیکھا اس لئے ساتھ ہو لئے اور اس کے قلب میں سکون واطمینان ڈال دیا۔ حتیٰ کہ ساری گھاٹی کو عبور کرایا اور پرلے کنارہ پر پہونچا کر چھوڑا۔ مگر نہ اس مسافر نے ان کو دیکھا اور نہ انھوں نے اپنے آپ کو اُس پر ظاہر کیا۔ دونوں ڈاکوؤں کو حق تعالیٰ نے اندھا بنا دیا اور وہ راستہ قطع کرنے والے مسافر کے ساتھ کچھ بھی نہ کر سکے۔ مسافر کو یقین ہو گیا کہ یہ میرے پیر روشن ضمیر کا کام تھا۔ چنانچہ وہ جب ان کی خدمت میں پہونچا تو حسب وعدہ چار اشرفیاں نذرانہ کی بھی پیش کیں۔ (اس میں پیروں کے لئے بھی عبرت و نصیحت ہے کہ ان کے مریدوں کو ایسے واقعات پیش آویں تو اپنا کمال نہ سمجھیں اور ناز نہ کریں۔ کیونکہ ممکن ہے ع کوئی معشوق ہو اس پردہ زنگاری میں

چہارم حضرت منصور بن احمد۔ جبل حبیب کے باشندہ تھے اور اقطاب میں سے تھے کہ بحری خدمات آپ کے

سپرد تھیں۔ ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے مجھ سے فرمایا کیا تم نے دیکھا ہے جب گوشت کو کاٹتے ہیں تو اس کا بعض حصہ کبھی کبھی کانپا اور پھڑکا کرتا ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں حضرت دیکھا ہے۔ فرمایا ہمارے حضرت شیخ منصور کی بس یہی حالت تھی کہ جب حق تعالیٰ نے ان کو فتح نصیب فرمائی تو حق تعالیٰ کی ہیبت وجلال کے سبب ان کے تمامی بدن کا ریشہ ریشہ پھڑکتا اور تھر تھر کانپتا تھا اور یہ حالت ایک مدت تک قائم رہی۔ نیز آپ نے فرمایا میں نے سیدنا ابراہیم خلیل اللہ کو دیکھا کہ حضرت منصور سے دعاء خیر طلب فرما رہے تھے۔

ف یہ اکابر کی شان ہے کہ اپنے چھوٹوں سے بھی دعاء خیر کے طالب ہوا کرتے ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی منقول ہے کہ حضرت عمر فاروق عمرہ کے لئے مکہ جانے لگے تو آپ نے فرمایا لَا تَنْسَانَا یَا اُخَیَّ مِنْ دُعَائِكَ بھائی ہمیں دعا میں نہ بھول جانا۔

پنجم حضرت محمد سراج کہ انجرا کے باشندہ تھے اور قطب وقت تھے ان کی ملاقات کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے۔

ششم حضرت احمد بن عبداللہ مصری۔ غوث زمانہ تھے اور حکایات جن کے ذریعہ آپ نے حضرت ممدوح کو کتمان سر کی وصیت فرمائی تھی شروع کتاب میں مذکور ہو چکی ہیں۔

ہفتم حضرت علی بن عیسیٰ مغربی۔ یہ بھی اقطاب میں سے تھے اور انکا وطن جبل درد ز علاقہ شام میں تھا۔ انکے مغرب سے ملک شام میں منتقل ہونے کا ایک لمبا قصہ مدت ہوئی حضرت نے بیان فرمایا تھا مگر مجھے پورا یاد نہیں رہا

ہشتم حضرت محمد بن علی کیموبی اور نہم حضرت محمد مغربی اور دہم حضرت عبداللہ جراز جن کا مسکن دیر دیر علاقہ مراکش میں تھا۔ اور ۱۱۲۹ھ میں حضرت ممدوح نے ایک نام کا اور اضافہ فرمایا یعنی حضرت ابراہیم ملیلز کہ الجزائر کے رہنے والے اور اکابر اولیاء میں سے تھے۔ اور فرمایا کہ اُن کی وراثت بھی مجھے ملی ہے۔ رحمۃ اللہ علیہم اجمعین۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اسم اعظم (جس کی خاصیت ہے کہ جو دعا مانگی جائے وہ قبول ہوتی ہے) اللہ جل جلالہ کے اسماء حسنیٰ یعنی نو ونہ ۹۹ ناموں میں نہیں ہے (بلکہ ان کے علاوہ) سواں ۱۰۰ نام ہے۔ البتہ اس کے کثیر معانی ننانوے ناموں میں موجود ہیں۔ اور وہ زبان کا ذکر نہیں بلکہ ذات کا ذکر ہے۔ کہ ذات ذاکر سے نکلتا ایسا سنائی دیتا ہے جیسے پیتل (کو کھٹکھٹانے) سے آواز نکلتی ہے۔ اور وہ ذات پر اتنا ثقیل ہے کہ دن بھر میں ایک یا دو مرتبہ سے زیادہ اس کا ذکر کرنے کی ذات میں طاقت نہیں ہے۔ میں نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ؟ فرمایا وجہ یہ ہے کہ اس کا ذکر مشاہدہ تامہ کے بغیر نہیں ہوتا اور وہ ذات انسانی پر بہت ثقیل ہے۔ ذات جب اس کا ذکر کرتی ہے تو (حق تعالیٰ کے) ہیبت وجلال اور خوف کی وجہ سے سارا عالم (اس کی نظروں سے) مفقود ہو جاتا ہے۔ ہاں سیدنا عیسیٰ علیہ السلام کو حق تعالیٰ نے اس کے ذکر کی خاص قوت عطا فرمائی تھی کہ وہ دن بھر میں چودہ مرتبہ اس کا ذکر فرمایا کرتے تھے۔ نیز آپ نے اسماء حسنیٰ کے

متعلق فرمایا کہ ان کے معانی کا (مختلف طور پر) حضرات انبیاء علیہم السلام کو مشاہدہ حاصل ہوا تھا۔ جس نبی کو جس معنی کا مشاہدہ ہوا انہوں نے اس کا نام وضع فرمالیا کہ معانی ان پر بقدر ان کے مشاہدہ کے ظاہر ہوئے اور اُسی کے موافق اسمار کا ظہور ہوا (مثلاً کسی نبی کو ان کی طاقت کے موافق قدرت الٰہیہ کا مشاہدہ ہوا تو انہوں نے حق تعالیٰ کا نام قدیر وضع کیا۔ اور جن کو کرم الٰہی کا مشاہدہ ہوا انہوں نے اللہ کا نام کریم تجویز کیا) غرض تمامی اسماءِ الٰہیہ حضرات انبیار کے وضع کرنے سے حاصل ہوئے ہیں۔ چنانچہ سیدنا حضرت ادریس علیہ السلام ہیں جنہوں نے سب سے پہلے علیم، قوی، عظیم، منان کو وضع کیا۔ مگر حضرات انبیائے ہر نام اپنی زبان میں وضع کیا تھا اور یہ خصوصی فضیلت ہے۔ قرآن مجید کی کہ اس نے تمامی اسماء جمع کئے اور سب کو عربی زبان میں ادا کیا نہ کہ انبیار متقدمین کی زبانوں میں، اور اسم جلالت (یعنی اللہ) سب سے اوّل حضرت آدم علیہ السلام نے وضع کیا کہ جب حق تعالیٰ نے اُن میں رُوح پھونکی اور وہ اٹھ کر کھڑے ہوئے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوئے اور دوسرے پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیک لیا۔ اس حالت میں ان کو اپنے پروردگار کا ایک عظیم مشاہدہ نصیب ہوا اور حق تعالیٰ نے ان کو گویائی عطا فرمائی تاکہ ذاتِ حق سبحانہ کے جن اسرار (و معانی صفات) کا مشاہدہ کیا ہے ان کو لفظ کے ذریعہ ادا کریں۔ تب اُن کی زبان سے نکلا اللہ۔ چونکہ اللہ جل جلالہٗ کے علم قدیم میں تھا کہ یہ اسمار حسنیٰ اس کے نام قرار پائینگے لہٰذا ان کو اپنے انبیار اصفیار کی زبانوں سے جاری کرایا۔ اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اُن معانی کے اسمار وضع فرماتے جو آپ کو بیرون از طاقت مشاہدہ میں حاصل ہوئے تو (وہ اسمار بھی دوسروں کے لئے ناقابل برداشت ہوتے) اور جو بھی ان کو سنتا وہ (رانگ کی طرح) پگھل جاتا۔ مگر حق تعالیٰ کا اپنے بندوں پر بڑا لطف و کرم ہے (اس لئے آپ کے مشاہدۂ عظمیٰ سے اسماء الٰہیہ وضع نہ ہوئے) جامع کتاب کہتے ہیں اس پر یہ شبہ نہ کیا جائے کہ اسمار حسنیٰ تو قدیم ہیں اور یہ تقریر (کہ حضرات انبیائے حسب مشاہدہ ان کو وضع کیا ہے) ان کا حادث ہونا بتا رہی ہے لہٰذا عقیدہ کے خلاف ہوا۔ کیونکہ اسمار حسنیٰ کے قدیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے معانی (چونکہ صفات الٰہیہ ہیں وہ) قدیم ہیں۔ نہ کہ ان کے الفاظ (جو کہ دلالت کرنے والے ہیں معانی پر) کہ وہ حادث ہیں۔ اس لئے کہ لفظ عرض ہے اور ہر عرض حادث ہوا کرتا ہے۔ خصوصاً جبکہ (بہتے ہوئے پانی کی طرح) سَیال ہو جیسے لفظ اور آواز وغیرہ (کہ پہلا حرف ختم ہو جائے گا تب دوسرا حرف زبان پر آئے گا۔ کہ ان کا حادث ہونا تو ان کی ہیئت ترکیبیہ اور تلفظ ہی سے ظاہر ہو رہا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ اسم جلالۃ (اللہ) میں تین اسرار ہیں اوّل یہ کہ اس کی مخلوق بیشمار ہے، اور اس کی مختلف اقسام ہیں۔ انسان، جنات، حیوان، وغیرہ وغیرہ اتنی انواع ہیں کہ بس اللہ

ہی کو معلوم ہیں، اور باوجود اس کثرت کے وہ یکتا ہے اپنے ملک میں کہ نہ اس کا کوئی وزیر ہے نہ معاون۔ وہ تنہا سب کا مدبر و منتظم ہے، اکیلا متصرف ہے۔ تمامی افراد و اشیا میں تصرف فرماتا ہے، نہ کوئی چیز اس سے بچ سکتی ہے نہ اس کی قدرت سے باہر نکل سکتی ہے۔ وہ تمامی اشیا پر قادر و غالب ہے، اور ہر چیز اس کے احاطۂ قدرت میں داخل ہے۔ چنانچہ فرماتا ہے۔ وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَائِهِمْ مُّحِيْطٌ دوم یہ کہ مخلوقات میں جس قسم کا اور جو تصرف چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ کسی کو توانگر بناتا ہے، کسی کو مفلس و نادار، کسی کو عزت بخشتا ہے اور کسی کو ذلت، کسی کو سفید بناتا ہے اور کسی کو سیاہ۔ کسی کی دعا قبول فرماتا ہے کسی کی درخواست مسترد و نامنظور۔ غرض زماں ہو یا مکاں ہو مختلف برتاؤ کرتا اور طرح طرح سے اپنی شان ظاہر فرماتا ہے كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِيْ شَأْنٍ پھر ایک کے ساتھ ایک برتاؤ دوسرے کے ساتھ دوسرے برتاؤ سے اس کو غافل نہیں بناتا۔ کلی اختیار ہر قسم کا اسی کو حاصل ہے۔ مخلوق کے ہاتھ اختیار کچھ بھی نہیں ہے وہی ہوتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ نہ کہ وہ جو مخلوق چاہتی ہے، سُبْحَانَهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ سوم یہ کہ وہ (ہر عیب سے) پاک ہے اور (ہر نقص سے) منزہ ہے، نہ اس کی کیفیت بیان ہو سکتی ہے اور نہ مخلوق میں کسی شے کا وہ شبیہ و مثل ہے اور باوجود اس کے وہ سطوت و اقتدار اور جلال ہے کہ اگر (غفلت کے) پردے نہ ہوتے جو حق تعالیٰ نے مخلوق پر ڈال دئے ہیں تو جس وقت ان پر حق تعالیٰ کی تجلی ہوتی سب ریزہ ریزہ اور ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔ بلکہ نام و نشان بھی باقی نہ رہتا اور کہنے والا کہتا کہ اس عالم میں کبھی کوئی مخلوق پیدا ہی نہیں ہوئی۔ مگر چونکہ حق تعالیٰ نے سابق قضا و قدر کی بنا پر محض اپنی رحمت اور حکمت سے طے فرمایا تھا کہ (جنت اور دوزخ) دو مقام بنائے جائیں اور ہر ایک کے اہل کو اس کے مقام پر پہونچایا جائے۔ ———— اس لئے جب کسی مخلوق کے پیدا فرمانے کا ارادہ کیا تو اس کے پیدا کرنے سے قبل پردہ و حجاب پیدا کر دیا (کہ وہی سبب بقا ہے) حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اہل بصیرت کو اسم ذات (اللہ) کے زبان سے نکلتے ہی یہ تینوں اسرار مخلوق کا مشاہدہ کئے بغیر ہی نظر آجاتے ہیں۔ اور اس کے بعد ایک مثال بیان فرمائی جس کا مطلب ہماری سمجھ میں یہ آیا کہ اسم ذات جامع ہے تمامی اسماء حسنیٰ کا واللہ اعلم۔ نیز آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ مقدس و منزہ ہے اور مخلوقات میں کسی شی کو بھی اس کے مثل نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ (فکر و تخیل سے بھی بالا ہے۔ کیونکہ) فکر و تخیل میں بھی جو صورت آتی ہے (کتنی ہی وہ فرضی اور من گھڑت کیوں نہ سمجھی جائے مگر وہ حق تعالیٰ کی مخلوقات میں کہیں نہ کہیں ضرور) موجود ہے (یہ دوسری بات ہے کہ ہمیں نظر نہیں آئی) نتیجہ یہ نکلا کہ خیالی صورت کا مثل چونکہ عالم میں ضرور موجود ہے اور اللہ جل جلالہٗ مثل سے منزہ ہے۔ اس لئے ذات حق کسی کے

فکر وخیال میں نہیں آسکتی اور حق تعالیٰ کی جو صورت وشکل بھی کسی کی قوت فکریہ اپنے اندر لائے گی وہ اس کے خلاف اور اس سے برتر و بالا ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ قوت فکریہ کو تو (حق تعالیٰ نے بڑی وسعت اور پرواز عطا فرمائی ہے کہ وہ) انسان کو اوندھا اور نگونسار بھی مصوّر کر سکتا ہے کہ پاؤں اوپر ہیں اور سر کے بل چلتا ہے۔ فرمایا واللہ میں نے ایسی مخلوق دیکھی ہے (لہٰذا یہ خیال کا تصور بھی مخلوقات عالم سے باہر نہیں ہوسکا۔ بلکہ یہ دیکھا ہے کہ وہ) مقلوب انسان اپنی شرمگاہ کو (ہر وقت اپنے) ہاتھ سے چھپائے رہتا ہے کہ اس کا ہاتھ گویا شرم گاہ کے لئے پردہ ہے اور وہ اس کو صرف اس وقت اُٹھاتا ہے جبکہ بول و براز یا مجامعت کا ارادہ کرتا ہے۔ نیز آپ نے فرمایا کہ ایک روز میں اور حضرت محمد بن عبدالکریم بصرادی بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ اسی کا تذکرہ آگیا اور وہ مجھ سے فرمانے لگے آؤ عجیب عجیب کوئی صورت اپنے فکر وخیال میں گھڑیں اور پھر مخلوقات خداوندی میں گشت لگا کر دیکھیں کہ وہ موجود ہے یا نہیں۔ میں نے کہا بہت اچھا جو صورت آپ کا دل چاہے وہ گھڑ لیجئے۔ فرمایا اچھا ایک صورت ایسی لیتے ہیں جو چوپایہ ہے اور اونٹ کی شکل ہے اور اس کی ساری پیٹھ پر منہ ہی منہ ہیں، اور اس کی پشت پر ایک گرجا ہے جس کا رنگ اس جانور کے رنگ سے مخالف ہے اور وہ (گرجا کے منارہ کی طرح) اوپر کو چڑھا چلا گیا ہے، اور اوپر کے رخ اس میں متعدد روشندان ہیں کہ ایک روشندان سے پیشاب کرتا ہے، اور ایک سے پاخانہ پھرتا ہے، اور ایک سے پیتا ہے۔ اور اُن روشندانوں کے درمیان مجسم انسان کی صورت ہے۔ کہ سر سے لے کر پاؤں تک تمامی اعضاء بالکل آدمی کے سے ہیں۔ پوری طرح ہم صورت گھڑ کر فارغ نہ ہونے پائے تھے کہ (روحانی سیاحت کے ذریعہ بعینہ) ایسی ہی مخلوق کثیر تعداد میں ہم کو نظر آگئی اور ہم نے دیکھا کہ اس کا نر جفتی کھاتا ہے مادہ سے اور وہ گیابھن ہوتی ہے۔ مگر اگلے سال وہ مادہ جفتی کھاتی ہے اس نر سے۔ یعنی حالت پلٹ جاتی ہے کہ جو اس سال نر تھا وہ آیندہ سال مادین بن جاتا ہے، اور وہ حاملہ ہونے لگتی ہے۔ ف حق تعالیٰ شانہ نے ہزارہا عالم پیدا فرمائے ہیں جن میں ایک چھوٹا سا عالم یہ ہے جس کو دنیا کہا جاتا ہے، اور جس کے تین حصّے میں پانی اور سمندر ہے اور چوتھائی حصہ میں زمین ہے جس پر انسان آباد ہے اور اور اسی لئے اس کا نام رُبع مسکون ہے۔ یہ رُبع مسکون بھی اتنا طویل وعریض ہے کہ برسہا برس بھی انسان کسی تیز سواری پر چلتا رہے تو سارے حصہ کو قطع نہیں کر سکتا۔ باوجودیکہ صدہا برس میں اس کے مختلف ممالک متعین کئے گئے اور نقشے بنائے گئے ہیں کہ اس کا چپہ چپہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ مگر بلا مبالغہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کے جنگلات بن جزائر کوہسار چٹانیں صدہا بلکہ ہزارہا میل کے رقبہ کی ایسی ہیں جو نہ سیاحان عالم کو معلوم ہوسکیں اور نہ انسانی مرتب کردہ نقشوں میں آسکیں۔ ابھی صدیاں چاہئیں

کہ ربع مسکون کی وہ سطحات ارضی معلوم ہوسکیں جواب تک نامعلوم ہیں اور نقشوں میں ان کا اضافہ ہوتا ہے۔ اسی مرتبہ و معلومہ سطح میں صرف حیوانات کو لیجئے تو اللہ جل جلالہ کی وہ وہ مخلوق آباد ہے جو کبھی کسی ملک کے عجائب خانہ میں نظر آتی ہے تو عقل دنگ ہو جاتی ہے اور گھنٹوں بھی نظر اس سے ہٹنا گوارا نہیں کرتی۔ مصر کے عجائب خانہ (جنینۃ الحیوانات) میں قسم قسم کے جانور صدہا ایسے ہیں جو اہل ہند سیاحین نے بھی نہیں دیکھے اور گویا کئی کئی جانوروں کا مجموعہ ہیں۔ زُرافہ ایک جانور ہے جس کی گردن اور ہاتھ پاؤں بالکل اونٹ کے سے ہیں۔ مگر خرگوش کے برعکس اگلے ہاتھ بڑے اور پچھلے پاؤں چھوٹے۔ بدن کی کھال بالکل چیتے کی سی ہے اور مُنہ گائے کا سا۔ اسی لئے فارسی میں اس کا نام شتر گاؤ پلنگ ہے۔ ایک اور جانور ہے بڑے بندر کی طرح کہ چال خرگوش کی سی ہے اور اس کی پستانیں پیٹ کے اندر ہیں۔ بچہ کو جب دودھ پینا ہوتا ہے تو ماں ان کو کھول دیتی ہے اور بچہ کبھی اس میں صرف منہ ڈال کر دودھ پی لیتا ہے، کبھی آدھا اندر چلا جاتا ہے۔ آدھا باہر لٹکا رہتا ہے، اور کبھی سارا اندر داخل ہو جاتا ہے، اور وہ پیٹ کا منہ بند کر کے بچہ کو اندر لئے ایسا پھرتی ہے جیسے گیابھن جانور۔ اور جب وہ دودھ پلا چکتی ہے تو دہانہ کھول کر زمین پر ڈال دیتی ہے اور بھاگ جاتی ہے۔ اسی طرح صدہا چرند و پرند ہیں جو کبھی دیکھنے میں نہیں آئے۔ اہل تصرف اقطاب و اغواث کو حق تعالیٰ نے چونکہ نظام عالم کا کارکن بنایا ہے اور ان کی سیاحت تمامی اکناف عالم میں اور لمحی ہے اس لئے مخلوقات کے جو عجائب و غرائب ان کو نظر آتے ہیں سیاحان دنیا کو ان کی ہوا بھی نہیں لگی۔ اس لئے ان کا یہ فرمانا کہ انسان کے تصور و تخیل میں ایسی چیز آ ہی نہیں سکتی جس کا وجود اس عالم دنیا میں نہ ہو۔ جہاں تجربہ کے درجہ میں صحیح اور واقعہ ہے۔ وہیں اس کی شہادت بھی ہے کہ انسان کو عقل اور قوت فکر یہ چونکہ آلہ گذران اور وسیلہ معیشت بنا کر دی گئی ہے اس لئے محدود ہے اور اس کا دائرہ اگرچہ آنکھ اور کان کی رسائی سے بہت زیادہ وسیع ہے مگر جب تک دنیا میں ہے۔ اُس وقت تک اشیاء دنیا کے اندر محصور ہے لہٰذا اس عالم سے باہر جو شے ہے اس کی حقیقت کا احاطہ کرنے سے بھی وہ قاصر و کوتاہ ہے چہ جائیکہ خالق جل شانہٗ کی ذات کا احاطہ۔ یہی وجہ ہے کہ عالم برزخ کے واقعات مثلاً یہ کہ روح کا اعادہ کیونکر ہوتا ہے محبوس اور بند ہوا میں اتنی دیر کیونکر جیتا ہے، منکر نکیر کے آنے کی اور سوال و جواب کی کیا صورت ہوتی ہے، جنت یا دوزخ کی کھڑکی کھُلنے کا کیا طریق ہے، وغیرہ وغیرہ کوئی بات بھی دنیا میں رہتے ہوئے ہماری عقل میں نہیں آسکتی۔ اس لئے کہ یہاں ہم کو جو عقل دی گئی ہے وہ زندگی کی گذران اور نظم عالم کو قائم رکھنے کے قابل دی گئی ہے۔ دوسرے عالم کی چیزیں سمجھنے اور اپنے دائرہ میں لانے کے قابل اس میں وسعت ہی نہیں ہے۔ اسی طرح جنت، وہاں کی نہریں، وہاں کی حوریں، وہاں کے پھل، وہاں کے

درخت، وہاں کے کھانے اور پینے کی چیزیں، اور ان کی لذتیں، غرض وہاں کی نعمتوں اور راحتوں کی حقیقت اگر کوئی اس عقل سے معلوم کرنا چاہے جو دنیا میں انسان کو دی گئی ہے تو ناممکن ہے۔ بلکہ تخیل اور تصور میں بھی لانا چاہے تو قادر نہیں۔ اسی لئے نعمائے جنت کے متعلق حدیث میں یہ لفظ آیا ہے ولا خطر علیٰ قلب بشر کہ انسان کے دل پر اس کا خطرہ وخیال بھی نہیں گذرا۔ وجہ یہی ہے کہ عالم جنت کی اشیاء کا ادراک دنیا کی ضرورت معاش کے قابل دی ہوئی عقل کے احاطہ سے باہر ہے اور وہ چیزیں اور انکی لذت یا کیفیت یا صورت اس دائرۂ عقل میں نہیں آسکتی۔ جو کچھ بتایا گیا ہے وہ محض برائے نام نمونہ دکھانے اور کچھ اتہ پتہ سمجھانے کے لئے بتایا گیا ہے، ورنہ حقیقت ہر عالم کے اشیا کی اسی عالم میں جاکر معلوم ہوگی اور یہی وجہ ہے کہ انسان اعتراض کرنے اور شبہات پیش کرنے لگتا ہے کہ اس عالم پر قیاس کرکے اپنے دائرۂ عقل میں اس کو محدود سمجھتا ہے اور اس پر شبہ لاحق ہوتا ہے۔ حالانکہ جو چیز اس کی عقل میں آئی ہے وہ اصل شے کی حقیقت نہیں آئی۔ کیونکہ اس عالم میں رہتے ہوئے وہ اس عقل کے اندر آہی نہیں سکتی۔ جیسے عالم بلوغ سے پہلے بطن اُنثیٰ حامل حمل ہو ہی نہیں سکتا اور نہ سمجھ سکتا ہے کہ حمل اور اسکے نشو ونما اور تربیت وتقلیبِ احوال کی حقیقت وکیفیت کیا ہے۔ جب عالم بلوغ کو پہونچے گی تو از خود ادراک کرے گی اور جو بات اس وقت قابل تعجب اور ہزار عقلی اعتراضات کا محل بنی ہوئی ہے اس وقت سہل ترین اور معمولی و ناقابل بحث بن جائے گی۔ کاش ہم اپنی عقل کی حد اور اس کے دائرہ کی تنگی کو عقل ہی سے ادراک کریں تو حاملان شریعت انبیاءؑ نے جو واقعات عالم برزخ وعالم جنت وعالم جہنم وعالم ملائکہ وعالم جنات وعالم شیاطین وغیرہ کے بیان فرمائے ہیں نہ ان کا انکار کریں اور نہ ان پر اعتراض وشبہ لادیں۔ ان کی مثال ایسی ہے جیسے کسی نے حجام سے پوچھا نائی رے نائی میرے سر پر بال کتنے ہیں؟ اس نے جواب دیا۔ ججمان جی اب سامنے آئے جاتے ہیں۔

پس جب عالم برزخ وعالم جنت ودوزخ ہر شخص کے سامنے آیا چاہتا ہے تو اس کی کرید اور تحقیق یا شبہ واعتراض سے کیا حاصل۔ بہت قریب ہے وہ زمانہ کہ سب نظروں کے سامنے کھُل جائے گا۔

ایک مرتبہ آپ مشاہدہ الٰہیہ کا تذکرہ اور اس کی عظمت شان کا اظہار فرمارہے تھے اور اس کے اسباب ووجوہ بیان کررہے تھے کہ اکثر مخلوق اس سے عاجز ہے۔ حتیٰ کہ آپ نے خود اپنا قصہ بیان فرمایا کہ اخیر ۱۱۲۷ھ میں ایک ولی کامل سے میری ملاقات ہوئی۔ اور میں نے ان سے درخواست کی کہ دعا فرمادیجئے حق تعالیٰ مجھے اپنا مشاہدہ نصیب فرمادے۔

اُنہوں نے فرمایا کہ اس خیال کو دل سے نکال دو اور تم اس کی طلب اللہ سے نہ کرو حتیٰ کہ وہ خود ہی اپنا مشاہدہ بلا طلب وسوال تم کو عطا فرمائے۔ کیونکہ اگر تمہارے سوال کے بغیر تم کو عطا فرمائے گا تو تمہاری مدد بھی فرمائے گا۔ اور تم کو عطا سے قبل اس کی برداشت کی طاقت بھی بخشے گا۔ اور اگر تم اسکی درخواست کروگے اور بار بار سوال کئے جاؤگے تو ممکن ہے ناکام نہ رہو، مگر اندیشہ ہے کہ اس کو اٹھا نہ سکو اور عاجز ہو جاؤ۔ میں نے کہا کہ آپ دعا فرما دیجئے میں اس کو اُٹھا لوں گا۔ فرمایا اچھا عالم انسان پر نظر ڈالو۔ چنانچہ میں نے اس پر نظر ڈالی۔ فرمایا سارا عالم انس بیک وقت اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا لے آؤ جیسا انگوٹھی کا حلقہ ہوتا ہے (کہ اس کا کوئی رُخ اور کوئی حصہ بھی نظر سے باہر نہیں نکلتا) میں نے کہا بہت اچھا سب نظر کے سامنے لے آیا۔ فرمایا اب عالم جنات پر نظر ڈالو اور ایسا ہی کرو جیسا عالم انسان کے ساتھ کیا۔ کہ تمامی عالم جنات حلقہ انگشتری کی طرح نگاہ کے سامنے آجائے میں نے کہا بہت اچھا کر لیا۔ غرض ایک ایک عالم کا علیٰحدہ علیحدہ نام لے کر فرماتے رہے کہ اس کو بھی بتمامہا نظر کے سامنے لاؤ۔ حتیٰ کہ عالم جنت اور جو کچھ بھی جنت میں (نعمتوں اور اہل نعمت کی انواع کثیرہ میں) ہے، اور عالم دوزخ اور جو کچھ بھی دوزخ میں (عذاب اور معذبین کی اقسام کثیرہ میں) ہے، سب کو گنوا گنوا کر میری نظر کے سامنے لانے کا حکم فرماتے رہے اور میں (تعمیل حکم کرتا اور) ہر عالم کو جدا جدا اپنی نظر کے سامنے لاتا رہا۔ اس کے بعد فرمایا کہ اچھا یہ عوالم جن کو جدا جدا نظر کے سامنے لائے ہو اور اب سب کو جمع کرو اور بیک وقت تمامی عوالم کو نظر کے سامنے لا کر جتنی بھی تم میں طاقت ہو اس کو صرف کر کے پوری کوشش کرو کہ ایک نگاہ سے سب کو دیکھو۔ اور بتاؤ کہ مجموعہ عوالم کو بہ یک نظر جمع کر سکتے ہو یا نہیں؟ چنانچہ میں نے کوشش کی مگر ایسا نہ کر سکا کہ بہ یک نظر بہ یک وقت تمامی عوالم میری نگاہ کے سامنے مستحضر ہو جاویں۔ اسوقت انہوں نے فرمایا کہ عزیز من جب تم اللہ کی مخلوقات کا مشاہدہ نہ کر سکے اور ایک نگاہ میں اُن کو مستحضر کرنے سے عاجز ہو گئے تو بھلا خالق جل شانہ کا مشاہدہ کیسے کر سکتے ہو۔ تب مجھے امر حق معلوم ہوا اور میں قلب کے آنسوؤں سے رو پڑا کہ (ناواقفیت کے سبب) ایسی چیز کی حرص کی جس کی مجھ میں کسی طرح بھی طاقت نہیں ہے نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ واقعی تمامی مخلوقات کو ایک نظر میں مستحضر کرنے کی طاقت کسی بشر میں بھی نہیں ہے۔ اسی طرح اولیاء میں جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت بحالت بیداری نصیب ہوئی ہے وہ پہلے تمامی عوالم کو دیکھ لیتا ہے۔ مگر بہ یک نظر نہیں (کہ وہ انسانی قدرت سے باہر ہے۔ بلکہ علیحدہ علیحدہ ہر عالم کا مشاہدہ کرتا ہے) نیز آپ نے فرمایا کہ یہی حال روح کا ہے کہ جب تک انسان پر تمامی عوالم مکشوف نہیں ہو جاتے اس وقت تک روح کی حقیقت منکشف نہیں ہوتی اور اگر عوالم کا

کوئی حصّہ بھی مکشوف ہوئے بغیر رہ گیا اور روح کی حقیقت اس پر منکشف ہوگئی تو فتنہ میں پڑجائے گا (اور اندیشہ ہے کہ ایمان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھے) نیز آپ نے فرمایا کہ بڑے سے بڑا اور فہیم سے فہیم بھی کوئی عالم میرے پاس بیٹھے اور روح کے متعلق سوالات کرنا شروع کرے اور میں اس کو جواب دیتا رہوں تو چار برس گذر جائیں گے۔ مگر اس کے اعتراضات ختم نہ ہوں گے۔ کیونکہ حقیقت روح اس درجہ خفی اور دقیق ہے (کہ عقل اور علم کے ذریعہ اس کا ادراک ناممکن ہے۔ اس کی معرفت صرف مشاہدہ سے ہو سکتی ہے اور اس کا مشاہدہ جب تک تمامی عوالم کا یکے بعد دیگرے مشاہدہ نہ ہو جائے اس وقت تک ہو نہیں سکتا) ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ بندہ میں طاقت نہیں ہے کہ اپنے رب کی حقیقی معرفت حاصل کر سکے اور جیسی بھی اُس کی شان عظمت و کبریائی ہے اس کو معلوم کر سکے۔ اور اس کے لئے ایک مثال بیان فرمائی کہ مٹی کے برتن کو اگر حق تعالیٰ فہم و ادراک عطا فرمادے اور کوئی اس سے دریافت کرے کہ اپنے بنانے والے صناع کی حقیقت بیان کر کہ اس کا طول کتنا ہے، اس کا رنگ کیا ہے، اسکی عقل کتنی ہے اس کا ادراک کیسا ہے، اس کی قوت سامعہ کتنی ہے، اسکی بصارت کیسی ہے عالم دنیا میں اس کی عمر کتنی ہے، وہ آلات واوزار کون کون سے ہیں جن کو تیرے بنانے کے وقت وہ کام میں لایا، وغیرہ وغیرہ وہ تمامی ظاہری و باطنی اوصاف دریافت کرے جو اس کے صناع میں موجود ہیں، تو وہ نہ بتا سکتا ہے اور نہ اُن کی معرفت کی اس میں طاقت ہے، اور نہ ان معارف اور حقائق کو اس کی ذات ترابی برداشت کر سکتی ہے، اور مٹی کے برتن ہی کی کیا خصوصیت ہے کوئی مصنوع بھی اپنے صانع کی حقیقت واقعیہ کو کبھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور جب حادث صانع کے متعلق حادث مصنوع کے عاجز ہونے کی یہ حالت ہے تو کیا پوچھنا صانع قدیم سبحانہ وتعالیٰ کا کہ اس کی معرفت حقیقیہ کسی مخلوق کو حاصل ہو جائے کوئی سی مخلوق کیوں نہ ہو حق تعالیٰ کی حقیقت سے ابدالآباد تک نہ اس عالم (دنیا) میں واقف ہو سکتا ہے نہ اُس عالم (آخرت) میں آگاہ بن سکتا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ذاتِ ترابی پر ذکر اللہ بہ نسبت عبادت کے زیادہ گراں ہوتا ہے۔ اور ذات سے مُراد ذاتِ خبیثہ ہے جس میں ظلمت ہو۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ذکر اس کو نور بنانا چاہتا ہے اور وہ اپنی ظلمت کے سبب نور کو قبول نہیں کرتی۔ گویا ذکر اس کی طبیعت کو بدلنا چاہتا ہے اور اس کی حقیقت سے اس کو نکالنا چاہتا ہے (جو ایسا ہی مشکل ہے) جیسے کوئی عورت کی طبیعت کو مردانہ یا مرد کی طبیعت کو زنانہ بنانا چاہے۔ یا جوار و باجرہ وغیرہ میں گیہوں کا مزہ اور گیہوں کی مٹھاس و ذائقہ ڈالنا چاہے۔ برخلاف عبادت کے کہ وہ محض بدنی محنت ہے جیسے پھاوڑا چلانا کہ اس میں صرف بدن کو

تعب و تکان لاحق ہوتا ہے (جس کی فی الجملہ ہر شخص کو عادت ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ منافقین بھی عبادتوں کے متحمل ہو گئے مگر ذکر اللہ نہ کرسکے۔ کہ ذکر سے مُراد ذکر قلبی یعنی اللہ کی یاد ہے نہ کہ ذکر لسانی۔ کہ وہ بھی من جملہ عبادات بدنی کے ہے اور اعضاء جسم سے تعلق رکھنے والی محنت ہے جس کا برداشت کرلینا معمولی سی طمع اور ادنیٰ سے خوف یا کسی مصلحت کی بنا پر ہر انسان کے لئے آسان ہے)

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ کے ناموں میں ایک نام ایسا ہے کہ جب بندہ کو اس کے نور سے سیراب کیا جاتا ہے تو وہ ہر وقت روتا رہتا ہے۔ میں نے پوچھا وہ کونسا نام ہے؟ فرمایا قریب۔ میں نے کہا غالباً رونے کی وجہ یہ ہوگی کہ (اس کے معنے کی حقیقت گویا اثر ڈال رہی ہے) کہ بندہ اپنی غفلت سے واپس آیا اپنے رب کی طرف جیسے مسافر اپنے سفر سے واپس آکر پہونچا اپنی ماں کے پاس، کہ ایسی حالت میں اکثر اس کی طبیعت بھر آتی ہے اور وہ رو پڑتا ہے۔ فرمایا ماں کے قریب آکر رونا تو محض فرط مسرت اور غلبہ فرح کی وجہ سے ہوتا ہے، اور رب کی طرف رجوع کرنے میں یہ (غلبۂ سرور) بھی ہے اور اس کے ساتھ ایک دوسری چیز بھی ہے۔ یعنی حیا جو اپنے زمانہ غفلت میں احکام الٰہیہ کی مخالفت کو یاد کر کے اس پر طاری ہوتی ہے (اور وہ سونے سہاگہ بن کر گریہ میں اضافہ کر دیتی ہے) نیز فرمایا کہ اور اسماء الٰہیہ میں ایک نام ایسا ہے کہ جب اس کے نور سے بندہ کو سیراب کیا جاتا ہے تو ہر وقت ہنستا ہی رہتا ہے اور ہنسنا بھی ایسا کہ فرض کرو ساٹھ آدمی کسی شخص کے پاس آکر اس کے کپڑے اُتار دیں اور سب مل کر اس کے گُدگُدی کرنا شروع کریں کہ جہاں گُدگُدی زیادہ لگتی اور بے اختیار زیادہ ہنسی آتی ہے (مثلاً بغل پیٹ تلوا وغیرہ) اُن مقامات کو انگلیوں سے خوب گدگدائیں، اور وہ اپنے آپ کو ان سے چھڑا نہ سکے میں نے کہا وہ کونسا نام ہے؟ فرمایا المتعالی۔ میرا دل چاہتا تھا کہ تمامی اسماء حسنیٰ کے انوار اور ان کے آثار آپ سے دریافت کروں مگر ہیبت کی وجہ سے ہمت نہ ہوئی اور دریافت نہ کرسکا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ولی پر اسماء حسنیٰ کے انوار کی سیرابی کے وقت سے زیادہ کوئی وقت بھی سخت ترین نہیں ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اسماء کے مقتضیات مختلف (اور باہم متضاد) ہیں کہ اس نام (مثلاً النافع) کا اقتضاء کچھ اور ہے اور دوسرے نام (مثلاً الضار) کا اقتضاء اس کے خلاف ہے۔ لہٰذا ذات ولی اضداد میں تڑپتی رہتی ہے (اور یکسوئی و سکون اور یک حالی کا قرار نصیب نہیں ہونے پاتا) نیز آپ نے فرمایا کہ کسی ولی کو صرف ایک ہی نام کا نور پلایا جاتا ہے اور اس پر عمر بھر اسی کا حکم مثلاً ضحک یا گریہ وغیرہ قائم و دائم رہتا ہے۔ اور کسی کو دو ناموں کا نور پلایا جاتا ہے، اور کسی کو اس سے زیادہ ناموں کا۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت کو کتنے اسماء کے انوار سے سیراب کیا گیا ہے؟ فرمایا ستانوے اسماء سے، یعنی سو میں تین کم۔ میں نے کہا اسماء حسنیٰ تو ننانوے ہیں نہ کہ سو۔ فرمایا سواں نام ان اسماء میں محسوب نہیں ہوا۔ کیونکہ لوگوں میں اس کی طاقت نہیں ہے۔ اور وہ وہی اسم اعظم ہے جس کے

متعلق حدیث میں آیا ہے اِذَا دُعِیَ بِہٖ اَجَابَ جب اس نام کے ذریعہ دعا مانگی جاتی ہے تو حق تعالیٰ عزوجل قبول فرماتا ہے، اس کو ملا کر اسماء حسنیٰ پورے ننّو ہیں۔ نیز فرمایا کہ اتنی تعداد کے اسماء سے سیرابی صرف ایک ہی شخص کو نصیب ہوا کرتی ہے (یعنی غوث اعظم کو کہ وہ عالم میں ایک ہی ہوتا ہے)۔

نیز میں نے آخیر عمر میں آپ سے یہ بھی سُنا کہ پورے ننّو اسماء کے انوار کی سیرابی آپ کو نصیب ہوگئی۔ نیز آپ نے یہ بھی فرمایا کہ سیرابی انوار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک سیرابی مرتبہ روح میں۔ اور یہی سیرابی ہے جو کسی ولی کو ایک نام کی نصیب ہوتی ہے۔ اور کسی کو دو ناموں کی، اور کسی کو اس سے زیادہ کی، اور پورے ننّو اسماء کی سیرابی بجز غوث وقت کے کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔ اور دوسری سیرابی ہے مقام سرّ و باطن میں۔ اور وہ پورے ننّو اسماء کی بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کے کسی مخلوق کو بھی نصیب نہیں ہوئی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ لوگ اپنے اوراد و وظائف میں جو اسماء الٰہیہ لیتے ہیں اور ذکر کرتے ہیں۔ پس اگر کسی عارف شیخ سے لیتے ہیں تو کسی قسم کی مضرت نہیں ہوتی۔ اور اگر کسی غیر عارف (یعنی چلتے پھرتے درویش یا کتابوں) سے اخذ کرتے اور وظیفہ قرار دیتے ہیں تو نقصان اُٹھاتے اور (جنون و مرض وغیرہ کی) مضرت پا جاتے ہیں۔ (غالباً اسی کا نام عمل کا پلٹ جانا اور وظیفہ کا اُلٹ جانا ہے) میں نے دریافت کیا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ فرمایا اسماء حسنیٰ کے انوار منجملہ انوار الٰہیہ کے ہیں۔ پس اگر اسم الٰہی کے ذکر کے وقت اس کا نور بھی اس کے ساتھ ہوگا تب تو مضرت نہ پہونچے گی۔ اور اگر اس کا نور اس کے ساتھ نہ ہوگا جو کہ ذاکر کو شیطان سے محفوظ رکھا کرتا ہے تو ذکرِ اسماء الٰہیہ کے وقت شیطان آکھڑا ہوگا اور ذاکر کی مضرت کا سبب بن جائے گا۔ اور شیخ عارف جس کو بارگاہ حق کی دائما حضوری نصیب ہے جب وہ اپنے مرید کو اسماء حسنیٰ میں سے کوئی نام دے گا (اور اس کا ذکر بصورت وظیفہ تلقین کرے گا) تو اسم مع اس نور کے دے گا جو اس کو شیطان سے محفوظ رکھے گا۔ لہٰذا مرید کو اس کے ذکر سے مضرت نہ پہونچے گی۔ پھر اس اسم کا نفع شیخ معطی کی نیت پر مرتب ہوگا کہ اگر دینوی نفع کی نیت سے دیا (اور شفاء مرض یا ادا قرض یا کامیابی مقدمہ کے لئے اللہ کے نام کا کوئی وظیفہ بتایا) ہے تب تو ذاکر کو وہی دینوی نفع حاصل ہوگا۔ اور اگر ثواب آخرت کی نیت سے دیا ہے تو وہی ثواب نصیب ہوگا اور اگر معرفت الٰہیہ حاصل ہونے کی نیت سے دیا ہے تو وہ نصیب ہوگی۔ اور اگر شیخ جس نے اسم الٰہی کی تلقین کی ہے عارف نہیں بلکہ محجوب (اور معرفت الٰہیہ سے محروم) ہے تو وہ اپنے مرید کو صرف نام دیگا بغیر اس کے نور کے۔ (کہ غفلت و حجاب کی وجہ سے انوار اسماء الٰہیہ خود اسی کو نصیب نہیں، دوسروں کو کہاں سے دے) اور بغیر نور کے شیطان سے حفاظت نہ ہوگی۔ لہٰذا مرید ہلاک ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ قرآن مجید میں اسماء حسنیٰ مذکور ہیں اور حفاظ و حاملین قرآن ہمیشہ قرآن مجید کی بھی تلاوت کرتے ہیں

اور اسمار حسنیٰ کی تلاوت کرتے ہیں مگر کبھی کسی کو مضرت نہیں پہونچی۔ حالانکہ کسی شیخ عارف سے اخذ نہیں کیا۔ فرمایا کہ قرآن مجید حق تعالیٰ نے ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو دے کر دنیا میں اس لئے بھیجا تھا کہ اپنے زمانہ سے لے کر قیامت تک آنے والی انسانی مخلوق کو پہونچائیں۔ ہٰذا جو بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتا (اور اس ضمن میں اسمار حسنیٰ پڑھتا ہے۔ وہ گویا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اخذ کرتا ہے پس) اس میں اس کے شیخ (سید العارفین) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے ہیں۔ اور یہ سبب بنتا ہے حفاظ کے شیطان سے محفوظ اور اس کی مضرت سے مامون رہنے کا۔ یہی صورت ہے اُن وظائف ماثورہ کی جو احادیث میں آئے ہیں اور ان میں اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں کہ چونکہ تعلیم فرمائے ہوئے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے تمامی امت کو، لہٰذا ان سے کسی کو مضرت نہیں پہونچ سکتی) علاوہ ازیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قرآن اپنی امت کو دیا ہے وہ بقدر ان کی طاقت کے اور بلحاظ اُن امور ظاہری کے دیا ہے جن کو وہ سمجھ سکیں اور برداشت کر سکیں۔ قرآن بہ جمیع اسرارہ اور مع اس کے تمامی انوار اور انوار اسمار کے نہیں دیا۔ اگر مع تمامی انوار کے عطا فرماتے تو آپ کی امت میں کوئی ایک بھی معصیت نہ کر سکتا اور سب کے سب اقطاب بن جاتے اور کسی کو کبھی اسمار الٰہیہ سے ضرر نہ پہونچتا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ سورۂ یٰسٓ میں (من جملہ اسمار حسنیٰ کے) دو نام ہیں شروع میں اَلْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ اور دو نام ہیں وسط سورت میں اَلْعَزِیْزُ الْعَلِیْمُ اور سورۂ صٓ میں دو نام ہیں اَلْعَزِیْزُ الْوَهَّابُ ان (چھیوں) اسمار میں صلاحیت ہے دنیا کی ساری خوبیوں کی اور آخرت کی تمام خوبیوں کی۔ اور سورۂ مُلک میں ارشاد خداوندی ہے اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ ط وَهُوَ اللَّطِیْفُ الْخَبِیْرُ یہ نافع ہے ہر حادثہ و مصیبت کے لئے خواہ فقر و افلاس ہو، یا مرض ہو، یا جہل ہو یا بلا و (آفت ناگہانی) ہو، یا ابتلار معصیت ہو۔ کہ اس آیت شریفہ کی (چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت) بکثرت تلاوت کرے گا تو جس کلفت میں بھی مبتلا ہو گا حق تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس کو رہائی و عافیت نصیب فرمائے گا۔ جامع کتاب کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ ایک شخص کے بدن پر وہ دانے نمودار ہوئے جو سخت ترین امراض میں سے ہے اور عام لوگ اس کو حب النیش کہتے ہیں (غالباً چیچک ہو یا اور کوئی مرض) وہ خوف زدہ ہو کر حضرتؒ کی خدمت میں آیا تو حضرت نے اس کو اسی آیت شریفہ کی بکثرت تلاوت کرنے کا حکم فرمایا۔ چنانچہ وہ محفوظ رہا اور خلاف گمان اس کا مرض رفع ہو گیا۔ حاضرات (یعنی درویشوں کے حلقہ مروجہ) کی بابت آپ نے فرمایا کہ اس کا وجود نہ قرن اول یعنی زمانہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں ثابت ہے، اور نہ قرن ثانی یعنی زمانہ تابعین میں، اور نہ قرن ثالث یعنی تبع تابعین کے زمانہ میں۔ اور یہی تینوں قرن بہترین قرون ہیں

جیساکہ حدیث میں آیا ہے (لہٰذا اس میں برکت و خیر نہیں ہے)

نیز فرمایا کہ ایک شخص نے مجھ سے اسی کے متعلق ایک مرتبہ سوال کیا۔ میں نے صاف اور صریح جواب دینا اس خیال سے پسند نہ کیا کہ میں (مولوی نہیں ہوں) اور ایک معمولی اور عامی شخص ہوں اس لئے میری بات یہ قبول نہ کرے گا۔ لہٰذا میں نے اس سے یہ تقریر کی کہ بھائی) یہ مسئلہ حضرات علماء سے دریافت کرنا چاہئے جاؤ ان سے پوچھو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حاضرات کی ہے یا کبھی نہیں کی؟ اگر وہ کہیں کہ کبھی نہیں کی تو پھر پوچھنا چاہئے کہ (آپ کے خلیفۂ اول) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے (اپنے زمانہ خلافت میں) کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ انہوں نے بھی کبھی نہیں کی۔ تو پوچھو کہ (خلیفہ دوم) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے (اپنے زمانہ رشد و ہدایت میں) کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ انہوں نے بھی کبھی نہیں کی۔ تو دریافت کرو کہ (خلیفہ ثالث) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ نے کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ کبھی نہیں کی۔ تو پوچھو کہ (خلیفہ رابع) حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے کبھی کی ہے یا نہیں؟ اگر وہ کہیں کہ چاروں خلفاء راشدین مہدیین کے زمانہ میں اس کا کہیں ثبوت نہیں ہے۔ تو اب اُن سے دریافت کرو کہ اچھا حضرات تابعین نے کبھی ایسا کیا ہے۔ یا اُن میں بھی کسی نے کبھی نہیں کیا؟ اگر وہ کہیں کہ ان میں بھی کسی نے کبھی نہیں کیا تو ان سے پوچھو اچھا حضرات تابعین کے تابعین میں کسی نے کبھی اس کو کیا ہے؟ اگر وہ کہیں کہ ان میں بھی کسی سے اس کا ثبوت نہیں ملتا تو بس اس سے ہم یہ نتیجہ نکال لیں گے کہ جب قرون ثلاثہ نے اس کو کبھی نہیں کیا تو اس میں مطلق خیر و برکت نہیں ہے۔ یہ حاضرات کی صورت تو قرن رابع میں ظاہر ہوئی ہے (جس کا احداث بروئے شہادتِ حدیث خیر میں داخل نہیں) اور اسکی صورت یہ ہوئی تھی کہ چار پانچ اولیاء اللہ (کسی جگہ جمع تھے) اور اہل مشاہدہ تھے کہ حق تعالیٰ نے ان کو فتح نصیب فرمائی تھی اکثر وہ ملائکہ کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ ملائکہ کی کیفیت یہ ہے کہ کوئی ان میں اللہ کا ذکر باللسان کرتا ہے، اور کوئی اپنی ذات سے (کہ ان کا جسم ذکر اللہ کرتا ہے) اور کبھی دائیں بائیں حرکت کرتا نظر آتا ہے، اور کبھی آگے پیچھے (جس کو جھومنا کہتے ہیں) یہ پانچوں ولی جب کسی فرشتہ کو اس حالت (ذکر بالذات) میں دیکھتے تو یہ حالت ان کو اچھی معلوم ہوتی اور فرشتہ کو جیسا کرتے ہوئے دیکھتے اس سے متاثر ہوا کرتے تھے۔ پھر وہی کیفیت ان کی ذات پر پیدا ہوتی اور بے اختیار خود بھی فرشتہ کی طرح حرکت کرنے اور جھومنے لگتے تھے۔ چونکہ مشاہدۂ حق سبحانہ میں محو و مستغرق ہوتے تھے اس لئے خود ان کو اپنے جھومنے کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ ان کے مریدین اور متوسلین نے جب ان بزرگوں کو جھومتے دیکھا تو وہ بھی ان کے اتباع میں یہی حرکت کرنے لگے۔ کہ اولیاء کا جھومنا فرشتہ کی وجہ سے تھا۔ اور مریدوں کا جھومنا اپنے شیخ کی دیکھا دیکھی اور انکی

سی صورت بنانے اور تشبہ ظاہری کی خاطر پھر وہ اہل باطن اہل صدق دنیا سے رخصت ہو لئے مگران ظاہری لباس اختیار کرنے والوں نے اس طریق کو نہ چھوڑا اور حاضرات میں مشغول ہو گئے۔ اور جھومنے میں اضافہ کرتے رہے کہ اس حالت کو لانے کے لئے آلات تجویز کئے (اور سرود و مزامیر تک نوبت پہونچ گئی) ظاہر ہے کہ خود مشائخ کی یہ حالت ضعف و کمزوری تھی (کہ قوت والے اولیاء دوسروں کی حالت سے متاثر نہیں ہوا کرتے اور اسی بنا پر مجذوب کو سالک کے مقابلہ میں ضعیف الحال کہا جاتا ہے) اور اہل قرون ثلثہ میں چونکہ ضبط کی طاقت تھی اور وہ (باطنی مشاہدہ اور اس کے اثرات سے) اپنے ظواہر کو محفوظ رکھ سکتے تھے اس لئے ان کے زمانہ میں کسی ایک کی بھی یہ حالت سننے میں نہیں آئی۔

ف مجھے چونکہ عمر بھر اس قسم کے مجامع میں شرکت کا اتفاق نہیں ہوا اس لئے میں نہیں کہہ سکتا کہ حضرۃ حاضرات اور حلقہ درویشان سے تعبیر کیا ہے کیا چیز ہوتی ہے۔ ایک مرتبہ مصر کے سفر میں جبکہ میرا قیام قاہرہ میں تھا مجھے ایک بزرگ کی اطلاع ملی کہ شہر سے باہر رہتے ہیں۔ چونکہ بزرگوں سے ملنے کا شوق تھا اس لئے میں وہاں گیا اور مغرب کی نماز وہیں جنگل میں شیخ کے ساتھ پڑھی کہ شہر سے چار میل ایک کچے کوٹھے میں رہتے تھے اور قریب ہی زمین کا فرش صاف کر کے پھوس کی چھوٹی سی مسجد بنا رکھی تھی۔ بعد مغرب ان کے دس بارہ مریدین و معتقدین جمع ہو گئے اور حلقہ شروع ہوا۔ جس کی صورت یہ تھی کہ شیخ بیچ میں دیوار سے کمر لگائے بیٹھے تھے اور سامنے ایک قوس دائرہ کی طرح مریدین کا حلقہ تھا۔ شیخ کے خادم خاص عبد القادر بٹنی نے کہ میرے خاص دوست تھے خوش الحانی کے ساتھ با آواز بلند قطب الزماں حضرت مولانا عبد السلام بن مشیش قدس سرہ کا ورد مشہور اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مَنْ مِنْہُ انْشَقَّتِ الْاَسْرَارُ الخ پڑھنا شروع کیا۔ اور شیخ گردن جھکائے مریدین پر توجہ ڈالتے رہے۔ چند ہی منٹ گذرے تھے کہ دفعۃً شیخ کھڑے ہو گئے اور ان کے ساتھ تمام مریدین دائرہ کی صورت میں کھڑے ہو گئے اور ایک نے اپنا ہاتھ دوسرے کے ہاتھ میں پکڑ کر شیخ کے دونوں ہاتھوں سے مربوط ہو کر ایک دائرہ بنا لیا۔ شیخ نے بھی عبد القادر بٹنی کی آواز میں آواز ملا کر اسی لہجہ میں ورد مذکور پڑھنا شروع کیا اور مریدین میں جن جن کو یہ ورد یاد تھا انہوں نے بھی آواز ملائی۔ گویا مختلف اور متعدد آوازیں ایک بن کر جوش و خروش کے ساتھ ورد مذکور پڑھنے لگیں اور سب نے بندھے ہوئے دائرہ کے ساتھ چکر لگانا شروع کیا۔ جوں جوں گھومتے تھے جوش بڑھتا تھا اور جھومتے تھے۔ میں چونکہ مریدین میں شامل نہ تھا اس لئے گوشہ میں علیحدہ بیٹھا ہوا اس منظر کا مشاہدہ کرتا رہا۔ تقریباً آدھ گھنٹے یہی رنگ رہا اور اس کے بعد شیخ بیٹھ گئے اور سب مریدین بھی ایک دوسرے کے ہاتھ چھوڑ کر اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ ذرا دیر بعد سب نے عشا کی نماز پڑھی اور اس کے بعد شیخ اپنے خلوت خانہ

میں چلے گئے اور میں اپنی قیامگاہ پر واپس ہوا۔ مزامیر یا آلات طرب وغیرہ کچھ نہ تھے اور نہ قوالی کی صورت میں اشعار وغیرہ تھے۔ عجب نہیں بلاد اسلامیہ میں اسی کا نام حضرۃ ہو جس کی جمع حاضرات ہے۔ گویا بارگاہ احدیت میں حاضری وحضوری کا کیف اور احتظاظ اس طرح بہ تکلف لایا جاتا ہے۔ ہر ملک اور ہر زمانہ میں چونکہ رنگ مختلف ہوتے رہتے ہیں اس لئے ممکن ہے اصل نوعیت حضرۃ کی یہ ہو جو بعض محتاط مشائخ میں محفوظ چلی آتی ہو۔ مگر دوسروں نے اس میں آلات طرب ومزامیر کا اضافہ کر لیا ہو۔ جیسا کہ ہندوستان میں اسی کیف کو مقصود سمجھ کر بہ تکلف اور آمد نہیں بلکہ آورد کے درجہ میں کھینچ کرلانے کے لئے سماع اور قوالی کا رواج شائع ہو گیا ہے۔ یہ شرف اور فضل تو صرف سنت نبویہ ہی کو حاصل ہے کہ نہ ملکی اثر سے بدل سکے اور نہ زمانی ووقتی اثر سے متاثر ہو۔ جو طریق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اُس وقت تھا جبکہ آپ دنیا میں تشریف فرما تھے وہی آج بدستور ماثور ومنقول اور محفوظ ومصون چلا آتا ہے۔ اور بعد کی ایجادات ہمیشہ زمانی ومکانی اثر سے متاثر ہوتی اور بدلتی رہیں۔ کہ کسی ملک میں حضرۃ اور حلقہ کا کوئی طریق ہے اور دوسرے ملک میں اس کے خلاف دوسرا طریق۔

کسی زمانہ میں امر محدث کا کوئی طرز تھا اور دوسرے زمانہ میں اس کا طرز بدل کر دوسرا ہو گیا اس لئے شیخ کی عبارت ہی سے جتنا معلوم ہوا کہ کوئی طریق جھومنے کا تھا جس کو وجد کہہ لو یا حال، وہ میں نے بیان کر دیا۔ ورنہ حقیقت اس کی کہ شیخ کے زمانہ میں اور ملک مغاربہ کے اندر وہ کیا طریق تھا جس کا نام حضرۃ رکھا ہوا تھا کسی کتاب سے بھی معلوم نہ ہو سکی۔ تجربہ سے یہ بات بھی محقق ہوئی کہ صرف سنت رسول ہی کو یہ فخر وکمال نصیب ہے کہ حصار سطوت الٰہیہ میں محصور ہے اور شیطان کی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا نہ اس میں اضافہ ہونے پایا اور نہ کسی معصیت یا شیطانی اثر کا اس میں دخل ہو سکتا ہے۔ برخلاف امور محدثہ کے جن کو بدعات کہا جاتا ہے کہ شروع میں بظاہر کوئی خاص خرابی اس میں معلوم نہیں ہوتی۔ مگر چونکہ اس کا اختراع واحداث غیر رسول کے ہاتھوں ہوا ہے اس لئے آئندہ حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ اور اسی لئے شیطان اس میں دخیل ہو کر آہستہ آہستہ اس میں معاصی کا شمول کراتا رہتا اور چند روز بعد اس حد پر لا پہونچاتا ہے کہ کوئی صاحب دل اور منور القلب اللہ والا اس کو سبب صلاح وخیر نہیں بتا سکتا۔ ضد وجہالت والے گو اپنی بات کی پچ کرتے اور یہ سند لاکر کہ معمول صلحاء واولیاء ہے طرح طرح کی تاویلوں سے اس کا مستحسن ہونا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر نور ایمان تو کسی نہ کسی درجہ کا حق تعالیٰ نے تمامی امۃ محمدیہ کو دیا ہے اور کتنا ہی کوئی بددین یا جاہل وضدی کیوں نہ ہو مشکوٰۃ قلب محمدی کی تجلیات سے کچھ

نہ کچھ ضرور مستفیض ہوا ہے، اس لئے خالی الذہن ہو کر جس وقت دیکھتے ہیں تو عاملین محدثات خود بھی دلوں سے اقرار کر لیتے ہیں اور انتساب بارگاہ محمدی کی بدولت یہ ضرور سمجھ لیتے ہیں کہ ہاں اب انکے مفاسد و مضار غالب آگئے ہیں مصالح اور مفاد پر۔ اور یہی علامت ہے ان کے محدث ہونے کی کہ شروع ہی میں اگر سنت کی طرح مجسم خیر ہوتے تو حفاظت الٰہیہ کے قلعہ میں دشمن کے ہر اثر سے محصور و مامون ہوتے اور آج یہ نوبت نہ آتی۔ بہر حال یوں بھی وجد ہو یا حال اور سماع سے ہو یا مزامیر سے قطع نظر معصیت کے چونکہ تاثر طبعی ہے کہ حیوانات بھی حُدی وغیرہ سے جھومنے لگتے اور مست ہو جاتے ہیں اس لئے نہ یہ انسانی کمال میں شامل ہے اور نہ کوئی قابل اعتنا خوبی ہے۔ بلکہ ایک قسم کا روحانی ضعف اور کمزوری ہے کہ مغلوب بننا ہے طبیعت سے اور اگر اس میں تصنع و تکلف کا دخل ہو اور آورد کا درجہ ہو کہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش و تدبیر کی جائے تب تو کوئی چیز ہی نہیں۔ بے کھٹکے اور بے خطر طریق روحانی کمالات اور ایمانی نور و حلاوت حاصل کرنے کا وہی ہے جو قرون ثلثہ میں ثابت ہو چکا ہے۔ اور اسی لئے بصیرت محمدیہ نے ان کے خیر مجسم ہونے کی شہادت دی ہے واللہ اعلم

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ نگاہ بصیرت کے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار اجزا ہیں جن میں ایک جز آنکھ کی نگاہ میں آتا ہے اور باقی تمام اجزا وارث کامل عارف کی ذات میں ہیں کہ وہ اپنی ذات سے دیکھتا ہے جیسے ہم اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ مگر تمامی اجزا (یعنی نگاہِ چشم سے تین لاکھ چھیاسٹھ ہزار گونہ بڑھی ہوئی نظر) سے دیکھتا ہے اور یہ قوت صرف ایک شخص کو حاصل ہوتی ہے۔ یعنی غوث اعظم کو جس کے ماتحت سات اقطاب ہوتے ہیں۔

حاضرین میں سے ایک شخص نے یہ قصہ نقل کیا کہ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اور حضرت شیخ احمد بن حسین رفاعی اور حضرت شیخ ابراہیم دسوقی تینوں ہم عصر حضرات قدس اللہ اسرارہم کا (بحالت حیات دنیا ایک مرتبہ) عالمِ ملکوت میں اجتماع ہوا اور وہاں کوئی واقعہ ان حضرات کا پیش آیا۔ حضرت ابراہیم دسوقی نے اس ملکوتی واقعہ کا تذکرہ اپنے کسی خادم سے کیا تو اس نے کہا اس واقعہ کا گواہ کون ہے؟ حالانکہ آپ مع خدام و مریدین کے ملک مصر میں تھے اور وہ دونوں حضرات (یعنی حضرت جیلانی اور حضرت رفاعی) ملک عراق میں تھے، مگر آپ نے ان کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ اس کی شہادت یہ دونوں دینگے چنانچہ دونوں حضرات اسی وقت وہاں تشریف لائے اور شہادت دی (کہ ہاں یہ واقعہ صحیح ہے اور ہمیں پیش آیا تھا) حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایسا قصہ تو معمولی ولی سے بھی ہو سکتا ہے (کہ طیِّ ارض اور ملکوتی اجتماع اور دور دراز ملک سے سماع و کلام کا جاری ہونا تو اقطاب و ابدال کیلئے معمولی بات ہے۔)

میں نے تو ایسے ولی کو دیکھا ہے جو اتنے بڑے مرتبہ پر پہونچا ہوا تھا کہ ناطق اور غیر ناطق انسان و حیوان وحوش وحشرات الارض جمادات و نباتات. ہفت زمین و ہفت افلاک ستارے اور سیارے غرض تمامی مخلوقات کا مشاہدہ کرتا تھا اور سارا کرۂ عالم اس سے مدد پاتا اور منتفع ہوتا تھا. وہ سب کی آوازیں اور گفتگو بیک لحظہ سنتا، اور ہر چیز کی ضروریات اور جو شے بھی جس کے لئے مناسب و شایاں ہے وہ اس کو پہونچاتا تھا، اور ایک شے میں مشغولیت اس کو دوسری شے سے غافل نہ بناتی تھی۔ بلکہ عالم بالا و عالم زیریں سب اس کے نزدیک گویا ایک محدود حصہ میں تھے۔ پھر حق تعالےٰ کی اس بندہ پر رحمت ہوئی (اور حقیقت کا انکشاف ہوا) تو اس نے دیکھا کہ میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ محض کالبد خاکی اور بمنزلہ ظروف خالی کے ہوں) یہ طاقت اور مدد جو کچھ بھی آرہی ہے دوسرے کی طرف سے آرہی ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے۔ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ طاقت اور مدد حق تعالیٰ سبحانہ کی طرف سے پہونچ رہی ہے لہٰذا سب کچھ اللہ جل جلالہٗ ہی کی طرف سے ہو رہا ہے (کہ وہی خالق متصرف اور قادر مطلق ہے۔ مخلوق سب بالذات محتاج و مفتقر اور ارادۂ ومشیت الٰہیہ کی منظہر وآلہ کار ہے) یہ ولی کہا کرتا تھا کہ جب میں دیکھتا ہوں کہ مدد و طاقت دوسرے کی طرف سے ہے تو مجھے اپنا نفس مینڈک کی طرح (ضعیف اور ہیچ) نظر آتا ہے اور ساری مخلوق کو اپنے سے زیادہ قدرت وطاقت والا پاتا ہوں۔ ف یہی وجہ ہے کہ ان اہل معرفت حقیقت شناس حضرات کو ان تصرفات عوالم کا اہل قرار دیا گیا ہے کہ تلوار کی دھار جتنی باریک ہوگی اسی قدر زیادہ کام کرے گی۔ کیونکہ اس کو اپنی حقیقت معلوم ہے کہ تلوار کے تمامی جسم میں نحیف تر اور ضعیف ترین ہوں اور خود کسی شے کو کاٹنا تو کیا معنے حرکت بھی نہیں کر سکتی۔ کاٹنے کی طاقت مالکِ سیف کے قوت بازو سے آتی ہے، اور بازو میں طاقت روح کی طرف سے آرہی ہے۔ ورنہ وہ خود ایک مضغہ گوشت ہے۔ اگر روح نکل جائے تو حرکت بھی نہ کر سکے۔ اور اسی لئے حق تعالیٰ نے اس باریک اور پتلی دھار کو تمامی اجزا سے قوی تر اور کارگذار بنایا اور ساری تلوار کا خلاصہ قرار دے کر صاحبِ تصرف اور اس اعلیٰ کام کا اہل بنایا جو تلوار کے کسی دوسرے حصہ سے کبھی انجام نہیں پا سکتا۔ جتنا کوئی ہیچ مدانی اور اپنے ضعف و افتقار اور لاشے محض ہونے کی حقیقت شناسی میں بڑھا ہوا ہے اسی قدر قادر ذوالجلال نے اس کو قوت وطاقت بخش کر تصرفات عوالم کا آلہ کار بنایا اور دنیا کو دکھایا ہے کہ قدرت الٰہیہ کی حقیقت اور اپنے پتلہ خاک ہونے کی معرفتِ نفس حاصل کرنے والوں کو یہ قوتیں عطا کی جاتی ہیں۔ اگر یہ حضرات ان خداداد قوتوں پر کچھ بھی ناز کرتے یا ادنی سے ادنی کام بھی اپنی طرف منسوب یا اپنی طاقت کی طرف مضاف

سمجھتے تو نہ اہل تصرف ہوتے اور نہ عنداللہ کسی قدر و منزلت پر پہونچتے۔ چنانچہ عوام بھی انہیں جیسے انسان اور بنو آدم ہیں۔ مگر چونکہ غفلت و عدم معرفت کے سبب اپنی عقل اپنی تدبیر اپنی طاقت اپنی جد و جہد کو کچھ سمجھتے اور اپنی طرف منسوب کرتے ہیں اس لئے ذرا ذرا بات میں ٹھوکریں کھاتے اور رات دن پریشان حال و ناکام بن کران ہی فقرا و درویش اور اللہ والوں کے آستانہ پر دعا کرانے اور دست بوس و قدمبوس ہو ہو کر حاجت براری کے متمنی بن کر آتے ہیں۔ اللہ کی شان ہے کہ بے طاقت سمجھنے والوں کو یہ طاقت بخشی اور طاقت ور سمجھنے والوں کو اتنا کمزور و ضعیف بنایا۔ کہ محتاج الی اللہ شخص مخلوق کا محتاج الیہ بن گیا۔ اور اپنے کو طاقت ور سمجھنے والا دنیا ہی میں محتاج بن گیا۔ واللہ اعلم۔

جامع کتاب کہتے ہیں کہ اس ولی سے مُراد خود حضرت شیخ ہیں کہ غوث وقت تھے اور اقطاب سبعہ آپ کے ماتحت تھے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ مجھے ساتوں آسمان اور ساتوں زمین اور عرش اپنی وسط ذات میں داخل نظر آتے ہیں۔ اور اسی طرح فوق العرش کے ستر حجاب بھی کہ ہر حجاب میں ستر ہزار عالم ہیں اور ایک حجاب سے دوسرے حجاب کی درمیانی مسافت ساٹھ ہزار برس کی ہے، اور یہ سب حصہ ملائکہ سے معمور و آباد ہے۔ اور اسی طرح ستر حجابوں سے اوپر عالم رقا کہ ان تمامی عوالم کی تمامی مخلوقات کے اعمال جوارح اور افعال اعضا تو درکنار ان کے فکر و خیال میں بھی کوئی بات پڑتی ہے تو ایک شخص (غوث اعظم) کے اذن سے پڑتی ہے۔ واللہ اعلم۔

میں نے ایک مرتبہ آپ سے دریافت کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم (کے روحانی کمالات) کی میراث ایک لاکھ چوبیس ہزار (اولیاء امت) میں منقسم ہوئی۔ اس کی کیا وجہ کہ سارا ترکہ صرف غوث کو نہیں ملا؟ فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں (کمالات کے تحمل کی) جتنی طاقت تھی وہ کسی شخص میں بھی نہیں ہے (اس لئے غوث ان سب کا وارث و متحمل کیسے ہوسکتا تھا۔ یہ بھی حضرتؐ ہی کے فیضان کا اثر ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار افراد نے مل کر وہ بوجھ اُٹھالیا جو آپ نے تنہا اُٹھا رکھا تھا) ہاں غوث کے وارث کامل ہونے کا صرف یہ مطلب ہے کہ اس زمانہ میں ذات محمدی سے جتنا اس نے پیا (اور وہ سیراب ہوا ہے) وہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔ اور انوار ذات رسول اس میں تمامی ہم عصروں سے نسبتہً زیادہ اور بدرجہ کمال آئے ہیں۔ واللہ اعلم

آٹھواں باب

سیدنا آدم علیہ السلام کی آفرینش کی تدریج اور صورت بنی آدم کا فضل و شرف

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے جب حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے کا ارادہ فرمایا تو دس دن تک ان کی مٹی جمع کرائی، اور بیس دن تک اس کو پانی میں ڈالے رکھا۔ چالیس دن میں ان کی شکل وصورت کو مکمل فرمایا اور پھر بیس دن تک ان کو چھوڑے رکھا حتیٰ کہ ترابیت سے وہ جسمیت کی طرف منتقل ہو گئے (اور پتلہ خاک ایک جسم بن گیا) یہ سب تین مہینے ہوئے یعنی رجب و شعبان و رمضان۔ پھر حق تعالیٰ نے ان کو (زمین سے) اُٹھا کر جنت میں پہونچادیا۔ اور وہیں ان میں روح ڈالی۔ اور وہیں کے قیام میں اُن سے حضرت حوا علیہا السلام کو پیدا فرمایا۔ یعنی حضرت حوا علیہا السلام کی آفرینش جنت میں ہوئی۔ جب آفرینش حوا کو پورے دو مہینے گذر لئے تو دونوں میں مادّہ شہوت ڈالا گیا اور حضرت آدمؑ نے اُن سے ہمبستری فرمائی۔ حضرت حوا کو حمل قرار پایا اور جنت سے نکلنے اور زمین پر آنے کے بعد جب کہ حمل کو تین مہینے گذرے (جو کہ آفرینش آدم علیہ السلام کی مدّت تھی) تو وضع حمل ہوا اور بچہ پیدا ہوا۔ پھر اس کے بعد زمین پر ان کو حمل قرار پایا تو نو مہینہ میں ولادت ہوئی اور آج تک یہی حالت مستمرہ بن کر چلی آتی ہے۔

میں نے دریافت کیا وہ کون سی مٹی تھی جس سے حضرت آدمؑ کی تخلیق ہوئی؟ فرمایا تمامی معدنیات کی مٹی لی گئی تھی۔ سونے کی کان۔ چاندی کی کان، پیتل اور سیسہ کی کان، وغیرہ وغیرہ سب کی مٹی شامل تھی۔ میں نے کہا اس کو جمع کس نے کیا تھا؟ فرمایا فرشتوں نے اور جس کو بھی اللہ نے چاہا اُس نے۔ اور سب میں زیادہ مٹی حضرت جبریلؑ لے کر آئے۔ کیونکہ حق تعالیٰ نے ان پر ظاہر فرما دیا تھا کہ مٹی سے پیدا کئے ہوئے (انسان) سے زیادہ عزت واحترام والا میرے نزدیک کوئی نہ ہوگا۔ اور جبریل اس کے انیس و رفیق ہوں گے اور برکات عظیمہ پائیں گے۔ اور اس سے مراد وجود باوجود تھا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا (کہ خلاصہ بنی آدم اور سید الوجود ہیں) اس لئے حضرت جبریل یہ سمجھ کر کہ اُسی ذات کی تخلیق کے لئے ہے جس کا اظہار کیا گیا ہے، مٹی زیادہ لاتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ اس مٹی کی مقدار کتنی تھی؟ فرمایا اتنی مقدار تھی جس سے ایک میل یا کچھ کم زمین کا حصہ معمور ہو جائے۔ یعنی اتنی کثیر مٹی جمع کی گئی تھی کہ ایک میل رقبہ کی مساحت کو گھیر لے۔ میں نے کہا کہ اس کے جمع کرنے میں دس دن کی

ضرورت کیوں پیش آئی جب کہ حق تعالیٰ کو ایک لمحہ میں اس کے جمع کرنے کی قدرت تھی ؟

فرمایا یہ (عجیب سوال ہے) اللہ کو تو آسمانوں اور زمینوں کے ایک لمحہ میں پیدا کرنے کی قدرت تھی۔ پھر ان کو چھ دن میں کیوں پیدا فرمایا۔ اور وہ تو قادر تھا آدم کو بغیر مٹی کے پیدا فرمانے پر پھر مٹی سے کیوں پیدا کیا (غرض اس طرح تو تمامی اسباب اور وسائط بلکہ تدریج و نظام عالم کی ترتیب ہی معطل ہو یگی۔ کہ قدرت الٰہیہ بلا واسطہ سبب اور دفعۃً بیک لحظہ سب کچھ کر سکتی ہے) بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ (جہاں بعض چیزوں کو بلا توسط سبب اور دفعۃً پیدا فرماتا اور اس طرح اپنی قدرت کاملہ کا ایک رنگ دکھاتا ہے وہیں اپنی قدرت کاملہ کا دوسرا رنگ دکھاتا اور) بعض چیزوں کے پیدا فرمانے میں متعدد ایام کی ترتیب دیتا اور بتدریج شیئاً فشیئاً اسکو کمال پر پہونچاتا ہے کہ اسکی وجہ سے ملا الاعلیٰ اور ملائکہ مقربین کو بڑے درجہ کی توحید نصیب ہوتی ہے کیونکہ آہستہ آہستہ نشو و نما اور ترقی پانے اور ایک حالت سے دوسری حالت اور ایک طرز سے دوسری طرز کی طرف منتقل ہونے میں (گویا ہر لمحہ ایک جدا تخلیق ثابت ہوتی) اور ملا الاعلیٰ کی توجہ اس حادث مخلوق میں امر الٰہی پر تعجب کے ساتھ (صدہا بلکہ ہزارہا مرتبہ) با اہتمام پڑتی رہتی ہے، اور اس کے بارہ میں یہ غور و فکر (مدت تک چلتا) رہتا ہے کہ کس طرح پیدا فرما رہا ہے، اور اس سے کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ اور اس کا منتہا و انجام کار کیا ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔ پس اس زمانہ ارتقار (اور تدریجی تکمیل کے ایام) میں اللہ جل جلالہٗ کی معرفت اور اس کی قدرت کاملہ سے واقفیت اور اشیار مخلوقہ میں اس کا سریان و جریان اتنا زیادہ حاصل ہوتا ہے (کہ دفعی تخلیق میں اس کا ہزاروں حصہ بھی نصیب نہ ہوتا کیونکہ) اس مخلوق میں اظہار قدرت کے جتنے بھی اسرار و مصالح ہیں وہ سب اُن کے ذہن میں آجاتے اور ان کو تفہیم تام حاصل ہو جاتی ہے۔ پس تدریج اس مصلحت کے لئے ہوا کرتی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس میں ایک مصلحت اور بھی ہے۔ وہ یہ کہ اس تدریج اور انتظار خروج حادث اور اس کی طرف دھیان و خیال لگے رہنے (کے زمانہ) میں اسی حادث جیسی یا اس سے بھی افضل و اعظم دیگر مخلوقات کو موجود کر دیا جاتا ہے (کہ اس کا سلسلہ تکمیل چل رہا ہے اور اثنار تدریج میں اس فاصل وقت کے اندر دوسری چیزیں پیدا کر دی گئیں۔ لہٰذا ایک کی تکمیل کے ضمن میں متعدد الانواع کی مخلوقات کا ظہور ہو گیا) غرض ہر چیز میں حق تعالیٰ کی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں (جن کو سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ اور یہ اعتراض کرنا بہت آسان ہے کہ جب یوں بھی کر سکتا تھا تو ایسا کیوں کیا اور ایسا کیوں نہ کیا۔ میں نے کہا وہ پانی کونسا تھا جس میں وہ مٹی ڈالی گئی اور بیس دن تک پڑی رہی تھی ؟ فرمایا زمین کا وہ پانی تھا جو حقیقت کے اعتبار سے زمین کی طرف منسوب ہے اور ذات آدمی کے ہم شکل و مناسب حال ہے۔ میں نے کہا وہ اصل زمین کا (یعنی تہ) کا پانی تھا؟ فرمایا اصل زمین کا نہ تھا بلکہ وہ پانی تھا جس کو زمین کے اکثر اجزار پر مرور و عبور

حاصل ہو چکا تھا۔ زمین پر بہنے والے پانی کی مختلف حالتیں ہوتی ہیں۔ بعض تو زمین کے کسی خاص حصّہ پر بہتا ہے اور اس میں صرف اسی خطہ زمین کے اسرار و اثرات آئیں گے۔ اور بعض کا جریان اکثر اجزار ارضیہ پر یا تمامی اجزار زمین پر ہوتا ہے اور اس میں تمامی اثرات و اسرار آجائیں گے۔ اور یہ پانی (جس میں وہ مٹی ڈالی گئی تھی) ان چشموں میں سے ایک چشمہ کا تھا جو زمین شام سے آنے والی خطہ ارض سے (فوارہ کی طرح اوپر) اُبل پڑے ہیں۔ وہیں زمین کے ایک اتنے بڑے غار میں جس کی مقدار ایک ایک میل کے قریب تھی سیدنا آدم علیہ السلام کی مٹی کو جمع کیا گیا اور اُس چشمہ کے پانی سے اس کو تری پہونچائی گئی۔ کیونکہ اس پانی کو تمامی اطراف زمین کے پانیوں سے مدد پہونچتی رہتی ہے کہ یہ از زمین اوّل اور دوم کے درمیانی خلو یعنی) تخوم ارض میں بہتا اور اجزار ارضیہ کو پھاڑتا ہوا اس چشمہ تک پہونچتا اور تمامی جوانب سے گذر کر اس تک آتا ہے۔ اور یہ چشمہ اب تک موجود ہے۔ اور اس میں ذات بنی آدم کے لئے اتنی موافقت موجود ہے کہ سطح زمین کے تمامی پانیوں میں کوئی پانی بھی اتنا مزاج انسانی کے موافق نہیں ہے۔ الغرض مٹی بلبیں[۲] دن تک پانی میں پڑی رہی اور اب گارے میں پڑے ہوئے پتلہ کے اندر صورت بننی شروع ہوئی کہ آہستہ آہستہ شیئاً فشیئاً چالیس دن میں کمال پر پہونچی۔ مگر کوئی چیز نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے بعد جب حق تعالیٰ نے گارے سے جمیعت انسانیہ کی طرف منتقل کرنا چاہا تو انگلیوں میں ایک پھنسی کی شکل نمودار ہوئی اور اس نے ساری انگلیوں کو بھر لیا۔ پھر وہ پھوٹ گئی اور اس کا مادّہ انگلی پر جم کر ایسا سفید ہو گیا جیسے درخت کھجور کی چھال اتارنے کے بعد اندر کا گدا ہوتا ہے جس کو شحم النخل کہتے ہیں۔ اس کے بعد ایک ایک عضو اور ہر ہر جزو میں سرایت کرتا (اور بڑھتا) رہا۔ حتیٰ کہ سارا پتلہ شحم النخل کی طرح بن گیا، یا ایسا جیسے خالص گیہوں کے آٹے کا گُندھا ہوا صاف پیڑا ہوتا ہے۔ پس اس سے آدم کی صورت متشکل ہوئی اور پھر اس میں تھوڑی دمویت داخل ہوئی۔ گارہ پھٹ کر جدا ہو گیا اور اس میں خشکی نمودار ہو گئی۔ اس کے بعد اس پر ہوائیں چلتی رہیں اور اجزار آدم میں خشکی دوڑتی اور ظاہر ہوتی رہی اور اس سے باذن الٰہی ہڈیاں بن گئیں۔ جب بیس دن میں بدن کی ساخت مکمل ہو گئی اور حق تعالیٰ نے اس میں روح پھونکنے کا ارادہ فرمایا تو ان کو اُٹھا لیا اور جنت میں منتقل فرمایا۔ میں نے پوچھا کہ یہ جنت کونسی تھی؟ فرمایا پہلی جنت۔ پھر جب کالبد جنت میں آگیا تو اس میں روح داخل ہوئی اور (ساتھ ہی ساتھ) عقل اور علم کا دخول ہوا۔ اور ان کو اللہ جل جلالہ کی معرفت اور پہچان حاصل ہوئی۔ اس وقت حضرت آدم علیہ السلام نے اٹھنے کا ارادہ کیا۔ مگر کپ کپا کر گر گئے۔ پھر کھڑے ہونے کا ارادہ کیا اور پھر گر گئے۔ جیسے شروع میں

بچے جب کھڑا ہونا چاہتے ہیں تو گر گر جاتے ہیں۔ پھر حق تعالیٰ نے اس حالت میں کہ حضرت آدمؑ ایک پاؤں زمین پر رکھے ہوئے اور دوسرے پاؤں کا گھٹنا زمین پر ٹیکے ہوئے سہارا لئے کھڑے تھے وہ مشاہدہ نصیب فرمایا جس کا تذکرہ اسمار حسنیٰ میں ہو چکا ہے۔ جب یہ مشاہدہ آپ کو حاصل ہوا تو آپ کی زبان سے نکلا اللہ اللہ اللہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ تب حق تعالیٰ نے ان کو قوت بخشی اور وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ اور جنت میں چلنے پھرنے لگے کہ جہاں چاہتے وہاں جاتے تھے۔ پھر حق تعالیٰ نے ان کی پسلی میں ایک درد پیدا فرمایا اور ایک بڑے دُنّل کی طرح (ورم) نمودار ہوا یہاں تک کہ انسان کے سر کی مقدار وہ ابھر گیا اور کچھ مدت تک قائم رہا اور پھر وہ پھوٹ گیا اور چھوٹے سے کالبد کی طرح ایک شے اس سے نمودار ہو کر زمین پر گر گئی۔

حضرت آدم نے اس پر نگاہ ڈالی تو اپنی سی صورت کا پتلہ دیکھا اور اس کو چھوڑ کر چلے گئے۔ اس پتلہ پر جنت کی ہوائیں چلتی اور مہک و خوشبوئیں اوپر گذرتی رہیں جس نے جلد جلد بڑھنے اور بسرعت نشوونمو پانے کا نفع پہونچا۔ حضرت آدم بار بار آکر اس پُتلہ کو دیکھا کرتے اور بہت ہی جلد جلد اس کو بڑھتا ہوا پاتے تھے اب اس کے ساتھ ان کو اُنس ہونے لگا۔ اور حضرت آدم اس پتلہ کے پاس بیٹھنے لگے۔ تب حق تعالیٰ نے اس کالبد میں عقل ڈالی اور وہ حضرت آدم سے باتیں کرنے لگا۔ جب دو مہینے گذر گئے تو دونوں میں حق تعالیٰ نے مادّہ شہوت ڈالا اور حضرت آدم نے حضرت حوا سے کہ وہ کالبد مذکور وہی تھی، مجامعت فرمائی۔

حضرت حوا علیہما السلام کو حمل قرار پایا اور تین مہینہ بعد جبکہ دونوں کا نزول زمین پر ہو چکا تھا، بچہ کی اس دنیا میں ولادت واقع ہوئی۔ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حضرت آدم کو حق تعالیٰ نے جنت کی طرف صرف اس لئے اُٹھایا کہ ان کی ذات کو انوار جنت سے سیراب کیا جائے تاکہ ان کی ذریت روز الست کے عہد و پیمان کو بھلا نہ دے۔ نیز سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم کی خاطر۔ اور اس کو اہل بصیرت خوب جانتے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ جس درخت کی حضرت آدم کو ممانعت کی گئی تھی وہ کونسا درخت تھا؟

فرمایا وہ انجیر کا درخت تھا بلا شک وشبہ۔ اور اس کے کھانے کی ممانعت صرف اس لئے فرمائی تھی کہ یہ درخت اور اس کے علاوہ درخت ہائے جنت کی دیگر انواع اسہال لاتی ہیں۔ لہٰذا اس کے کھانے سے ممانعت فرما دی کہ دست آنے لگیں گے تو پھر جنت میں نہ رہ سکیں گے (کہ جنت بول و براز کی جگہ نہیں ہے) میں نے کہا کہ جنت کے طعام اور جنت کے پھل اور جنت کی تمام نعمتیں تو اگرچہ جرم رکھتی ہیں مگر خالص انوار ہیں جن میں ثقل نام کو بھی نہیں ہے جیسا کہ بہت سی حدیثوں میں آیا ہے۔ اور جس چیز میں ثقل نہ ہوگا اس کے کھانے سے دست نہیں آسکتے۔ فرمایا یہ تمہارا کہنا صحیح ہے مگر اہل جنت جب بروز قیامت جنت میں داخل ہوں گے تو اُن کے مزاج بالذات صحیح و تندرست ہوں گے، اور ان کو وہ قوت بخشی جائے گی

جو (احادیث میں مذکور اور) سب پر ظاہر ہے۔ اور جب حضرت آدم جنت میں گئے تھے تو ان کی ذات کی یہ شان نہ تھی (بلکہ ضعیف المزاج تھے لہٰذا ان کے ابتدائی بغرض ابتلاء دخول جنت کو انتہائی دخول جنت بصلۂ اعمال پر قیاس نہ کرو) کہ اہل جنت کے پیٹ میں جب نعماء جنت اتریں گی تو ان کی برداشت (اور ہضم کی استعداد) ان کو اس قوت کی وجہ سے ہو گی جو ان میں ڈالی جائے گی۔ اور نیز اس لئے کہ آخرت میں اہل جنت کی ذوات وطبائع بھی نعمائے جنت کی طرح مجسم انوار ہوں گی۔ لہٰذا انوار انوار میں گھل مل جائیں گے اور ہر پھل کا نور اپنی اصل کی طرف لوٹ جائے گا۔ برخلاف اس ابتدائی دخول جنت کے کہ اس وقت حضرت آدم کی ذات چونکہ ترابی اور ضعیف تھی اس لئے اس درخت کا پھل کھانے کی طاقت نہ رکھتی تھی۔ میں نے کہا کہ اس کا مقتضا تو یہ ہوا کہ اُسوقت حضرت آدم نہ اس درخت کا پھل کھانے کی طاقت رکھتے تھے اور نہ جنت کے کسی دوسرے پھل کی (پھر جنت میں رہ کر کھاتے کیا تھے) فرمایا کہ جنت کے درخت اور جنت کی نعمتیں دو طرح کی ہیں۔ ایک تو وہ قسم ہے جو خالص انوار ہیں کہ عالم دنیا کی نعمتوں میں کسی کے بھی مشابہ وہم شکل نہیں ہیں۔ اور جنت میں یہی قسم زیادہ اور کثیر ہے۔ پس یہ تو نور مجسم ہیں جن میں نام کو بھی ثقل نہیں اور حضرت آدمؑ کی ذات اس کی طاقت (اس وقت) بھی رکھتی تھی، اور اسی نوع میں سے کھانے کی آپ کو اجازت دی گئی تھی۔ اور دوسری قسم وہ نعمتیں ہیں جو نوعیت اور کیفیت میں عالم دنیا کی نعمتوں کے مشابہ وہم شکل ہیں (اگرچہ لذت و مزہ میں بیحد فوقیت لئے ہوئے ہیں) اس نوع کی نعمتوں اور پھلوں میں ثقل و بوجھ ہے۔ اور یہی وہ قسم ہے جس کے کھانے (اور ہضم کرنے) کی حضرت آدمؑ میں طاقت نہ تھی۔ لہٰذا اس کے کھانے کی حق تعالیٰ نے ممانعت فرمادی تھی، تاکہ جنت سے ان کا اخراج نہ ہو جائے۔ اور جنت کی نعمتوں کے دو قسم ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کے علم قدیم میں یہ بات تھی کہ اہل جنت کی دو حالتیں ہوں گی۔ ایک حالت جو کہ غالب اور کثیر ہو گی وہ یہ ہو گی کہ (جنت میں جانے کے بعد) دنیا رفانی کا خطرہ وخیال بھی ان کے عقل و قلب پر خطور نہ کرے گا اور دنیا اور اس کے سارے معاملات اور اس کی تمامی لذتیں اور نعمتیں عقول و افہام سے غائب اور محو ہو جائیں گی۔ اس حالت میں تو حق تعالیٰ ان کی میزبانی فرمائے گا قسم اول نعماء جنت سے (جس میں نہ ثمار دنیا کی مشابہت ہے نہ ثقل ہے)، کہ اسی نوع سے کھائیں گے اور اسی نوع سے پئیں گے اور مزہ اڑائیں گے۔ اور دوسری حالت جو شاذ و نادر کبھی کبھی ہو گی وہ یہ ہو گی کہ دنیائے فانیہ کا ان کو خیال آئے گا اور جن حالتوں میں یہاں تھے وہ مستحضر ہوں گے۔ لہٰذا ان کی تمنا کریں گے اور فوراً ان کو حاضر وجود پائیں گے اور یہ (نعمتیں جو دنیا کی یاد پر ان کی حسب خواہش حاضر کی جائیں گی) وہ قسم دوم ہے (جن کو ثمار دنیا کا ہم شکل اور صاحب ثقل کہا گیا ہے)، پہلی حالت بہر صورت اکمل ہے۔ بلحاظ نکر بھی کہ اہل جنت گویا

اپنے رب کے ساتھ ہیں اور دوسری شے کی نہ ان کو خبر ہے نہ اس کا تفکر و تخیل ؛ اور بجہت نعمت بھی اکمل ہے کہ اصل نعمتیں جو اہل جنت کے لئے تجویز ہوئی ہیں اور جن کو جنتیوں کی حالت مقتضی ہے (کہ لاثانی و بے ثقل اور خالص نور ہوں) وہ یہی ہیں، اور اکمل ہے دوام کے اعتبار سے بھی کہ اہل جنت کی حالت غالبہ اور اکثر یہی ہوگی۔ اور دوسری حالت بہر صورت ادنیٰ ہے ان باتوں میں بلحاظ تفکر اس لئے کہ (اس حالت تذکر دنیا میں) گویا وہ غیر حاضر اور غائب ہیں مشاہدہ الٰہیہ سے اور باخبر ہیں اپنے نفوس سے کہ نفس سے باخبری ہی تو امور دنیا کے فکر و خیال کی طرف لائی حتے کہ دنیا کی لذتوں اور نعمتوں کی تمنا و خواہش کرنے لگے۔ (اور مقتضاء جنت و بے نظیری کے لحاظ سے ادنیٰ ہونا تو ظاہر ہی ہے کہ کہاں جنت کے مزے اور کہاں دنیا کی لذت اور اسی طرح بلحاظ دوام ادنیٰ ہونا بھی واضح ہے کہ یہ حالت کبھی کبھی اور گاہے ماہے ہوگی) مگر چونکہ حق تعالیٰ کو علم تھا کہ جنتیوں کو کبھی کسی وقت دنیا کی طرف بھی التفات ضرور ہوگا۔ لہذا جنت میں طبیعت جنت کے موافق بھی نعمتیں پیدا فرمائیں جن میں جن میں مطلق ثقل نہیں اور اس التفات کی خاطر طبیعت جنت کے خلاف وہ نعمتیں بھی پیدا فرمائیں جن میں ثقل بھی ہے اور اہل دنیا کی نعمتوں کے ساتھ مشابہت بھی ہے (تاکہ جنت جو ہر قسم کی خواہش پوری ہونے کا مقام ہے ادنیٰ خواہشوں کے پورا کرنے سے بھی عاجز نہ رہے)۔ لیکن اہل جنت کی ذوات و طبائع چونکہ جنت میں مجسم انوار اور قوی ترین ہوں گی اس لئے ان صاحب ثقل نعمتوں میں بھی ان کو ثقل محسوس نہ ہوگا۔ (جیسے قوی الہضم کو بھٹے اور پھوٹ کے کھانے سے بھی کوئی گرانی محسوس نہیں ہوتی) اور حضرت آدم علیہ السلام کی ذات جب جنت میں گئی تھی تو چونکہ ان ذوات اہل جنت کی بہ نسبت ضعیف تھی اس لئے ان صاحب ثقل نعمتوں میں ان کو ثقل محسوس ہوا (جیسے بیماری سے اٹھے ہوئے کمزور شخص کے لئے روٹی ذرا سخت ہو تو وہ بھی ثقیل معلوم ہوتی ہے اور پیٹ میں درد کر دیتی بلکہ اسہال جاری کر دیتی ہے) الحاصل قسم دوم کا ثقل بھی صرف ضعیف و کمزور پر ظاہر ہوگا اور اس وقت بجز آدم علیہ السلام کے اور کوئی ذات ضعیف و کمزور موجود نہ تھی (لہذا اسہال کا سبب ہوئی اور اسہال سبب اخراج بنا)

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کی عقل کا تعلق خالص اپنے رب کے ساتھ تھا کہ اپنے مصالح نفس سے بالکل غافل و بے خبر تھے۔ مگر پھل کھا کر صورت حال پلٹ گئی اور عقل کا تعلق اپنی ذات کے مفاد اور نفس کے مصالح کے ساتھ ہو گیا۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ درخت کا پھل کھانے سے قبل ان کا جنت میں کھانا پینا محض تنعم و تفکہ کے درجہ میں تھا۔ کہ نہ بھوک لگتی تھی نہ پیاس۔ اور اس لئے بھوک کے انتظام اور معاش کی تدبیر سے مستغنی و بے فکر تھے اور

عقل کا تعلق محض رب کے ساتھ تھا۔ (کہ وہ حق تعالیٰ کی سطوت وجلالت شان کے سوچنے سمجھنے اور اس کے سامنے خشوع وخضوع اور عجز ونیاز ہی کی صورتوں میں غور وفکر کیا کرتی تھی) مگر جب اس درخت کا پھل کھا کر اسہال جاری ہوئے اور اس کے بعد بھوک لگی تو عقل کی توجہ ذات کی طرف مبذول ہوئی، اور خیال ہوا کہ جب پیٹ خالی ہو گیا تو اب اس کو کس چیز سے بھرنا چاہئے۔ چنانچہ تدبیر معاش کا فکر ہونے لگا اور جو عقل بسوئے حق متوجہ تھی اب انتظام معیشت اور بقاء ذات کی تدابیر میں لگ گئی) اور اسی لئے حق تعالیٰ نے ان کو عالم تعب ومشقت میں اتار دیا کہ فکر معاش میں عقل صرف کرنیکے لئے دنیا کو پیدا کیا گیا ہی نہ کہ جنت کو) اور چونکہ حق تعالیٰ کو علم تھا کہ ایسی صورت ضرور پیش آئے گی اور حضرت آدم کو دنیا میں یقیناً آنا ہو گا اس لئے جنت سے اتار نے کے قبل ہی (دنیا میں) ان کے لئے معاش کے اسباب اور گذران کے وسائل مہیا فرمادئے تھے۔

اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب مٹی اور گارہ سے حضرت آدم کی صورت مکمل ہو گئی۔ اور ہم بیان کر چکے ہیں کہ مٹی (جو میل بھر کے وسیع غار میں جمع کی گئی تھی) بہت زیادہ مقدار میں تھی اس لئے اسی مٹی سے حق تعالیٰ نے وہ حیوانات پیدا فرمائے جن کی احتیاج دربارۂ معاش حضرت آدمؑ کو پیش آنے والی تھی۔ چنانچہ اِن کی اصل خلقت بھی مذکورہ مٹی سے ہوئی۔ کہ جب آدم علیہ السلام کو آسمان کی طرف اُٹھالیا گیا تو تمامی حیوانات کیڑوں کی صورت میں اس مٹی کے اندر نمودار ہوئے اور حق تعالیٰ نے ہر نوع کے دس دس جانور یعنی پانچ نر اور پانچ مادیں پیدا فرمادئے۔ مثلاً شیر، چیتا، تیندوا وغیرہ پانچوں درندے ایک نوع ہوئی (اور گائے بکری اونٹ وغیرہ وغیرہ ہر ایک کی پانچ پانچ قسمیں علیحدہ علیحدہ ایک ایک نوع قرار پائیں) اس کے بعد حق تعالیٰ نے اتنی زور کی بارش برسائی کہ اس جیسی کبھی کسی کے سننے میں بھی نہیں آئی۔ اور ہر طرف سے سیلاب رواں ہو گئے اور ان کے ساتھ مٹی اور کیچڑ بے تعداد بہ بہ کر اس غار کی مٹی میں آملی۔ اس سے ان حیوانات کو (جو چھوٹے چھوٹے کیڑوں کی صورت میں نمودار ہوئے تھے) بیحد مدد اور قوت پہونچی۔ جیسے سمال کا موسم آجائے اور خوب پیداوار ہو اور کھیتیاں لہلہا جائیں (تو انسان کو وسعت معاش اور خوشحالی کی قوت پہونچا کرتی ہے) جب نو مہینہ کے بعد حضرت آدم (جنت سے) اتر کر زمین پر آئے تو حیوانات کو زمین پر چلتے ہوئے پایا اور دیکھا کہ تھوڑا تھوڑا بڑھ رہے ہیں۔ لہٰذا ان سے مانوس ہونے لگے اور حق تعالیٰ نے ان کو اس کا علم بخشا کہ یہی (حیوانات) قیامت تک کے لئے تمہاری اور تمہارے اولاد کی معاش کا ذریعہ تجویز کئے گئے ہیں۔

نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ (غار میں) جس مقام پر حضرت آدمؑ کا سر تھا وہاں حق تعالیٰ نے کھجور، انگور، انجیر، اور زیتون کے درخت پیدا فرمائے۔ چنانچہ جب نو مہینہ کے بعد حضرت آدم جنت سے اتر کر زمین پر آئے

اور (اسہال کی وجہ سے) پیٹ خالی ہوگیا (اور بھوک لگ کر) کھانے کی خواہش اور غذا کی طلب ہوئی تو حق تعالیٰ نے ان درختوں کے پھلوں میں ذائقہ ڈالا اور پہلا رزق جو منجملہ اسباب معاش کے حق تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو عطا فرمایا وہ یہی پھل تھے۔ کہ اس قلیل مدت میں باذن الٰہی یہ درخت پھل لے آئے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ حدیث جو مشہور ہے اَکْرِمُوْا عَمَّتَکُمُ النَّخْلَۃَ فَاِنَّھَا خُلِقَتْ مِنْ طِیْنِ اٰدَمَ احترام کرو اپنی پھوپھی درخت کھجور کا کہ وہ تمہارے باپ آدم کی مٹی سے پیدا کی گئی ہے، صحیح ہے یا نہیں فرمایا (مضمون اگرچہ صحیح ہے جیسا کہ مذکور ہوا مگر) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا کلام نہیں ہے (لہٰذا حدیث کو موضوع کہا جائے گا۔ چنانچہ علامہ ابن حجر علامہ زرکشی اور علامہ سیوطی وغیرہ ہم حفاظ حدیث نے بھی اس کو موضوع لکھا ہے۔ پھر میں نے دریافت کیا کہ ان چار درختوں کے سوا کیا اور درخت بھی (اس مٹی سے) حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے؟

فرمایا ہر وہ درخت جس کا نام قرآن مجید میں مذکور ہے مثلاً نخیل (کھجور) اعناب (انگور) تین (انجیر) رمان (انار) اور زیتون۔ غرض جن پھلوں کا بھی نام قرآن میں آیا ہے وہ سب حق تعالیٰ نے اسی مٹی سے پیدا فرمائے ہیں (اور اسی لئے ان پھلوں کو مزاج انسانی کے ساتھ موافقت زیادہ ہے۔ کہ ذائقہ اور لذت کے لحاظ سے بھی عام طبائع کو مرغوب ہیں اور قوت و فرحت کے اعتبار سے بھی عام مزاجوں کو ہر عمر اور ہر حالت میں مُفید اور مقوی بدن و مفرح قلب ہیں)

نیز آپ نے فرمایا کہ اللہ جل جلالہٗ کی تمامی مخلوقات میں بلحاظ آفرینش بنی آدم سے بہتر و خوبصورت کوئی مخلوق نہیں ہے۔ ان کی ذوات واجسام ساری مخلوقات میں افضل وارفع اور اقوم ہیں کہ ذی عقل شخص جب ذات آدمی کی ہئیت ترکیبیہ اس کے اجزاء بدن، اس کے جوڑوں اور رگوں کی ترتیب اور اُنکی ظاہری و باطنی خوبیوں میں غور کرے جن پر اس کی ساخت مشتمل ہے تو حیران ہو جائے اور اس کے صانع و خالق کی عظمت معلوم کر کے بے اختیار کہہ اٹھے۔ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ میں نے پوچھا کہ ذات ملائکہ پر بنو آدم کو کس امر میں فضیلت ہے؟

فرمایا جتنی چیزیں (مختلف و متعدد) ذات بنی آدم میں پیدا فرمائی گئی ہیں وہ ذات ملائکہ میں پیدا نہیں کی گئیں، اور جتنی چیزیں ذات ملائکہ میں پیدا کی گئی ہیں وہ سب مع شئی زائد ذات بنی آدم میں پیدا کردی گئی ہیں۔ چنانچہ فرشتہ کی (جسمانی) ترکیب نور سے ہوئی ہے اور اس نور میں عقل رکھی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ذات ملک میں اور کچھ نہیں ہے۔ مگر ذات آدمی میں نور بھی ہے اور عقل بھی ہے اور ان کے علاوہ) روح بھی ہے، رنگ برنگ کی مٹی بھی ہے، آگ بھی ہے، ہوا بھی ہے پانی بھی ہے

اور ان میں ہر چیز کے اندر اسرار قدرت الہیہ مضمر ہیں۔ لہذا ایک ذات میں ان سب چیزوں کا جمع ہو جانا ان اسرار کو اس ذات میں قوی کر دے گا (اور اس کو جامع الاسرار بنا کر افضل ترین مخلوقات بنا دیگا) الحاصل ذات آدمی مجموعہ ہے متعدد مخلوقات کا۔ اور دوسری کوئی ذات اس جیسی (مجموعہ مخلوقات) نہیں ہے۔ لہذا آدمی کی ذات تمامی ذوات میں قوی تر ہوئی۔ اور اسی لئے (ربوبیت وقدرت الٰہیہ کے) جتنے اسرار کو یہ اٹھا سکتی ہے فرشتہ کی ذات بھی نہیں اٹھا سکتی۔ اور یہی وجہ ہے کہ سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی صورت وشکل عطا فرمائی گئی کہ آپ کی ذات مبارکہ اسرار ربانی برداشت کرنے میں تمامی مخلوقات سے قوی ترین تھی۔ پس اگر کوئی دوسری ذات، ذاتِ آدمی سے زیادہ قوی ہوتی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کی صورت وشکل عطا کی جاتی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ باوجود ذاتِ آدمی کے احسن الذوات اور افضل ترین ہونے کے علم الٰہی میں طے ہو چکا تھا کہ ان کا ایک فریق جنت میں جائے گا۔ اور ایک فریق بصیرتوں پر پردے پڑے ہونے کی وجہ سے دوزخ میں جائے گا۔ اس لئے اولاً حق تعالیٰ نے اس ذات میں روح ڈالی، اور عقل ڈالی جو کہ حقیقت ہے روح کی، اور معرفت الٰہیہ ڈالی۔ اور نور ایمان ڈالا مشاہدہ کے ساتھ اور اپنے اور اس کے درمیان کا پردہ اٹھا لیا کہ اس کو اپنے خالق جل وعلا شانہ کی معرفت بطریق اکمل حاصل ہو گئی (اور اس وقت اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کا سوال فرما کر سب سے اقرار ربوبیت لیا) اور جب وعید کی تنفید کا ارادہ فرمایا تو ذاتِ آدمی پر پردہ ڈال دیا کہ مشاہدہ جو کہ اس کو حاصل ہوا تھا زائل ہو گیا اور بے تعلقی وانقطاع لاحق ہو گیا۔ اور کاش جس وقت (ذاتِ حق سے) یہ بے تعلقی واقع ہوئی تھی وہ کسی دوسری شے سے تعلق قائم نہ کرتا۔ کہ یہ اس کے لئے اس حالت سے بدرجہا بہتر ہوتا جس میں وہ پڑ گیا اور امید تھی کہ قطع شدہ تعلق پھر واپس آجاتا۔ مگر اس نے تو یہ غضب کیا کہ اللہ سے توڑ کر عقل کے نور کا تار جو اس میں باقی تھا اس کو دیکھ کر (اس پر ریجھا اور) اس سے تعلق جوڑ لیا اور ہر شے میں اسی کو اپنا تکیہ گاہ ومعتمد قرار دیا۔ لہٰذا اللہ سے بے تعلقی میں اضافہ ہو گیا۔ کیونکہ اس نے عقل کو اس نگاہ سے دیکھا کہ وہ میری ہے، اور مجھ ہی سے پیدا ہوئی ہے، اور (ہر طرح بھروسہ کے قابل ہے) اور ہر بات میں اسی کی طرف رجوع کرنے لگا۔ پس اپنے نفس کے ساتھ استقلال اور اللہ سے اس کا انقطاع بڑھ گیا۔ اور اگر عقل کی طرف اس کی نگاہ بایں لحاظ جاتی کہ وہ اللہ کی طرف سے آئی ہے، اور وہی ہر لحظہ اس کا محرک ہے، تو یہی اللہ کی طرف رجوع بن جاتا اور وہ مشاہدہ جو زائل ہو گیا تھا پھر حاصل ہو جاتا۔ الغرض نتیجہ یہ ہوا کہ قدیم سے تعلق قطع کیا اور حادث کے ساتھ علاقہ قائم

کیا۔ اور اگر کسی شے سے تعلق نہ رکھتا تب بھی اس کے لئے خیریت تھی۔ نیز آپ نے فرمایا جب آدمی نے ذاتی تدابیر اور امر معاش اور معاشرت مع الخلق میں عقل کے ساتھ تعلق وابستہ کیا تو چونکہ اللہ کو علم تھا کہ (اس کی بدولت) وہ سیدھے راستہ سے ضرور منحرف ہو جائے گا۔ لہذا اس کی طرف پیغمبر بھیجے تاکہ اس کو معرفت الٰہیہ کے راستہ کی طرف واپس لائیں۔ پس ازل میں جو قرار پا چکا تھا اس کا ظہور ہوا کہ ایک گروہ نے پیغمبروں کا کہنا مانا اور ایک گروہ نے ان کو جھٹلایا۔ پہلے گروہ کے کہنا مان لینے میں اتباع عقل سے کچھ علیحدگی ہوئی اور دوسرے گروہ کے جھٹلانے میں عقل کے ساتھ غایت درجہ کا تعلق اور اس کا کمال اتباع ثابت ہوا۔ میں نے عرض کیا کہ وہ پردہ کیا تھا جو ڈالا گیا اور اس سے مشاہدہ زائل ہو گیا۔ آیا وہ خون تھا جو (رگوں میں جاری اور) غفلت کا سبب ہے، یا کچھ اور؟

فرمایا دوسری ہی چیز تھی۔ یعنی ظلمات جہنم کی ظلمت کہ وہ ذات کو پہنا دے گی اور اس نے حق تعالیٰ اور اس کی معرفت سے آدمی کو چھپا لیا۔ میں نے کہا کہ اس میں اور خون میں کیا نسبت ہے؟

فرمایا نسبت تو کچھ بھی نہیں ہے بجز اس کے کہ خون حق تعالیٰ سے بعد میں اضافہ کر دیتا ہے اور اس لئے حجاب میں زیادتی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کا صغیر سن بیٹا ہو جو اس کو بیحد عزیز اور محبت و پیار میں آنکھوں کا تارہ بنا ہوا ہو۔ اس کے چیچک نکل آوے اور اس کے منہ اور تمام جسم کو گھیر لے تو باپ کو (باوجودیکہ گھناونا بن گیا ہے مگر اس سے نفرت نہ ہو گی) بلکہ ترس آئے گا، دل دکھے گا اور بچے کی تکلیف بیحد شاق گذرے گی۔ وہ بچہ سے بھاگنے کا نہیں بلکہ اس کی محبت اتنی غالب آئے گی کہ اس مرض کو برا بھی نہ سمجھے گا اور بچہ کو چومے گا گود میں لے گا، اور اس کو سونگھے گا۔ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ محض اس اتصال و تعلق کی وجہ سے جو اس کے اور بچہ کے درمیان قائم ہے۔ ورنہ اگر یہ بچہ کسی دوسرے کا اور اس سے اجنبی و بعید العلاقہ ہوتا اور کسی شے میں بھی اس کے اور بچہ کے درمیان مناسبت نہ ہوتی تو اس سے بے انتہا نفرت کھاتا، گھنیاتا، ناک بھول چڑھاتا، دور بھاگتا اور حد درجہ اس سے بچتا، اور پرہیز کرتا۔ بس یہ مثال ہے خون کی مومن میں اور کافر میں (کہ خون بمنزلہ چیچک کے اللہ سے بعید کرنے والی شے ضرور ہے۔ مگر مومن میں نور ایمان و معرفت اور تعلق مع اللہ موجود ہے اس لئے بجائے نفرت و علیحدگی کے حق تعالیٰ کی مومن پر شفقت و محبت ہوتی ہے اور اس لئے رحمت پر رحمت برستی ہے۔ اور کافر چونکہ اجنبی بن چکا اور اللہ سے ہر قسم کا تعلق قطع کر چکا ہے اور عقل کا بندہ بن کر مناسبت ہی کھو چکا ہے اس لئے اس کا خون جو سبب غفلت ہے نفرت کاملہ کا سبب بنتا اور حق تعالیٰ اس کو دور پھینک دیتا ہے) پھر اس گروہ کے متعلق

جس نے پیغمبروں کا کہنا مانا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ اس کی بھی دو قسمیں ہو گئیں۔ کہ ایک فریق نے ان کا کہنا مانا، مگر ایمان بالغیب میں ٹھیر گئے اور مشاہدہ (کی نہ طلب کی اور نہ وہ) ان کو حاصل ہوا۔ یہ تو عامہ مومنین کہلاتے ہیں۔ اور دوسرے فریق نے کہنا مانا اور آگے مشاہدہ تک ترقی کی پھر بعض تو ان میں ہر دم اہل مشاہدہ بنے رہے، اور بعض کی حالت ابتدائی مشاہدہ پر رُک گئی جن کا مشاہدہ استمراری ہوا وہ دائما ترقی و اضافہ پاتے رہے۔ اور جن کا مشاہدہ رک گیا وہ دائماً تنزل اور کمی میں آتے رہے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو فقیر کسی دولتمند سے بھیک مانگنے کے لئے گھر سے نکلے۔ دونوں نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور ہر ایک نے اس سے ایک ایک درہم کا سوال کیا (چنانچہ اس نے دونوں کا سوال پورا کیا اور ایک ایک درہم ان کو دیدیا)۔ پس ایک تو درہم لے کر بے نیاز بن گیا (اور اس کو کافی سمجھ کر چلدیا اور دوسرے نے (اکتفا نہ کیا بلکہ اس پر) اضافہ چاہا۔ چنانچہ دولتمند نے ایک موزونہ اور دیدیا۔ پھر وہ زائد کا طالب ہوا تو اس نے دس موزونہ دیدیئے۔ پھر وہ اور زیادتی کا خواہاں ہوا تو اُس نے ایک دینار طلائی دیدیا۔ اب فرض کر و کہ وہ دولتمند بڑا سخی ہے اور اس کے پاس خزانہ بھی اتنا ہے کہ (دادو دہش سے) نہ ان میں کمی آتی ہے نہ وہ ختم ہوتے ہیں۔ نیز فرض کرو کہ یہ سائل سوال سے تھکتا ہی نہیں اور ہمیشہ و ہر وقت اضافہ کا طالب رہتا ہے تو ظاہر ہے کہ عطا کسی حد پر رکنے کی نہیں (اور ہمیشہ جاری اور بڑھتی رہے گی) پس یہی حال ان اولیاء اللہ کا ہے جن کا مشاہدہ استمراری ہے۔ کہ وہ ہر لحظہ ابدالاباد تک ترقی میں رہتے (اور اللہ کے خزانہ لطف و کرم سے انوار و تجلیات اور مشاہدات و باطنی کیفیات میں ترقی کے سائل و طالب بنے رہتے، اور مولیٰ کریم کے دربارِ گہربار کی بھرپور عطاؤں سے روز افزوں مالا مال ہوتے رہتے ہیں) حتیٰ کے جس وقت ان کو موت آتی ہے تو اس کا بھی ان کو احساس نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ ان کی عقول ان کی ارواح ان کی ذوات اور ان کے نفوس سب غیر اللہ سے منقطع اور بے تعلق ہوتے ہیں۔ اور موت بھی چونکہ اللہ کی غیر ہے اس لئے اس کا بھی ان کو حس اور شعور نہیں ہوتا۔ (یہ کلام اسی کے قریب قریب ہے جو پہلے مذکور ہو چکا ہے کہ جو فانی ذات ذات باقی میں فنا ہو جاتی ہے۔ اس کو یہ عُرفی موت نہیں آتی اور یہ کہ موت کی دوا یہی ہے کہ باقی میں فنا و محو ہو جاتا ہے) واللہ اعلم

نواں باب

فتح ظلمانی و فتح نورانی کا فرق اور مجنوں و مجذوب کی شناخت

فتح یعنی مشاہدہ کی بہتیری باتیں متفرق طور پر اس کتاب کے مختلف ابواب میں بیان کی جا چکی ہیں خصوصاً آیۃ شریفہ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ کے تحت میں امور باطلہ و فانیہ و ظلمانیہ کا مشاہدہ، اور امور ثابتہ و باقیہ و نورانیہ کا مشاہدہ تفصیل کے ساتھ مذکور ہو چکا ہے۔ اس کو دوبارہ غور سے دیکھ لو۔ نیز جو شخص بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت کا دعویٰ کرے اس مسئلہ کے ضمن میں بھی درباب پنجم سوال دوم یہ بحث آ چکی ہے۔ اور حدیث شریف اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ اُنْزِلَ عَلٰی سَبْعَۃِ اَحْرُفٍ کی نفیس و طویل بحث میں بھی فتح اہل کمال کا تذکرہ کیا جا چکا ہے اس لئے اس کا اعادہ بے سود اور تکرار محض سمجھ کر یہاں صرف وہ جدید باتیں بیان کرنی مقصود ہیں جن کو اس باب سے تعلق ہے۔

میں نے ایک مرتبہ حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ سقراط و بقراط اور افلاطون و جالینوس وغیرہ حکماء دنیا اور فلاسفہ کفر و ضلال نے عالم علوی کے متعلق جتنا کچھ بیان کیا ہے مثلاً نجوم اور ستاروں کی گردش، اور جدا جدا ان کے افلاک، تجویز کرنے کے متعلق کہ قمر فلک اوّل میں اور عطارد فلک دوم میں اور زہرہ فلک سوم میں اور شمس فلک چہارم میں اور مریخ فلک پنجم میں اور مشتری فلک ششم میں اور زحل فلک ہفتم میں۔ پھر ان کے قِران باہمی پر حکم لگاتے ہیں اکہ فلاں ستارہ جس وقت فلاں ستارہ سے ملتا ہے تو یہ اثر ہوتا ہے۔ مثلاً ارزانی غلہ ہوتی ہے یا قحط واقع ہوتا ہے وغیرہ وغیرہ کہ علم نجوم اسی کا نام ہے اور اس کے جاننے والے کو منجم اور جوتشی کہا جاتا ہے) یا مثلاً امور تعدیل فلک، یہ علم ان کو کہاں سے حاصل ہوا، حالانکہ خالص غیب ہے (کہ افلاک تک ان کی رسائی نہیں ہوئی) اور نہ ان باتوں کا ادراک بذریعہ حواس خمسہ ہو سکتا ہے اور نہ عقلی دلائل سے ان کا ثبوت محقق بن سکتا ہے۔ پھر وہ اس کو منسوب کرتے ہیں وحی کی طرف کہ کسی نبی کو حق تعالیٰ نے بذریعہ وحی اس پر مطلع فرمایا تھا۔ (یہ بھی محتاج نقل ہے کہ وحی کے ذریعہ معلوم ہو کس نبی پر اترا تھا اور کس زمانہ میں) اور بعض روایات میں سیدنا ادریس علیہ السلام کی طرف اس کا انتساب اوّل تو (مجمل ہے) اس تفصیل کیلئے (جو منجمین و

فلاسفہ مذکورین نے بیان کی ہے) کافی نہیں۔ علاوہ ازیں سیدنا ادریس علیہ السلام کا زمانہ بہت بعید ہو چکا اور اس کو مدت مدید گذر چکی (ثبوت کے لئے روایت متواترہ ہونی چاہئے) اور تواتر (اس طویل مدت میں) یقیناً معدوم اور منتفی ہے۔ (اور یوں کسی ایک دو کا کہدینا کہ حضرت ادریس سے چلا ہے خبر واحد کہلاتی ہے اور) خبر واحد اس بارہ میں کافی اور مفید نہیں۔ اس لئے کہ خبر دہندہ اگر کوئی فلسفی ہے تو ظاہر ہے کہ (وہ دہریہ منکر خدا اور رسول اور) اہل کفر ہے اور خبر واحد بجز ثقہ راوی کے (جس کی پہلی شرط اسلام ہے) کسی کی بھی مقبول نہیں۔ اور اگر مخبر فلسفی نہیں کوئی اور ہے تو وہ (مجہول الحال و نامعلوم الایمان ہے) پتہ نہیں کہ مسلمان تھا یا غیر مسلم۔ اس کے ایمان اور کفر کی تحقیق نہیں (بہر حال دریافت طلب یہ امر ہے کہ علم کہاں سے چلا اور اس کی سند کیا ہے۔ خصوصاً جبکہ اکثر مطابق واقعہ بھی پڑ جاتا ہے تو اہل کفر و ضلال کو غیبی حقائق ربانیہ کا علم کیسے حاصل ہوا؟)

فرمایا کہ حق تعالیٰ نے دو چیزیں پیدا فرمائی ہیں۔ نور اور ظلمت۔ اور ہر ایک کے لئے اہل پیدا فرمائے کہ نور کے لئے اہل حق اور ظلمت کے لئے اہل باطل۔ پس اہل حق کو مشاہدہ کرایا جاتا ہے نورانی امور اور ان کے تمامی متعلقات کا۔ اور اہل باطل کو مشاہدہ کرایا جاتا ہے۔ ظلمانی امور کا کہ جس شے کو بھی تعلق ہے ظلمت سے وہ ان کی نظروں کے سامنے آتی اور اس کی معرفت ان کو حاصل ہوتی ہے۔ نور اور حق کیا شے ہے؟ وہ تو اللہ پر ایمان لانا یعنی اس کے وجود کا یقین اور اس کی ربوبیت کا اذعان اور اس امر کی تصدیق ہے کہ وہ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے برگزیدہ بنا لیتا ہے (کسی کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ فلاں کو شریف خاندان یا اندھا یا مخبوط الحواس یا سیاہ فام یا نادار کیوں پیدا کیا، اور فلاں کو وضیع یا بینا یا عاقل یا حسین یا رئیس کیوں پیدا کیا۔ یا یہ کہ فلاں کو مومن یا ولی یا نبی کیوں بنایا، اور فلاں کو کافر یا فاسق یا عاصی کیوں بنایا) نیز ایمان لانا انبیاء و رسل پر اور اللہ کے فرشتوں پر اور تمامی ان چیزوں پر جن کو اللہ جل جلالہ کی رضا و خوشنودی سے تعلق ہے۔ اور ظلمت و باطل کیا چیز ہے؟ وہ کفر و شرک اور ہر وہ چیز ہے جو اللہ سے تعلق قطع کرنے والی ہے۔ اور منجملہ ان کے خود دنیا اور فانی امور اور دنیوی حوادث و واقعات ہیں۔ (کہ یہ سب اپنی طرف رجھاتے اور اللہ سے تعلق کو تڑا کر اپنا گرویدہ بناتے ہیں) اور دنیا کے مجسم ظلمت ہونے کی دلیل یہی کافی ہے کہ سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں اَلدُّنْيَا مَلْعُوْنَةٌ وَّمَلْعُوْنٌ مَا فِيْهَا اِلَّا ذِكْرُ اللّٰهِ وَمَا وَالَاهُ۔ دنیا ملعون (اور رحمت حق سے دور) ہے، اور جو کچھ دنیا میں (ساز و سامان) ہے سب ملعون ہے۔ بجز اللہ کی یاد اور اس کے متعلقات کے (کہ باوجودیکہ ان کا وقوع بھی دنیا میں ہوتا

ہے مگر وہ اللہ کی رحمت سے قریب ہے، اور نور وحق ہے۔ باقی سب فانی اور ظلمت و باطل ہے)
غرض حق ایک نور ہے انوار الٰہیہ میں سے اور وہ اہل حق کی ذوات کو پلایا جاتا ہے، جس سے انکے انوار معارف وحقائق کی شعاعیں پھیل جاتی ہیں۔ اور باطل ایک ظلمت وتاریکی ہے جو اہل باطل ذوات کو پلائی جاتی ہے، جس سے ان کی عقلیں سیاہ پڑجاتی ہیں، اور آنکھیں حق کے دیکھنے سے اندھی ہوجاتی ہیں، اور کان حق بات کے سننے سے بہرے بن جاتے ہیں۔ بلکہ حق ان کی عقلوں میں پڑتا ہی نہیں اور نہ ان کے دل پر اس کا خطرہ گذرتا ہے۔ حق ان کے نزدیک ایسا ہے جیسے پردہ عدم میں چھپی ہوئی چیز جس سے کبھی کان بھی آشنا نہ ہوئے ہوں۔ یعنی وہ حق سے ایسے غافل وناآشنا ہوتے ہیں جیسے صاحبان عقل معدوم شے سے غافل وناآشنا ہوا کرتے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ اہل باطل (کفار ومشرکین) کو اس عالم دنیا میں اس کے آسمان اور زمین ہی کا مشاہدہ ہوا کرتا ہے اور ان میں جو امور فانیہ ہیں مثلاً اجرام حادثہ اور ان کی صورت وہیئت بس وہی نظر آتے ہیں (ان کے اندر جو انوار الٰہیہ اور اسرار ربانیہ ہیں وہ مطلق نظر نہیں آتے) چنانچہ انہیں پر وہ حکم لگاتے ہیں۔ مثلاً ستاروں پر کہ فلاں ستارہ کا مقام فلاں آسمان ہے اور فلاں ستارہ سے جب فلاں ستارہ آملے گا تو ایسا ہوگا (مثلاً بارش برسے گی یا قحط پڑے گا یا جنگ عظیم ہوگی یا امن وامان ہوگا) یا مثلاً ملکی مختلف زبانوں کو بروج پر بانٹ دیا ہے کہ عربی زبان منسوب ہے بُرج عقرب کی طرف اور فارسی زبان منسوب ہے مریخ کی طرف وغیرہ وغیرہ۔ باقی رہی دنیا کی نورانی چیزیں مثلاً قبر مطہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی، اور وہ نور جو قبر مطہر سے دراز ہو کر آپ کے مقام برزخی یعنی) قبہ برزخ تک جا پہونچا ہے۔ یا مثلاً اولیاء عارفین کی ذوات مبارکہ یا ارواح مومنین جو صحن ہائے قبور میں ہیں یا مثلاً ملائکہ محافظین، کرام کاتبین، اور وہ فرشتے جو نمبر دار آتے جاتے رہتے ہیں (مثلاً نماز فجر میں آتے اور دن بھر کے اعمالِ مخلوق لکھ کر مغرب کے وقت چلے جاتے ہیں، اور ان کی جگہ دوسری جماعت نماز مغرب میں آجاتی اور رات بھر کے اعمال خلق لکھ کر صبح ہوتے چلی جاتی ہے) اور ان کے علاوہ وہ اسرار وتجلیات جو وصول الی اللہ کا سبب وذریعہ ہیں اور ان کو حق تعالیٰ نے دنیا میں رکھ دیا ہے (باوجودیکہ یہ سب چیزیں دنیا ہی میں ہیں مگر چونکہ حق اور نور ہیں اس لئے) ان کو بالکل نظر نہیں آتیں، نہ انکی معرفت کا ان کو مشاہدہ ہوتا ہے، اور نہ یہ چیزیں کبھی ان کی عقل میں آتی ہیں۔ اس کا سبب یہی ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ظلمتوں سے سیراب کیا ہے اور حق کی معرفت وشناخت سے بے تعلق بنا دیا ہے۔ حتیٰ کہ اس اہل باطل کو اگر لوح محفوظ بھی نظر آوے جس میں قرآن مجید مکتوب ہے جو کہ نور اور شفا ہے قلبی امراض کیلئے تو اسکی

کھوئی بصیرت کو لوح کا صرف جرم ہی جرم دکھائی دے گا اس میں لکھے ہوئے تمامی کلام اللہ کا ایک حرف بھی دکھائی نہ دے گا۔ اسی طرح اہل ظلمت کو حق تعالیٰ کے اُن اسرار و حکم میں سے جو اس نے آسمانوں میں رکھی ہیں نہ کوئی سرّ الٰہی نظر آئے گا، اور نہ بے شمار ملائکہ میں کسی فرشتہ کا مشاہدہ ہوگا، نہ ان کی تسبیح سنائی دے گی، نہ جنت نظر آئے گی، نہ لوح، نہ قلم، نہ وہ انوار حروف جو قلم سے نکلتے ہیں۔ علیٰ ہذا نہ وہ حق سبحانہ کو پہچان سکیں گے جو کہ ان کا خالق ہے، اور نہ اس کی صفات جلال و جمال سے آگاہی پا سکیں گے۔ ف سورج گرہن کی وقت یہ معلوم کرنے کے لئے کہ کتنی مقدار گہہ چکا ہے ایک سفید شیشہ کو آگ کے دھوئیں سے سیاہ بنا لیتے ہیں اور اسی کو آنکھ پر رکھ کر سورج کی طرف دیکھتے ہیں تو ٹکیہ صاف نظر آتی ہے اور اس کا نور بالکل نظر نہیں آتا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ بے نور کا گول جرم ہے۔ بس یہی صورت ہے اہل ظلمت کے کشف کی کہ اجرام محضہ نظر آتے ہیں اور ان کے انوار قطعاً نظر نہیں آتے۔ اطبا کی نظر تمامی اعضاء بدن پر گئی مگر روح کو نہ سمجھ سکے۔ بجز اس کے کہ خون یا حرارت عزیزیہ کو کہ وہ بھی جرم یا عرض ہے روح قرار دیا۔ کفار و مشرکین نے پیغمبروں کو عامہ بشر کی طرح سمجھا اور نور وحی و تجلیات نبوت کو ادراک نہ کر سکے۔

غرض ان کو اللہ نے اپنی ذات اور ہر اُس شے سے جو موصل الی اللہ ہے محجوب بنا دیا ہے اور اس کے علاوہ دوسری چیزیں ان پر منکشف فرما دی ہیں جو اللہ سے بے تعلق بنا کر ان کے لئے مُضر بن رہی ہیں اور نفع خاک بھی نہیں پہونچا رہیں۔ پس فلاسفہ ملعونین کی دی ہوئی ساری خبریں اسی قبیل سے ہیں اور اس بارہ میں جو بھی انہوں نے حکم لگائے ہیں وہ سب غلط اور نادرست ہیں۔ کہ (حوادث عالم کو) ستاروں کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ حالانکہ ان کا فاعل اللہ سبحانہ و تعالیٰ ہے جو کہ ستاروں کا بھی خالق ہے۔ اور اسی لئے حدیث قدسی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اور اپنے رب کریم سے روایت کی ہے کہ صبح ہوتی ہے تو میرے بعض بندے مجھ پر ایمان لائے ہوئے اُٹھتے ہیں، اور میرے بعض بندے میرا کفر و انکار کرتے ہوئے اٹھتے ہیں۔ (جس کی شرح یہ ہے کہ) جو کہتے ہیں ہم پر بارش برسی اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے تو وہ مجھ پر ایمان لائے اور ستاروں کے منکر ہوئے، اور جنہوں نے کہا کہ ہم پر بارش برسی فلاں ستارہ کے فلاں بُرج میں جانے کے سبب وہ میرے منکر ہوئے اور ستاروں پر ایمان لائے۔ پس فلاسفہ کو (خدا کی ان پر پھٹکار) حق تعالیٰ نے اپنی معرفت سے محجوب فرما دیا اور ان کی عقول کو ستاروں کے ساتھ وابستہ و متعلق بنا دیا تاکہ ان ہی میں پھنسے رہیں اور ان پر اس وعید کا نفاذ کیا جائے جو ان کے لئے مقدر ہو چکی ہے

علاوہ ازیں وہ ربط و تعلق جس کا یہ لوگ احکام نجوم میں ذکر کرتے ہیں (کہ فلاں ستارہ کے فلاں برج میں جانے کو مثلاً تعلق ہے بارش ہونے سے) سو اگرچہ یہ بھی فعل الٰہی ہے (کہ ستارہ کے اس برج میں جانے اور بارش ہونے میں باہم ارتباط اور وقتی اتحاد پیدا فرما دیا ہے) تاہم اس ربط کی تعیین میں بھی کبھی کوئی بات ٹھیک ہو جاتی ہے ورنہ اکثر باتیں خطا اور غلط ہوتی ہیں (چنانچہ صدہا پیشین گوئیاں منجمین کی رات دن غلط اور خلاف واقعہ ظاہر ہوتی رہتی ہیں) برخلاف اہل حق کے کہ ان کو امر اول کا بھی مشاہدہ ہوتا ہے اور امر ثانی کا بھی۔ اول الامر کا مشاہدہ تو انہیں تمام چیزوں کا مشاہدہ ہے جن کا ذکر ہوا کہ اہل ظلمت کو اس عالم دنیا میں ہوا کرتا ہے۔ مثلاً آسمان کا اور زمین کا۔ چنانچہ عارف ولی مشاہدہ کرتا ہے ساتوں زمین کا اور جتنی چیزیں بھی ان میں ہیں ان سب کا، اور مشاہدہ کرتا ہے ساتوں آسمان کا اور جتنی بھی چیزیں ان میں ہیں ان سب کا' اور مشاہدہ کرتا ہے بندوں کے افعال کا جو وہ اپنے گھروں کے اندر کرتے ہیں۔ اور ان آنکھوں سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ اپنی چشم بصیرت سے دیکھتا ہے جس کو نہ کوئی پردہ روک سکتا ہے نہ دیوار۔ اسی طرح وہ مشاہدہ کرتا ہے امور مستقبلہ و آیندہ کا کہ مثلاً فلاں دن یہ ہوگا اور فلاں مہینہ میں یہ واقعہ ہوگا اور فلاں سنہ میں یہ ہوگا۔ اس مشاہدہ میں تو یہ حضرات اور اہل ظلمت بالکل برابر ہوتے ہیں اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ کشف، ولایت کا ضعیف ترین درجہ ہے یعنی اس لئے کہ اہل حق کے پاس بھی پایا جاتا ہے اور اہل باطل (جوگیوں، سادھوؤں، مشرکوں، کافروں) کے پاس بھی پایا جاتا ہے۔ اور نیز اس لئے کہ صاحب کشف ولی کی حالت قابل اطمینان نہیں جب تک اس مقام کو طے کر کے آگے نہ بڑھ جائے ہر وقت خطرہ ہے کہ کہیں اللہ سبحانہ سے قطع تعلق ہو کر اہل ظلمت میں نہ جا ملے۔ اور ثانی الامر کا مشاہدہ یہ ہے کہ اس کو حق تعالیٰ کے اسرار نظر آتے ہیں جن سے اہل ظلمت کو محروم و محجوب بنا دیا گیا ہے۔ چنانچہ وہ مشاہدہ کرتے ہیں اللہ کی معرفت والے اولیاء کا' اور باوجود بُعد مسافت کے ان سے اس طرح باتیں کرتے ہیں جیسے جلیس اپنے ہم جلیس سے باتیں کیا کرتا ہے اسی طرح وہ مشاہدہ کرتے ہیں قبور کے اوپر ارواح مومنین کا، کرام کاتبین کا، ملائکہ کا' عالم برزخ کا اور ان مردوں کی روحوں کا جو برزخ میں مقیم ہیں۔ نیز وہ مشاہدہ کرتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کا۔ اور اس نورانی ستون کا جو مزار مبارک سے ممتد ہو کر قبہ برزخ تک پہونچا ہے (مگر ان مشاہدوں میں بھی خطرہ رہتا ہے کہ کہیں دل بستگی نہ ہو جائے) پھر جب بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ کا مشاہدہ نصیب ہوتا ہے تو شیطان کے

تلاعب سے امن واطمینان مل جاتا ہے۔ کیونکہ رحمت الہیہ کے ساتھ اجتماع حاصل ہو گیا یعنی سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ (کہ بمقتضاء وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ مجسم رحمت الٰہیہ آپ ہی کا وجود باوجود ہے) پھر ولی کا ذات شریفہ کے ساتھ اجتماع سبب بنتا ہے اللہ سبحانہ کی معرفت اور ذات ازلیہ الہیہ کے مشاہدہ کا۔ کیونکہ ذات محمدی کا مشاہدہ الہیہ میں محو و مستغرق پاتا ہے۔ لہذا بہ برکت ذات محمدی ولی کا تعلق اللہ سبحانہ سے ہر لحظہ بڑھتا رہتا ہے اور وہ شیئاً فشیئاً معرفت الٰہیہ میں ترقی پاتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس کو بھی مشاہدہ ربانیہ اور اسرار معرفت وانوار محبت نصیب ہو جاتے ہیں۔ اور یہی مشاہدہ ثانیہ حد فاصل ہے اہل حق اور اہل باطل کے درمیان۔ ورنہ مشاہدہ اُولیٰ تو جیسا ان کو ہوتا ہے ایسا ہی اہل ظلمت کو بھی ہوتا ہے کہ امور فانیہ ان پر منکشف بھی ہو جاتے ہیں اور اُن میں تصرفات کرنے پر بھی وہ قدرت رکھتے ہیں۔ چنانچہ اہل باطل کو دیکھو گے کہ دریا پر چل رہا ہے (خشک زمین کی طرح) اور ہوا میں اڑ رہا ہے (پرند کی طرح) اور غیب سے اس کے پاس کھانا آرہا ہے۔ حالانکہ وہ کھلا کافر اور اللہ کا منکر ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے نور کو پیدا کیا، اور نور سے فرشتوں کو پیدا فرمایا، اور ان کو اہل نور کا ناصر و معین بنایا کہ مقتضائے ایمان کے موافق اور راہِ راست پر قائم رکھنے اور خرق عادت (کرامات صادر کرانے میں) ان کی مدد و اعانت کرتے ہیں۔ اسی طرح ظلمت کو پیدا کیا، اور ظلمت سے شیاطین کو پیدا فرمایا، اور ان کو اہل باطل کا ناصر و معین بنایا کہ استدراج اور اضافہ خسران اور خرق عادت امور کی قدرت میں ان کی مدد و اعانت کرتے رہیں۔ اور اسی اصول پر حضرت ابراہیم خواص اور یہودی کا قصہ متفرع ہوگا کہ ایک کشتی میں دونوں کا اتفاقیہ ساتھ ہو گیا اور باہمی تعارف ہو کر معاشرت میں باہم رفاقت ہو گئی۔

یہودی نے حضرت شیخ سے کہا کہ اگر تمہارا دین سچا ہے تو سطح دریا پر چلو اور لو میں تو چلتا ہوں۔ یہ کہکر وہ اٹھا اور پانی میں چلنے لگا۔

حضرت ابراہیم خواص نے (دل میں کہا) اگر یہ یہودی مجھ سے بڑھ گیا تو (دین اسلام کے لئے) بڑی ذلت کی بات ہے۔ یہ کہہ کر آپ نے اپنے آپ کو دریا میں ڈالدیا۔ حق تعالیٰ نے مدد فرمائی اور آپ بھی پانی پر اسی طرح (بے تکلف) چلنے لگے۔ جیسا یہودی چل رہا تھا۔ جب کنارہ پر پہونچکر دونوں دریا سے باہر نکلے تو یہودی نے کہا میں سفر میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔

حضرت ابراہیم نے فرمایا میری طرف سے اجازت ہے۔

یہودی نے کہا مگر شرط یہ ہے کہ نہ تو ہم مسجد میں جاویں کہ وہ مجھے پسند نہیں اور نہ آپ گرجا میں جاویں کہ یہ تمہیں پسند نہیں اور شہر کے اندر بھی نہ جائیں کہ لوگ کہیں گے مسلمان اور یہودی ساتھ ساتھ ہیں۔ بس جنگلوں اور بیابانوں میں پھرتے رہیں اور کھانا پینا کچھ ساتھ نہ لیں۔

آپ نے فرمایا اچھا منظور ہے۔ چنانچہ تین دن کامل بنوں میں پھرتے رہے اور دونوں کو کوئی چیز چکھنے کو بھی نہ ملی (تین دن کے بھوکے پیاسے) ایک جگہ بیٹھے ہوئے تھے کہ ایک کتا آیا جس کے منہ میں تین روٹیاں تھیں۔ یہودی کے پاس پہونچکر اس نے تینوں روٹیاں اس کے سامنے ڈالدیں اور چلا گیا۔

ابراہیم خواص فرماتے ہیں کہ اُس نے میری صلاح بھی نہ کی اور (باوجود مرافقت کے) اتنا بھی نہ کہا کہ آؤ کھالو۔ اس نے تینوں روٹیاں کھالیں اور میں بھوکا (صبر کئے) بیٹھا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میرے پاس ایک نوجوان آیا نہایت خوبصورت حسین جس کے بدن سے خوشبو مہک رہی تھی اور اس کے ہاتھ میں کھانا تھا بے نظیر کہ اس جیسا کبھی دیکھنے میں بھی نہیں آیا۔ اس نے وہ کھانا میرے سامنے رکھ دیا اور چلا گیا۔ میں نے یہودی سے کہا کہ آؤ کھالو۔ مگر اس نے انکار کیا اور اس لئے میں نے (تنہا شکم سیر ہو کر) کھالیا۔ اس کے بعد یہودی کہنے لگا کہ ابراہیم مذہب تو ہمارا اور تمہارا دونوں کا حق ہے، اور موصل الی اللہ ہے' اور دونوں پر ثمرہ مرتب ہوتا ہے (کہ دونوں پانی پر چلے اور دونوں کو غیب سے روزی ملی) مگر اتنا فرق ہے کہ تمہارا مذہب صاف ستھر الطیف چمکدار اور خوبصورت زیادہ ہے۔ پس تمہاری رائے ہو تو میں بھی تمہارے مذہب میں داخل ہو جاؤں۔ چنانچہ مسلمان ہو گیا اور ہمارے دوستوں میں سچا صوفی بنا۔

یہ قصہ ابونعیم نے حلیہ میں نقل کیا ہے۔ میں نے اس کے متعلق حضرت ممدوح سے دریافت کیا تو فرمایا ان خانہ خراب تہی دستوں کے ساتھ شیاطین کھیل کیا کرتے اور خرق عادت امور ان سے صادر کرایا کرتے ہیں۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ اپنے مذہب کے موافق عبادت کرنے کا بھی کچھ ثمرہ ہے (حالانکہ عبادت کا یہ ثمرہ ہی نہیں اس کا ثمرہ تو حبِ الٰہی عظمت رسول معرفت حقائق اور انوار و تجلیات حقہ ہیں جو مسلمان ہوئے بغیر نصیب نہیں ہو سکتے)

نیز حضرت ممدوح نے فرمایا کہ فلسفی علوم اور عالم علوی کے متعلق حکم لگانے کی اصل یہ ہے کہ سیدنا ابراہیم علیہ وعلی نبینا السلام کے زمانہ میں ایک شخص تھا جو آپ پر ایمان لے آیا تھا اور آپ کو جو مشاہدے ملکوت سمٰوات وارض کے ہوا کرتے اور ان کے متعلق جو باتیں آپ ذکر فرمایا کرتے ان کو وہ سنا کرتا تھا۔ ایک مدت اسی حالت پر گذری۔ حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے اس کو بھی مشاہدہ نصیب فرمادیا مگر جس عالم کا اس کو مشاہدہ ہوا اسی پر وہ رُک گیا (کہ اس کو کمال اور اپنے کو کامل سمجھ کر نازاں ہو گیا)

اور اللہ سبحانہ سے تعلق قطع کر بیٹھا کہ اس کی طلب و تمنا ہی دل سے نکل گئی، خسر الدنیا والآخرہ کا مصداق بن گیا (کہ نہ ادھر رہا نہ اُدھر کا رہا) عالم علوی کا مشاہدہ کرتا اور اس پر اترایا کرتا، ستاروں کے مقامات بیان کیا کرتا، اور احکام کا ان کے ساتھ ربط دیا کرتا (کہ فلاں ستارہ کے فلاں بُرج میں جانے کا حکم یہ ہے کہ خوب مینہ برسے وغیرہ وغیرہ) دین ابراہیمی سے بھی پھر گیا اور مرتد بن گیا۔ بد دین اور حرمان نصیب لوگوں نے اس علم کو اس سے حاصل کرنا شروع کر دیا اور ہوتے ہوتے یہ فن ملعون اہل فلاسفہ تک پہونچ گیا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ وہ شخص شدید غضب الٰہی میں مبتلا ہوا کیونکہ اس نے غیر اللہ کا راستہ دکھایا اور جو غیر اللہ کا راستہ دکھایا کرتا ہے وہ اللہ سے قطع تعلق والی جماعت میں شامل ہو جاتا ہے

نیز آپ نے فرمایا کہ نبوت و رسالت کا فائدہ ہی صرف رہبری ہے اللہ کی طرف (اور غیر اللہ سے تعلق قطع کرا کے) سمیٹ لانا ہے اللہ کے حضور۔ فرض کرو کسی کو نبوت و رسالت دی جائے اور وہ بفرض محال غیر اللہ کا راستہ دکھلانے یا لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اللہ سے قطع تعلق کرانے لگے تو اس کا حکم بھی اسی شخص کا سا ہو گا۔ حالاں کہ نبی سے ایسا ہونا قطعاً ناممکن اور محال ہے مگر اس امر محال کو فرض کے درجہ میں محض غیر اللہ کی رہبری سے نفرت دلانے کے لئے ہم نے مبالغہ کے طور پر ذکر کیا ہے۔

ف جیسے حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ اِنَّكَ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ اے محمدؐ اگر (بفرض محال) تم نے علم آئے پیچھے کافروں کے خواہشات کا اتباع کیا تو تم بھی ظالمین سے ہو جاؤ گے، کہ یہ طریق کفار کے اتباع سے نفرت دلانے کے لئے علی سبیل المبالغہ ذکر کیا گیا ہے، ورنہ پیغمبر سے خصوصاً سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم سے محال ہے کہ کفار کے کسی خیال کا بھی اتباع کریں۔ کاش دنیا طلب پیروں کے مریدین اور مدعی نبوت شخص کے معتقدین کو یہ سمجھ کر اللہ جل جلالہ کی عدالت عالیہ میں پیشی کا وقت بہت قریب آلگا ہے اپنے پیشواؤں کو بنظر غور و انصاف اس کسوٹی پر کس لینا چاہئے کہ انہوں نے اللہ کا راستہ دکھانے کی کوشش کی اور اہل غفلت محبین دنیا کو زاہد و عاشقان خدا بنایا اور بنا رہے ہیں، یا اپنی خدمت، اپنی عقیدت، اپنی محبت اور اپنے جاہ و مال کی بیشی، اور چند دن کا سبق پڑھایا ہے اور عشاق دنیا بنا رہے ہیں) اس تقریر کے وقت ہم باب الحدید کے پل پر عبور کر رہے تھے کہ حضرت ممدوح نے فرمایا بتاؤ یہ پل کیوں بنایا گیا ہے اور اس کا نفع کیا ہے؟

میں نے عرض کیا اس کا نفع یہ ہے کہ لوگ اس پر چلیں اور قعر دریا کے خطرات سے محفوظ رہیں اور بامن و امان منزل مقصود تک پہونچ جاویں۔ فرمایا اگر یہ نفع اس سے اٹھا لیا جائے تو یہ لوگوں کیلئے

ضرر خالص اور بیکار محض بن جائے گا یا نہیں؟

میں نے کہا ہاں بے شک (پھر تو فضول جگہ گھیرنا اور وقت کا ضائع کرنا ہے)

فرمایا بس یہی حال انبیائے مرسلین اور ملائکہ مقربین اور عباد صالحین اولیاء عارفین کا ہے (کہ وہ بحر غفلت میں ڈوبنے سے بچانے کے لئے بمنزلہ پل کے ہیں) تاکہ اللہ سبحانہ تک پہونچنے کی رہبری فرمائیں اور چار طرف سے مخلوق کو سمیٹ کر آستانہ خدا پر لا ڈالیں۔ اگر یہ فائدہ اُن سے جاتا رہا (اور ان کے ذریعہ زہد عن الدنیا اور توجہ الی اللہ حاصل نہ ہوئی) تو ظاہر ہے کہ وہ بیکار و عبث پل کے مثل (محض بوجھ اور بار) بن گئے۔ واللہ اعلم

نیز فرمایا کہ کاملین اہل حق سے اگر واقعات آیندہ کے متعلق کوئی بات پوچھی جاتی ہے تو بجز اسکے کہ مختصر سی کوئی بات کہدیں زبان سے کچھ بھی نہیں نکالتے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا مشاہدہ انہوں نے شروع زمانہ میں کیا تھا اور اس کے بعد ان کو حق تعالی کا مشاہدہ نصیب ہوگیا اور (مشاہدہ حوادث مخلوقہ کا) باطل ہونا معلوم ہوگیا۔ لہذا وہ خود پیشین گوئی کو بھی بُرا سمجھتے ہیں اور اس کے زبان سے نکالنے کو بھی برا سمجھتے ہیں۔

نیز حوادث و واقعات (چونکہ امور فانیہ اور دنیا میں داخل ہیں) اس لئے عند اللہ مبغوض ہیں اور جو چیزیں عند اللہ مبغوض ہوتی ہیں وہ اولیاء اللہ کے نزدیک بھی مبغوض ہوتی ہیں (اس لئے اس میں پڑنا ان کو ناگوار گذرتا ہے)۔

نیز حوادث مستقبلہ کی خبر دینا اس کے بغیر نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے درجہ سے ایسا نیچے اتریں جیسے ثریا (آسمان سے) (زمین) کی طرف اترے۔ کیونکہ ان حوادث کا درجہ اہل ظلمت کے کشف کا درجہ ہے (جو گویا تحت الثری ہے۔ اور تنزل ظاہر ہے کہ عالی مرتبہ کو پسند نہیں)

نیز اہل اللہ کو جو مشاہدہ ہوتا ہے وہ بذریعہ انوار الہیہ کے ہوتا ہے۔ اور نور الہی میں زمانہ اور اس کی ترتیب مرتفع ہو جاتی ہے کہ نہ ماضی رہتا ہے نہ حال نہ مستقبل اس لئے ولی کو اکثر نور حق سے بس اتنا معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ واقعہ ضرور ہوگا۔ باقی یہ بات کہ فلاں دن اور فلاں وقت ہوگا، جب تک نیچے اس مقام پر نہ اترے جہاں زمانہ اور اس کی ترتیب کا اعتبار ہے، اس کو مطلق معلوم نہیں ہوتا اور یہ ان کے نزدیک بمقابلہ نور حق کے ایک ظلمت ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب اپنے آسمان سے (جہاں وہ قید زمان و مکاں سے مستغنی و بالا ہے) نیچے اتر کر اپنی آنکھوں پر عینک لگالے اور اس کے ذریعہ (اپنی ماتحت و زیریں دنیا کی چیزوں کو) دیکھنا شروع کردے۔ میں نے کہا کہ

حق تعالیٰ شانہ کو تو واقعاتِ آیندہ کا بھی علم ہے، اور ان کے زمانہ اور ترتیب کا بھی علم ہے، اور یہ تفصیل بھی معلوم ہے کہ یہ واقعہ ماضی کا ہے، اور یہ حال کا ہے، اور یہ مستقبل کا ہے۔ جب ولی ہر چیز کو بہ نورِ الٰہی دیکھتا ہے تو اس کو بھی درجہ ظلمت کی جانب اترے بغیر واقعاتِ عالم ترتیب زمانی کے ساتھ بہ تفصیل معلوم ہو جانے چاہئیں۔ فرمایا حق تعالیٰ کو یہ (ترتیب و تفصیل) اس لئے معلوم ہے کہ اس کا علم ہر شے کو محیط اور قوی ہے۔ برخلاف بندہ کے کہ وہ ضعیف ہے اور اس کا علم قاصر ہے۔ لہٰذا بندہ کو رب متعال پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ دیکھو سیدنا خضر علیہ السلام نے (ایک چڑیا کو سمندر پر پانی پیتے دیکھ کر) سیدنا موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ میرے سارے علم اور تمہارے سارے علم (کے مجموعہ نے) اللہ کے علم میں اتنی بھی کمی نہیں کی جتنی اس چڑیا کی چونچ نے سمندر کے پانی میں کمی کر دی ہے (جب پیغمبر کے تمامی علوم تشریعی اور سید الاغواث کے تمامی علوم تکوینی کے مجموعہ کو علم الٰہی سے اتنی بھی نسبت نہیں جتنی چونچ بھر پانی کو بحرِ ناپیداکنار کے پانی سے نسبت ہے۔ تو پھر بندہ کے علم کو حق تعالیٰ کے علم پر کیسے قیاس کر سکتے ہیں)

نیز آپ نے فرمایا کہ کبھی ولی اپنے درجہ سے نیچے اتر کر کسی واقعہ آیندہ کی خبر دے بھی دیا کرتا ہے اور یہ کوئی معصیت نہیں، مگر کوتاہ ہمتی اور درجہ عظمیٰ سے انحطاط ضرور ہے۔ اور اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس قسم کی خبروں کا صادر ہونا مطلوب ہو تو (بارگاہ محمدی کا) سوءِ ادب بھی ہے۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حالت نہ تھی (کہ پیشین گوئیوں کو پسند فرماویں اور مشاہدہ خالق کو چھوڑ کر مشاہدہ مخلوق کی طرف آ دیں) علاوہ ازیں اکثر اولیاء کاملین کی پیشین گوئیاں (نفس کی خواہش سے نہیں ہوئیں بلکہ) بہ حکم تقدیر صادر ہوئی ہیں کہ (حق تعالیٰ نے اُن واقعات آیندہ کا اظہار چونکہ ان کی تقدیر میں لکھ دیا تھا اس لئے) ان کو اپنے ارادہ ازلیہ کا آلہ کار بنایا کہ یہ حضرات مظاہر حق ہوتے ہیں (اور حق تعالیٰ جو کام بھی ان سے لینا چاہتا ہے وہ خواہش کے موافق ہو یا نہ ہو۔ بہر حال اس کے ظہور کے لئے اپنا سر تسلیم خم کر لیتے ہیں) اب جامع کتاب کہتے ہیں کہ مخلوق کو اولیاء اللہ کی شناخت اور ان کی صحبت اختیار کرنے میں زیادہ تر مضرت اسی مبحث سے پہونچی ہے۔ شناخت کے متعلق اسکی بڑی مضرت تو یہ ہے کہ عام لوگ اہل حق کے کشف میں اور اہل ظلمت کے کشف میں فرق نہیں سمجھتے اور اس لئے ان کا خیال یہ ہوتا ہے جس کے بھی کشفی علوم عامہ مخلوق کے علوم سے بڑھ جائیں گے اور ایسے خارق عادت امور اس سے صادر ہوں جو عوام کی طاقت سے باہر ہیں، وہ کامل ہے اور اہل حق ہے اور اللہ کا ولی ہے۔ (بلکہ چودھویں صدی کے بعض مسلمانوں نے تو اسی کو معیارِ نبوت قرار دیکر

مرزا قادیانی کو نبی مان لیا۔ اور پیشین گوئیاں بھی صرف طاعون کی، یا کسی کے مرنے کی، یا کسی عورت کے اپنے نکاح میں آنے کی۔ اور ان میں بھی اکثر کے جھوٹا ثابت ہونے پر ایسی رکیک تاویلیں گھڑیں جن کو سنکر ہنسی آتی ہے) پس ایک فریق کا عقیدہ تو یہ ہو گیا کہ جسے کشف ہوتا ہو (چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو مگروہ) ولی ہے اور ولایت کا صرف یہی مقصود اور منتہا ہے۔ اور ایک جماعت اس کی معتقد ہو گئی کہ جس کو بھی ظاہری نماز روزہ پر پابندی و دوام حاصل ہو اگرچہ اس کا باطن اللہ سے خالی اور غیر اللہ سے وابستہ ہو وہ ولی ہے (حالانکہ ولایت نام ہے اللہ کی محبت و عشق اور اس لگن کا جو عبادات ظاہرہ میں پابندی کے ساتھ ساتھ اخلاص اور کشش پیدا کرے۔ مانا کوئی پھل بغیر چھلکے کے قائم اور محفوظ نہیں رہ سکتا لیکن اگر اس کے اندر رس اور مزہ نہ ہو تو خالی چھلکے کا نام کوئی آم رکھ بھی نہیں سکتا۔ صوفیہ کے کلام میں جہاں بھی زاہد خشک کی مذمت آئی ہے وہ اسی غفلت والی عبادت کی آئی ہے جو بتقاضاء عادت ہو، یا بہ نیت حصول جاہ و مال۔ کہ ایسی نماز روزہ گویا جسد بے روح ہے۔ ورنہ پابندی شریعت اور فرائض پر دوام و مواظبت بلکہ سنن و مستحبات تک کا اہتمام جتنا اہل حق عارفین سے ثابت ہے دوسرا کوئی کر بھی نہیں سکا) اور شیخ کی صحبت میں رہ کر کشوف سے جو مضرت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے مقصود کو برعکس کر دیا۔ شیخ بنانے سے مقصود تو یہ تھا کہ وہ اس کو رب سے آشنا کرے اور اللہ سے قطع تعلق کرنے والی مرغوبات سے بچائے اور ڈرائے جن میں بڑا درجہ حب دنیا اور اس کا دل بھانے والی آرائشوں کا ہے۔ پس جب مرید شب و روز اس سے قضاء حاجات (کی دعاؤں اور حصول دنیا کے اوراد و وظائف) ہی مانگنے میں لگ گیا۔ نہ رب کے متعلق کوئی بات پوچھتا ہے اور نہ طریق معرفت دریافت کرتا ہے تو ولی کو اس سے نفرت ہو جائے گی اور پھر نزول آفت ہی سے محفوظ رہ جائے تو غنیمت ہے (چہ جائیکہ نفع اٹھانا) اور اس کی کئی وجہ ہیں۔

اول یہ کہ ولی کے ساتھ محبت توجہ اللہ نہ ہوئی (بلکہ خود غرضی کی اور اوپری ہوئی) اور اوپری محبت کھلا خسارہ ہے۔ کہ اس میں شیاطین اور وسوسوں کا ورود ہوا کرتا ہے اور حق کا نور اس پر کبھی نہیں اترا کرتا۔

دوم۔ ولی (دنیا طلبی میں) اس کو اللہ سے بے تعلق پا کر چاہتا ہے کہ اس سے باہر نکالے (اور یہ خود پیر سے بھی دنیا ہی کا طالب ہو کر) چاہتا ہے کہ اس کو بڑھائے اور اس میں ترقی کرے۔

سوم۔ اگر ولی سے (اس کی درخواست پر) کوئی کشف یا حاجت براری ظاہر ہوتی ہے تو یہ بیچارہ اس غلطی میں پڑ جاتا ہے اور سمجھتا ہے یہی ولایت کا کمال ہے اور ولی کا دامن پکڑنے سے یہی نفع اور

مقصود ہے۔ اور یہ سب اسباب ضلال و وبال ہیں۔

ایک مرتبہ حضرت نے فرمایا کہ ولی کی مثال ایسی ہے جیسے ظروف ساز کہ اس کا ہاتھ اور تمامی اعضا ہر وقت طرح طرح کے برتن بنانے میں مشغول ہوں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اس کے پاس ضروریات خلق یعنی طعام وغیرہ کے خزانے بھی موجود ہوں مگر اس کا قلب اس سے مانوس نہ ہو بلکہ وحشت و نفرت کھاتا ہو اور اس کے نزدیک ان کی کچھ بھی وقعت نہ ہو۔ صرف اپنی صناعی اور پیشہ سے دل بستگی رکھتا ہو کہ اس کے سوا کوئی بات بھاتی ہی نہ ہو۔ بلکہ دوسرا تذکرہ ناگوار گذرتا اور اتنا مبغوض ہو کہ اس کا تذکرہ کرنے والے کو مار بیٹھے تو عجب نہیں۔ اب دو شخص اس کے پاس آویں جن کو اس کی حالت کا علم حاصل ہو اور وہ خوب جانتے ہوں کہ فن ظروف سازی کے سوا دوسرے تذکرہ سے اس کو گرانی ہوتی ہے۔ اور مقصود ان کا اس کے خزانوں سے نفع اٹھانا ہو تو ہوشیار اور سمجھ دار شخص کا طریق کار تو یہ ہوگا کہ وہ آتے ہی اس کی صناعی کا ذکر چھیڑ دیگا اور پوچھے گا کہ برتن کیونکر بنائے جاتے ہیں، اور اس میں کس کس چیز کی ضرورت ہوتی ہے، اور وہ چیزیں کہاں اور کس طرح دستیاب ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ غرض جب آوے یہی اس کا کام ہو اور یہی اس کی عادت۔ نتیجہ ضرور یہ ہوگا کہ صناع کے قلب میں اس شخص کی محبت بیٹھ جائے گی اور یہ اس کا اس درجہ محبوب بن جائے گا کہ اس کے آنے اور پاس بیٹھنے سے بھی راحت پہونچے گی۔ اس کے بعد اگر اس کے خزانے میں سے کوئی چیز بھی وہ اس سے مانگ لے گا تو یقیناً وہ دے گا۔ بلکہ اگر اس کو اختیار بخش دے کہ جتنی ضرورت ہو لے لو تو عجب نہیں۔ اور جو نادان و بے وقوف ہوگا وہ اس کے پاس آتے ہی روپیہ پیسہ کا سوال کرنے لگے گا اور جو بات بھی کرے گا وہ خزانوں اور اُن سے منتفع و متمتع ہونے کے متعلق کرے گا۔ پس اگر وہ ضبط کر جائے اور کوئی مضرت نہ پہونچائے تو یہی بڑی بات ہے ورنہ عجب نہیں کہ کوئی برتن اٹھا کر اس کے سر پر دے مارے۔ اسی طرح ولی کا پیشہ صرف یہ ہے کہ اللہ کا راستہ دکھائے، اللہ کی سطوت شان سے واقف بنائے۔ اس تک پہونچنے کا جو طریق ہے اس سے آگاہ کرے۔ اس کو اگر پسند آتی ہے تو اسی کا تذکرہ اور اسی کے متعلق گفتگو پسند آتی ہے۔ وہی صحبت اور مجلس اس کو بھاتی ہے جس میں اس کی بات چیت ہو، اور وہی اس کا محبوب و مقرب بنتا ہے جس کو اسی تذکرہ سے رغبت اور اسی پیشہ و صناعی کی طلب و تمنا اور کرید و تلاش ہو۔ لہٰذا جو اس کو سمجھ لے گا وہ دین اور دنیا دونوں کا نفع اٹھائے گا اور مالا مال ہو جائے گا، اور جو اس سے ناواقف ہوگا (اور پیر کو اپنی کار براری اور قضاء حاجات دنیویہ کا آلہ کار بنائے گا) وہ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنے گا۔ (اور کف افسوس ملے گا کہ چشمۂ حیات پر پہونچ کر بھی پیاسا ہی واپس آیا)

میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ حوادث کو امور باطلہ میں کیسے قرار دیا گیا۔ ان کا تو تحقق اور وجود ہے اور وہ آنکھوں سے نظر آتے اور حواس کے ذریعہ ادراک کئے جاتے ہیں۔ اور باطل اس کو کہتے ہیں جو بے اصل ہو۔

حضرت نے سامنے کی دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرمایا۔ دیکھو یہ دیوار آنکھوں سے نظر آتی ہے اور فانی ہے کہ نیست اور معدوم ہو جائے گی۔ اور اس کا رب ہمیں نظر نہیں آتا جو اپنی قدرت سے اس کو تھامے ہوئے ہے، اور وہ ہمیشہ سے زندہ ہے، اور زندہ رہے گا، نہ اس کو فنا ہے نہ زوال ہے۔ ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ ہمارے قریب ہے، ہمارا پیدا کرنے والا ہے، جو چاہتا ہے ہمارے اندر تصرف فرماتا ہے، نفع اور ضرر اسی کے ہاتھ میں ہے۔ پس دیوار کا مشاہدہ جس سے نہ کوئی نفع ہے نہ نقصان، اور خالق سبحانہ و تعالیٰ کا عدم مشاہدہ، اگر مشاہدہ باطلہ نہیں تو کیا ہے۔ چونکہ بطلان ایک اضافی امر ہے اس لئے مراد یہ ہے کہ جو (دیوار) ہمیں نظر آرہی ہے بمقابلہ اس (خالق برتر) کے جو ہمیں نظر نہیں آرہا گویا عدم اور ہیچ ہے۔ چنانچہ ہم کہہ چکے ہیں کہ لوح محفوظ کا مشاہدہ بغیر اُن حروف کے جو اس میں لکھے ہوئے ہیں باطل مشاہدہ ہے (چونکہ اصل اور مقصود کے فوت ہو جانے پر فرع بے سود ولا حاصل ہے۔ اس کی مثالیں شریعت میں بہت ہیں۔ مثلاً نماز بغیر وضو کے باطل ہے، حالانکہ افعال نماز کا وجود ہوا۔ یا عبادت دکھاوے کی باطل ہے۔ حالانکہ صورت عبادت موجود ہے۔ مگر چونکہ اس کی روح یعنی اخلاص جو اصل الاصول تھا اس میں نہیں ہے اس لئے اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے) پس جس پر حق تعالیٰ لطف و کرم فرماتا ہے اس کو اپنی ذات عالیہ اور صفات کمالیہ اور افعال جلالیہ وجمالیہ کا مشاہدہ وکشف عطا فرماتا ہے (کہ وہ حیّ وقیوم اور واجب الوجود اور غیر فانی ہے، اور یہی مشاہدہ مشاہدہ حقہ ثابتہ وصحیحہ کہلاتا ہے) پس اس کا تعلق اپنے رب کے ساتھ ہو جاتا اور اس کو وہ حیات وسعادت نصیب ہوتی ہے جس کے بعد نہ فنا ہے نہ شقاوت۔ کیونکہ فانی جب باقی سے وابستہ ہو گیا تو اس کی بقار کے ساتھ اس کو بھی بقا مل گئی

نیز آپ نے فرمایا کہ کشف اول (یعنی حوادث اور ارض وسما کے مشاہدہ) میں اگرچہ اہل ظلمت اور اہل حق دونوں شریک ہیں۔ مگر مقصود میں دونوں کے اختلاف ہے۔ اہل ظلمت کو یہ کشف عطا فرمانے کا ان کو اپنے آستانہ سے دھکے دینا، اور اس کے راستہ سے باز رکھنا ہے کہ (کفر وتمرد کی وجہ سے) ان کے ساتھ اللہ کو بغض ہے۔ اس لئے ان سے تعلق قطع فرمالیا ہے، اور دوسروں کا تعلق ان کو دیدیا ہے، اور استدراج کے لئے ان خوارق عادت امور پر ان کو قوت بخش دی ہے۔ تاکہ وہ سمجھیں کہ ہم بھی کچھ ہیں (اور اس لئے اپنے الحاد وسرکشی پر اڑے اور جمے رہیں) برخلاف اہل حق کے کہ ان کو یہ کشوف اس

غرض کے لئے دیئے جاتے ہیں کہ (عطار منعم کے سبب) ان کو اللہ کی محبت بڑھے، اور درجہ بدرجہ اوپر چڑھتے اور ترقی کرتے رہیں۔ کیونکہ (یہ علامت ہے کہ اللہ نے ان کے لئے (اپنی ذات تک رسائی کا دروازہ کھولدیا، اور ان کے قلوب کو اپنا تعلق بخش دیا، اور اغیار سے بے تعلق بنالیا، اور یہ خوارق عادات اس لئے عطا فرمائے تاکہ ان کی بصیرت قوی ہو جائے (اور اس میں مشاہدہ حق کی طاقت آجائے) اور معرفت مستحکم ہو جائے (الحاصل ایک ہی شے دو شخصوں کو دی جاتی ہے مگر ایک کے لئے نعمت ہوتی ہے اور دوسرے کے لئے نقمت) چنانچہ ارشاد فرماتا ہے: فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَزَادَتْهُمْ اِیْمَانًا وَّهُمْ یَسْتَبْشِرُوْنَ ۔ وَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰی رِجْسِهِمْ وَمَاتُوْا وَهُمْ كٰفِرُوْنَ پس جو لوگ ایمان لائے ہیں آیات قرآنیہ نے ان کے ایمان کو بڑھادیا اور وہ مسرور ہو گئے اور جن کے دلوں میں (کفر و شرک کی ظلمت کا) مرض موجود تھا آیتوں نے ان کی گندگی پر اور گندگی بڑھادی اور وہ (تا زیست اسی خباثت میں جمے رہے حتی کہ) کفر ہی کی حالت میں مر گئے۔

نیز فرمایا حوادث کے مشاہدہ میں کبھی چھوٹا ولی زیادہ بڑھ جاتا ہے بڑے (درجہ کے) ولی سے۔ اور اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بڑے درجہ کا ولی اس سے اونچے اور زبردست مشاہدہ یعنی مشاہدہ حق سبحانہ تعالیٰ میں مشغول ہونے کے سبب اس (مشاہدہ حوادث) سے غائب و بے خبر ہوتا ہے۔ برخلاف چھوٹے ولی کے کہ اس کی توجہ ہی اس طرف ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کے مشاہدہ کا محل وہی ہے اور گو مشاہدہ حق بھی اس کو ہوتا ہے مگر بڑے ولی کا سا مشاہدہ نہیں ہوتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ بڑے درجہ کا ولی مشاہدۂ خالق میں قوی ہوتا ہے اور مشاہدۂ مخلوق میں کمزور۔ اور چھوٹے درجہ کا ولی اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یعنی مشاہدہ مخلوق قوی ہوتا ہے اور مشاہدۂ خالق میں کمزور۔ اور یہی حقیقت ہے سیدنا خضر اور سیدنا موسیٰ علیہما السلام کے قصہ کی جو قرآن میں مذکور ہے کہ کشتی کو عیب دار اور لڑکے کو قتل، اور دیوار کو سیدھا کرنے کی مصلحت و حکمت (حضرت خضر کو معلوم ہوئی حالانکہ چھوٹے درجہ میں تھے اور) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کو معلوم نہ ہوئی کیونکہ آپ اس سے قوی ترین یعنی مشاہدہ حق سبحانہ میں مشغول تھے۔ لہذا آپ کی ناواقفیت (آپ کے بڑے اور اونچے درجے میں ہونے کی دلیل اور) عین کمال تھی۔ اس کی مثال ایسی سمجھو کہ مثلاً بادشاہ کے دو غلام ہوں۔ ایک کو پادشاہ نے اپنی چھاتی سے لگا رکھا اور اپنے پاس رکھ چھوڑا ہو۔ اس کا شغل بجز اس کے کچھ نہ ہو کہ پادشاہ کے سامنے دست بستہ حاضر اور ہر وقت اس کا منہ تکتا اور اس کی زیارت کرتا رہتا ہے۔ جب پادشاہ باہر آتا ہے تو یہ بھی باہر آتا ہے، اور پادشاہ اندر جاتا ہے تو یہ بھی اندر جاتا ہے۔ وہ کچھ

کھاتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ کھاتا ہے، اور وہ کوئی چیز پیتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ پیتا ہے، اور وہ جب بات کرتا ہے تو یہ بھی اس کے ساتھ باتیں کرتا ہے۔ اور دوسرے غلام کو پادشاہ نے رعیت کا انتظام حوالہ کر رکھا ہو، اور وہ رعایا کے پاس جا جا کر پادشاہ کے احکام ان میں نافذ کرتا، اور جلسے منعقد کر کر کے رعایا سے ان کے معاملات اور بہبودی کی صورتوں میں مشورے لیتا اور بعض احکام سلطانی کے انجام دینے میں مدتوں پادشاہ سے دور اور نظروں سے غائب رہتا ہو۔ ظاہر بات ہے، کہ پہلا غلام بہ نسبت دوسرے غلام کے پادشاہ کا زیادہ مقرب اور ذات سلطانی کے اسرار سے زیادہ واقف ہوگا۔ بایں ہمہ رعایا کے حالات اور سیاسی امور اور انتظامی معاملات کے متعلق جب کوئی بات اس سے دریافت کی جائے گی تو دوسرے غلام کی سی آگاہی و واقفیت اس میں ہرگز نہ نکلے گی۔

بس یہی حال سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا تھا کہ ان کی مثال پہلے غلام کی سی ہے (جو ہر وقت سلطانی حاضر باش ہے) اور سیدنا خضر علیہ السلام کی مثال دوسرے غلام کی سی ہے (جس کے متعلق ملکی انتظام اور رعایا کی نگرانی واصلاح ہے) سیدنا موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ یقیناً بلا اختلاف حضرت خضر علیہ السلام سے بہت بڑا اور بلند تر ہے۔ کیونکہ وہ اللہ کے پیغمبر اور اس کے کلیم وصفی ہیں۔

میں نے کہا کیا حضرت خضر علیہ السلام نبی تھے جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے چنانچہ علامہ ابن حجر نے بخاری کی شرح میں لکھا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کی شان چاہتی ہے کہ آپ کی نبوت کا اعتقاد رکھا جائے تاکہ غیر نبی کا نبی سے اعلم ہونا ثابت نہ ہو (یعنی حضرت خضر کو نبی نہ مانا جائے تو لازم آتا ہے کہ منصب نبوت ملے بغیر ان کا علم نبی کے علم سے بڑھ گیا۔ اور کشتی وغیرہ کے قصوں میں جو مصالح مخفیہ حضرت موسیٰ پیغمبر کو معلوم نہ تھے وہ ان کو معلوم تھے)

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ خضر علیہ السلام نبی نہ تھے۔ صرف ولی تھے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنی معرفت عطا فرمائی، اور اپنی رعیت (یعنی مخلوق) میں تصرف کی طاقت بخشی تھی، اور معرفت کاملہ اور تصرف تام نصیب فرمایا تھا۔ جیسا کہ امت محمدیہ میں غوث اعظم کو دیا جاتا ہے۔ اور حضرت خضر نے یہ مرتبہ بلا شیخ کے اور بغیر سلوک کے پایا تھا کہ ابتداءً ہی حق تعالیٰ نے ان کو یہ قوت نصیب فرما دی تھی۔ بس حضرت خضر علیہ السلام کا یہی درجہ تھا اور یہ درجہ نہ منصب نبوت کو پہونچ سکتا ہے نہ مرتبہ رسالت کو اور کشتی وغیرہ کے قصہ میں حضرت خضر کا واقف اور حضرت موسیٰؑ کا ناواقف ہونا اس شبہ کا موجب نہیں ہو سکتا کہ غیر نبی کا علم بڑھ گیا نبی سے۔ کیونکہ اس کی وجہ وہی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ان امور سے غافل تھے اس لئے کہ مشاہدہ حق میں غرق تھے جس کا نہ کوئی بدل ہے نہ کوئی نظیر۔ لہذا حضرت

خضر کے متعلق نبوت کے اعتقاد کی مطلق حاجت نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ جو علماء ان کی نبوت کے قائل ہوئے ہیں ان کی دلیل وَمَا فَعَلْتُهُ عَنْ أَمْرِي ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام فرماتے ہیں اے موسیٰ میں نے یہ کام اپنے حکم سے نہیں کیا (بلکہ بحکم خدا کیا ہے اور حکم خدا نبی ہی کو ہو سکتا ہے) فرمایا ہر غوث اور قطب اہل تصرف کی یہی شان ہے کہ وہ کوئی کام اور حادث و فانی شے میں کوئی تصرف بھی حکم الٰہی کے بغیر نہیں کیا کرتا، اور یہ نبوت نہیں کہلاتی اور نہ یہ منصب رسالت ہے۔ مگر اکثر آدمی بے علم ہیں (کہ اہل تصرف صاحبان خدمت پر شبہ کر بیٹھتے ہیں) ف چہ جائیکہ کوئی صاحب خدمت اور عارف و متقی بھی نہ ہو اور محض پیشین گوئیوں پر مدعی نبوت ہو جائے اور نبوت بھی اس بڑے درجہ کی جس کے الفاظ نقل کرنے سے دل کانپتا ہے۔

ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے فرمایا ہر چیز کی (شناخت کے لئے) علامت ہوا کرتی ہے اور اس کی علامت کہ بندہ کو بحالت بیداری ذات محمدی کا مشاہدہ نصیب ہو گیا ہے، یہ ہے کہ ہمہ وقت اُس کا فکر و خیال آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی میں پڑا رہے اور کوئی دھندا اور کوئی مشغلہ بھی اس کو تخیل ذات محمدی سے نہ ہٹا سکے کھانا کھائے تب اس کا دھیان ذات محمدی میں پڑا ہو، اور پانی پیئے تب اس کا تخیل ذات محمدی میں پڑا ہو کسی سے نزاع یا تیز گفتگو ہو تب اس کا یہی حال ہو، اور سو رہا ہو تب وہ اسی رنگ میں ہو۔ غرض کوئی حالت اور کوئی وقت بھی اس سے خالی نہ رہے۔ مگر یہ نعمت بندہ کے کسب اور تدبیر سے حاصل نہیں ہوتی۔ اگر تدبیر و کسب سے حاصل ہوتی تو جب کوئی مشغلہ یا عارض پیش آتا تو اس اشتغال سے غفلت ہو جایا کرتی (کیونکہ اکتسابی شے عارض و مانع کے ہوتے ہوئے کبھی قائم نہیں رہ سکتی۔ بلکہ محض وہبی ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ بندہ کو اس (دھیان اور فکر ذات محمدی) پر آمادہ کرتا اور اس کا عامل بنا دیتا ہے، اور بندہ کو اپنے ارادہ اور اختیار کا اس میں دخل بھی نہیں محسوس ہوتا۔ حتیٰ کہ اگر اس کو مجبور کیا جائے کہ اس دھیان کو چھوڑ دے تو اس کو اس پر قدرت نہ ہو گی۔ (اگر اس کا حصول اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا تو اس کے دفع اور ازالہ پر بھی اس کو ضرور قدرت ہوتی) اور یہی وجہ ہے کہ دیگر مشاغل اور عوارض اس کے دھیان کو ہٹا نہیں سکتے الحاصل اس شخص کا باطن و اندرون آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوتا ہے، اور اس کا ظاہر و بیرون عام مخلوق کے ساتھ کہ ان سے باتیں کرتا ہے تب بلا ارادہ، اور کھاتا ہے تب بلا قصد، غرض جو کام بھی اس کے اعضاء سے صادر ہوتا نظر آتا ہے وہ سب اس کے قصد کے بغیر صادر ہوتا ہے۔ کیونکہ (قصد و ارادہ میں) اعتبار قلب کا ہے۔ اور قلب ان (افعال اور مخلوق) کے ساتھ نہیں (بلکہ ذات محمدی کے ساتھ ہے) جب بندہ کی اس حالت پر ایک مدت گذر لیتی ہے تب حق تعالیٰ اس کو بحالت بیداری اپنے نبی کریم اور رسول عظیم کا مشاہدہ نصیب فرماتا ہے۔ اور اس دھیان کی مدت مختلف ہوا کرتی ہے۔ کسی کے لئے ایک مہینہ ہے اور

کسی کے لئے اس سے کم اور کسی کے لئے اس سے زیادہ۔

نیز فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کی بڑی شان ہے۔ اگر حق تعالیٰ طاقت نہ بخشے تو بندہ اس کا کبھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ فرض کرو ایک شخص میں چالیس مَردوں کی یکجا قوت جمع ہو جاوے اور وہ چالیس بھی ایسے قوی اور دلیر ہوں کہ ہر ایک ان میں شیر کا کان پکڑ سکے۔ پھر فرض کرو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس شخص کے سامنے تشریف لے آویں تو یقیناً اس کا جگر پھٹ جائے گا، اور اس کی ذات (پانی کی طرح) پگھل جائے گی، اور فوراً اس کا دم نکل جائے گا۔ اس کا سبب محض آپ کی ہیبت اور سطوت عظیم ہے۔ مگر باوجود اس سطوت و رعب کے آپ کے مشاہدہ شریفہ میں وہ مزہ اور لذت ہے جس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ حتیٰ کہ جس کو یہ مشاہدہ نصیب ہوتا ہے اس کے نزدیک دخول جنت سے بھی بہتر و افضل ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جو کوئی بھی جنت میں جائے گا اس کو جنت کی تمام نعمتیں تو ملیں گی نہیں۔ بلکہ حسب رحمت الٰہیہ جس درجہ میں جائے گا، خاص اس کی نعمتیں اس کو دیجائیں گی (اور صرف انہیں کا اس کو مزہ آئے گا)، برخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ کے کہ جس کو حاصل ہو گا اس کی ذات تمامی نعمائے جنت سے سیراب کی جائے گی۔ لہٰذا ہر رنگ کی لذت اور ہر قسم کی حلاوت ایسی پائے گا جیسی جنت میں جاکر جنتی پائیں گے۔ اور جنت کی تخلیق ہی جس ذات کے نور سے ہوئی ہو اس کے (مشاہدہ) میں تو یہ لذت بھی کم ہے۔ پھر ہر دفعہ کے مشاہدہ میں چونکہ یہی سیرابی ہوا کرتی ہے لہٰذا جس کے لئے یہ مشاہدہ دائمی ہو گا اس کے لئے یہ لذت بھی دائمی اور ہر وقت کی ہو گی۔

نیز فرمایا اور اس کی علامت کہ بندہ کو اپنے پروردگار جل جلالہٗ کا مشاہدہ نصیب ہو گیا ہے، یہ ہے کہ مشاہدہ محمدیہ کے بعد اُس کا فکر و خیال اپنے رب جل شانہ میں ایسا پڑا رہے جیسا بحالت مشاہدہ محمدیہ ذات محمدی میں پڑا رہا تھا کہ کسی وقت بھی اس سے دھیان نہ ہٹے۔ پھر یہ حالت مسلسل قائم بھی رہے۔ یہاں تک کہ مشاہدۂ حق سبحانہ کا انکشاف ہو جائے۔ اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ میں اہل جنت کی نعمتوں کے تمامی انواع کی سیرابی نصیب ہوتی ہے تو خود ہی سوچو کہ حق تعالیٰ کے مشاہدہ میں کیا کچھ مزہ نصیب ہو گا۔ کہ وہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی خالق ہے، اور جنت کا بھی خالق ہے۔ بلکہ ہر شے اور ہر چیز کا وہی خالق ہے۔

نیز فرمایا پھر مشاہدۂ حق سبحانہٗ کا کشف حاصل ہونے کے بعد اہل مشاہدہ کی دو قسمیں ہو جاتی ہیں۔ ایک قسم وہ اولیاء ہیں کہ مشاہدۂ الٰہیہ میں (مستغرق ہو کر) تمامی ماسوی سے غائب و بے خبر ہو جاتے ہیں۔ اور دوسری قسم اور وہی اکمل و افضل بھی ہے وہ حضرات ہیں جن کی روح مشاہدہ حق میں رہتی ہے اور

ذات مشاہدۂ محمدی میں۔ نہ روحی مشاہدہ مغلوب کرتا ہے ذاتی مشاہدہ کو، اور نہ ذات کا مشاہدہ غالب آتا ہے روح کے مشاہدہ پر۔ اور یہ قسم اکمل اس لئے ہے کہ مشاہدہ حق تعالیٰ کے بارہ میں اکمل اور اعلیٰ ہوتا ہے بہ نسبت پہلی قسم کے مشاہدہ کے۔ اور اس کا سبب یہ ہے کہ ان کو مشاہدہ محمدیہ سے جو کہ مشاہدۂ الٰہیہ میں ترقیات کا ذریعہ ہے بے تعلقی نہیں ہوئی۔ پس جس کو مشاہدہ ذات محمدی زیادہ نصیب ہوگا اس کو مشاہدۂ حق سبحانہ بھی زیادہ نصیب ہوگا، اور جس کے مشاہدۂ محمدیہ میں کمی ہوگی اس کے مشاہدہ الٰہیہ میں بھی کمی ہوگی۔ اگر بندہ کو اختیار دیا جائے اور اس کی عمر مثلاً نوے (۹۰) برس کی تجویز ہو تو وہ اسی صورت کو اختیار کرے گا کہ یہ سارا زمانہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدہ میں گذر جائے اور مرنے سے صرف ایک دن قبل اللہ جل جلالہٗ کا مشاہدہ نصیب ہو۔ کیونکہ اس کو مشاہدۂ محمدیہ میں استحکام حاصل اور قدم راسخ ہو جانے کے سبب اس ایک دن میں مشاہدہ حق سبحانہٗ کا جو انکشاف ہوگا وہ اس سے بدرجہا زیادہ ہوگا جو اس شخص کو نصیب ہوگا جسے شروع ہی سے دونوں مشاہدے حاصل تھے اور نوے برس تک برابر حاصل رہے۔ اس کے بعد آپ نے (حقیقت سمجھانے کے لئے) اپنی آنکھوں پر عینک چڑھالی اور حروف کو دیکھنے لگے۔ پھر فرمایا بتاؤ حروف کا واضح اور صاف نظر آنا اس عینک کے شیشہ کی آب وتاب اور صفائی کے تابع ہے یا نہیں؟ ہم نے عرض کیا کہ ہاں بیشک (جتنا شیشہ آبدار زیادہ ہوگا اسی قدر حروف زیادہ صاف اور کھلے نظر آئیں گے) فرمایا بس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات شریفہ کا مشاہدہ گویا عینک کا شیشہ ہے اور حق تعالیٰ کا مشاہدہ بمنزلہ حروف کے ہے۔ کہ مشاہدۂ نبویہ جتنا زیادہ صاف ہوگا اسی قدر مشاہدہ حق سبحانہ میں صفائی ہوگی اور اس سے غبار یا دل پھٹ جائیگا یہ تقریر آپ نے اس وقت کی تھی جبکہ ایک عالم نے آپ سے سوال کیا کہ (لوگ کہتے ہیں ولی بن جانے کے بعد ظاہری نماز کی ضرورت نہیں رہتی اور مقربان خدا کا دل ہر وقت نماز پڑھتا رہتا ہے تو) کیا ہو سکتا ہے کہ ولی نماز پڑھنا چھوڑ دے؟

آپ نے فرمایا ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ولی نماز پڑھنا چھوڑ دے۔ اور یہ ہو کیسے سکتا ہے جبکہ (آتش محبت کے) دو کلٹیے[1] ہر وقت اس کو داغتے رہتے ہیں کہ مشاہدۂ ذات محمدی (کی داغنی) داغنی ہے، ذات ولی کو اور حق تعالیٰ کا مشاہدہ داغتا ہے روح کو۔ اور دونوں مشاہدے اس کو حکم دیتے رہتے ہیں۔

---

[1] عربی میں لفظ مشھاب ہے جس کا ترجمہ کلٹیہ کر دیا ہے جس کو تپا کر ٹانکا لگایا جاتا ہے یا داغنی جس سے جانوروں کو داغ کر نمبر وغیرہ ڈالتے ہیں۔ مطلب وہ تپش محبت ہے جو اتباع اور تاثر پر مجبور کرے (مترجم)

نماز پڑھنے کا اور دیگر تمامی احکام شرعیہ کا۔ اور ایک مرتبہ آپ نے یہ تقریر فرمائی کہ ولی بھلا نماز پڑھنا کیسے چھوڑ سکتا ہے، حالانکہ خیر و فلاح جو کچھ بھی اس کو ہر دو مشاہدہ میں حاصل ہوئی ہے وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات شریفہ کے اسرار سے سیراب ہونے کے بعد حاصل ہوئی ہے۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ ذات شریفہ کے اسرار سے سیراب کیا جائے اور وہ افعال نہ کرے جو ذات شریفہ نے کئے تھے (لہٰذا وہ تو مجسم اتباع سنت ہوگا کہ عبادات اور فرائض تو بڑی چیز ہیں، عادات نبویہ میں بھی رائی برابر خلاف نہیں کر سکتا۔ ورنہ علامت ہے کہ ذات محمدی کے پورے اسرار سے اس کو سیرابی نصیب نہیں ہوئی۔ پس ناممکن ہے کہ ولی تارک صلوٰۃ ہو (یا کوئی تارک صلوٰۃ شخص اللہ کا ولی ہو)۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جب حق تعالیٰ کسی بندہ پر (مشاہدہ کا) انعام فرمانا چاہتا اور حجاب کی حالت سے فتح کی طرف منتقل فرماتا ہے تو اولیاء (یعنی اقطاب و اغواث زمانہ) کو اس کے متعلق بڑا خطرہ ہوتا ہے۔ کہ دیکھئے زندہ رہے گا یا مشاہدہ کی طاقت نہ رکھنے کے سبب مر جائے گا۔ اور اگر زندہ بھی رہا تو نہ معلوم اس کی عقل قائم رہے گی (اور سالک بنے گا) یا عقل سلب ہو جائے گی (اور مجذوب بن جائے گا) اور عقل کے سلب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جن بڑی چیزوں کا مشاہدہ ہوتا ہے عقل ان کے ساتھ چلی جاتی اور ذات سے بالکل جدا اور ایسی بے تعلق بن جاتی ہے کہ پھر کبھی واپس نہیں آتی۔ اور عقل کے سلب نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نور عقل کا کچھ حصہ مشاہدہ کی ہوئی چیزوں کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ اور کچھ حصہ اس کا ذات کے ساتھ باقی رہ جاتا ہے جو خورد و نوش اور لباس و دیگر مصالح ذات کا محافظ بنا رہتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ سالکین اولیاء کو ان چیزوں کا اہتمام نہیں رہتا۔ جو کچھ بھی روکھا سوکھا حلال ذریعہ سے مل گیا کھا پی لیا اور بآسانی و بلا کلفت موٹا جھوٹا جیسا مل گیا پہن لیا۔ کیونکہ مقصود صرف یہ ہے کہ بدن جو روح کے لئے بمنزلہ سواری کے ہے قائم و محفوظ رہے۔ نہ لذتوں کی طلب اور متاع دنیا کی رغبت و گرویدگی رہتی ہے اور اور نہ ان کے حاصل کرنے میں تدبیریں سوجھتی ہیں۔ کیونکہ عقل کا اکثر حصہ مشاہدۂ حق سبحانہ میں غرق ہے اور بقاء حیات کے قابل بقدر ضرورت عقل و فہم صرف تحصیل معاش کے لئے باقی رہ گئی ہے) غرض جس کو فتح عطا کی جاتی ہے اس کے متعلق یہ حال کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ بجز شیخ کے کسی دوسرے کو معلوم نہیں ہوتا۔

میں نے عرض کیا کہ آخر وہ از جارفتہ کیوں ہو جاتا ہے؟ اور اس حالت پر پہونچ جانے کا کیا سبب ہے کہ یا مر جائے یا عقل سلب ہو جائے؟

فرمایا جب بندہ کو فتح نصیب ہوتی ہے تو وہ چیزیں اس کو نظر آتی ہیں جن کی برداشت نہیں

ہو سکتی۔ مثلاً عالم، ملائکہ عالم جنات عالم شیاطین، اور ایسی وحشت ناک صورتیں دکھائی دیتیں اور ہولناک آوازیں سنائی دیتی ہیں جن سے کلیجہ پھٹ جاتا اور جگر شق ہو جاتا ہے۔ بہتیرے لوگوں کو ایسا قصہ پیش آیا کہ اپنی دکان پر بیٹھے سودا بیچنے میں مشغول تھے کہ حق تعالیٰ نے فتح نصیب فرمائی اور ایسی صورتیں دیکھ کر جن کی برداشت نہ ہو سکی ان کا دم نکل گیا۔ لوگ سمجھے کہ (حرکتِ قلب بند ہو گئی) اور بلا سبب اچانک موت آگئی حالانکہ درحقیقت ولایت پر موت آئی (اور مشاہدہ ملکوتی سبب مرگ ہوا)

میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا کہ ایک شخص کی عقل جاتی رہے فتح کی وجہ سے (اس کا نام مجذوب رکھا جاتا ہے) اور ایک شخص کی عقل کسی دوسری وجہ سے جاتی رہے (اس کا نام مجنوں اور پاگل رکھا جاتا ہے) ان دونوں میں فرق کیا ہے؟

فرمایا جس کی عقل فتح کی وجہ سے گئی ہے درحقیقت اس کی عقل گئی نہیں بلکہ مشاہدہ حق میں غائب ہو گئی ہے۔ کہ ہر وقت اس کے سمندروں میں تیرتا رہتا ہے۔ البتہ اس کا تعلق حق تعالیٰ نے خاص مصلحت کی بنا پر اس کی ذات سے منقطع فرما دیا ہے۔ اور جس کی عقل کسی دوسری وجہ سے گئی ہے اس کا سبب یہ ہے کہ حق تعالیٰ جب کسی کی عقل زائل اور اس کو ہلاک کرنا چاہتا ہے (کہ پاگل کی زندگی درحقیقت موت سے بدتر ہے) تو اس کی روح کا تعلق ایک دو ساعت کے لئے اپنی ذات پاک کے مشاہدہ سے قطع فرما کر اس ذات ترابی کے افعال کے ساتھ وابستہ کر دیتا ہے جس میں وہ رہتی ہے۔ پس اس گناہ گار بندہ سے جو افعال قبیحہ صادر ہوتے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے روح پر پوری ایک ساعت بھی نہیں گذرنے پاتی کہ اسے ایک انقباض پیش آتا ہے، اور اس کی وجہ سے عقل جاتی رہتی ہے۔ پھر اگر اس قبض کو دوام ہوتا ہے تو عقل کا زوال بھی دائمی بن جاتا ہے (کہ ہر وقت جنون میں رہتا ہے) اور اگر انقباض دائمی نہیں ہوتا بلکہ کسی وقت روح کو انبساط اور جمال بھی حاصل ہو جاتا ہے تو روح پھر ذاتِ حق کے مشاہدہ کی طرف لوٹ آتی ہے جیسی قطع تعلق سے قبل تھی۔ اور عقل بھی واپس آجاتی ہے (کہ ہوش کی باتیں کرنے لگتا ہے۔)

میں نے عرض کیا کہ عقل تو کبھی نابالغ بچہ کی بھی جاتی رہتی ہے، حالانکہ (غیر مکلف ہونے کے سبب) اس کے افعال کو نہ قبیح کہہ سکتے ہیں اور نہ اس کو گنہگار قرار دے سکتے ہیں (پھر اس کی عقل کیوں جاتی رہی؟)

فرمایا کہ روح کے نزدیک تو بندہ کی تمام حالتیں گناہ ہی گناہ ہیں۔ کیونکہ روح نے حق تعالیٰ کی جو شان دیکھی اور سمجھی و پہچانی ہے اس کا مقتضا یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اللہ کے سامنے سجدہ میں پڑا رہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی سر نہ اٹھائے۔ لہٰذا روح کے نزدیک اس میں بچے اور بوڑھے سب برابر ہیں۔ (یہ تو لطف و کرم ہے حق تعالیٰ کا کہ سزائے جہنم کے لئے بلوغ کی قید لگا کر بچہ کو معافی دیدی، ورنہ عیب و نقص ہونے

کے درجہ میں کہ درحقیقت خطا و گناہ اسی کا نام ہے، بچہ ہو یا بڑا ایک لمحہ بھی عبودیت سے غافل رہا تو گنہگار ہے)۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اہل فتح کے پاس جب یہ دونوں شخص بیٹھیں گے جن میں ایک کی عقل فتح کی وجہ سے گئی ہے اور دوسرے کی عقل دوسری وجہ سے، اور پھر اس کے ساتھ وہ باتیں کریں گے تو ولی ان کی گفتگو ہی سے فوراً دونوں میں امتیاز کرے گا (کہ یہ مجذوب ہے اور یہ مجنون ہے) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اگرچہ مجذوب کو (عقل نہ ہونے کے سبب) خود خبر نہیں کہ زبان سے کیا کہہ رہا ہے۔ مگر اکثر اس کی گفتگو سے اسرار الٰہیہ ظاہر ہوں گے (خالی بکواس نہ ہوگی) اور ان کو اہل اسرار فوراً سنتے ہی سمجھ لیں گے۔ برخلاف مجنوں کے کہ اس کی باتوں میں یہ بات مطلق نہ ہوگی۔

نیز دونوں میں امتیاز کرنے کا ولی کے نزدیک ایک طریقہ اور بھی ہے وہ یہ کہ مجذوب کی روح کو ہر وقت انبساط اور فرح وسرور میں دیکھے گا۔ اور مجنوں کی روح کو منقبض اور سرنگوں، جیسے کسی پر سخت مصیبت نازل ہوئی ہو اور وہ بیحد پریشان و مغموم اور متفکر و محزون ہو۔ اور یہ (مجانین) جن کی عقل کسی دوسری وجہ سے گئی ہے چوپاؤں کے حکم میں ہیں (کہ شرف انسانیت کا مدار صرف عقل پر ہے اور وہ ان میں مفقود ہے۔ لہٰذا چاہیئے تھا کہ آخرت میں بھی بہائم کی طرح مٹی بنا دئے جاتے اور جنت میں نہ بھیجے جاتے) مگر حق تعالیٰ کی رحمت ان کو جنت میں اس لئے داخل فرمادے گی کہ آدمیت کی شکل و صورت جس پر ان کو پیدا کیا گیا ہے ان کی شفاعت کرے گی (اور اس کو حق تعالیٰ قبول فرمائے گا) پس یہ لوگ گویا چوپایہ ہیں جن کو بنی آدم کی صورت دی گئی ہے۔ لہٰذا حق تعالیٰ نے اس بزرگ صورت کے طفیل جس پر اپنے انبیا ورسل اور برگزیدہ بندوں کو پیدا فرمایا ہے، ان پر رحم فرمایا اور چوپایوں کی طرح مٹی نہ بنایا۔ ف جب مقبولین الٰہی کی صورت میں مشابہت اور ظاہری تشبہ کی حق تعالیٰ کے نزدیک اتنی رعایت ہے کہ غیر اختیاری چیز یعنی صورت انسانیت سبب دخول جنت بن گئی، تو افعال اختیاریہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تشبہ صوری میں کیا کچھ رحمت و برکت اور مقبولیت ہوگی۔ اور اس کے برعکس مبغوضین خدا کفار و مشرکین کی مشابہت ظاہریہ میں بغض و نقمت الٰہیہ کا کتنا کچھ اثر ہوگا۔ مگر افسوس کہ آج مسلمان ہی یوں کہہ رہے ہیں کہ داڑھی و لباس اور صورت و وضع میں دین کا کوئی دخل نہیں۔ دین میں اعتبار صرف سیرت کا ہے کہ وہی اصل شے ہے۔ لیکن اگر حق تعالیٰ صورت کی رعایت نہ فرماتا اور محض سیرت پر حکم جاری کرتا تو بہائم سیرت دیوانوں کے جنت میں جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ ۱۲۔

نیز آپ نے فرمایا (اور مجاذیب) جن کی عقل بوجہ فتح ومشاہدہ کے گئی ہے، وہ اولیاء کرام میں شامل ہیں

البتہ ان کو تصرف عالم کی خدمت نہیں دی جاتی اور ان میں نہ کوئی غوث بنتا ہے نہ قطب۔ ہاں جس وقت حق تعالیٰ چاہے گا کہ دجّال کا خروج ہو تو اس وقت تصرف عالم ان (مجاذیب) کے ہاتھ میں دیا جائے گا اور انہیں میں کا ایک مجذوب غوث بنے گا۔ پس (ان کے مسلوب العقل ہونے کے سبب دنیا کا سب) نظام مختل اور انتظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اور انھیں کے عہد تصرف میں دجال کا ظہور ہوگا۔ جب دجال کا قصہ (سیدنا عیسٰی علیہ السلام کے ہاتھوں مقتول ہو کر) طے ہو جائے گا تو مجاذیب کی حکومت بھی ختم ہو جائے گی اور پھر ان کی طرف کبھی عود نہ کرے گی۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ایک مرتبہ میرے مرشد حضرت عبداللہ برناوی ؒ نے مجھ سے سوال کیا کیوں جی کیا تمہیں معلوم ہے کہ دنیا میں کون چیز ہے جو دخول جنت سے بہتر ہے، اور کون چیز ہے جو دخول جہنم سے بدتر ہے؟ میں نے عرض کیا جی ہاں مجھے معلوم ہے۔ وہ چیز جو جنت میں جانے سے بدرجہا بہتر اور عزیز ہے سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت شریفہ بحالت بیداری ہے کہ ولی آپ کو آج اسی صورت و شکل میں دیکھے جس میں حضرات صحابہ نے آپ کو دیکھا تھا۔ پس یہ جنت سے بھی افضل ہے (کہ اس میں تمامی جنتوں کی عمومی نعمتوں کی لذت ہے) اور وہ چیز جو دوزخ میں جانے سے بھی زیادہ بری اور بدتر ہے فتح نصیب ہونے کے بعد اس کا سلب ہو جانا ہے۔ یہ سنتے ہی حضرت شیخ نے میرے پاؤں پکڑ لئے اور بار بار ان کو چومنا شروع کر دیا۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت یہ کیوں؟

فرمایا یہی سوال میں تقریباً اسّی مشائخ سے کر چکا ہوں۔ مگر یہ جواب کسی ایک نے بھی نہیں دیا جو آج تم نے دیا۔ ف بحالت بیداری آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت شریفہ تو بڑی چیز ہے خواب میں جس خوش نصیب کو آپ کی زیارت نصیب ہو جاتی ہے وہ فرط مسرت سے پھولا نہیں سماتا، اور جب اپنی خواب کو یاد کرتا ہے تو خوشی کے مارے اس کا رواں رواں کھل جاتا ہے۔ حالانکہ احتمال ہے کہ وہ آپ کی صورت حقیقیہ نہیں ہے اور اس میں رائی کے قلب کی ظلمت کو دخل ہے۔ بلکہ مسلمان محض اپنے تخیل میں جس وقت سید المحبوبین صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ صورت شریفہ لاتا ہے جو آپ کے رنگ و ہیئت، قد و قامت، خد و خال، اور حسن و جمال کے متعلق حالات اس نے کتابوں میں پڑھے ہیں تو حالانکہ اصل اور نقل میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور نقل بھی محض قلمی اور محض قائل کا ادراک اور زبان سے اس کا اظہار۔ بھلا وہ حقیقت کو کیسے واضح کر سکتا ہے ؎

گر مصوّر صورت آن دلستان خواہد کشید ۔۔۔ لیک حیرانم کہ نازش را چسان خواہد کشید

با ایں ہمہ اس صورت متخیلہ سے بھی روح کو وہ فرحت پہونچتی ہے جس پر دنیا کی تمام لذتیں نثار ہیں

اور بے ساختہ و بے اختیار زبان سے نکلتا ہے ؎

زفرق تابقدم ہر چہ می نگرم کرشمہ دامن دل میکشد کہ جا اینجاست

اور واقعہ بھی ہے کہ جس ذات کو حق تعالیٰ نے اپنا محبوب بنایا ہو، اس کے ظاہری و باطنی حسن کا مخلوق میں ثانی کہاں نکل سکتا ہے۔ چنانچہ حیات شریفہ کے واقعات آپ کے ساتھ ہزاران ہزار صحابہ کی اس محبت و عشق کا ثبوت دے رہے ہیں جو کسی عالم میں بھی کسی مخلوق کو نصیب نہیں ہوا۔ اب رہا سوال آپ کی ہیبت و سطوت کا کہ حضرات صحابہ کے کلیجے شق کیوں نہ ہوئے سو اوّل تو وہ حضرات چونکہ طفولیت کے زمانہ سے آپ کو دیکھتے رہے اور ہر وقت کی صحبت و اختلاط اور ممارست و مشاہدہ سے ایک کیفیت انس کی پیدا ہو کر رعب کا اثر قابل برداشت بن جاتا ہے۔ اس لئے رویت کے ایسے متحمل ہو گئے جیسے سلطان وقت کے بچپن کے رفقاء۔ دوم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت و بے تکلفی اور صحابہ کے ساتھ اکثر اوقات انبساط و خوش طبعی کا برتاؤ اثر ہیبت کی ایسی تلافی کرتا رہتا تھا جیسا آگ پر بار بار ٹھنڈا پانی پڑنے سے اس کا احراقی اثر مضمحل ہوتا رہتا ہے۔ سوم چونکہ ان حضرات سے حق تعالیٰ کو کام لینا اور وصال محمدی کے بعد ان کو نائبین رسالت اور مظاہر تعلیمات نبویہ بنانا منظور تھا، اس لئے ان کے قلوب میں وہ قوت عطا فرما دی تھی کہ سطوت محمدیہ سے ہلاک نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ امت محمدیہ میں اقطاب و اغواث کو جب یہ شرف رویت عطا کیا جاتا ہے تو پہلے وہ قوت قلبیہ دیدی جاتی ہے جو سلطانی دربار کے حاضر باش غلاموں کے لئے شایان ہے۔ پس عوام جن کو حاکم ضلع کی عدالت کا جلال و رعب بھی دیکھنا کبھی نصیب نہ ہوا ہو وہ اگر سلطانی ایوان میں جا کر دفعۃً پادشاہ کے چہرہ پر نظر ڈالنے سے بے ہوش ہو کر گر پڑیں، بلکہ حرکت قلب بند ہو کر اُن کی رُوح قفص عنصری سے پرواز کر جائے تو کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ شاہانہ سطوت و ہیبت کا مقتضا ہی یہ ہے۔ اور اس پر یہ شبہ وارد نہیں ہو سکتا کہ جب ہیبت کا یہ اثر ہے تو بیوی، بچے، بیگمات و شاہزادے، وزراء اور امراء، میر منشی و مصاحبین، حاجب و پہرہ دار، باڈی گارڈ و ملازمین حاضر باش، اور خواجہ سرا و اعواط حرم، غلامان خاص اور باندیاں کیسے زندہ رہتی ہیں اور کاروبار سلطنت کیونکر چل سکتا ہے۔ جامع کتاب کہتے ہیں میں نے حضرت ممدوح سے کہا حضرت برنادی قدس سرہ کو تو جواب معلوم ہوگا اور دوسروں سے دریافت فرمانا محض امتحان کی خاطر اور ذکاوت جانچنے کے لئے ہوگا؟

فرمایا ہاں بے شک حضرت قدس سرہ جواب سے خوب واقف تھے اور سوال سے مقصود صرف فہم و ذکاوت کا امتحان لینا تھا۔

میں نے کہا رویۃ محمدیہ کے جنت سے افضل ہونے کی وجہ تو گذشتہ تقریر سے معلوم ہو چکی مگر سلب بعد الفتح کا دوزخ میں جانے سے زیادہ بُرا ہونا کس بنا پر ہے؟

فرمایا یہ صرف اس کے حق میں ہے جس کی فتح دائمی ہو (اور سلب لاحق نہ ہوا ہو) کہ وہ حاصل شدہ فتح کے زائل کر دینے والے سلب کو جہنم سے بھی زیادہ قبیح سمجھتا ہے ورنہ سلب کے واقع ہو جانے کے بعد تو مسلوب کا قلب پتھر کی طرح (بے حس اور سخت) ہو جاتا ہے کہ نہ کچھ اس کو نظر آتا ہے نہ کسی بات کو سمجھتا ہے (ایسا بن جاتا ہے) گویا کسی شے کا کبھی مشاہدہ ہی نہ کیا تھا (لہٰذا اس کو سلب کے قبح کا ادراک ہی نہ ہو گا بلکہ) اس کی خبیث ذات فتح کے بوجھ سے اپنے آپ کو سبکدوش اور ہلکا سمجھے گی۔ دنیا میں کسی امیر کبیر کی دولت چھن جائے تو اس کا حال اس (دولت مشاہدہ کے) مسلوب سے پھر اچھی ہو گی کہ اپنے زمانہ تونگری کی تمامی نعمتوں اور لذتوں کا اس کو دھیان تو آئے گا اور اس تصور سے بھی اس کو فی الجملہ لذت حاصل ہو گی مگر اس مسلوب کا قلب تو (مادرزاد اندھے کی طرح) چوپٹ اور اس کی بصیرت کا شمس (گہن کی طرح) بالکل تاریک و بے نور ہو جاتا ہے (جس کو اپنے اندھے ہو جانے کی بھی نہ کلفت ہوتی ہے نہ احساس) ف مثل مشہور ہے قدر نعمت بعد زوال۔ مگر یہ اسی نعمت کا حال ہے جس کا بعد زوال ادراک و شعور بھی قائم رہے۔ چنانچہ کوئی امیر جب فقیر بن جاتا ہے تو چونکہ دینوی لذتوں کا ادراک اب بھی اس میں موجود ہے اس لئے گو زبان کو مزہ نہ ملے گا مگر خیال و تصور کے ذریعہ قلب کو پھر بھی مزہ ملے گا اور اسی لئے اس کو ہم و غم اور تحسّر و تالم ہو گا۔ کہ خیالی لذت زبان کو نصیب نہیں ہوتی۔ مگر جس کی نسبتِ روحانیہ چھن جائے یا حلاوتِ ایمان جاتی رہے تو قلب سے مادہ ادراک ہی سلب ہو جاتا ہے۔ جہاں نعمت گئی وہیں اس کا ادراک بھی گیا۔ لہٰذا اس کو تو اس نعمت کے چھن جانے سے اتنا بھی حس نہ ہو گا جتنا ایک سوئی کھو جانے سے ہوتا ہے چہ جائیکہ عذاب دوزخ سے بدتر معلوم ہونا۔ البتہ صاحب فتح کو سلب اور زوال فتح باوجود مزہ نہ چکھنے کے اس سے بھی زیادہ قبیح معلوم ہو گا جتنا ایک مومن کو دوزخ میں جانا باوجودیکہ اس نے دوزخ کی کسی تکلیف کا مزہ نہیں چکھا قبیح اور بُرا معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ حضرت محمد بنّا طرابلسی کامل چودہ برس مرشد کی تلاش میں رہے جو ان کو آستانہ خدا تک پہونچائے، اور کوئی جگہ نہیں چھوڑی جہاں (اس جستجو میں) پہونچے نہ ہوں۔ مصر شام عراق قسطنطنیہ اور ہندوستان سب ہی میں چکر لگایا اور جہاں بھی کسی ولی کا نام سنا یا پتہ لگا وہاں آئے۔ مگر جس کے پاس بھی آتے باوجودیکہ لوگوں میں اس کی ولایت کا شہرہ اور جگہ جگہ اسکے کمالات

کا تذکرہ ہوتا تھا مگر (خالی شہرت کے سوا) کچھ نہ پاتے اور واپس ہو جاتے تھے۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ ان کے والد عارفین میں سے تھے اور انہوں نے امر حق اُن سے سنا تھا۔ مگر جب ان کے ہاتھوں پر ان کو فتح نصیب نہ ہوئی تو ایسے عارف کامل کو تلاش کرنا شروع کیا جو اللہ تک پہونچائے اور سلوک طے کرائے۔ مگر پرکھ کا مادہ موجود تھا اس لئے سمجھ بوجھ کر دامن پکڑنا چاہتے تھے۔ محض شہرت پر اعتبار نہ کرتے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ عراق میں مجھے ایک پیر ملے جن پر بے شمار مخلوق مجتمع تھی آنے جانے والوں کے لئے ایک مہمان خانہ تھا جس میں باہر والوں کی اتنی کثیر آمد تھی کہ روزانہ تقریباً دو سو مد (چار من) کھانا پکتا تھا۔ خانقاہ میں ایک حجرہ تھا جس کو شیخ نے اپنا عبادت خانہ تجویز کر رکھا تھا۔ اسی میں رہا کرتے اور مہینہ میں بجز آخری تین دنوں کے کبھی باہر نہ آتے تھے۔

ستائیس دن برابر رکوع و سجدہ میں لگے رہتے تھے۔ اس خلوت خانہ میں ایک روشندان تھا جس کے ذریعہ خادم باہر ہی سے شیخ کا کھانا پہونچا دیا کرتا تھا۔ حجرہ ہی میں ایک جانب قضاء حاجت کے لئے جگہ بنا دی گئی تھی۔ غرض مریدوں نے شیخ کی تمامی ضروریات کا انتظام حجرہ کے اندر ہی کر دیا تھا تاکہ ان کو باہر نکلنے کی حاجت پیش نہ آوے اور وہ اپنے ستائیس دن اس میں بآرام پورے کر سکیں۔ جب ستائیس دن پورے ہو جایا کرتے تو تین دن کے لئے وہ باہر نکلا کرتے اور حاضرین سے جو کہ اپنی اپنی ضرورتیں لیکر کثیر تعداد میں جمع ہو جایا کرتے تھے نمبروار گفتگو کیا کرتے حتیٰ کہ سب سے فارغ ہو جاتے تھے۔ جب تین دن پورے ہو جاتے تھے اور نئے مہینہ کا چاند نظر آتا تو پھر اپنے خلوت خانہ میں چلے جاتے اور ستائیس دن وہاں پورے کیا کرتے۔ مدت سے انکا یہی معمول تھا۔ چنانچہ ان کا نام اور حال سن کر میں بھی سفر کر کے وہاں پہونچا اور انتظار میں صبر کے ساتھ بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ وہ (حسب عادت وقتِ معمول پر حجرہ سے) باہر تشریف لائے اور جو لوگ مجھ سے پہلے آچکے تھے نمبروار اُن سے باتیں کیں۔ جب میرا نمبر آیا تو مجھ سے کہا کہ اپنی ضرورت تم بھی ظاہر کرو۔

میں نے کہا کہ حضرت میں آپ سے دو مسئلہ دریافت کرتا ہوں۔ ایک کا تعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے، اور دوسرے کا تعلق رب العزت جل جلالہٗ سے۔

انہوں نے کہا ہاں پوچھو۔

میں نے عرض کیا حق تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِن ذَنبِكَ وَمَا تَأَخَّرَ اے محمدؐ ہم نے تم کو فتح مبین عطا فرمائی تاکہ اللہ تمہارے اگلے اور پچھلے گناہ بخش دے۔ اس آیت شریفہ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے اگلے اور پچھلے دونوں گناہوں کو

ثابت کیا اور تصریح کی کہ مغفرت دونوں کو شامل ہوگی۔ حالانکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم قبل از نبوت اور بعد از نبوت (بہر حال) معصوم ہیں۔ لہٰذا آپ کے لئے گناہ کا وجود ہی نہیں۔ پھر آیۃ شریفہ کا مفہوم کیا ہے؟

فرمانے لگے کہ گناہوں کی دو قسمیں ہیں۔ بعض گناہ ثقیل (اور کبیرہ) ہوتے ہیں، اور بعض گناہ خفیف (اور صغیرہ) ہوتے ہیں۔ پس ثقیل گناہ مثلاً زنا و شرب خمر وغیرہ تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر نہیں ہو سکتے۔ مگر خفیف گناہ مثلاً ازواج مطہرات میں باری تقسیم کرنے کے متعلق ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا، یا کسی ایک کی طرف میلان و رجحان وغیرہ امور آپ سے صادر ہو سکتے ہیں۔ اور آیت میں بخشے ہوئے اگلے پچھلے گناہوں سے یہی خفیف گناہ مراد ہیں۔

یہ جواب سن کر میں نے سمجھ لیا کہ جاہل ہے منصب رسالت سے بھی واقف نہیں۔ اور عارف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل و شرف اور صغیرہ و کبیرہ ہر دو قسم کے گناہوں سے آپ کی معصومیت کو جانتا ہے نا واقف نہیں ہوا کرتا۔ کیونکہ گناہ کا صدور صاحب حجاب اور اہل غفلت و ظلمت سے ہوا کرتا ہے اہل مشاہدہ مقربین اولیاء اللہ سے بھی نہیں ہوتا۔ چہ جائیکہ حضرات انبیاء علیہم السلام، اور چہ جائیکہ سید الانبیاء والمرسلین صلی اللہ علیہ وسلم۔

پھر وہ بولے کہ اب دوسرا سوال پیش کرو۔

میں نے کہا حق تعالیٰ فرماتا ہے هُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ وہ (اللہ) تمہارے ساتھ ہے جہاں کہیں بھی تم ہو۔ اس معیت سے کیا مراد ہے؟

کہنے لگے جن کی معیت ظاہر فرمائی ہے ان سے مُراد مومنین ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ مومنین کے دلوں میں ہے کہ اسی سے دُعائیں مانگتے ہیں، اور ہمہ وقت اسی کا ذکر کرتے ہیں، اور اسی عبادت میں لگے رہتے ہیں۔ یہ جواب سن کر میں نے معلوم کر لیا کہ رب جل جلالہٗ کی شان سے بھی جاہل ہے (اور پیر بننے کے قابل نہیں بلکہ) اہل باطل میں سے ہے

نیز انہیں محمد بنا نے یہ قصہ نقل کیا کہ میں بلاد ہند میں ایک اور پیر کے پاس گیا جس کی حد سے زیادہ عبادت اور زہد کا مجھ سے تذکرہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ میں پہونچا اور واقع میں جیسا لوگوں نے کہا ویسا ہی عبادت اور زہد میں ان کو پایا۔ کہ ہمارے ملک کے بلوط پھل کے مشابہ وہاں ایک پھل ہوتا تھا۔ بس وہ ایک پھل ان کی خوراک تھی۔ کہ رات دن کے چوبیس گھنٹہ میں اسی پر اکتفا کرتے اور اس سے زائد کچھ نہ کھاتے تھے۔ میں نے اُن سے بھی رب العزۃ کی شان کے متعلق سوال کیا اور انتہا درجہ کا جاہل

پایا۔ سمجھ لیا کہ بنیاد کے بغیر چنائی ہو رہی ہے۔

نیز انہیں کا بیان ہے کہ میں ایک دن ساحل سمندر پر کھڑا ہوا تھا کہ چند کشتیاں (تجارتی) مال لے کر آئیں اور لنگر انداز ہوئیں۔ اسباب اُتارنے کے لئے حمالین جمع ہو گئے کہ کمر پر بوجھ لاد کر شہر میں پہونچائیں اور اجرت لے لیں۔ میں نے دیکھا کہ معمول سے بہت زیادہ بوجھ کمر پر اُٹھا لیتے ہیں جیسے مصر میں کسالوں کی، اور شہر فاس میں زرزایہ قوم کی، (اور جدہ میں تکرونی مزدوروں کی) حالت ہے۔ یہ دیکھ کر میں دل ہی دل میں تعجب کرنے لگا۔ دفعۃً ان میں سے ایک شخص میری طرف آیا جو کہ عارفین میں سے تھا مگر مجھے اس کا پتہ نہ تھا۔ وہ کشف کے ذریعہ میرے مافی الضمیر پر مطلع ہوا اور مجھ سے کہنے لگا کہ اس پر تعجب نہ کرو۔ بلکہ اللہ کی قدرت پر تعجب کرو جو ابھی میرے اندر ظاہر ہوگی۔ یہ کہہ کر اپنا بوجھ لئے ہوئے روانہ ہوا اور ذرا ہی دیر بعد واپس آیا۔ پھر چت لیٹ گیا اور اپنے ہاتھ پاؤں پھیلا دئے اور روح نکل گئی۔ مرحوم نے گویا اشارہ کیا کہ (ہم بیچاروں کی کیا طاقت و قوت ہے) قوت والا تو درحقیقت اللہ تعالیٰ ہے جو تمامی قوتوں اور طاقتوں کا مالک ہے۔ جس کو جتنی چاہتا ہے دیدیتا ہے اور جس سے جس وقت بھی چاہتا ہے سلب کر لیتا ہے۔ تعجب و حیرت کے شایان تو اس کی قدرت ہے اور اسی کی عظمت و بڑائی کا استحقاق ہے۔ فَتَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الخَالِقِیْنَ۔

نیز وہ فرماتے ہیں کہ (اس سفر میں) عارفین کی ایک جماعت سے بھی مجھے ملنا نصیب ہوا۔ مگر ان میں ہر ایک نے مجھے واپسی وطن کا مشورہ دیا۔ اور یہی کہا کہ تمہاری حاجت صرف شہر فاس میں پوری ہوگی۔ چنانچہ میں اپنے وطن (طرابلس) واپس آگیا۔

اب حضرت ممدوح فرماتے ہیں کہ ان کے وطن میں بھی ایک بزرگ نے ان کو یہی بتایا کہ تمہاری مُراد فاس میں پوری ہوگی۔ چنانچہ انہوں نے سفر کی طیاری کی اور یہاں آکر ایک شخص سے ملے جس کے ہاتھوں حق تعالیٰ نے ان کو فتح نصیب فرمائی (وہ خود حضرت شیخ تھے) فاس میں صرف چھ مہینہ قیام کیا اور رحمہ اللہ عارفین و اہل دیوان میں سے ہو گئے۔

میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا کہ اس کو حضرت والا کی حیات ہی میں فتح عطا ہو گئی۔ حالانکہ باپ کی زندگی میں کسی کو فتح مل نہیں سکتی۔ اور اگر مل بھی جاتی ہے تو جلدی ہی جاتی رہتی ہے۔ باقی نہیں رہ سکتی۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فتح کا نزول سرِّ ذات پر ہوا کرتا ہے اور شیخ کا سرِّ ذات جب اس کے روحانی بیٹے (یعنی خلیفہ و جانشین) کی طرف منتقل ہوتا ہے تب اس کو فتح عطا ہوتی ہے۔ اور باپ کی زندگی میں اس کا سرِّ ذات منتقل ہو نہیں سکتا کہ وہ منتقل ہو تو اس کی ذات

مشاہدہ سے خالی اور فتح سے محجوب بن جائے) اور اسی لئے اس کو میراث کہا جاتا ہے کہ وفات شیخ کے بعد بصورت ترکہ روحانی اولاد کو ملتی ہے) حالانکہ اس شخص کو فتح نصیب ہوئی اور وہ قائم وباقی بھی رہی۔ اس کی کیا صورت ہوئی؟ فرمایا وہ میرا (روحانی) بیٹا نہ تھا (اور یہ فتح جو میرے ذریعہ اس کو ملی تھی) ایک شخص کی امانت تھی (جس کا میں امین تھا کہ محفوظ رکھوں اور جب یہ شخص آئے تو اس کو پہونچا دوں)

میں نے کہا وہ کون بزرگ تھے جن کی یہ امانت تھی؟

فرمایا نواح مراکش کے ایک شخص تھے اور عارف باللہ تھے۔ ان کا سرّ باطنی (بطریق امانت) میرے پاس باقی تھا۔ چنانچہ جب یہ شخص آیا تو میں نے اپنے اوپر سے قمیض اُتار کر اس کو پہنا دیا اور وہ سرّ باطنی (جس کی صورت مثالیہ خرقہ پہنانا تھا) اس کے حوالہ کر دیا۔

میں نے کہا کہ سرّ مذکور تو اس شخص کے لئے ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسی (مراکشی عارف) کا سرّ ذات اس کی طرف منتقل نہ ہو (اور اس کے لئے ضرورت ہے کہ وہ اس کو تعلیم دیں اس کے ساتھ محبت اور اس کی تربیت کریں اور اس سے واقف وشناسا ہو کر قصد وارادہ کریں سرّ ذات دینے کا) چہ جائیکہ انہوں نے اس شخص کو دیکھا تک بھی نہیں۔

فرمایا حق تعالےٰ اس امین کو جس کے پاس ذات ولی کا سرّ امانت رکھا ہے قدرت بخشتا ہے کہ وہ اس کو دوسرے شخص کے حوالہ کر دے، اور پھر اس کو سرّ اور فتح پر بھی قبضہ دے دیتا ہے۔ اور باوجود اس کے وہ اس کا (روحانی) بیٹا نہیں کہلاتا اس (عطار سرّ ذات کا) انتساب اسی پہلے شخص کی طرف رہتا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ کہاں مورث کا وطن مراکش اور کہاں وارث کا مکان طرابلس۔ کیا اہل مغرب میں کوئی اس قابل ہی نہ تھا کہ پاس کے پاس ہم وطن شیخ سے ان کی وفات کے وقت سرّ ذات لے لیتا اور) اس کو باہر نکل کر طرابلس میں آنے کی ضرورت نہ ہوتی۔

فرمایا (سرّ ذات کی اس روحانی میراث کا مدار مناسبت طبعیہ پر ہوتا ہے کہ) مورث اور وارث ہم شکل ومشابہ ہوں عقل میں اور طبیعت میں اور خون میں۔ چنانچہ ہمارے شیخ فلاں فرمایا کرتے تھے کہ اس (وراثت باطنیہ) کا مدار اگر (جسمانی) قرب پر ہوتا تو میرا وارث میرا بیٹا ہوتا (کہ اس سے زیادہ میرا قریب کوئی نہیں) اور اگر اس کا مدار قوت پر ہوتا تو یہ ترکہ سلطان کو ملتا (کہ اس سے زیادہ با قوت کوئی نہیں) اور اگر اس کا مدار خدمت پر ہوتا میرا وارث میرا فلاں خادم ہوتا (کہ اس سے زیادہ

میری خدمت کسی نے نہیں کی، مگر اس کا مدار تو صرف اس پر ہے کہ (مورث) کی عقل وفہم کو موافقت ہو (وارث کی) عقل وفہم سے، اور اس کی طبیعت کو موافقت ہو اس کی طبیعت سے۔ اور اس کے خون کو موافقت ہو اس کے خون سے۔ اور یہ (موافقت) کسی کی اکتسابی اور اختیاری نہیں (بلکہ محض وہبی اور خداداد ہے۔ اس لئے عدم مناسبت کے سبب پاس والے اس ترکہ سے محروم رہ جاتے ہیں۔ اور دور والے میں یہ موافقت موجود ہوتی ہے اس لئے وہ سرّ باطنی کا وارث ہو کر اس پر قبضہ کر لیتا ہے۔

حسن زبصرہ بلال از حبش صہیب از روم زخاک مکہ ابوجہل این چہ بوالعجبی ست

اور یہ (طرابلسی) شخص اپنے مورث (مراکشی عارف) کے ساتھ ان باتوں میں ہم شکل ومشابہ تھا (لہٰذا باوجود بُعد مسافت اور بُعد زمانی کے اس کا وارث قرار پایا۔ حتیٰ کہ انہوں نے اس کی صورت بھی نہیں دیکھی مگر ترکہ بدرجہ امانت دوسرے کے پاس محفوظ رکھا گیا تا حق بہ حقدار رسد) واللہ اعلم

نیز آپ نے فرمایا کہ جب تم کسی عارف کو کثرت سے یہ کہتا ہوا سنو کہ فلاں شخص میرا وارث ہوگا اور میرا سرّ باطنی اس کو ملے گا اور تم میرے بعد اس کا دامن پکڑنا۔ تو غالب یہ ہے کہ ایسا نہ ہوگا کیونکہ اسرار ربانیہ خلاف گمان آیا کرتے ہیں جہاں کسی کا خیال بھی نہیں جاتا۔ چنانچہ خود ان مشائخ کو یہ اسرار جس وقت ملے ہیں تو لوگوں کا خیال بھی نہ تھا کہ یہ اس کے اہل ہیں۔ اسی طرح جب ان سے خارج (اور دوسرے کی طرف) منتقل ہوں گے تو بلا ظن وگمان ہی منتقل ہوں گے۔ پھر فرمایا کہ آٹھ مرید اپنے شیخ کی خدمت کیا کرتے تھے۔ ایک ان میں سے تھک گیا تھا اور خدمت کے قابل نہ رہا۔ باقی رہے سات وہ برابر خدمت میں لگے رہے اور ان میں بھی تین نے خدمت میں انتہا کر دی۔ حتیٰ کہ اپنی بیٹیاں شیخ کی زوجیت میں دیدیں (کہ وہ خادمہ بن کر گھر کے اندر شیخ کو آرام پہونچائیں) ان تین میں بھی ایک کی لڑکی بہت حسین اور صاحب سلیقہ وخدمت گذار تھی اس لئے اس کے باپ سے شیخ کو تعلق زیادہ تھا کہ ہر بات میں اس کو دوسروں پر ترجیح دیتے تھے۔ عام لوگوں کا خیال تھا کہ شیخ کا وارث (اور قائم مقام) یہی ہوگا۔ مگر جب شیخ کی وفات کا وقت قریب آیا اور سب خدام ومنتسبین حاضر ہوئے تو انہوں نے اس عاجز کو جو خدمت سے معذور ہو چکا تھا آواز دی، اور فرمایا کہ تم ہو صاحب سرّ۔ یہ کہتے ہی روح پرواز کر گئی اور دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ عام لوگ جس کو بہ نظر حقارت دیکھا کرتے ہیں اللہ کی رحمت اور نگاہِ کرم اس پر زیادہ ہوا کرتی ہے بہ نسبت اس کے جس پر لوگوں کی نظریں عزت واحترام کی پڑا کرتی ہیں۔ اس بنا پر اہل احتقار زیادہ مستحق

ہوتے ہیں ربانی اسرار کے۔ ف اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے دل شکستہ اور انتظار سے خالی ہوتے ہیں کہ وہ خود بھی اپنے کو حقیر اور نااہل سمجھتے ہیں اور یہ عجز و شکستگی ہی بارگاہ احدیت میں زیادہ مقبول و محبوب ہے۔ اور عطا کا تو رب متعال کی یہ حال ہے کہ چھپر پھاڑ کر دینا ضرب المثل ہوگیا ہے اور یَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ اس کی شان بے نیازی کا ادنیٰ کرشمہ ہے ؎

خدا کے دین کا موسیٰ سے پوچھئے احوال ۔۔۔ کہ آگ لینے کو جائیں پیمبری مل جائے

ایک بار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے رب العزت سے سوال کیا کہ آپ کو کہاں ڈھونڈوں؟ ارشاد ہوا شکستہ دلوں کے پاس۔ اور بات بھی یہی ہے کہ اللہ کی جس مخلوق کو عام مخلوق بہ نظر حقارت دیکھے اگر خالق جل شانہ بھی اس پر نگاہ کرم نہ فرمائے تو پھر وہ بدنصیب کہاں جائے اور کس دروازہ پر پڑے۔ ۱۲

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا۔ ایک بزرگ کے دو مرید تھے۔ ایک عامی اور معمولی شخص تھا اور دوسرا شریف و صاحب جاہ۔ دونوں فتح اور سر باطنی سے خالی تھے۔ بزرگ نے اس عامی سے کہا کہ شریف کے پاس جا کر کہو کہ سر و فتح تمہارے ہاتھ بیع کر دے۔ چنانچہ وہ اس کے پاس گیا اور کہا کہ سر و فتح بعوض سو دینار کے میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ اس نے انکار کیا کہ میں نہیں بیچتا۔ عامی نے کہا اچھا سو دینار اور بڑھاتا ہوں (دو سو دینار لے لو اور فتح و سر کا حق مجھے دیدو) شریف نے کہا مجھے منظور نہیں۔ اس نے کہا اچھا ایک خادم (غلام قیمت میں) اور بڑھاتا ہوں۔ شریف نے کہا اس پر بھی منظور نہیں۔ عامی نے کہا اچھا اپنی دختر کا اور اضافہ کرتا ہوں کہ اس کو تمہاری زوجیت میں دے دوں گا۔ شریف نے کہا میں اس پر بھی راضی نہیں، عامی نے کہا اچھا اپنا مکان بھی دیتا ہوں۔ اس پر شریف نے کہا اچھا منظور ہے۔

حالانکہ دونوں اہل حجاب تھے کہ فتح کے اسرار و انوار میں سے کسی نے کچھ بھی نہ دیکھا تھا مگر عامی نے جو کچھ کیا وہ محض شیخ کے کلام کو سچا سمجھنے کی بنا پر (بروئے عقیدت اور حکم کی تعمیل میں) کیا تھا۔ بیع کا ایجاب و قبول ہو جانے کے بعد عامی نے شریف سے کہا کہ گواہ لاؤں (تاکہ میں یا تم اس معاہدۂ باہمی کا نقص یا انکار نہ کر سکیں)

شریف نے کہا بہتر ہے۔ چنانچہ عامی چند دینداروں کو بلا کر لایا اور سارا قصہ ان کو سنا کر کہا کہ میں نے قیمت میں فلاں فلاں چیز ان کے حوالہ کی ہے، تم اس پر گواہ رہنا۔ شریف نے بھی کہا ہاں میں بھی تم کو گواہ بناتا ہوں کہ میں سر و فتح اس کے ہاتھ فروخت کر چکا۔ الغرض دختر بعد نکاح رخصتی ہو کر شریف کے

گھر پہونچ گئی اور مکان و خادم اور دو سو دینار پر اس کا قبضہ ہوگیا۔ اُس پر تو رات ایسی پُر لطف اور مزہ کی گذری کہ عمر بھر میں کوئی رات ایسی مزہ دار نہ گذری تھی۔ اور عامی بیچارے پر ایسی پریشانی کی رات گذری کہ ساری عمر ایسی تاریک و تنگ کوئی رات بھی نہ گذری تھی کہ تمام شب شیخ کی طرف سے بدگمان بنانے والے قسم قسم کے وسوسے آتے رہے اور یہ ان کو دفع کرتا رہا۔ مگر جب پَو پھٹی اور صبح صادق نمودار ہوئی تو سِرّ اور فتح اوّل شریف کے پاس آئی، حتیٰ کہ اس نے اس کا مشاہدہ کیا اور اس میں (وہ وہ عجائب) دیکھے جو نہ کسی آنکھ نے (دنیا میں) کبھی دیکھے تھے، نہ کسی کان نے سُنے تھے، اور نہ کسی کے خیال میں گذرے تھے جب اُس نے خوب غور اور گہری نظر سے اس کو دیکھ لیا تو وہ سلب ہوگئی اور اس عامی کی طرف چلی گئی۔ وہ تو ولی کامل بن گیا اور شریف جس نے اس کو (فانی و چند روزہ متاع دنیا پر) بیچ دیا تھا اس کی ہوئی قیمت میں بھی کسی چیز سے منتفع نہ ہوسکا۔ اور اس کی وجہ یہ ہوئی کہ جب اس کے لئے (سِرّ و فتح کا) سلب واقع ہوا تو اس کی عقل جاتی رہی اور اس کی زبان پر بجز اس کے کچھ نہ رہا کہ کہتا تھا تو کہاں ہے، لے اپنا مکان لیلے، اپنا غلام لیلے، اپنی دختر لیلے، اپنے دینار لیلے، بلکہ میں اپنی مال بھی تجھے دیتا ہوں سب لیلے۔ گویا (حالت جنوں میں) اس عامی کو مخاطب بنا کر کہتا تھا کہ اے سِرّ و فتح کے خریدار تو کہاں چلا گیا تجھے کس جگہ ڈھونڈوں، تو نے مجھے جو کچھ بھی دیا ہے وہ سب تجکو واپس کرتا ہوں اور مال کا اضافہ کرتا ہوں۔ اس قصہ کے بعد تقریباً ساٹھ برس وہ زندہ رہا۔ مگر مدت العمر مسلوب العقل اور دیوانہ ہی بنا رہا یہ قصہ سنکر کسی نے کہا حضرت اس کی تو دنیا بھی گئی اور آخرت بھی گئی۔ دونوں کھو کر بدنصیب دنیا سے اٹھا۔

فرمایا پھر اس میں کسی کا کیا بس۔ اس سے تو سِرّ و فتح بھی گیا اور ایک اور چیز بھی گئی جس کو میں کہنا نہیں چاہتا۔

نیز آپ نے فرمایا میں ایک مسلوب العقل مجنوں سے واقف ہوں، اس کا کام بجز اس کے کچھ نہیں کہ پتھر اُچھالتا اور اوپر ہوا میں پھینکتا ہے اور اپنا سر اس کے نیچے کر دیتا ہے کہ وہ اس کے دماغ پر آکر پڑتا ہے۔ مدت دراز سے میں اس کو اسی حالت میں دیکھتا تھا اور وجہ سمجھ میں نہ آتی تھی کہ ایسا کیوں کرتا ہے اب (حق تعالیٰ نے وجہ سمجھا دی اور) معلوم ہوا کہ یہ شخص تپ کہنہ کا علاج کیا کرتا تھا اور اس کی دکان کوچۂ رضیف میں تھی۔ ایک دن اس کو ایک ولی ملا اور اس نے کہا بیٹا میں چاہتا ہوں کہ تم میرے لئے ایک نئی ٹوپی خرید کر لادو۔ لو یہ درہم لیتے جاؤ اور ٹوپی خرید لاؤ۔ یہ شخص اس سے واقف نہ تھا کہ ولی کامل ہے) درہم لے کر بازار چلا گیا۔ اور ولی کھڑا ہوا اس کا انتظار دیکھتا رہا۔ اس نے ٹوپی خریدی اور اس

ولی کو دینے کے لئے چلا۔ راستہ میں اس کی نیت بگڑی اور اس کے نفس نے کہا یہ شخص جس نے ٹوپی خریدنے کے لئے تجھے درہم دیدئے بڑا ہی بیوقوف ہے۔ جان نہیں، پہچان نہیں، اس نے تجھ پر اطمینان کیسے کر لیا۔ (اب تو بیوقوف ہے اگر ٹوپی اس کو پہونچاتا ہے، خود اس کو اوڑھ لے اور اس کے پاس نہ جا۔ چنانچہ اس نے پرانی ٹوپی جو اس کے سر پر تھی اتار کر دو موزوں میں بیچدی اور اس ٹوپی کو اوڑھ لیا اور اپنی دکان پر جا بیٹھا۔ ولی کو جب معلوم ہوا کہ اس نے خیانت اور بدعہدی کی تو اس دن تو کچھ نہ بولے۔ اگلے دن سیدھے اس کی دکان پر پہونچے اور اس کو غافل پا کر سر کے اوپر سے ٹوپی اتار لی اور یہ کہہ کہ دیکھ اللہ کی کیا نعمت تجھ سے جاتی رہی، وہاں سے بھاگ گئے۔

اس خائن نے ولی کی طرف دیکھا تو اس کو فتح نصیب ہوئی اور وہ (عجائب قدرت) نظر آئے جو نہ کسی آنکھ نے دیکھے تھے، نہ کان نے سنے تھے، نہ کسی بشر کے خیال میں آئے تھے۔ جب اس نے نظر ہٹا کر اپنی دکان کی طرف دیکھا تو وہ فوراً سلب ہوگئی اور اس کی عقل جاتی رہی۔ چونکہ اس کو علم تھا کہ یہ آفت سر کی طرف سے آئی ہے (کہ نہ ٹوپی خیانت کر کے سر پر اوڑھتا اور نہ فتح جیسی نعمت سلب ہوتی) اس لئے وہ اپنے سر کے ساتھ یہ عمل کرتا ہے (کہ پتھر کا نشانہ بنا بنا کر رات دن اس کو کچلتا رہتا ہے) اب تک وہ زندہ ہے اور اپنی اسی حالت پر قائم ہے۔ چنانچہ حضرت ممدوح نے اس کو مجھے بھی دکھایا اور فرمایا یہ ہے وہ شخص جس کا میں نے قصہ سنایا تھا۔ میں نے دیکھا تو واقعی اس کا یہی حال تھا جیسا حضرت نے بیان فرمایا تھا۔

میں نے حضرت سے سرّ باطنی کے متعلق جس کی طرف صوفیہ اشارہ کیا کرتے ہیں ایک مرتبہ دریافت کیا تو آپ نے مثال کے طور پر فرمایا کہ پادشاہ کے پاس طلاء سرخ ہوا کرتا ہے جسے وہ ہر کہ دمہ کو عطا نہیں کیا کرتا۔ بلکہ جس سے خصوصی تعلق ہوتا ہے اسی کو دیا کرتا ہے۔ یہی شان سرّ باطنی کی ہے کہ (وہ کندن ہے) جسے حق تعالیٰ اپنی مخلوق میں منتخب و برگزیدہ بندوں کے سوا کسی کو عطا نہیں فرماتا۔

میں نے کہا سرّ اور فتح کیا ایک ہی چیز ہیں؟

فرمایا فتح ایک زائد چیز ہے کہ سرّ باطنی اس کی معیت میں قوت پکڑ جاتا ہے۔ کیونکہ فتح (کے معنی ہیں کشادگی اور کھل جانا یعنی جس کو یہ) نصیب ہوتی ہے اس کی بینائی میں اتنی کشود ہو جاتی ہے کہ ہفت افلاک و ہفت زمین اس کو نظر آتی ہیں۔ اور سماعت اتنی کھول دی جاتی ہے کہ پرندا گر خلاء فلک میں پر ہلائے، یا چیونٹی اپنے پاؤں کو حرکت دے تو (اس کی آواز) ایک سال کی مسافت سے اس کو سنائی دیتی ہے۔ اور قوت شامہ میں اتنی وسعت آجاتی ہے کہ مٹی کی بو اس کو سنگھائی دیتی ہے اور ہر مٹی کی بو جدا ہے

پانی کی بو وہ سونگھتا ہے، تمامی ذوات اور ارواح کی جُدا جُدا بو اس کو سنگھائی دیتی ہے، زندہ ذات کی بو جدا سونگھتا اور معلوم کرتا ہے کہ یہ زندہ حیوان کی) ہے، اور مُردہ ذات کی بو جدا سونگھتا اور امتیاز کرتا ہے کہ یہ مُردہ شے کی ہے، غرض تمامی اشیاء کی بو سونگھتا (اور فرق محسوس کرتا) ہے، اور ذوق میں اتنی کشادگی بخشی جاتی ہے کہ بدن سے مَس کئے بغیر اشیاء مذکورہ کے مزے اور ذائقے محسوس کرتا ہے۔ اور اسی طرح قوت لامسہ کو کھول دیا جاتا ہے۔

نیز سماعت اتنی کھل جاتی ہے کہ مختلف آوازیں اس پر مختلط نہیں ہوتیں اور ایک آواز کی سماعت دوسری آواز کی سماعت سے مانع نہیں بنتی۔ ہزاروں آدمیوں کی آواز کو آن واحد میں سنتا اور ہر ایک کی بات کو سمجھتا (اور جدا جدا ادراک کرتا) ہے۔ پس اگر وہ سرّ الٰہی جس کا پہلے ذکر ہوا (کہ بمنزلہ کُندن اور طلاء سُرخ کے ہے) اس فتح (اور قوت حواس و ادراکات) کے ساتھ جمع ہو جاتا ہے تو دو قوتیں اکٹھی ہو جاتی ہیں اور اگر تنہا سرّ ہوتا ہے حجاب کے ساتھ (کہ فتح حاصل نہ ہونے کا نام حجاب اور پردہ ہے) تو فقط سرّ ہی سرّ ہے۔ کہ جس کو عطا ہوتا ہے اس میں صاحب فتح کی سی قوت و طاقت نہیں ہوتی۔

میں نے کہا کہ تنہا سرّ کے حاصل ہونے سے کیا بات نصیب ہوتی ہے؟

فرمایا حق تعالیٰ کے اوصاف کی مشابہت فی الجملہ حاصل ہو جاتی ہے صاحب سرّ کیلئے امر حق طبیعت ثانیہ بن جاتا ہے، کہ حق پر چلتا ہے، حق ہی بات زبان سے نکالتا ہے، اور حق ہی سے مالوس ہوتا ہے۔ نیز اوصاف عالیہ اور اخلاق حمیدہ سے متصف ہو جاتا ہے۔ مثلاً عفو و درگذر حلم و چشم پوشی، حیا و کرم، وغیرہ اس کے خصائل و شمائل بن جاتے ہیں۔ اور اگر اس سرّ پر فتح کا بھی اضافہ ہو گیا تو دو ہری طاقت نصیب ہو جاتی ہے ف سرّ الٰہی ایک نعمت عظمٰی ہے جس کو عام اصطلاح میں نسبت مسلسلہ بولتے ہیں اور جب شیخ دیکھتا ہے کہ حق تعالیٰ نے اس کے فلاں مرید کو اس عطا سے نواز لیا تو وہ اس کو بیعت لینے اور دوسروں کی تربیت کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ اس کو خلیفہ اور مجاز کہا جاتا ہے۔ نسبت درحقیقت بندہ کا اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہ کے ساتھ ایک ارتباط قلبی ہے، اور یہ اس کے آثار و ثمرات ہیں۔ یعنی حق گوئی و حق عملی اس کا ایسا امر طبعی بن جاتا ہے جیسا چلنا پھرنا اور کھانا پینا کہ اس میں تکلف اور آورد کی ضرورت نہیں رہتی۔ اخلاق رذیلہ مثلاً کبر و بغض و حسد وغیرہ سے طبعاً ایسی نفرت ہو جاتی ہے جیسے بول و براز اور گھناونی چیزوں سے نفرت ہوتی ہے اور اخلاق حمیدہ مثلاً صبر و شکر و توکل وغیرہ سے ایسا انس ہو جاتا ہے جیسا شیریں پھلوں اور لذیذ غذاؤں سے اُنس ہوتا ہے۔ سرّ الٰہی گویا ایک صحیح و بے عیب تخم ہے جس سے وہ شاداب درخت پیدا ہوتا ہے جس کے پتے سبز، پھول خوشبودار، اور پھل رسیلے اور مزہ دار ہوں۔ یا یوں کہو کہ نسبت باطنیہ روح کے لئے بمنزلہ

صحت و تندرستی کے لئے کہ لطیف غذاؤں کی رغبت ہوگی، اور کثیف غذاؤں سے وحشت، جو کھائے گا وہ ہضم ہوگا اور بدن کو لگے گا کہ ہر عضو میں طاقت آئے گی اور تمامی جوارح کو قوت پہونچے گی۔ واعظین اسلام جس اصلاح کی ان دو رباعیوں میں تولاً نصیحت کرتے ہیں کہ ؎

اور	خواہی کہ شوی بمنزل قرب مُقیم صبر و شکر و قناعت و علم و یقین خواہی کہ شود دلِ تو چوں آئینہ حرص و امل و غضب دروغ و غیبت	دیگر	نہ چیز بہ نفس خویش فرما تعلیم تفویض و توکل و رضا و تسلیم وہ چیز بروں کن از درون سینہ بخل و حسد و ریا و کبر و کینہ	

ان کی عملی حالت اور اتصاف کا نام نسبت اور سرِ الٰہی ہے۔ اور فتح نام ہے ملکوتی مشاہدہ کا کہ ادراکات و حواس باطنیہ میں بیش از بیش قوت آجاتی ہے۔ پھر اس قوت کے بھی کثیر مراتب ہیں، جس درجہ کی قوت نصیب ہوگی اسی درجہ کی فتح کہلائے گی۔ اور اسی بنا پر کہا کرتے ہیں کہ فلاں ولی کی فتح ضعیف ہے اور فلاں کی قوی ہے۔ صاحبان خدمت جن کے متعلق حق تعالیٰ نے نظام عوالم فرمایا ہے وہ عموماً فتح سے نوازے جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک ملک اور رعیت کا مشاہدہ حاصل نہ ہو اس کا نظم انجام نہیں دے سکتے۔ اور ہر چند کہ یہ حضرات محض مظاہر امر الٰہی اور کارکنان قضا و قدر ہوتے ہیں کہ اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں اس لئے کہ عالم میں متصرف حقیقی بجز حق تعالیٰ کے کوئی نہیں۔ اور ہمیں تو اس کا محض عقیدہ ہی ہے لیکن ان حضرات کو یہ حقیقت بھی منکشف ہو کر علم الیقین بلکہ عین الیقین حاصل ہوتا ہے۔ مگر چونکہ نظام عالم میں تنفید مشیت صورۃً انہیں حضرات کے ہاتھوں ہوتی ہے اور ان کی قوۃ ارادیہ کو سبب کی شکل میں واسطۂ کار بنایا جاتا ہے۔ اس لئے تقرب الٰہی میں ان کا بڑا درجہ ہے۔ اور یہ جراعت امت محمدیہ کے منتخب و چیدہ کی افراد کی ہے۔ سرِّ الٰہی اور فتح و حجاب کا لفظ اس کتاب میں جگہ جگہ آیا ہے اور میں وعدہ کر آیا تھا کہ آیندہ اس کی حقیقت واضح ہوگی۔ چنانچہ کتاب کے اسی مقام کا انتظار تھا اور آج ایفاء وعدہ سے الحمد للہ سبکدوش ہوا۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ فتح کا جب کسی ذات پر نورِ قوت سے قبل نزول ہو جاتا ہے تو ذات کو اختلال اور نقصان پہونچ جاتا ہے کہ مر جاتا ہے یا مسلوب العقل (مجذوب) ہو جاتا ہے۔ اور اگر ذات پر پہلے قوت کا نور (اور تحمل و برداشت کی طاقت) نازل ہو اور پھر اس کے بعد فتح کا نزول ہو تو ذات کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا (اور وہ صاحب فتح سالک و ولی کامل بن جاتا ہے)

میں نے عرض کیا کہ وہ قوت کیا ہے؟

آپ نے گھاس کے ایک تنکے کی طرف جو وہاں پڑا ہوا تھا اشارہ کر کے فرمایا کہ اگر وہ قوت جس کا ہم

تذکرہ کر رہے ہیں حق تعالیٰ اس تنکے کو عطا فرمادے تو یہ اس پہاڑ کو اٹھالے، اور پہاڑ کی طرف انگلی کا اشارہ کیا جو ہمارے سامنے تھا۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا خوش نصیب اور صاحب توفیق وہ ہے جو حق تعالیٰ سے اس کی درخواست کرے کہ نور فتح کے نزول سے پہلے قوت (و برداشت) کا نور نازل فرمائے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ میں اپنی ابتدائی حالت میں ایک مرتبہ حضرت منصور کی خدمت میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ رو رہے ہیں۔ حضرت ممدوح غزلی تھے یعنی کتان بننے کا پیشہ کیا کرتے تھے۔

میں نے رونے کا سبب پوچھا۔ تو فرمایا ہم اصلاح کس چیز کی کریں (ہمارے ہاتھ میں تو کچھ بھی نہیں) اب مجھے بننے کی حالت میں فعل الٰہی کا مشاہدہ ہوتا ہے۔ میں سمجھا کرتا تھا کہ میں کچھ کر رہا (اور خود کپڑا بُن رہا) ہوں مگر (حقیقت یہ منکشف ہوئی کہ) کوئی اور (یعنی ذات حق سبحانہ) ہی ہے جو سب کچھ کر رہی ہے۔ حضرت فرماتے تھے کہ اس وقت میری سمجھ میں نہ آیا جو جواب دیتا۔ مگر آج میں واقف ہوں کہ مجھے کیا عرض کرنا چاہیئے تھا۔

میں نے پوچھا وہ کیا ہے جو آپ ان سے فرماتے

فرمایا ان سے یہ عرض کرتا کہ اللہ جل جلالہ سے ترقی طلب کیجئے کہ اوپر چڑھائے (اور اپنی ذات و صفات کا مشاہدہ نصیب فرمادے) ابھی تک آپ حادث (اور فانی) ہی چیزوں کے مشاہدہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ کیونکہ افعال الٰہیہ تو منجملہ اس کی مخلوقات حادثہ کے ہیں۔ میں نے دریافت کیا کہ حضرت منصور نے کیا اس حالت سے ترقی پائی؟ فرمایا (اسی درجہ میں) آپ کی وفات ہو گئی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ میرے شیخ حضرت عمر ہواری قدس سرہ کے اوصاف کمالیہ سے (جن کو وہ مخفی رکھا کرتے تھے) اگر لوگ واقف ہو جاتے تو دوسرے زندہ ولیوں مثلاً فلاں اور فلاں کے پاس کبھی نہ جاتے۔ کیونکہ حضرت ممدوح میں چار خوبیاں ایسی تھیں جو دوسروں میں ملنی مشکل تھیں۔

اوّل وہ کسی کے بارے میں کبھی کچھ نہ کہتے تھے۔ اور کسی کو بھی نہ علانیہ کبھی بُرائی سے یاد کرتے تھے نہ خفیہ۔

دوم عزلت ان کو بیحد پسند تھی۔ کہ تمامی عمر علی بن حرزہم کے روضہ میں سجادہ بنے رہے مگر سب سے یکسو اور اپنے خلوت خانہ میں دن بھر تسبیح و تہلیل اور دلائل الخیرات کے پڑھنے میں مشغول رہتے تھے۔ اور مغرب کے وقت اپنے گھر چلے جاتے تھے۔ زائرین کی جب کثرت ہوتی تو روضہ بھی چھوڑ دیتے اور باب روضہ کے سامنے سدرۂ محررہ میں جا بیٹھتے۔ اور سب سے الگ اپنے شغل میں لگے رہتے تھے۔

سوم فضول اور عبث کام سے بالکل محفوظ تھے۔ پھر اپنے آپ کو کچھ بھی نہ سمجھتے تھے قابل یا کثیر کوئی

عبادت بھی اپنی طرف منسوب نہ کرتے تھے (سب اللہ کا فضل و انعام سمجھتے تھے) حتیٰ کہ جتنے لوگ روضہ میں بغرض زیارت آتے خصوصاً (ذاکرین و شاغلین) جو وہاں شب بیداری کیا کرتے تھے ان کو بھی مطلق پتہ نہ تھا کہ شیخ عمر صاحب سرّ اور اہل نسبت ہیں۔ شیخ علی روضہ میں حاضر رہتے تھے۔ اور زائرین سب انہیں کے پاس جاتے اور وہیں اُن سے ملتے جلتے تھے۔ نہ ان سے کوئی دعا کا خواستگار ہوتا تھا نہ فاتحہ خوانی و ایصال ثواب کا

چہارم زہد کہ لذات دنیا سے بچتے تھے۔ جب سے مجھے ان کی صحبت اور مخالطت نصیب ہوئی اکثر میں نے دیکھا کہ آپ علی الصباح شیخ علی کے پاس آتے اور آپ کے پاس روٹی کا سوکھا ٹکڑا بھی نہ ہوتا تھا۔ شیخ علی کے پاس (کسی کا دیا ہوا ہدیہ یا نذرانہ) آگیا تو انہوں نے بھی اس میں سے کچھ کھا لیا ورنہ تمام دن فاقہ سے گذارتے اور خالی پیٹ بھوکے پیاسے اپنے ذکر و شغل میں لگے رہتے تھے۔ میں دیکھا کرتا تھا کہ بعض دفعہ ان کو روکھی روٹی کا ٹکڑا مل جاتا تو شیخ علی سے ذرا سا روغن زیت لے لیتے اور اس میں قدرے نمک ڈال کر اسں میں چور کر روٹی کھا لیا کرتے تھے۔ اور اگر زیت بھی نہ ملتا تو پانی میں نمک گھول کر اس میں بھگو بھگو کر روٹی کھایا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے فرمایا اولیاء میں ایک خصلت ایسی ہے کہ لوگوں کو اگر اس کا اور اس کی راحت و لذت کا علم ہو جائے تو جو کچھ بھی ان کو (دنیا کا زر و مال) حاصل ہے (اس کے مقابلہ پر) سب پھینک دیں اور وہ یہ ہے کہ مصیبت یا کلفت (جس کا پیش آنا مقدر ہو چکا ہے) جب تک سر پر نہ آپڑے ولی کو نہ اس کا فکر ہوتا ہے نہ اس کی وجہ سے کوئی پریشانی لاحق ہوتی ہے۔ اگر اس کو ظن غالب بلکہ یقین بھی ہے کہ وہ عنقریب ایک ہی گھڑی بعد یا اس سے بھی کم میں نازل ہونے والی ہے۔ تو اس کی نظر میں بمنزلہ عدم کے ہے کہ اس کو بالکل بھی اس کا حس و شعور نہ ہوگا تم اس کو دیکھو گے کہ بہ زمانہ آئندہ جو حادثہ اس کو پیش آنے والا ہے حالانکہ وہ اس کا مشاہدہ کر رہا ہے مگر کھا بھی رہا ہے، پی بھی رہا ہے، بیوی سے ہمبستری بھی کر رہا ہے غرض ایسا مطمئن ہے گویا ناواقف ہے کہ نہ اس کی مطلق بصیرت حاصل ہے اور نہ اُسے علم ہے کہ کیا ہوا چاہتا ہے۔ (یہ سکون ایسی نعمت ہے کہ کبھی پریشانی اور تکدر پاس بھی نہیں آتا) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں حق تعالیٰ کے تصرف کا کوئی شخص بھی احاطہ نہیں کر سکتا۔ لوگ جس بات کو سمجھیں کہ ہونے والی ہے، ممکن ہے کہ اللہ کا تصرف اس کو قطع کر دے اور وہ ہو نہ سکے۔ غرض ان کی نظر حق تعالیٰ کے آزاد اور بے قید تصرف پر پڑتی ہے کہ (اس کی قدرت و مشیت نہ کسی کے کشف کی پابند ہے نہ لوح کی لکھت یا ولی کے مشاہدہ کی۔ اگر موافقت فرماتا ہے تو اپنے ارادہ و اختیار ہی سے فرماتا ہے نہ کہ پابند اور مجبور ہو کر۔ پس باوجود امر مقدر کا مشاہدہ ہو جانے کے جانتے ہیں کہ تحت قدرت الٰہیہ اور

زیر تصرف خداوندی ہے۔ کیا ضرور ہے کہ وہ اس کا پابند ہو اور یہ ہو کر ہی رہے) پس اس خصلت میں اتنی راحت ہے کہ اس کی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی۔ اور جب امور مقدرہ کا مشاہدہ کرنے والے صاحب فتح ولی کی یہ حالت ہے تو صاحبِ حجاب کی کیا حالت ہونی چاہئے (جسے پیش آئندہ حادثہ کا قبل از وقت علم ہی نہیں ہوا) اُس کو تو لازم و ضروری ہے کہ تدبیر کے اہتمام سے سبکدوش اور سوٴ تقدیر سے مستریح و بے فکر بنا رہے (کہ جو مقدر ہے ہو رہے گا قبل از مرگ واویلا سے کیا حاصل خصوصاً جب کہ اپنی تدبیر کا کوئی نتیجہ بھی نہیں (کہ مقدر کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور ساری دنیا بھی اس کو روکنا چاہے جس کا نزول حق تعالیٰ نے طے فرمایا ہے تو ایک لمحہ کے لئے بھی نہیں روک سکتی)

میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ وہ کونسا ولی ہے جس کے لئے تین سو چھیاسٹھ [۳۶۶] ذات ہوتی ہیں؟

فرمایا صرف غوث کہ وہی انوار محمدی کا وارث کامل ہوتا ہے۔

میں نے عرض کیا اور موروث[1] اعظم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تو ایک لاکھ چوبیس [۱۲۴۰۰۰] ہزار ذات ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ غوث ان سب کا وارث نہیں ہوا؟

فرمایا جتنی طاقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں تھی وہ کسی میں بھی نہیں ہے۔ اور غوث کے وارث ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ (انوار محمدیہ) جس مقدار میں اس نے پیے ہیں اتنے (اس زمانہ میں) کسی نے بھی نہیں پیے۔ ف بندۂ ناچیز اس عبارت کا جو مفہوم سمجھا ہے اس کو ذرا بسط کے ساتھ عرض کرتا ہے۔ اللہ جل جلالہٗ کی مرضیات جن کو انسانی کمالات اور مظاہر انوار الٰہیہ کہنا چاہئے کثیر در کثیر ہیں جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہے۔ پھر ان کمالات میں بھی ضعف اور قوت کے کثیر درجات اور بلحاظ کمیت و کیفیت مختلف مراتب ہیں۔ مثلاً اللہ تعالیٰ سبحانہ پر کمال ایمان، اس کے ساتھ محبت تامہ، اس کی معرفت کاملہ، علم، یقین، تفویض، توکل، رضا، تسلیم، فہم، ذکا، فراست، فطانت، عبادت، ریاضت، نصرت، سیاست، شجاعت، ہمت، ایثار، رقت قلب، تعلیم، فرح بر نعمت، حق جوار، اطاعت، صدق، وفا، صبر، شکر، قناعت، زہد، حلم، عدل، خوف، خشیۃ، عزم، استقلال، استقامت، حیا، عفت، عصمت، حب فی اللہ، بغض فی اللہ، اخلاص، ادب، تواضع، رحم، عفو، جود، کرم، رفق، شفقت، رافت، حنانت، عجز، انکسار، میانہ روی، مہمان نوازی، مسکنت، سادگی، خندہ روئی، حسن خلق،

---

[1] جس کی وراثت دوسرے کو ملتی ہے اس کو موروث کہتے ہیں کہ وارث اسم فاعل ہے اور موروث اسم مفعول، عوام اس کو غلطی سے مُورث بولنے لگے حالانکہ وہ متعدی اور باب افعال سے ہے۔ ۱۲ مترجم

حُسن معاشرت، حسن معاملہ، سلطنت، رعایا پروری، جان نثاری، طہارت، عبدیت، خشوع، غیرت، انبساط، سادگی، بے تکلفی، اخوت، مساوات، امارت پسندی سے اجتناب، طول امل سے نفرت عدم حرص، عدم بخل، عدم کبر، لطف طبع، حسن صورت، جمال، ملاحت، نزاکت، اعتدال وغیرہ وغیرہ سب جدا جدا محاسن ہیں اور ہر حُسن کے بلحاظ متعلقات متعدد اجزا اور مختلف اقسام ہیں۔ مثلاً ایمان باللہ میں ذات باری پر ایمان جیسا بھی وہ حقیقت میں ہے، اس کے علم قدیم پر ایمان، اس کی قدرت غیر متناہیہ پر ایمان، اس کے سمیع ہونے پر ایمان، اس کے بصیر ہونے پر ایمان، اس کے واحد لاشریک ہونے پر ایمان، اس کے تصرفات اور کُلَّ یَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ پر ایمان، اس کی مشیت وارادہ پر ایمان قرآن مجید کے کلام اللہ ہونے پر ایمان، تقدیر پر ایمان، ملائکہ پر ایمان، بعث پر ایمان، پُلصراط پر ایمان، میزان پر ایمان، جملہ مغیبات پر ایمان، حشر ونشر پر ایمان، جنت اور مَا فِيهَا پر ایمان دوزخ اور مَا فِيهَا پر ایمان، عرش، عرش وکرسی پر ایمان، لوح محفوظ اور اسکی لکھت پر ایمان، وغیرہ وغیرہ جن کو علمار کلام نے عقائد اسلام کا درجہ دیا ہے، علیٰ ہذا عبادت میں مثلاً نماز کی محبت، روزہ کی محبت، حج کا شوق، زکوٰۃ اور صدقات سے انس، تلاوت قرآن مجید کا ذوق، اعتکاف کا جذبہ وغیرہ وغیرہ جس کا عنوان کتاب العبادات ہے اسی طرح مثلاً صدق میں صدق مقال وراستگوئی، صدق افعال، صدق حال۔ یا مثلاً شفقت میں دشمنوں پر شفقت، اہل کتاب پر شفقت، مشرکین پر شفقت، عورتوں پر شفقت، بچوں پر شفقت، یتامیٰ پر شفقت، بیوگان پر شفقت، اپاہج ومعذورین پر شفقت، جانوروں پر شفقت، ذبیحہ وقربانی پر شفقت، جنگلی پرندوں پر شفقت، صحرائی درندوں پر شفقت، عصاۃ پر شفقت، عباد وزہاد پر شفقت، رہبان وگبر وترسا پر شفقت، غلاموں پر شفقت، وغیرہ وغیرہ۔ غرض ہر خصلت حمیدہ میں خواہ وہ عمل کے متعلق ہو یا خلق کے اور قلب سے تعلق رکھتا ہو یا جوارح سے، اور تصور ومراقبہ سے متعلق ہو یا فکر وتخیل سے، اور ظاہر ہو یا باطن: بہر حال متعدد اجزا، نکلیں گے جن کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوگی۔ محض نمونہ کے درجہ میں مختصراً چند کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ پھر ان محاسن کا ایک ادنیٰ درجہ ہے کہ اس سے نیچے اُتر کر حُسن کا وجود ہی باقی نہیں رہتا، اور ایک اعلیٰ ترین درجہ ہے کہ اس سے اوپر کسی بشر کو حاصل نہیں ہوا۔ ان اوصاف کمالیہ میں جس ذات اور جس شخص کو ایک کمال بھی حاصل ہو جائے وہ اس صفت خاصہ میں کامل اور مستقل ذات کہلائیگی مگر سیدنا ومولانا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو حق تعالیٰ شانہ نے ان تمامی کمالات انسانیہ کے اعلیٰ ترین درجہ سے نوازا ہے کہ کسی ظاہری وباطنی حُسن کا کوئی جزو بھی ایسا نہیں جس کے انتہائی درجہ پر آپ کو نہ پہونچا دیا گیا ہو، اسی بنا پر آپ کی ذات مقدسہ کو جامع الکمالات کہا جاتا ہے، اور یہی آپ کی محبوبیت کاملہ کا

سبب ہے، عالم ارواح میں آپ کی روح پُرفتوح سے حضرات انبیاء علیہم السلام کی ارواح طیبہ نے استفاضہ فرمایا اور اپنے اپنے نور نبوت کی استعداد کے موافق ایک ایک کمال کو خصوصی طور پر اخذ کیا تو ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں انوار کمالات محمدیہ کی تقسیم پوری ہوئی کہ سیدنا ابراہیم علیہ السلام نے کمال توحید لیا اور حنیف قرار پائے۔

سیدنا موسیٰ علیہ السلام نے کمال بغض فی اللہ لیا،
سیدنا عیسیٰ علیہ السلام نے کمال رحم وحنانت اخذ کیا۔
سیدنا یحییٰ علیہ السلام نے کمال خوف وخشیہ لیا۔
سیدنا داؤد علیہ السلام نے کمال عدل، اور خوش الحانی کو اخذ کیا،
سیدنا سلیمان علیہ السلام نے سلطنت وسیعہ اور فہم باطنی کا کمال حاصل کیا۔
سیدنا ایوب علیہ السلام نے کمال صبر اخذ کیا۔
سیدنا اسمٰعیل علیہ السلام نے کمال صدقِ وعد لیا۔
سیدنا یوسف علیہ السلام نے کمال حسن صورت لیا وغیرہ وغیرہ۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ حضرات انبیاء میں بجز اس حسن وخوبی کے اور کوئی خوبی آئی نہیں۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ کمالات سارے حاصل کئے مگر خاص اس کمال میں خصوصی اور بالائی وامتیازی درجہ حاصل کیا جیسے بلاتشبیہ مدرسہ کے پچاس طلبہ اپنے جامع علوم وفنون استاد سے درسی تمام علوم پڑھتے ہیں اور بقدر ضرورت سب میں کامل دست گاہ حاصل کرتے ہیں۔ مگر باوجود اس کے خدا داد طبعی مناسبت کے سبب کسی کو علم تفسیر میں زیادہ کمال حاصل ہوتا ہے اور وہ مفسر کہلایا جاتا ہے، اور کسی کو علم حدیث میں زیادہ کمال حاصل ہوتا ہے اور اس کا نام محدث پڑ جاتا ہے کوئی ادیب بنتا ہے کوئی خطیب کوئی فقیہ کوئی صرفی کوئی نحوی کوئی منطقی کوئی اصولی وغیرہ وغیرہ جس کا یہی مطلب ہے کہ تمامی فنون کی مہارت رکھتے ہوئے خاص اس فن میں اس کو امتیازی کمال حاصل ہوا ہے۔ اسی طرح تمامی حضرات انبیاء علیہم السلام ایک لاکھ چوبیس ہزار کمالات سے نوازے گئے ہیں کہ برگزیدہ خلق ہیں، معصومین ہیں، خلاصہ کائنات ہیں، اور بہترین افراد عالم ہیں۔ مگر خصوصی وامتیازی درجہ میں اُستاذ الکل جامع الکمالات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انوار کی تحلیل وتجزیہ کے وقت اس ایک کمال کے ساتھ اُن کو اُنس زیادہ ہوا اور مناسبت طبعیہ کی وجہ سے اس کو زیادہ مقدار میں اخذ کیا۔ گویا یوں کہئے کہ ایک ذات محمدی کے کمالات جدا جدا ہو کر ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیا کی ذوات میں منتقل ہوئے اور ہر کمال جس کے لئے ایک مستقل ذات ہونی چاہئے تھی

سب یکجا جمع ہو کر ایک ذات محمدیؐ میں سما گئے ؎

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری — آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

چنانچہ قرآن مجید میں جہاں ان حضرات انبیاءؑ کے تذکرے آئے ہیں اور ان کو جدا جدا امتیازی خوبیوں کے ساتھ متصف کیا گیا ہے کہ کسی کی شان میں آیا ہے وہ سب طرف سے منہ موڑ کر صرف اللہ کے ہو رہے تھے، کسی کے متعلق مذکور ہے وہ اپنے متعلقین کو نماز کا حکم کیا کرتے تھے، کسی کی شان ہے وہ صابرین میں سے تھے، کسی کا تذکرہ ہے کہ وہ وعدہ کے سچے تھے، وغیرہ وغیرہ اس کا یہی مطلب ہے کہ تمامی کمالات بقدر ضرورت تمامی انبیاءؑ میں تھے مگر خاص اس صفت میں ان کو شغف و اہتمام اور خصوصی امتیاز حاصل تھا۔ اور یہ وہی کمال تھا جس کو ان کی روح مقدسہ سے عالم ارواح میں روح محمدی سے لیا اور اپنی خداداد مناسبت طبعیہ کے سبب خاص اس کمال کو اونچے درجہ میں لیا۔ جس شخص کو حق تعالیٰ علم وسیع عطا فرمائے کہ وہ کمالات کی حقیقت اور ان کے مراتب مختلفہ سے آگاہ ہو جائے اور پھر تمامی حضرات انبیاء علیہم السلام کے واقعات و سوانح اور ان کے الوان طبعیہ بھی معلوم ہو جاویں تو اس کو صاف نظر آ جائے گا کہ ہر نبی میں ایک خاص کمال خصوصی و امتیازی درجہ میں ایسا حاصل ہے کہ دیگر انبیاءؑ میں وہ کمال اس درجہ پر نہیں پایا جاتا۔

اور بالاجمال اسی سے پتہ چل جائے گا کہ اگر وہ روایت جس میں حضرات انبیاءؑ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی گئی ہے صحیح ہے تو کمالات روحانیہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار ہی ہے۔ کہ ہر کمال جدا جدا ایک ذات کو دیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی جس وقت کوئی شخص سوانح محمدیہ پر نظر ڈالے گا اور ولادت سے لے کر وفات تک کے واقعات جو تاریخی روایتوں سے بدرجہا زیادہ اہتمام سند و ثقاہت پر مرتب ہیں اور ہر زبان میں مذکور ہر کافر و مسلم کے سامنے ایسے کھول کر رکھ دیئے گئے ہیں جیسے آسمان پر سورج کہ کسی سے اس کا کوئی حال چھپا ڈھکا نہیں، تو واللہ العظیم اس کو اقرار کرنا پڑے گا۔ کہ یہی کمالات تھے جو جدا جدا انبیاءؑ سابقین لے کر دنیا میں تشریف لائے تھے۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ اس کی کوئی دلیل نہیں کہ عالم ارواح میں ان کمالات کی تقسیم روح محمدیؐ سے ہوئی تھی اور سب نے ان محاسن کو آپؐ ہی سے اخذ کیا تھا۔ مگر جب ہم دیکھتے ہیں کہ جس وقت وہی ذات محمدی جس کی روح کو ہم نے سید الارواح اور استاذ الانبیاءؑ مانا ہوا ہے جسد ترابی اور جسم عنصری لے کر دنیا میں تشریف لائی تو بعینہ اس کے فیوضات روحانیہ کی یہاں بھی وہی تقسیم ہوئی ہے۔ کہ جس وقت آپ نے سنگستان عرب میں کلمہ توحید کا اعلان کیا ہے تو ایک متنفس بھی آپ کا ماننے والا نہ تھا۔ مگر اس کے تیئس برس بعد جب آپ نے وفات پا کر عالم قدس کا سفر کیا ہے تو حضرات صحابہ کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار چھوڑی ہے۔ اور اس پاک باز اور افضل ترین امت جماعت میں

بھی ہم یہی دیکھتے ہیں کہ تمامی روحانی کمالات ہر ایک نے اخذ کئے مگر خصوصی درجہ میں ایک ایک کمال ایک ایک صحابی نے اُس عالی درجہ پر لیا کہ اس میں اس کا کوئی ثانی نہیں آتا۔

مثلاً توحید وکمالِ ایمان حضرت صدیق ؓ میں ممتاز ہے۔

تو رعایا پروری و نظم سلطنت حضرت فاروق اعظم ؓ میں۔

حیا کا غلبہ حضرت عثمان ؓ ذوالنورین میں ہے۔

تو کمال شجاعت حضرت علی ؓ بن ابی طالب میں۔

زہد کا غلبہ حضرت ابوذر میں ہے تو اشاعت علم کا غلبہ حضرت ابوہریرہ میں، کوئی شب بیداری سے زیادہ مانوس ہے، تو کوئی کثرت اسفار میں مشہور، کوئی مہمان نواز زیادہ تھا، اور کوئی ایثار میں بے نظیر۔

غرض تمامی صحابہ کی پوری سوانح عمریاں یکجا اور بیک نظر محفوظ ہوں تو آفتاب نصف النہار کی طرح واضح ہوگا کہ اصل کمالات روحانیہ میں جن پر رضا رحق مرتب و متفرع ہے سب کامل تھے۔ مگر کسی نہ کسی خوبی میں اکمل بھی ضرور تھے۔ اور وہی ان کی امتیازی شان تھی جو سونے پر سہاگہ بن کر ان کو اپنے جدا رنگ سے چمکا رہی ہے۔ یہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کی ذوات میں انوار محمدیہ کی تحلیل عالم جسد اور دنیا کے اندر، واضح کر رہی ہے کہ انبیاء سابقین کی ایک لاکھ چوبیس ہزار ذوات میں بھی انوار محمدیہ کی یہی تحلیل عالم ارواح اور دار آخری میں ضرور واقع ہوئی تھی۔ اُن حضرات نے متقدمین و سابقین بن کر ترتیب دار تمامی کمالات محمدی کو فرداً فرداً کھولا۔ اور حضرات صحابہ نے متاخرین ولاحقین بن کر تمامی کمالات محمدیؐ کو فرداً فرداً واضح کیا۔ میرے نزدیک یہی مفہوم ہے شیخ کی اس عبارت کا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار ذوات ہیں۔ یعنی ہر کمال کے لئے ایک مستقل ذات ہے، اور وہ مقبولیت اور ملائکہ پر مباہاۃ و ثبوت اکملیت کافی ووافی ہے۔ مگر ذات محمدیؐ مجموعہ ہے ان ایک لاکھ چوبیس ہزار ذوات کا کہ جس کمال کا تحمل جدا جدا ایک ایک ذات نے کیا تھا، تنہا ذات محمدیؐ ان سب کی یکجا حامل و متحمل ہوگئی۔

نیز اس خصوصی کمال میں بھی جو شان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے وہ دیگر انبیا کی نہیں۔ کہ باوجود جامع ہونے کے آپ کا ہر کمال نبی کے خصوصی کمال سے برتر اور قوی تر اور بہتر ہے۔ پھر تحلیل انوار محمدیہؐ سے یہ شبہ نہ کیا جائے کہ تقسیم کے بعد ذات محمدیہؐ عیاذاً باللہ خالی ہوگئی۔ تاکہ یہ تقسیم حوادث دنیا اور امور فانیہ کی نہیں بلکہ انوار کی ہے جنکی شان یہ ہے کہ ایک چراغ سے دس لاکھ چراغ روشن کرلو، مگر اس کے نور میں تل برابر فرق نہ آئے گا

نیز یہ بھی شبہ نہ کیا جائے کہ حضرات صحابہ کی شان حضرات انبیاء کی برابر ہوگئی۔ کیونکہ استفادہ

اور اخذ نور اپنی اپنی استعداد و قابلیت کے موافق ہوا کرتا ہے۔ ایک قمقمہ صرف دو بتی کی برقی روشنی لے سکتا ہے اور دوسرا قمقمہ پچاس بتی کا متحمل ہو سکتا ہے۔ ہرچند کہ مخزن و منبع ایک ہے مگر آخذ و مستفید میں جتنی طاقت ہوگی اسی مقدار میں استفادہ کرے گا۔ پس حضرات انبیاء علیہم السلام کی فطری استعداد بوجہ نور نبوت، نور رسالت، نور علم، نور بسط، نور فہم، نور عصمت اور سلامتی قلب، کے ایسی بڑھی ہوئی تھی جیسے کسی چراغ میں اعلیٰ درجہ کا صاف شفاف تیل پڑا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ جب وہ دوسرے چراغ سے روشن کیا جائے گا تو اس کی روشنی اتنی صاف اور کھلی ہوئی ہوگی کہ دوسرے چراغ کی جس میں دوسرے نمبر کا تیل ڈالا گیا ہو اتنی صاف روشنی نہ ہوگی۔ حالانکہ وہ بھی اسی چراغ سے روشن کیا گیا ہے۔ اس لئے ہرچند کہ عالم ارواح میں جس کمال کا نور ایک پیغمبر نے مشکوٰۃ محمدیؐ سے حاصل کیا ہے وہی نور ایک صحابی نے عالم اجساد میں اسی مشکوٰۃ محمدیؐ سے حاصل کیا ہے، مگر جو فرق نبی اور غیر نبی میں ہونا چاہئے وہ اس حاصل کردہ نور کی قوت میں ضرور نمایاں ہوگا اور اس لئے صحابہ کا نبی ہونا لازم نہ آیا البتہ شبیہ ہونا ثابت ہو سکے گا جیسا کہ علماء امتی کانبیاء بنی اسرائیل کا مفہوم ہے بشرطیکہ اس کا حدیث ہونا محقق ہو جائے۔

میرا دل چاہتا تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کم از کم اتنے کمالات کے اظہار اور ثبوت میں جن کے عنوانات میں نے گنوائے ہیں واقعات نقل کروں کہ ہر دعویٰ بعد شہادت ہی مقبول ہوتا ہے۔ مگر طول بہت ہو جائے گا جو ترجمہ کتاب کے مناسب نہیں۔ اس لئے دیگر کتب سیر پر محول کرتا ہوں جو بکثرت شائع ہو چکی ہیں، ہاں اتنا ضرور کہتا ہوں کہ جتنے بھی واقعات حیات شریفہ میں پیش آئے ہیں خواہ خانہ داری کے ہوں، یا جہاں بانی کے، اور رات کو پیش آئے ہیں، یا دن کو ہر واقعہ ایک جدا کمال کا مظہر ہے۔ گویا پوری سوانح محمدیہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کمالات انسانیہ کو عملاً بیان کرنے والی ہے کہ دو واقعہ ایک ہی کمال کے مظہر نہ نکلیں گے۔ فرق اگرچہ اتنا دقیق ہوگا کہ ادراک کرنا دشوار ہے مگر یہ ناممکن ہے کہ آپ کے سوا لاکھ کمالات میں کوئی کمال واقعہ کی شہادت سے خالی رہ گیا ہو۔ ان کو دیکھ کر کوئی کافر بھی بشرطیکہ ضد اور ہٹ سے خالی ہو مسلمان اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا شیدا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ مگر زیادہ افسوس اپنے بھائیوں پر ہے کہ وہ آنحضرتؐ روحی فداہ کی شان کمال سے اتنے غافل ہو گئے کہ حد نہ رہی۔ چاہئے تو یہ تھا کہ سیدنا موسیٰ اور سیدنا عیسےٰ علیہما السلام بھی دنیا میں تشریف لاتے اور اپنا کوئی مسلک خاص بیان فرماتے تو ہم بصد ادب عرض کرتے کہ یا نبی اللہ آپ پر اللہ کا ہزاراں ہزار صلوٰۃ وسلام مگر

عمل کے لئے تو ہمیں اپنے باپ کی تعلیم بالکل کافی اور خاتم النبیینؐ کا مسلک قطعاً وافی وشافی ہے کسی دوسرے رہبر کی ضرورت نہیں۔ چہ جائیکہ آباو اجداد یا لیڈران قوم یا مدعیان اصلاح کفار کی تجاویز پر نگاہ محبت یا اس پر عمل ہو۔ فیا اسفی انما اشکوا بثی وحزنی الی اللہ۔

غوثِ زمانہ چونکہ اپنے زمانہ کا اکمل الاولیاء اور نائب رسول وقائم مقام پیغمبر ہوتا ہے اس لئے وہ تمامی اہل زمانہ اولیاء امت سے زیادہ یعنی تین سو چھیاسٹھ خصوصی کمالات سے سیراب کیا جاتا ہے۔ مگر اس کا بھی یہ مطلب نہیں کہ وہ حضرات صحابہ یا حضرات انبیاء سے بڑھ گیا کہ نبی سے غیر نبی کا افضل ہونا محال ہے۔ اور اسی طرح یہ بھی محقق ہے کہ غیر صحابی خواہ قطب ہو یا غوث صحابی کے درجہ سے نہیں بڑھ سکتا۔ پس اس کا مطلب بھی وہی ہے کہ حضرات انبیاء کا استفاضۂ کمالات عالم ارواح میں اور حضرات صحابہ کا استفادۂ کمالات عالم اجساد میں گو خصوصی درجہ پر تقریباً سوا لاکھ شیون محمدیہ میں سے کسی ایک شان کا ہوا ہے، مگر جس طرح صحابی اس شان میں نبی کے برابر نہیں پہونچا۔ اسی طرح کوئی قطب یا غوث اس شان میں صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہونچ سکا۔

نیز گو خصوصی استفادہ ایک کمال میں ہوا مگر عمومی استفادہ اور تمامی کمالات میں ہوا ہے اور حضرات انبیاء وصحابہ کا یہ عمومی استفادہ بھی مابعد حضرات کے خصوصی استفادہ سے بڑھا ہوا ہے۔ کہ وہ براہ راست وبلاواسطہ اور بالمواجہہ ہوا تھا اور اغواث واقطاب کا استفادہ بالواسطہ اور برزخی فیضان سے ہوا ہے۔ اس لئے غوث کا تین سو چھیاسٹھ شیون محمدیہ میں اکمل ہونا صرف اپنے ہمعصروں کے اعتبار سے ہے کہ اس درجہ کا شُربِ انوار محمدیؐ اس کے زمانہ میں کسی کو نصیب نہیں ہوا نہ کہ حضرات صحابہ کے اعتبار سے کہ اُن کا عموم بھی عجب نہیں اِن کے خصوص سے افضل اور قوی تر ہو۔

واللہ اعلم بالصواب الیہ المرجع والمآب۔ ان کان صوابا فمن اللہ تعالیٰ و ان کان خطاء فمنی والی؛ استغفرہ واتوب الیہ؛ انہ ھو التواب الرحیم۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جس کو فتح کبیر نصیب ہوتی (اور غوث اعظم بنایا جاتا) ہے اس کے (بہ تبعیت ظل محمدیؐ) اگلے اور پچھلے گناہ بخشدئے جاتے ہیں، اس کے اعمال حسنہ سب مقبول ہوتے ہیں، اور اس کی تمامی سیئات کو جو اس نے فتح حاصل ہونے سے قبل کی تھیں حسنات بنا دیا جاتا ہے۔ اور فتح حاصل ہونے کے بعد تو اس سے گناہ کا صدور ہی نہیں ہوتا (اور وہ معصوم تو نہیں مگر محفوظ بن جاتا ہے)۔ کیونکہ گناہ کا صدور صرف اہل حجاب سے ہوتا ہے (جن کو ذات حق کا مشاہدہ نصیب نہیں) اور یہ حضرات ہر وقت مشاہدۂ حق میں رہتے ہیں۔ اور اسی بنا پر کہ مشاہدۂ حق معصیت کے لئے مانع ہے، ملائکہ کی شان

لَا یَعْصُوْنَ اللّٰہَ مَآ اَمَرَھُمْ وَیَفْعَلُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ ہے کہ اللہ تعالیٰ جو ان کو حکم دیتا ہے اسکے خلاف نہیں کرتے اور جس بات کا حکم کیا جاتا ہے وہی کرتے ہیں۔ (یعنی حکم الٰہی صادر ہو تو ان کو تعمیل میں دریغ نہیں ہوتا اور جب تک حکم نہ ہو اس وقت کسی کام میں قدم نہیں اٹھاتے۔ یہ بے دریغ امتثال اور یہ معصیت سے معصومیت اسی مشاہدہ کا ثمرہ ہے جو ہر وقت ان کو حاصل ہے)

میں نے حضرت سے عارفین کی نماز کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کیسی ہوتی ہے (اور عوام کی نماز میں اور اس میں کیا فرق ہے)

فرمایا عارف جب اَللّٰہُ اَکْبَر کہتا ہے اور جسم ظاہری سے نماز پڑھتا ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کے اندر کی روح بھی نماز پڑھتی ہے۔ کہ بدن کے رکوع کے ساتھ وہ بھی (جھکتی اور) رکوع کرتی ہے، اور بدن کے سجدہ کے ساتھ وہ بھی سجدہ کرتی ہے۔

نیز فرمایا میں ایک مرتبہ غور کرنے لگا کہ دیکھوں پہلے جسم زمین کی طرف جاتا (اور روح اس کا اتباع کرتی ہے) یا پہلے روح (رکوع و سجدہ کرتی اور اس کے تبعاً) جسم زمین پر جھکتا ہے تو حافظ اعمال (فرشتہ) نے مجھے اس سے منع کر دیا (کہ اس تحقیق میں نہ پڑو) اور روح کی نماز بہر حال مقبول ہوتی ہے (اس لئے ان کی نماز کی قبولیت یقینی ہے)

میں نے کہا شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ روح نظر نہیں آتی اور اس لئے اس میں نمود کا دخل نہیں ہو سکتا۔

فرمایا یہ وجہ نہیں بلکہ اس لئے کہ روح امر حق ہے، حق کی طرف سے ہے، اور حق ہی کی طرف (اس کا رجوع) ہے اور ظاہری نماز کی مشروعیت اسی لئے ہے کہ اکثر مخلوق روحی نماز سے عاجز ہے۔ اور عارفین اگرچہ اپنی ارواح سے نماز پڑھتے ہیں مگر بدن سے نماز پڑھتے ہیں، بنا بر عادت (کہ ابتداء سے اس کے خوگر رہے ہیں اور اسی کی بدولت روحی نماز کا درجہ پایا ہے)

اور نیز ظاہر شریعت کو محفوظ رکھنے کے لئے (کہ اس کے بھی مامور ہیں) اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص اس نیت سے درزی کا پیشہ کرے کہ اس کے ذریعہ ریشم کی صنعت (اور ریشمی پھول بوٹے بنانا) آجائے اور یہ سلائی کا کام وسیلہ بن جائے ریشمی صنعت کا۔ پھر حق تعالیٰ نے بغیر کسی استاد اور معلم کے اس کو ریشم کی صنعت سکھا دی ہو اور یہ بدستور درزیوں میں چھپا پڑا رہا (تو یہ اس کی وضعداری اور شرافت کی علامت ہے) پھر فرض کرو درزیوں کی کوئی خاص وضع اور خاص ہیئت ہے جو ان کے ظواہر پر نمایاں رہتی ہے اور جس کو دیکھ کر ہر شخص شناخت کرتا ہے کہ یہ درزی ہے۔ پس اگر یہ شخص اپنی وضع

اور وہ عادت وشکل ولباس بدل لے جو درزیوں کے لئے گویا علامت تھی۔ اور پھر لوگ اس سے پوچھیں کہ تم نے اپنی وضع سابق کو تبدیل کیوں کر لیا؟ تو یہ جواب دے کہ میں اب درزی نہیں رہا بلکہ ریشمی صنعت کا کاریگر بن گیا ہوں۔ حالانکہ علم الٰہی میں طے ہو چکا تھا کہ درزی کے پیشہ ہی میں اس کو ریشم کی صنعت نصیب کی جائے گی اور اس کی شناخت صرف (ایک مخفی علامت سے ہوگی جس کا) ظہور قیامت کے دن ہوگا۔ لہٰذا اس کو زیبا ہے کہ یہ بدستور درزیوں کی عادت کا تابع بنا رہے اور ان کے لباس وہیئت کو اختیار کئے رہے اور اپنی پہلی حالت پر بدستور قائم رہے۔

میں نے حضرت ممدوح سے ایک مشہور شخص کے متعلق دریافت کیا جو دسویں صدی کا تھا۔

فرمایا اس کو فتح نصیب ہوئی تھی مگر اسی (ابتدائی مشاہدہ پر) اس کی حالت رُک گئی اور وہ منجملہ ساحرین کے ایک ساحر بن گیا۔ (کہ اس کے بعد جو عجائب امور اس سے ظاہر ہوتے تھے وہ طلسمیات اور جادو کے ثمرات تھے نہ کہ کرامات)

میں نے عرض کیا یہ کیسے؟

فرمایا بندہ کو (فتح ومشاہدہ میں) سب سے اول جو شے منکشف ہوتی ہے وہ بندوں کے معاصی ہیں۔ کہ اس کو ان کے گناہ نظر آتے ہیں، ان کے اسباب ووجوہ نظر آتے ہیں، ان کے گناہ میں پڑنیکی کیفیت نظر آتی ہے اور وہ ظلمانی دھواں ان کو نظر آتا ہے جس سے اہل ظلمت کو مدد پہونچتی (اور مرتکبین معاصی اس سے مستفیض ہو کر غافل وجری بنتے ہیں) پس اگر حق تعالیٰ کا فضل وکرم اس کو نہ سنبھالے تو اس کی عقل ان امور کی طرف جھکتی ہے اور وہ ان میں غور وفکر کرنے لگتا ہے۔ پس اگر ایک گھڑی کے لئے بھی فکر ان امور میں ڈوبا رہا تو انقطاع لاحق ہو جاتا اور حق تعالیٰ سے تعلق قطع ہو کر صرف ان کشفیات ہی میں پھنسا رہ جاتا ہے۔ اور یہ (چونکہ ظلمانی امور ہیں کہ) شیطان کا ڈیرہ اسی جگہ پڑا ہوا ہے اور بنی آدم کے لئے فتنہ کا مقام ہے اس لئے اس کا منظر اور شیطان کا منظر ایک ہو جاتا اور یہ شیاطین کا ساتھی اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالا ہوا رفیق بن جاتا ہے۔ شیطان سحر پر اس کو قبضہ دیدیتا ہے اور وہ ساحروں میں شامل ہو جاتا ہے۔ اور اگر حق تعالیٰ شانہ اس ابتدائی کشف والے پر لطف وکرم فرماتا ہے تو فوراً ہی دوسرے امور اس پر منکشف فرما دیتا ہے۔ کہ اس کی توجہ اُدھر مبذول اور ان امور سے غافل ہو جاتی ہے۔ پھر اسی طرح ہر لحظہ اس کو ترقی بخشتا اور یکے بعد دیگرے ملکوتی عجائب اس پر منکشف فرماتا رہتا ہے (کہ وہ مشاہدہ محمدیہ کے حصول تک جو محل امن واطمینان ہے کسی شے سے بھی دل بستگی نہیں لینے پاتا)

نیز آپ نے فرمایا کہ فتح کی شان بھی عجیب وغریب ہے۔ حق تعالیٰ کے بہتیرے بندے ہیں کہ عند اللہ

محبوب ہیں اور حق تعالیٰ ان پر لطف وکرم کی بنا پر ان کو فتح سے روکے رکھتا ہے (اور نصیب نہیں فرماتا) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ فتح میں بہتیرین چیزیں ایسی ہیں کہ اگر ذات کے پاک صاف ہونے سے قبل ان کا مشاہدہ ہو جائے تو اسی وقت عیاذاً باللہ نصرانی بن جائے۔ اور بہتیری چیزیں ہیں کہ ان کا مشاہدہ اگر ہو جائے تو عیاذاً باللہ فوراً یہودی بن جائے (اس لئے خطرہ ایمان سے محفوظ اور حلاوت ایمان پر قائم رکھنے کے لئے اس کو غیر مفتوح رکھا جاتا ہے) اور اللہ کے بہتیرے بندے ہیں کہ ان کو روح نکلتے وقت ہی فتح نصیب ہو جاتی ہے (کہ اب خطرات ارتداد سے مطمئن ہو گیا) اور بہتیرے بندے ہیں جن کا غیر مفتوح ہی ہونے کی حالت میں انتقال ہو جاتا ہے۔ مگر حق تعالیٰ بروز قیامت ان کو مفتوح کی حالت سے افضل اور اکمل حالت پر اٹھائے گا۔ لہٰذا فتح ومشاہدہ کی ہوس اور طلب نہ کرنی چاہئے۔ طلب ہو تو صرف اللہ کی خوشنودی اور لطف وکرم کی ہو کہ اس کا فضل وانعام کسی خاص حالت کے ساتھ محدود ومقید اور مخصوص نہیں ہے۔ طریق رضا کو اس کے حوالہ کرنا چاہئے ؎

فراق ووصل چہ باشد رضا دوست طلب — کہ حیف باشد از و غیر او تمنائے

نیز آپ نے فرمایا کہ جس کو فتح عطا کی جاتی ہے اس سے فتح کے وقت ایک سیاہ جلد کی سی شے دور کی جاتی ہے۔ اور وہ (سیاہ کھال کی شبیہ) وہ ظلمت ہے جو چار طرف سے ذات انسانی کو محیط ہے جب وہ جلد سیاہ دور ہو جاتی ہے تب ذات پر فتح کا نور ڈالا جاتا ہے جس کو فرشتے ایک عظیم الشان جلوس کی شکل میں لے کر آتے ہیں۔ اللہ پاک کی ایک دوسری جماعت تو اس جلد سیاہ کے دور کرنے میں لگ جاتی ہے اور فرشتے سرِّ الٰہی کو لئے کھڑے رہتے ہیں۔ اور کھال کے دور ہوتے ہی ملائکہ فوراً اس نور کو ذات کے اندر رکھ دیتے ہیں۔ اس جلد سیاہ کے دور کئے جانے کے وقت مفتوح کے متعلق ایک مخلوق سراسیمہ اور خائف ہوتی ہے۔ کیونکہ ان کو انجام کا پتہ نہیں ہوتا کہ موت ہو گی، یا عقل کا سلب ہو جانا، یا دونوں سے سالم ومحفوظ رہنا اس لئے اس کی شان ایسی ہوتی ہے جیسے مریض کو خطرناک آپریشن کہ اس کے اقارب و احباب بدحواس ہوتے ہیں اور جب تک کلوروفارم سے پورا ہوش نہ آجائے یہی فکر رہتا ہے کہ دیکھئے جاں بر ہوتا ہے یا بیہوشی ہی میں ختم ہو جائے گا، غرض سب گڑگڑا کر اللہ سے دعائیں مانگتے رہتے ہیں کہ اس کو قوت برداشت بخشے اور اس بوجھ اٹھانے کی جو اس پر ڈالا جا رہا ہے توفیق نصیب فرمائے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ فتح کا نور شیخ کی ذات میں ہوا کرتا ہے پس اگر اس کا وارث (جو اس کی جگہ قطب بننے والا ہے) اپنے شیخ کی حیات کے اخیر حصہ میں (اس کے اٹھانے پر) قادر ہو گیا ہے تب تو وہ شیخ کے اس دار فانی سے اٹھ جانے پر اس کو لے لیتا ہے۔ اور اگر اس کے برداشت کی ابھی اس میں طاقت نہیں

آئی تو وہ نور سیدنا جبریل علیہ السلام کے پاس امانت رہتا ہے۔ یہاں تک کہ مرید کی ذات میں اس کی طاقت آجائے۔ اس وقت اس کی جلد سیاہ دور کر دی جاتی ہے اور وہ (جبریل امین سے) سرّ الٰہی لے لیتا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا جس کو فتح عطا کی جاتی ہے تین دن قبل سیدنا جبریل علیہ السلام اس کے بے تکلف دوست بن کر تشریف لاتے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبتِ کاملہ سے اس کو مانوس بناتے، اور اس کو (ہر قسم کی کجی سے بچاتے، اور) راہ راست پر چلاتے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت ممدوح نے فتح کے متعلق اور بہت کچھ اسرار بیان فرمائے (جن کو بخوف طوالت چھوڑ دیا گیا۔ مگر اتنا ضرور کہنا ہے کہ) سیدنا جبریل علیہ السلام کے اس تذکرہ سے اس بنا پر کہیں وحشت پیدا نہ ہو کہ بعض علماء انام (امام غزالی وغیرہ) اس کے قائل نہیں ہیں، بلکہ جو کہے کہ مجھے ملائکہ نظر آتے ہیں اس پر شدت سے نکیر اور اعتراض کرتے ہیں (کیونکہ ان حضرات کی رائے یہ ہے کہ ملائکہ کا مشاہدہ صرف نبی کو ہوتا ہے) اس لئے جواباً عرض کیا جاتا ہے کہ اوّل تو علماء ہی کا ایک گروہ اس کی تردید کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ نہ اس میں کوئی محال لازم آتا ہے اور نہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان رفیع کے مزاحم ہے (اس لئے کہ یہ آنا انزال وحی کے لئے نہیں ہے۔ نیز حضرت روحی فداہ ہی کے برکات اور عطاء نور ایمانی کے طفیل امتی کو یہ نعمت ملتی ہے۔) اس کی تائید ایک مشہور اور جلیل الشان صحابی حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کے قصہ سے ہوتی ہے۔ کہ ملائکہ ان کو اکثر نظر آتے اور سلام کیا کرتے تھے۔ مگر جب انہوں نے (کسی مرض کے علاج میں) بدن کو دغوایا تو یہ صورت (مشاہدہ وسلام کی) جاتی رہی۔

نیز علامہ شعرانی نے تو اپنی کتاب میں اس کو نعمت عظیمہ شمار کیا ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کو ایسے شخص سے ملاقات نصیب فرمائی جو سیدنا جبریل علیہ السلام کا مشاہدہ کیا کرتے تھے۔ پھر علماء منکرین بخاری وغیرہ کی ان متفق علیہ احادیث صحیحہ کا کیا جواب دیں گے جن میں امت محمدیہ کے سوا دیگر امم کیلئے اس کا وقوع مذکور ہے۔ جس کا دل چاہے بخاری میں اخبار بنی اسرائیل کا مطالعہ کرلے۔ پھر امت محمدیہ کے لئے اس کے ممنوع ہونے کی کیا وجہ۔ اب ہم (امور فانیہ کے مشاہدہ ظلمانیہ سے فارغ ہو کر) چندان امور باقیہ نورانیہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو بڑے درجہ کی فتح والے (غواث) کو نظر آیا کرتے ہیں۔ مثلاً برزخ، جنت، دوزخ، پلصراط، حوض کوثر، ارواح طیبہ، ملائکہ، اور محافظ بشر فرشتے، اور اولیاء اللہ وغیرہ (اور اسی پر کتاب کو ختم کر دیں گے)

دسواں باب

برزخ اور اس کی صورت وحالت اور اسمیں نزول ارواح کی کیفیت

برزخ کے متعلق حضرت ممدوح نے ارشاد فرمایا کہ اس کی صورت ایسی ہے جیسے کوئی مقام نیچے سے تنگ ہو اور جوں جوں اوپر کو جائے تو وسیع ہوتا جائے حتیٰ کہ منتہا پر پہونچ کر ایک قبہ اس کے سر پر قائم کیا جائے جیسا منارہ یا دھواں کش چمنیوں کے اوپر قائم کیا جاتا ہے۔ نمونہ کے درجہ میں اس کی مثال لکڑی کے بڑے ہاؤن (یا اوکھلی) کی سی سمجھو۔ کہ اس کا حصۂ زیرین چھوٹا اور تنگ ہوتا ہے اور پھر اوپر کو بڑا اور وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر اس کے سر پر ایک گنبد بنا کر رکھدو تو یہ صرف شکل اور صورت میں برزخ کا نمونہ بن جائے گا۔ مگر مقدار اور بڑائی میں تو (کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے) اس کی جڑ اور ابتدا آسمان دنیا میں ہے کہ ہماری جانب میں اس سے باہر نہیں نکلا۔ اور اوپر کو اونچا چڑھتا چلا گیا ہے، حتیٰ کہ آسمان دوم کو پھاڑ کر پھر چڑھتا چلا گیا۔ اور تیسرے آسمان کو پھاڑتا ہوا پھر اوپر چڑھا اور چوتھے آسمان کو پھاڑا۔ پھر اوپر چڑھا حتیٰ کے پانچویں آسمان کو پھاڑا پھر اوپر چڑھا حتیٰ کہ چھٹے آسمان کو پھاڑا۔ پھر اوپر چڑھا حتیٰ کہ ساتویں آسمان کو پھاڑا اور پھر اتنا اوپر چڑھتا چلا گیا جس کی حدود شمار نہیں۔ پھر اس کے اوپر اس کا قبہ قائم کیا گیا ہے۔ یہ ہے اس کی لمبائی اور یہی ہے بیت المعمور۔

میں نے عرض کیا کہ بیت المعمور کے متعلق تو روایات سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ (ساتویں آسمان میں ہے، اور برزخ تو آسمان دنیا سے شروع ہوتا ہے اور ساتویں آسمان سے بھی اوپر بے شمار اونچا چلا گیا ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ بیت المعمور ہر آسمان میں ہے؟

فرمایا ہاں (یہی صورت ہے) اور بالائے فلک ہفتم کے ذکر پر تو اہل روایت کے اس لئے اکتفا کیا ہے کہ وہاں اس کا قبہ ہے جو کہ خلاصہ ہے برزخ کا اور اشرف و افضل ہے تمامی برزخ سے۔ کیونکہ اس میں بجز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح شریفہ اور اُن حضرات کی ارواح طیبہ کے جن کو حق تعالیٰ نے آپ کے شرف کی وجہ سے نوازا ہے اور کوئی نہیں ہے۔ مثلاً آپ کی ازواج مطہرات، صاحبزادیاں ان کی ذریت جو آپ کے زمانہ میں تھی، یا جو آپ کے بعد قیامت تک ہوگی۔ بشرطیکہ اس نے حق پر عمل کیا ہو۔

نیز خلفاء اربعہ کی روحیں بھی اسی میں ہیں، اور اسی میں ان شہداء کی روحیں ہیں جن کا انتقال آپ کے زمانہ میں ہوا اور جنہوں نے آپ کی زندگی و بقاء کی خاطر اپنی جانوں کو خرچ کیا تھا۔ اور ان کے اس حسن عمل کے صلہ میں (حق تعالیٰ نے) ان ارواح کو وہ طاقت اور قوت دی ہے جو دوسروں میں نہیں پائی جاتی۔

نیز قبہ ہی میں آپ کے ورثہ کاملین اولیاء اللہ مثلاً اغواث اور اقطاب کی روحیں ہیں رضی اللہ عنہ اجمعین غرض برزخ کا اشرف ترین حصہ چونکہ قبہ مقدسہ ہے اس لئے (جس نے کہا کہ بیت المعمور فلک ہفتم پر ہے اُس نے) برزخ کے اقوال میں اسی قبہ پر اکتفا کیا۔ رہا برزخ کا عرض سو وہ اس سے اندازہ کرو کہ سورج چوتھے آسمان پر ہے اور وہ برزخ کے چار طرف ایسا چکر لگاتا ہے جیسے طواف کرنے والا چار طرف گھومتا ہے) اور وہ اس مسافت کو ایک سال میں قطع کرتا ہے۔ اور سارے برزخ میں (شہد کی مکھیوں کے چھتہ کی مثل) سوراخ ہی سوراخ ہیں، اور ان سوراخوں میں (جن کی تنگی و وسعت روح کے حسب حال و حسب اعمال ہے) روحیں رہتی ہیں۔ البتہ سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کی روح مبارکہ اور جن کو حق تعالیٰ نے آپ کے شرف کی وجہ سے شرف بخشا ہے ان کی روحیں وہ سب قبہ میں ہیں۔ پھر اقسام جنت کی تعداد کے موافق یہ قبہ بھی سات قسموں پر منقسم ہے کہ ہر حصہ ایک جنت کے مشابہ ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پُر فتوح کا محل و مقام اگرچہ قبہ میں ہے مگر ہر وقت وہاں نہیں رہتی۔ اس لئے آپ کی روح شریفہ کا بوجھ اٹھانے کی ان اسرار کی وجہ سے جو اس میں موجود ہیں نہ اس قبہ میں طاقت ہے، نہ تمامی مخلوقات میں کسی دوسری شے کے اندر۔ اس روح شریفہ کا بوجھ اُٹھانے کی طاقت صرف آپ کی ذات مطہرہ (اور جسد مبارک) ہی میں تھی۔ لہذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی روح شریفہ برزخ میں کسی خاص اور معین مقام پر مقیم نہیں رہتی کیونکہ کسی شے میں طاقت ہی نہیں کہ اس کی حامل ہو سکے۔ اور جو روحیں برزخ کے اس (بالائی) حصہ میں ہیں جو آسمان چہارم میں اور اس سے اوپر واقع ہے ان کے لئے ایسے قوی انوار ہیں کہ (اجسام میں بجلی کی طرح) پار ہوتے چلے جائیں۔ اور جو روحیں آسمان سوم میں اور اس سے نیچے ہیں وہ عموماً محجوب ہیں کہ ان میں بالکل نور نہیں۔ اور یہ برزخی سوراخ آدم علیہ السلام کی پیدایش کے قبل سے ہیں کہ ان میں ارواح (جو یکے بعد دیگرے اب دنیا میں آرہی ہیں) رہتی تھیں اور اُن ارواح میں نور بھی تھا۔ مگر اس نور سے کم تھا جو اجسام سے مفارقت کرنے (اور بعد مرگ برزخی سوراخوں میں جانے کے بعد) ہوا۔ (کیونکہ ایمان اور اعمال صالحہ کے انوار ان میں شامل ہو گئے۔ مگر کفار کی ارواح کا ظلمت کفر کی وجہ سے پہلا نور بھی محجوب و مستور ہو گیا) پس جب (ارواح میں سب سے پہلے) حضرت آدم علیہ السلام کی روح اتر کر اُن کے کالبد میں آئی

تو اس کی جگہ (جو برزخ میں تھی وہ) خالی ہوگئی۔ اور اسی طرح جب کوئی روح (دنیا میں) اتری تو اس کا سوراخ اس سے خالی ہوگیا۔ پھر جب مرنے کے بعد روح واپس ہوتی ہے تو جو جگہ اس کی (برزخ میں) تھی وہاں نہیں جاتی بلکہ دوسری جگہ کی مستحق ہوتی ہے۔ حضرت ممدوح کا مطلب یہ تھا کہ روح مومنہ ہوتی ہے تو (ایمان واعمال کی وجہ سے) بالائی حصہ میں جگہ کی مستحق ہوتی ہے (اور وہ اس کا مستقر قرار دیا جاتا ہے) اور اگر کافرہ ہوتی ہے تو زیریں حصہ میں جگہ کی مستحق ہوتی ہے (اور جو سوراخ (ارواح سے) خالی رہیں گے وہ مخلوقات الٰہیہ میں دیگر مخلوقات سے آباد کئے جائیں گے۔ اور روز الست سے قبل ارواح اپنے نتائج سے بالکل ناواقف تھیں۔ ان کو کچھ معلوم نہ تھا کہ ان کے پیدا کرنے سے حق تعالیٰ کا کیا مقصود ہے اور انکے متعلق ارادہ الٰہیہ کیا ہے۔ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ پہلے سے ازل اور قضاء وقدر میں جو طے ہوچکا ہے وہ ان پر ظاہر ہوجائے تو حضرت اسرافیل کو صور پھونکنے کا حکم فرمایا اور ان کے صور میں پھونک مارتے ہی ساری روحیں ایک جگہ اکٹھی ہوگئیں اور ان کو وہ ہول وہراس اور اضطراب لاحق ہوا جو بروز قیامت (دوسرے نفخ صور پر) قبروں سے اٹھتے وقت لاحق ہوگا۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ (اس وقت پیش آیا کہ اچانک ودفعی اور پہلی بار کا تھا) جب ساری روحیں جمع ہوگئیں تو حق تعالیٰ جل وعلا نے اپنا بے کیف خطاب ان کو سنایا اور فرمایا اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟۔

پس جو روحیں اہل سعادت (اور خوش نصیب) تھیں انھوں نے اپنے رب کو (اقراری جواب) فرح وسرور کے ساتھ دیا۔ اور اسی وقت اس جواب دینے میں ان کا تفاوت ظاہر ہوا کہ کسی نے غایت سرور سے جواب دیا اور وہ صلحاء ومطیعین تھے، اور کسی نے معمولی سرور سے جواب دیا اور وہ عصاۃ مومنین تھے) نیز وہیں ان کا مشاہدہ میں فرق مراتب کھل گیا کہ کسی کو وہاں مشاہدہ کا مدد قویہ حاصل ہوا، اور کسی کو ناقصہ وضعیفہ، اور اسی کا دنیا میں وقوع ہوا) اور اسی جگہ شیخ اور مرید میں امتیاز ہوا کہ بعض ارواح نے دوسری روحوں کو مدد پہونچائی اور وہی دنیا میں مشائخ اور مریدین بنے) اور کھل گیا کہ فلاں تعلق واتصال فلاں سے ہوگا اور فلاں شخص فلاں سے بے تعلق ہوگا۔

نیز انبیاء علیہم السلام کے مراتب کا تفاوت اور ان کی امتوں کے باہمی درجات کا اختلاف بھی ظاہر ہوگیا اور جو روحیں اہل شقاوت (و بدنصیب تھیں) انہوں نے خطاب سنا مگر مکدر ومتغیر ہوئے اور اقراری جواب ناگواری کے ساتھ دیا۔ اس کے بعد ایسے بھاگے جیسے شہد کے چھتہ میں جب دھواں پہونچتا ہے تو اس کی مکھیاں بھاگا کرتی ہیں۔ پس ان کو ذلالت لاحق ہوئی اور ان کے انوار (سورج گرہن کی طرح یک لخت) سلب ہوگئے اسی وقت مومن اور کافر کا پتہ چل گیا؛ اور اسی وقت ہر روح کے لئے برزخ میں جگہ معین کردی گئی۔ ورنہ

اس سے قبل (ان کو آزادی تھی کہ) جس محل میں چاہیں قیام کریں اور جب چاہیں اس سے منتقل ہو کر دوسرے محل میں جا قیام کریں۔

نیز حضرت نے فرمایا کہ (اہل بصیرت اولیا ہیں) جو شخص اب برزخ کی طرف نظر ڈالتا ہے تو اُن ارواح کو جدا معلوم کرلیتا ہے جو اجسام سے جدا ہو کر (بعد مرگ یہاں) آئی ہیں۔ کیونکہ ان کے انوار میں قوت ہوتی ہے (جبکہ مومنہ ہوں) یا ان کی ظلمت میں کثرت ہوتی ہے (جبکہ کافرہ ہوں) اور اُن ارواح کو بھی معلوم کرلیتا ہے جو ابھی تک دنیا میں نہیں آئیں۔ کیونکہ ان کے نور اور ظلمت میں ضعف و کمی ہوتی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جب تک وہ روحیں جو اب تک دنیا میں نہیں آئیں، سب دنیا میں آنہ لیں گی اور اُن سے فراغ نہ ہو جائے گا حتیٰ کہ ایک روح بھی اگر باقی رہ جائے گی تو اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔

میں نے عرض کیا کہ اس سے تو لازم آتا ہے کہ اس (برزخ وارواح کے) کشف والوں کو قیامت کا علم ہے کہ کب آئے گی۔ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے اِنَّ اللّٰہَ عِنْدَہٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَیُنَزِّلُ الْغَیْثَ الآیہ کہ اللہ ہی کو علم ہے قیامت کا اور وہی مینہ برساتا ہے نیز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں فِیْ خَمْسٍ لَا یَعْلَمُھُنَّ اِلَّا اللّٰہُ کہ قیامت منجملہ ان پانچ چیزوں کے ہے جس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں (اور وہ یہی پانچ چیزیں ہیں جو آیت شریفہ میں مذکور ہیں)

فرمایا یہ ارشاد نبوی ایک خاص مصلحت وقتی کی وجہ سے تھا ورنہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پنج امور مذکورہ میں کوئی شے بھی پوشیدہ نہ تھی۔ اور آپ سے پوشیدہ کیسے رہ سکتی ہیں جبکہ اقطاب کو ان کا علم ہے، حالانکہ وہ غوث سے کم درجہ پر ہیں۔ چہ جائیکہ غوث، اور چہ جائیکہ سید الاولین والآخرین صلی اللہ علیہ وسلم کہ سبب وجود عالم اور اصل خلقت بنی آدم ہیں۔

ف۔ حضرت ممدوح کی اس تقریر سے صراحۃً اور بعض گذشتہ تقریروں سے اشارۃً ظاہر ہو رہا ہے کہ مغیبات خمسہ کا علم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ آپ کی امت کے اغواث و اقطاب کو بھی ہوتا ہے۔ مگر علماء سلف و خلف کا قاطبۃً مسلک یہ ہے کہ ان کا علم ذات باری کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور ان کی بڑی دلیل یہی آیت شریفہ۔ اور حدیث مذکور ہے۔ اس لئے مجھے حضرت ممدوح کے اس قول میں انشراح نہیں ہوا۔ قطع نظر اس کے کہ کشف مورث علم یقین نہیں ہے اور اس کو کسی مسئلہ شرعیہ بالخصوص باب عقائد میں حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ یوں بھی چند اشکالات ہیں۔

اوّل حضرت ممدوح کی تقریر کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ جب تک عالم ارواح کی سب روحیں دنیا میں نہ اُتر لیں گی اس وقت تک قیامت نہ آئے گی۔ اور اہل مشاہدہ اقطاب کو نور روح کا قوت و ضعف دیکھکر

پتہ چل جاتا ہے کہ فلاں روح کا ابھی دنیا میں نزول نہیں ہوا۔ بلکہ یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ ابھی اتنی روحیں دنیا میں اُترنے سے باقی رہ گئی ہیں، مگر اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ ان کو قیامت کا علم ہوگیا۔ زیادہ سے زیادہ یوں کہو کہ قیامت کے موقوف علیہ کا علم ہوگیا اور اس کا نام علامات قیامت یا شرائط ولوازم قیامت کا علم ہے نہ کہ قیامت کا علم اور شرائط وعلامات قیامت کا علم تو عام امت کو بھی حاصل ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جب تک مہدی موعود حضرت محمد بن عبداللہ کا ظہور نہ ہوئے گا قیامت نہ آئے گی جب تک مدعی الوہیت دجّال کا خروج نہ ہوئے گا قیامت نہ آئے گی، جب تک سیدنا عیسیٰ روح اللہ کا نزول نہ ہوئے گا قیامت نہ آئے گی، جب تک قوم یاجوج وماجوج کا خروج نہ ہوئے گا قیامت نہ آئے گی جب تک دنیا میں ایک بھی اللہ کا نام لینے والا رہے گا قیامت نہ آئے گی، وغیرہ۔ یہی نوعیت اس کی ہے کہ جب تک عالم ارواح کی سب روحوں کا دنیا میں نزول نہ ہوئے گا قیامت نہ آئے گی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ علامتیں عام اہل بصارت کے لئے ہیں اور یہ خاص اہل بصیرت کے لئے ہے۔ قیامت کا علم ہونے کا مفہوم تو یہ ہے کہ بالیقین یہ معلوم ہو کہ فلاں صدی کے فلاں سنہ، اور فلاں مہینہ میں اور فلاں تاریخ فلاں گھنٹہ فلاں منٹ اور فلاں لمحہ میں آئے گی۔ اور یہ حضرت ممدوح کی تقریر سے کہیں ظاہر نہیں ہوا۔

دوم علامات پر نتیجہ کا حکم لگانا بھی اس درجہ میں صرف مورث غلبہ ظن ہے، مورث علم یقین نہیں۔ کیونکہ تحت مشیت الٰہیہ ہے اور اذنِ الٰہی کا محتاج ہے۔ اور اذن الٰہی کا کسی کو علم نہیں ہے۔ اور اسی بنا پر مطلق علم غیب صفت خاصہ ہے ذات باری عز اسمہ کی۔ خود حضرت شیخ تحریر فرما چکے ہیں کہ عارف کو حق تعالیٰ نے ایک موجب رشک راحت عطا فرمائی ہے کہ وہ کتابت لوح محفوظ کو دیکھ کر اور اپنے متعلق کسی حادثہ یا سانحہ کا نزول مقدر پاکر بھی متفکر و پریشان نہیں ہوتا۔ کیونکہ جانتا ہے کہ اس کا وقوع تصرف الٰہیہ کا ماتحت ہے اور اس کا تصرف آزاد اور بے قید ہے۔ کسی کے علم کا پابند یا لکھت میں محدود نہیں۔ جو چاہے بدلے اور جو چاہے کرے، بالخصوص جب کہ یَمْحُوا اللّٰہُ مَا یَشَاءُ وَیُثْبِتُ وَعِنْدَہٗ اُمُّ الْکِتَابِ ارشاد فرما چکا کہ جو چاہے مٹائے اور جس کو چاہے قائم رکھے۔ لہٰذا قطع نظر اس کے کہ علامت اور اس کے نتیجہ بلکہ سبب اور مسبب میں بسا اوقات تخلف ہوجاتا ہے، یوں بھی یہ ترتب مورث علم نہیں ہے۔ اس لئے علامات قیامت کا علم کسی طرح بھی موجب علم قیامت نہیں ہوا۔ اور اس کی مثال ایسی ہوئی جیسے کوئی منجم کہے کہ جب تک فلاں ستارہ فلاں برج میں نہ آجائے گا بارش نہ ہوگی۔ یا کوئی عامی کہے کہ جب تک کالی اور گہری گھٹا نہ آئے گی مینہ نہ برسے گا۔ اس کا نام نہ کسی نے علم نزول الغیث رکھا اور نہ مغیبات خمسہ کا تزاحم ثابت کیا۔

سوم یہ قیاس کہ جب اقطاب اور اغواث کو اس کا علم حاصل ہے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو

بدرجہ اولیٰ ہونا چاہیئے، خود حضرت ممدوح کی سابق تقریر سے مخدوش اور مع الفارق بن چکا ہے۔ چنانچہ حضرت خضر علیہ السلام اور سید نا موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں جو کہ قرآن مجید کے اندر مذکور ہے تحریر فرما چکے ہیں کہ حوادث اور امور فانیہ کا مشاہدہ چونکہ ادنیٰ درجہ کا مشاہدہ ہے اس لئے حضرت خضر علیہ السلام کو حاصل تھا۔ اور سید نا موسیٰ علیہ السلام کا مرتبہ افضل اور اعلیٰ تھا اس لئے وہ امور باقیہ یعنی مشاہدۂ خالق سبحانہ میں مستغرق تھے۔ اُن کے لئے ان امور سے ناواقفیت ہی عین کمال ہے"۔ لہذا اگر قیاس جاری ہو سکتا ہے تو اس میں جاری ہو سکتا ہے۔ کہ جب سید نا موسیٰ علیہ السلام کے لئے تکوینی امور کا عدم علم عین کمال ہے تو کیا پوچھنا سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ مشاہدۂ خالق سبحانہ میں سب نبیوں سے برتر اور افضل تھے۔

چہارم تکوین درحقیقت تابع اور خادم ہے تشریح کی۔ کہ شریعت الٰہیہ کے بقا پر دنیا کا بقاء موقوف ہے۔ جس دن اس قانون الٰہی کا علم وعمل دنیا میں ختم ہو جائے گا اُسی دن نظام عالم درہم برہم اور قیامت قائم ہو جائے گی۔ اور جب دنیا ہی موجود نہ رہے گی تو اس کے فروع وجزئیات کی ترتیب جس کا نام نظم ہے وہ کہاں رہے گی۔ یعنی اقطاب واغواث کی خدمات مفوضہ اور سیاسات باطنیہ سب معطل ہو جائیں گی۔ لہذا خادم کے لئے امور متعلقہ بالخدمت کے علوم کی ضرورت ہے، اور مخدوم کے لئے امور متعلقہ بالمخدومیت کے علوم کی حاجت ہے۔ دونوں کے علوم ایسے ہی متبائن اور جُدا جدا ہیں جیسے حضرت ممدوح نے خود مثال دی ہے کہ پادشاہ اپنے دو غلاموں میں ایک کو صوبہ کا ناظم وگورنر بنا کر ملکی انتظام کے لئے باہر بھیج دے اور دوسرے کو اپنا ندیم وصاحب الاسرار بنا کر اپنے پاس رکھ لے، کہ اس کا کام ہر وقت کی حاضر باشی کے سوا کچھ نہ ہو تو ظاہر ہے کہ ملکی حالات کے متعلق اگر اس سے کوئی بات دریافت کی جائے گی تو کچھ جواب نہ دے سکے گا۔ مگر اس کے ساتھ ہی اسرار سلطانی ورموز خسروانہ سے جو واقفیت اِس کو ہوگی وہ اُس کو نہ ہوگی۔ بنابریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے علوم تو وہ معارف الوہیت وحقائق ربوبیت اور اسرار شریعت ہیں جن تک رسائی نہ کسی نبی مرسل کو حاصل ہوئی نہ ملک مقرب کو۔ آپ کے لئے ان باتوں کا علم کہ دنیا کب ختم ہوگی، مینہ کب برسے گا، فلاں کے بطن سے لڑکا پیدا ہوگا، یا لڑکی، کل کو کیا ہوگا، اور فلاں شخص کہاں جا کر مرے گا، ایک درجہ میں کسر شان ہے۔

پنجم مشاہدات تکوینی کو کسی درجہ میں اگر کمال مان بھی لیا جائے کہ علامت ہے رحمت الٰہیہ کی تو مغیبات پر ایمان لانا ایک مستقل کمال ہے، بلکہ اصل الکمالات اور مدار عبدیت ہے۔ کیونکہ آنکھوں سے نظر آنے والی شے کا یقین تو وہبی وبدیہی اور غیر اختیاری شے ہے کہ ہر شخص کو حاصل ہوتا ہے۔ مگر

جو چیز نظروں سے اوجھل ہو اس پر محض حق تعالیٰ کے حکم سے ایمان لانا اور بدیہیات کی طرح ان کا یقین کرنا اکتسابی و اختیاری امر ہے اور علامت ہے خاص غلامی کی صرف اللہ کے برگزیدہ بندوں کو نصیب ہوتا ہے۔ چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات برکات جامع جمیع کمالات ہے اس لئے ذات مطہرہ کو ایمان بالغیب کے کمال سے خالی کیسے کہا جا سکتا ہے خصوصاً جبکہ نسبت عبدیت ہی آپ کی تمام جماعت انبیاء ورسل میں مایہ ناز اور شان مابہ الامتیاز ہے۔ اور اسی لئے کلمۂ ایمان کے جزو دوم اشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ میں شان رسالت سے بھی اس کو مقدم رکھا گیا ہے۔ اس کمال کا مظہر اکثر علوم تکوینی ہیں جن سے آپ کی لاعلمی قولاً و فعلاً اکثر احادیث میں مذکور ہے اور یہ امور خمسہ ہی چونکہ اصول ہیں تمامی امور تکوینیہ[له] کے اس لئے ان کے علم کا مخصوص بذات اللہ ہونا آیت وحدیث میں مذکور ہوا ہے۔

ششم کتاب ہذا کا یہ مضمون کہ مصلحت و ضرورت وتقیہ کے سبب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مغیبات خمسہ کے علم کا باری تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہونا ظاہر فرمایا۔ گویا اس کا اقرار ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم روحی فداہ نے اپنے لئے ان اشیا خمسہ یا دیگر علوم غیبیہ کا کبھی اظہار نہیں فرمایا، اس لئے ہمارے لئے یہی حجت کافی ہے کیونکہ ہم نصوص کے ظاہری معنے پر ایمان لانے کے مکلف ہیں۔ پس اگر حقیقت اس کے خلاف بھی ہو تب بھی ہم معذور رہیں خصوصاً جبکہ جمہور امت کی موافقت بھی اس میں حاصل ہے۔ اور اس کے خلاف میں گرفت کا بھی اندیشہ ہے کہ غیر الرسول کو رسول پر ترجیح ہے، اور باب فتنہ کا بھی کھولنا ہے، کہ ہر بزرگ کے کشف پر ظاہر نص کو چھوڑنا پڑے گا۔

ہفتم جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بقول حضرت ممدوح وقتی مصلحت کی رعایت فرما کر علم بالمغیبات کا اخفار فرمایا تو ہم غلامان رسول پر زیادہ ضروری ہے کہ آپ کی ملحوظ کردہ رعایت کو ملحوظ رکھیں، اور یہی کہیں کہ مغیبات خمسہ اور تمامی وہ امور جن سے آپ نے اپنی لاعلمی ظاہر فرمائی ہے

[له] ابن مردویہ نے حضرت سلمہ بن اکوع سے روایت کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سُرخ قبہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک شخص گھوڑی پر سوار آیا اور سوال کیا آپ کا کیا دعویٰ ہے؟ آپنے فرمایا میں اللہ کا پیغمبر ہوں اس نے پوچھا قیامت کب آئے گی؟ فرمایا یہ غیب ہے اور غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ پھر اس نے پوچھا میری گھوڑی کے پیٹ میں کیا ہے؟ یعنی نر بچہ ہے یا مادین؟ آپنے فرمایا یہ غیب ہے اور غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں علاوہ ازیں سنہ ھ میں کسوف شمس کا قصہ اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ اندیشہ فرمانا کہ مبادا قیامت تو نہیں آگئی۔ نیز ابن صیاد کے بارے میں تردد کہ کہیں یہ دجال تو نہیں ہے۔ ۱۲

اپنے ظاہر معنی پر محمول ہیں اور ان کا علم آپ کو نہ تھا۔ حاشا وکلا مجھے حضرت ممدوح پر اعتراض مقصود نہیں ہے۔ بلکہ جس طرح خبر متواتر کے مقابلہ پر اخبار آحاد کی تاویل کی جاتی ہے اور اسکا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ قول رسول پر اعتراض کیا بلکہ یہ مفہوم ہوتا ہے کہ خبر واحد کا راوی چونکہ ایک یا دو ہے اس لئے اس خبر کا قول رسول ہونا ہی اذعان کے درجہ میں محقق نہیں ہوا ہے۔ اسی طرح شیخ کا یہ قول مطبوعہ کتاب میں صرف بروایت احمد مبارک رحمۃ اللہ علیہ منقول دیکھ کر جبکہ علماء جمہور کا قول متواتر اس کے خلاف ہے، مجھے اس کے حضرت ممدوح کا قول ہونے ہی میں تردد ہے اور وہ اس درجہ ثابت ومحقق نہیں کہ ائمہ کا متفق علیہ مسلک اس کی وجہ سے چھوڑا جا سکے۔ بالخصوص جبکہ بعض[1] اہل کشف بھی علمائے کے ہم مسلک ہیں۔ اس وقت تحدیث نعمت رب کی بنا پر اس اظہار پر بھی مجبور ہوا کہ چند روز ہوئے بندۂ ناچیز، سیدنا موسیٰ کلیم اللہ علیہ وعلی نبینا السلام کی زیارت سے خواب میں مشرف ہوا کہ آپ کی پیشانی مبارک پر بوسہ دے رہا ہوں۔ اور پھر شوق کا غلبہ ہوا تو آپ کے ہر دو قدم مبارک کو بوسہ پر بوسہ دینے لگا۔ آنکھ کھلی تو اس رویار صادقہ کا ایک خاص احتظاظ قلب میں کئی دن تک موجود پایا۔ اب ترجمہ میں اس مقام پر پہونچا تو از خود قلب میں پڑا کہ تعبیر کا مصداق یہی مقام ہے۔ اس لئے تحریر مذکور کی جرأت وہمت ہوگئی کہ طبعاً بھی مجھ ناکارہ کو اہل تشریع حضرات علماء امت ہی سے زیادہ محبت بھی ہے ؎

أُحِبُّ الصَّالِحِيْنَ وَلَسْتُ مِنْهُمْ ؛ لَعَلَّ اللّٰهَ يَرْزُقُنِيْ صَلَاحًا

اگر خطا ہو تو حق تعالیٰ معاف فرمائے کہ ایمان اسی پر ہے جو عند اللہ وعند الرسول واقعہ اور حقیقت ہو واللہ اعلم ۱۲

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ ارواح کے اجسام سے نکل کر جانے سے قبل برزخ میں نور بہت ہی کم تھا اور حضرت آدم علیہ السلام کی آفرینش سے پہلے بلکہ ان کے ایام حیات میں بھی اس کی روشنی بہت قلیل تھی۔ مگر جب (حضرت آدمؑ کی وفات پر) ان کی روح اور پھر (آئندہ زمانہ میں یکے بعد دیگرے) ان کی ذریت واولاد کے انبیاء ورسل کی اور اولیاء کی روحیں برزخ کی طرف چڑھیں تو اس کے انوار بتدریج بڑھتے رہے۔ کیونکہ ان روحوں کا چڑھنا بھی (بہ یک وقت نہیں بلکہ) بتدریج ہوا۔

---

[1] خصوصاً سید الطائفہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول جو مسند امام احمد مسند ابو یعلیٰ ابن جریر اور ابن مردویہ میں مروی ہے قال لم یغم علی نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم الا الخمس من سرائر الغیب اور ظاہر ہے کہ سردار اولیاء واغوات مظہر العجائب والغرائب کی شہادت ان کے اخلاف کی شہادت پر مقدم ہے اور قابل ترجیح ۱۲ ع

میں نے دریافت کیا کہ کفار کی روحیں اجسام سے نکل کر برزخ میں کہاں جاتی ہیں؟

فرمایا برزخ کے حصۂ زیرین میں۔ اور اگر ان کے برزخی مستقر پر نظر ڈالو گے تو کوئلہ کی طرح بالکل سیاہ وتاریک پاؤ گے۔ اور جائے قرار کو سیاہ اس کے ساکنین یعنی کفار کی حالت نے بنا دیا ہے (کہ وہ خود ظلمت کفر کی وجہ سے کوئلہ کی طرح سیاہ ہیں) اور اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کا حال دنیا کے بالکل برعکس ہے۔ کوئی شخص اگر دنیا میں چمکتا ہوا سفید لباس پہنے گا تو خواہ کافر ہو یا مومن جب تک باہر سے کوئی عارضی میل اور غبار اس پر نہ پڑے گا وہ بدستور سفید و بارونق رہے گا۔ مگر آخرت میں لباس پر میل کچیل (پہننے والے کی) ذات سے آئے گا (کہ ذات اگر بوجہ ایمان کے نورانی ہے تو اس کا سیاہ لباس بھی نورانی بن جائے گا اور اگر ذات بوجہ کفر کے مظلم ہے تو اس کا سفید لباس بھی سیاہ بن جائے گا) پس فرض کرو (عالم آخرت میں) کسی کافر کو نہایت حسین اور نہایت سفید شفاف لباس پہنا دیا جائے (حالانکہ کافر کو یہ نصیب ہی نہیں ہو سکتا) مگر وہ سارے کپڑے (ظلمت کفر کی وجہ سے) فوراً ایک لحظہ میں کوئلہ سے زیادہ سیاہ بن جائیں گے۔ بلکہ ہوا جو چارطرف سے ہم کو گھیرے ہوئے ہے اس کا حال بھی دار دنیا اور دار آخرت میں باہم مخالف ہے۔ کہ دنیا میں اگر وہ ہوا منور ہوگی (جیسی کہ دن کے وقت سورج کی شعاعیں اس کو روشن کردیتی ہیں) تو کافروں کے ہوں یا مومنین کے تمامی اجسام جو اس ہوا کے اندر ہیں سب روشن ہو جائیں گے مگر آخرت میں ذوات کا حکم چلے گا اور وہی (ہوائے محیط پر) غالب ہوگا کہ ذوات مومنین (اپنی چارطرف کی ہوا کو) جگمگا دیں گی۔ اور خود ہوا مومنین کے انوار سے محیر العقول روشنی حاصل کرے گی (جس کی وجہ سے ان کی ارواح کا مستقر ایک بقعہ نور نظر آئے گا) اور ذوات کفار (اپنی چارطرف کی ہوا کو بھی) لُو کی طرح گرم اور کوئلہ کی طرح سیاہ بنا دیں گی۔ اور کوئلہ بھی وہ جس سے زیادہ کوئی سیاہ چیز نہ ہو۔ غرض دار آخرت میں باطنی امور کے احکام ظاہر ہوں گے۔ کیونکہ اصل وہی ہیں اور آخرت درحقیقت ظہور اصلیت ہی کا گھر ہے۔

پسینہ کے متعلق جو حدیث میں آیا ہے کہ بروز قیامت کسی کو اتنا پسینہ آئے گا کہ اس کے ٹخنوں تک پہونچ جائے گا، اور کوئی اپنے پسینہ میں گھٹنوں تک ڈوب جائے گا، اور کسی کو پسینہ اس کی کمر تک آ جائیگا اور کسی کا گردن تک، کسی کو لگام بن کر دہن تک غرق کر دے گا۔ حالانکہ (پسینہ کے وقت) جس زمین پر کھڑے ہوں گے وہ سب کے لئے ایک سطح مساوی ہے۔ دنیا میں اگر تین شخص بھی ایک سطح مستوی پر کھڑے ہوں تو یہ اختلاف کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق بھی حضرت ممدوح نے قریب قریب یہی جواب دیا کہ دنیا کے اندر چونکہ امر باطن (یعنی درجات طاعت و معصیت) میں سب متفاوت ہو گئے اس لئے آخرت میں

اس کا حکم واضح ہوگیا) کہ پسینہ کی مقدار حسب معاصی ظاہر ہوئی) کیونکہ آخرت دار حق ہے (واقعیت کا اس میں ظہور ہوگا اور چھپا ڈھکا سب کھل جائے گا)۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ برزخ کے اس حصہ میں جہاں کافروں کی روحیں ہیں جگہ جگہ عراجین ہیں جو برزخ سے نکل کر لمبے ستونوں کی طرح جہنم کی سمت میں بڑھتے چلے گئے ہیں اور ان عراجین میں رہنے والوں پر جہنم کے عذاب اور اس کی لپٹ اور بدبو وغیرہ کا اثر اتنا پہونچتا ہے گویا وہ جہنم ہی میں ہیں۔ ان عراجین میں جو رکھے جائیں گے وہ منافقین اور شدید الکفر لوگ ہوں گے جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا۔ اسی طرح برزخ کے جس حصہ میں ارواح مومنین ہیں اس میں بھی عراجین ہیں جو برزخ سے نکل کر لمبے ستون کی طرح جنت کی سمت میں بڑھتے چلے گئے ہیں۔ اور ان میں رہنے والوں پر جنت کی نعمتوں، ٹھنڈی ہواؤں، اور مہک وخوشبوؤں کا ایسا ورود ہوگا کہ گویا وہ خاص جنت ہی کے اندر ہیں۔ اور جو ان میں رکھے جائیں گے وہ شہدار اور وہ لوگ ہوں گے جن پر اللہ کی خاص رحمت ہے۔ اور یہ ہر دو فریق کے عراجین مذکورہ درحقیقت برزخ ہی کے حصے ہیں۔ مگر ان کی صورت ایسی ہے جیسے زائد چیز باہر نکل کر برزخی سمت کے سوا دوسری سمت کو بڑھتی چلی جاتی ہے ف کھجور کے پتے جب کاٹ دئے جاتے ہیں تو اس کی جڑ کا حصہ تنہ درخت میں لگا ہوا رہ جاتا ہے اور وہ قائم رہتا ہے کہ درخت کھجور کے سیدھے تنہ پر انہیں پر انگوٹھا ٹکا ٹکا کر پھلنگ پر پہونچ جاتے ہیں۔ اس ٹھنٹھ کو عربی میں عرجون کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع ہے عراجین۔ یہ حصہ درحقیقت تنہ کھجور ہی کا حصہ ہے مگر اصل تنہ سے زائد ہو کر ادھر ادھر کو باہر نکل گیا ہے۔ ۱۲

میں نے عرض کیا کہ برزخ کا حصہ زیرین جب آسمان دنیا پر ہے تو اس میں ارواح کفار کے جانے کی صورت بجز اس کے کوئی نہیں کہ آسمان کا دروازہ کھولا جائے۔ حالانکہ حق تعالیٰ فرماتا ہے لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ السَّمَاءِ کہ ارواح کفار کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔

نیز علمار نے بیان کیا ہے کہ مومنین کا برزخ قبر سے لے کر اعلیٰ علیین تک ہے اور کفار کا برزخ قبر سے لے کر سجین تک اور سجین اسفل السافلین میں ہے (جس سے نیچے کوئی حصہ ہی نہیں۔ پھر آسمان اُن کا مستقر کیسے ہوسکتا ہے؟)

پس اس کے جواب میں ایک مرتبہ تو آپ نے یہ فرمایا کہ جب کافر کی روح اسفل برزخ یعنی آسمان دنیا میں ہے اور (تمامی ادراکات سے محروم و) محجوب بنادی گئی ہے گویا اس کی آنکھ کان دل اور تمامی آلات حس وشعور کو سی دیا گیا ہے تو (کھلا دروازہ بھی) اس کے لئے گویا ایسا ہے جیسے کھولا ہی نہیں

گیا۔ ف یعنی ارشاد خداوندی تمثیل کے درجہ میں ہے۔ مثلاً فرمایا ہے وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا کافروں کے ایسی آنکھیں ہیں جن سے دکھائی نہیں دیتا، اور ایسے کان ہیں جن سے سنائی نہیں دیتا۔ مطلب یہ ہے کہ جب حق شے اور حق بات کا آنکھ کان کے ذریعہ شعور و ادراک نہ ہوا تو آنکھ کا دیکھنا بمنزلہ نہ دیکھنے کے ہے۔ اور کان کا سننا بمنزلہ نہ سننے کے ہے، اور اسی بنا پر ان کو صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ کہا گیا ہے کہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں۔ یعنی جب کان اور زبان اور آنکھ سے ان کے مُدرکات کا ادراک ہی نہ ہوا تو انکا ہونا نہ ہونا برابر ہے) ۱۲

اور ایک مرتبہ یہ فرمایا کہ برزخ میں ارواح کفار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ ہے جو ظلمت و بدحالی کے غلبہ کی وجہ سے بالکل پردہ میں (اور چوپٹ اندھی) ہے۔ کہ کسی روح تک کو بھی نہیں دیکھ سکتی اور قلیل کثیر کچھ بھی اس کو نظر نہیں آتا۔ اور یہ پردہ (کپڑے یا لوہے وغیرہ جرم کا نہیں بلکہ) اللہ پناہ میں رکھے صرف غضب خداوندی کا ہے۔ اور ایک قسم وہ ہے جس پر حجاب نہیں ہے بلکہ وہ دیکھتی ہے۔ مگر کیا دیکھتی ہے؟ صرف وہ عذاب دیکھتی ہے جو اس کے لئے طیار کیا گیا ہے۔ اور ہر دو قسم پر اللہ پاک کا غصہ ہے۔ لہٰذا وہ بمنزلہ اس کے ہے۔ جس کے لئے آسمان کے دروازے نہیں کھولے گئے (اس کا مفہوم یہ ہے کہ آسمان کے دروازہ کا کھولا جانا علامت ہے احترام کی کہ ملائکہ استقبال کریں اور مبارکباد دیں، اور یہ مشاہدہ کرے آسمانی مخلوق اور مناظر قدرت الٰہیہ کا اور جب یہ صورت نہیں بلکہ ایسا ہے جیسے پٹی باندھ کر جیل خانہ کی کال کوٹھری میں ٹھونس دیا جائے کہ بجز تکالیف اور سزاہائے مشقت کے چار طرف کچھ نظر نہ آئے تو آسمانی دروازہ کھلنا نہ کھلنا اسکے لئے برابر ہے۔ پہلی تقریر میں تمثیل فتح باب کے عدم شعور و ادراک میں تھی، اور اس تقریر میں تمثیل فتح باب کے مقصود یعنی مشاہدہ مَا فِی السَّمَآءِ سے حرمان اور عدم احترام میں ہے) جامع کتاب کہتے ہیں کہ اس کی تائید آیت شریفہ کی تفسیر کے متعلق خود علماء کے اختلاف سے ہو رہی ہے کہ بعض نے کہا ہے مطلب یہ ہے کہ (صعود روح کے لئے نہیں بلکہ) کافروں کی دعاؤں کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔ یعنی وہ مقبول نہ ہونگی (اور بارگاہ مجیب الدعوات تک ان کی رسائی نہ ہوگی) اور بعض نے یہ مطلب بیان کیا ہے کہ جس (عزت افزائی اور استقبال ملائکہ) کے لئے مومنین کے واسطے دروازہ ہائے آسمان کھولے جائیں گے اس شان پر ان کافروں کے لئے نہ کھولے جائیں گے (پس نفس کشود باب کی نفی مراد نہیں۔ بلکہ برائے استقبال کشود کی نفی مُراد ہے) چنانچہ بیضاوی میں یہ اقوال مذکور ہیں۔ نیز معراج والی حدیث میں آیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم آسمان پر حضرت آدمؑ سے ملے اور دیکھا کہ ایک جماعت ان کے دائیں بیٹھی ہے۔ (یہ ارواح مومنین تھیں) اور ایک جماعت ان کے بائیں طرف بیٹھی ہے (اور یہ کافروں کی روحیں تھیں) حضرت آدم علیہ السلام جب

داہنی طرف نظر ڈالتے ہیں تو مسکرا دیتے ہیں اور جب بائیں طرف نگاہ کرتے ہیں تو رو پڑتے ہیں۔ اس حدیث میں بھی جماعت کافرین کے متعلق علماء کا اختلاف ہوا ہے کہ بعض نے ظاہری معنے پر حمل کیا اور ارواح کفار کا آسمان پر صعود مانا ہے) اور بعض نے اس کی تاویل کی ہے (کہ ارواح کی صور مثالیہ تھیں حقیقی ارواح نہ تھیں)۔

اور ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے (دوسرے شبہ کے جواب میں) یہ فرمایا کہ جب برزخ کی ابتداء آسمان دنیا سے ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ صرف ہمارے سر ہی کی جانب ہے۔ بلکہ ہمارے پیروں کے نیچے بھی ہے اس لئے کہ آسمان ساری زمین کو محیط ہے اور ہر آسمان ان چیزوں کو محیط ہے۔ اور جو اس کے اندر واقع ہیں (لہٰذا زمین بھی اس کے اندر ہوئی) اور عرش سب (آسمانوں اور زمینوں) کو محیط ہے۔ اور برزخ بڑی اور عظیم الشان چیز ہے کہ اس کی اصل کا عرض جو برزخ کا سب میں زیادہ تنگ حصہ ہے مقدار میں زمین سے سات گنا ہے۔ پس جب ہم نے کہا کہ برزخ ہمارے سروں پر ہے تو یقیناً اس کا ایک حصہ ہمارے پیروں کے نیچے بھی ہوا۔ لہٰذا جن علماء نے یہ فرمایا ہے کہ کفار کی روحیں اسفل سافلین میں ہوں گی ان کی مُراد برزخ کی وہ زیریں جانب ہے جو ہمارے پیروں کے نیچے ہے۔

حضرت ممدوح کا مطلب یہ ہے کہ برزخ ساتوں آسمانوں کو قطع کرتا ہوا اعلےٰ علیین (بالا از بالا) تک چلا گیا ہے۔ نیز ساتوں زمینوں کو قطع کرتا ہوا اسفل سافلین (زیریں از زیریں) تک چلا گیا ہے۔ (کہ زمین مع مافیہا اسکے خوف میں آگئی ہے) پس برزخ کا زیریں حصہ ساتویں زمین کے نیچے سجّین میں ہوا اور بالائی حصہ اس کا ساتویں آسمان کے اوپر علیّین میں ہوا۔ اس سے اس روایت کی موافقت بھی ہوگئی جس میں آتا ہے کہ جنت آسمانوں کے اوپر ہے، اور جہنم زمینوں کے نیچے ہے۔ کہ برزخ کا زیریں حصہ سمت جہنم ہوا اور اس میں کفار و اشقیاء اور فجار کی روحیں ہیں، اور برزخ کا بالائی حصہ جنت کے رخ ہوا اور اس میں مومنین و سعداء اور اخیار کی روحیں ہیں۔ اس تقریر کو سابق اختلاف سے بھی کوئی منافات نہیں۔ کیونکہ جب برزخ کی یہ صورت ہے (کہ وہ محیط ہے افلاک کو بالا و زیریں ہر دو جانب سے) تو لازم نہیں آیا کہ ارواح کفار کے لئے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے (کیونکہ بجصہ زیرین سجین میں جانا بھی آسمان ہی کے دروازہ سے ہوگا اگرچہ وہ دروازہ آسمان کے اُس حصہ میں ہوگا جو زمین سے نیچے ہمارے پیروں کی جانب واقع ہے)

نیز ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ کفار میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی روح کو برزخ کی جانب چڑھنے سے روک لیا جاتا ہے اور وہ (ہمزاد اور دیگر) شیاطین جو اس کی ذات میں دنیا کے اندر روسو سے

ڈالا کرتے تھے اس پر مسلط کردئے جاتے ہیں۔ کہ جس وقت بھی وہ روح اپنی ذات (اور جسم) سے باہر نکلتی ہے تو یہ شیاطین فوراً اس کو آگھیرتے اور اس کو کھلونا بنا کر اس کے ساتھ کھیلتے ہیں جیسے بچے گیند سے کھیلا کرتے ہیں کہ ایک شیطان دھکا دیکر اُسے دوسرے پر پھینکتا ہے اور وہ شیطان اُدھر سے ڈھکیل کر اس پر پھینک دیتا ہے۔ پھر سب مل کر پتھروں پر اس کو پٹختے ہیں اور سنگلاخ زمینوں پر دے دے مارتے ہیں۔ غرض جب تک اس کا بدن (جل کر یا قبر میں پھول پھٹ کر) فنا نہیں ہو جاتا اور مٹی نہیں بن جاتا اس وقت تک طرح طرح کے ناقابل برداشت عذاب الٰہی میں اس کو مبتلا رکھتے ہیں۔ اس کے بعد اس روح کو برزخ کے حصۂ زیریں میں اس کی قیامگاہ پر پہونچا دیا جاتا ہے۔ پس جن علمائے کافر کی روح کے لئے دروازۂ آسمان نہ کھولے جانے کا یہ مطلب لیا ہو کہ وہ تا فنا جسم شیاطین کے ہاتھوں دنیوی عذاب میں دنیا ہی کے اندر گرفتار رہتی ہے) تو یہ بھی صحیح ہے۔

بہر حال ان تمامی اقوال میں تعارض نہیں ہے اس لئے کہ ارواح کفار کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض اسفل برزخ (سجین) میں ہوں گے۔ اور بعض اُن عراجین میں (جو زائد حصہ کی طرح عمودی شکل میں بہ سمت جہنم نکلے چلے گئے ہیں) اور بعض ان دونوں کے درمیان وسطی حصہ میں ہوں گے (اور بعض تا فنا جسم دنیا ہی کے اندر شیطانی ہاتھوں میں محبوس ہوں گے) اور بعض زمین سوم میں ہوں گے چنانچہ ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے فرمایا کہ میں نے زمین سوم میں چند جماعتوں کو تنگ مکانوں اور گہرے کنوؤں میں بھڑکتی ہوئی آگ اور مسلسل عذاب کے اندر مبتلا دیکھا کہ (ہنڈولے کی طرح) ہر وقت صعود اور نزول میں رہے ہیں۔ کوئی ان میں اوپر آکر کلام کرنا چاہتا ہے مگر بات پوری نہیں کرنے پاتا کہ فوراً نیچے اتر جاتا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ ان ہی لوگوں میں میری نظر ایک شخص پر پڑی جس سے مجھے عالم دنیا کی واقفیت تھی اور اس کا نام بھی مجھے معلوم تھا۔ میں نے اس کا نام لے کر اُسے پکارا اور کہا وائے تجھ پر، تو یہاں کس شامت اعمال میں آگیا؟ وہ چاہتا تھا کہ مجھ سے بات کرے مگر فوراً ہی نیچے اترا چلا گیا جامع کتاب کہتے ہیں کہ میرا غالب گمان یہ ہے کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ یہ جگہ بھی برزخ ہی کی جگہ ہو گی اس لئے کہ برزخ ساتوں زمینوں کو قطع کرتا ہوا اسفل سافلین تک چلا گیا ہے؟ فرمایا ہاں تم سچ کہتے ہو واللہ اعلم بالصواب۔

صرف یہ ایک موقع ہے جس میں مجھے اپنی تمامی تحریر کتاب کے اندر شک لاحق ہوا (کہ یہی ہے جو میں نے لکھا ہے یا مجھے کچھ سہو ہوا ہے) اور اس لئے میں نے غالب گمان کا لفظ لکھ کر اس پر متنبہ کر دیا ہے اور یہ شخص

جس کو حضرت ممدوح نے (مبتلا رعذاب) دیکھا عالم دنیا میں منجملہ مومنین کے تھا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا اور مشیت الٰہیہ کا عجیب کرشمہ ہے کہ ارواح کفار کو ارواح مومنین سے کوئی نفع نہیں پہونچتا حالانکہ دونوں میں کوئی پردہ یا اوٹ نہیں ہے۔ ظاہری حجاب کے بغیر (محض ارادہ و مشیت کا) حجاب قائم فرمادیا۔ کہ ارواح مومنین کے لئے وہ انوار ہیں جن کی روشنی اور چمک کو چاند اور سورج وغیرہ کسی نورانی جسم کی روشنی بھی نہیں پہونچ سکتی بلکہ ان نورانی اجرام کی روشنی بھی انہیں انوار سے آئی ہے جیسا کہ آئندہ مذکور ہوگا۔ مگر باوجود اس کے کافر کی روح اس سے منتفع نہیں ہوسکتی۔ اور اس کی قلیل وکثیر کچھ بھی روشنی نہیں لے سکتی۔ بدستور اپنی اسی کثیف تاریکی اور بیحد سیاہی میں رہتی ہے۔ گویا ان انوار کے اعتبار سے وہ پردہ میں ایسی چھپی ہوئی ہے۔ جیسے اس کو ڈبہ میں بند کردیا گیا ہو اور ڈبہ کا منہ رانگ سے جھال دیا گیا ہو۔ حالانکہ نہ ڈبہ ہے نہ رانگ بلکہ محض ارادہ الٰہیہ مانع ہے کہ وہ نہیں چاہتا اس کافر کو انوار مومنین سے انتفاع نصیب ہو۔ ہاں ارواح مومنین میں باہم ایک کو دوسرے سے نفع پہونچتا ہے، اور ایک روح دوسری کو نور پلاتی ہے، اور ایک دوسرے کی شفاعت کرتی ہے حتیٰ کہ ایک روح میں ان گناہوں کے آثار نظر آتے ہیں جو اس کی ذات نے دنیا میں کئے تھے، پھر وہ آثار بالکل زائل ہوجاتے ہیں۔ محض اس وجہ سے کہ اللہ کے کسی مقبول ومحبوب بندہ کی روح اس کے قریب ہوتی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ برزخی مکانات اور جنت کے درمیان نور کے ڈورے ہیں جو روحوں کے اجسام سے جدا ہوکر برزخ میں جانے کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ نور (جو دھاگے کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے) نور ایمان ہے (اور اس لئے اُن روحوں میں نہیں ہے جو ابھی دنیا میں آکر مکلف بالایمان نہیں ہوئیں) مثلاً زید کی رُوح ہے (جو ایمان کے ساتھ دنیا سے اٹھی تھی) تو نظر آئے گا کہ نور کا ڈورا اس سے نکل کر برزخ کو قطع کرتا ہوا جنت تک چلا گیا ہے۔ اور اس نور کے ذریعہ اس کو جنت سے تمتع وانتفاع حاصل ہو رہا ہے۔ اور اسی طرح کفّار کے برزخی مکانات اور دوزخ کے درمیان ظلمت کے ڈورے ہیں۔ اور وہ بھی ارواح کے اجسام سے جدا ہونے کے بعد ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اور یہ ظلمت ظلمتِ کفر ہے کہ اس کا ڈورا کافر کی روح سے نکل کر دوزخ تک چلا گیا ہے اور اس کے ذریعہ کافر کی روح کو جہنم کی لُو اور لپٹ پہونچتی ہے۔

ف حدیث میں آتا ہے کہ منکر ونکیر کے سوال جواب کے بعد اگر مومن ثابت ہوا تو اس کے لئے جنت کی کھڑکی کھولدی جاتی ہے۔ اور اگر کافر ہوا تو جہنم کی کھڑکی کھولدی جاتی ہے، عجب نہیں اس سے یہی خیوطِ نور وظلمت مُراد ہوں جن کی مقدار وضخامت حسب مقدار کفر وایمان ہوتی ہے اور جس طرح نل اور

تار کے ذریعہ دور کی ہوا اور بھاپ کھچتی ہے اسی طرح یہ ڈورے جنت کی خوشگواری وتازگی کو اخذ کرتے اور جہنم کی تپش اور سوزش کو جذب کر کے اس مبتدا تک پہونچاتے ہیں جہاں سے ڈورے چلے ہیں۔ جیسے شعاعوں کے تار کہ سورج کی گرمی بھی شعاع ہی کے ذریعہ سر پر آتی ہے اور چاند کی خنکی بھی اس کی شعاع ہی کے ذریعہ بدن پر پڑتی ہے۔ اسی طرح نور ایمان اور ظلمت کفر کے تار جاذب ہوا بن کر خنکی وراحت اور تپش وکلفت پہونچاتے ہیں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اسی طرح برزخ کے اور دنیا میں اجسام مومنین کے درمیان بھی انکے نور ایمان کے ڈورے ہیں کہ صاحب بصیرت کو ایمان کا ڈورا بالکل صاف اور سفید ایسا نظر آتا ہے جیسے دھوپ کسی بند دروازۂ مکان پر پڑ رہی ہو اور اس کی شعاع کسی باریک سوراخ کے ذریعہ اندر آ رہی ہو۔ کہ وہ لمبے دھاگے کی طرح دروازہ سے آگے نکلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اسی طرح یہ ڈورا صاحب بصیرت کو زندہ مومنین میں ہر ایک کے سر سے نکلا ہوا برزخ میں جو جگہ بھی اس کا مستقر ہے وہاں تک چڑھتا نظر آتا ہے۔ مگر جب تک سروں سے ایک بالشت اونچا نہیں ہو جاتا اس وقت تک نمایاں نہیں ہوتا۔ اور ڈورے کی ضخامت حسب قسمت ازلی مختلف ہوتی ہے کہ کسی مومن میں دھاگے کی طرح باریک نظر آتا ہے، اور کسی میں اس سے زیادہ موٹا سرکنڈے کی مٹائی کے مثل، اور کسی میں بانس اور گنے کی طرح، اور کسی میں تنہ کھجور کی طرح موٹا، اور یہ لوگ (جن کا نور ایمان تنہ کھجور کے مثل ضخیم ہوتا ہے) اکابر اولیاء ہیں رضی اللہ عنہم۔ اسی طرح کفار کے اجسام اور ان کے برزخی مستقر کے درمیان ڈورے نظر آتے ہیں۔ مگر کفار کے ڈوروں کا رنگ سیاہی مائل نیلگوں ہوتا ہے۔ جیسے گندھک کی لو کا رنگ ہوتا ہے (اور پرانے زمانہ کی دیا سلائی جلانے سے شروع میں نظر آتا تھا) جس شخص میں اس رنگ کا ڈورا نظر آوے وہ اس کے شقی (اور جہنمی) ہونے کی علامت ہے۔ اور یہ بھی حسب سابق ضخامت میں مختلف ہوتا ہے۔ کہ کسی کا ڈورا پتلا ہوتا ہے (جو اس کے معمولی کفر کی علامت ہے) اور کسی کا تنہ کھجور کے موافق ضخیم (جو متمرد اور شدید الکفر ہونے کی علامت ہے) غرض حسب تفاوت کفر یہ ڈورا بھی رقیق اور غلیظ ہوتا ہے۔

نیز آپ نے فرمایا اکثر ایسا ہوتا ہے کہ میں یہود کی بستیوں میں جاتا ہوں تو یہ ڈورے ان کے سروں سے نکلے ہوئے دیکھتا ہوں جو اوپر چڑھ کر افق میں ایسے جمع ہو جاتے ہیں جیسے سیاہ کہرا کہ موسم سرما میں برف پڑنے کے دن خلا میں دھویں اور سیاہ گھٹا کی طرح ایک چھت سی قائم ہو جاتی ہے) نیز ان میں (ملے جلے) بہت کم ڈورے سفید اور چمکدار بھی نظر آتے ہیں۔ اس سے میں سمجھ لیتا ہوں کہ یہ ڈورے والے (اپنا مذہب چھوڑ کر) دین محمدی کی طرف منتقل ہوں گے۔ اسی طرح کسی اسلامی شہر میں جاتا ہوں

تو دیکھتا ہوں ان کے سروں سے سفید چمکدار ڈورے نکل کر برزخ کی طرف چڑھ رہے ہیں۔ ہاں بعض ڈورے ان میں ایسے بھی نظر آتے ہیں جن میں نیلاہٹ ہوتی ہے مگر ایسے ڈورے بہت قلیل مقدار میں ہوتے ہیں۔ اور جس میں یہ ڈورا نظر آئے وہ اس کی شقاوت (اور ارتداد) کی علامت ہے۔

جامع کتاب کہتے ہیں کہ ان ہی کی طرف اشارہ ہے اس حدیث میں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں۔ انسان لوگوں کی نظروں میں عمل کرتا ہے جنتیوں کے سے اعمال۔ کہ دفعتہً ازلی لکھت اس پر غالب آتی ہے اور وہ عمل کرنے لگتا ہے دوزخیوں کے اعمال اور آخر وہ داخل ہوتا ہے جہنم میں۔ اور زمرہ یہود میں جو سفید ڈورے والے نظر آتے ہیں ان کی طرف اشارہ ہے اس جز و حدیث میں کہ انسان عمل کرتا رہتا ہے اہل جہنم کے سے اعمال۔ حتے کہ اس کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک بالشت کا فصل رہ جاتا ہے (یعنی موت کا وقت قریب اور دخول جہنم پاس آجاتا ہے) کہ دفعتہً لکھت اس پر غالب آتی ہے اور وہ عمل کرنے لگتا ہے اہل جنت کے سے اعمال۔ اور آخر وہ داخل ہو جاتا ہے جنت میں

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا جو ازلی لکھت کا نظارہ کرنا چاہے اور حق تعالیٰ کا ارشاد جو حدیث میں مذکور ہے ھٰؤلاء الی الجنۃ ولا ابالی وھٰؤلاء الی النار فلا اُبالی مشاہدہ کرنا چاہے وہ بچوں پر نگاہ ڈالے یعنی بشرطیکہ صاحب بصیرت ہو اور اس کشف خیوط سے بہرہ یاب ہو۔ تو وہ دیکھے گا کہ بعض بچے ایسے ہیں جن کا ڈورا نہایت چمکدار ہے (جو علامت ہے کہ ایمان پر خاتمہ ہوگا اور جنتی فریق میں درج ہوا ہے) اور بعض ایسے ہیں جن کے ڈورے میں نیلاہٹ ہے (جو علامت ہے کہ کفر پر مرے گا اور جہنمی فریق میں درج ہوا ہے) حالانکہ ابھی تک غیر مکلف ہیں۔ مگر ازلی لکھت تو ازلی ہے (اسکو کون مٹا سکتا یا بدل سکتا ہے)

ایک مرتبہ ہمارا گذر دو کمسن بچوں پر ہوا جن کی عمر تقریباً چار پانچ برس کی تھی اور وہ دونوں کھیل رہے تھے۔ حضرت نے مجھے فرمایا دیکھو اس نے کونسا عمل کیا ہے اور اس نے کونسا عمل کیا ہے۔ یعنی (باوجود عمل کا وقت نہ آنے کے) ایک کا ڈورا چمکدار ہے (جو بتا رہا ہے کہ عامل بالحسنات ہوگا) اور دوسرے کا ڈورا نیلگوں ہے (جو بتا رہا ہے کہ عامل بالسیئات ہوگا)

اور ایک مرتبہ بچوں کی ایک جماعت پر ہمارا گذر ہوا جو کھیل رہے تھے تو آپ نے فرمایا اس زمانہ کے بچوں پر نظر ڈال کر معلوم ہوتا ہے کہ آنے والے زمانہ سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس زمانہ کے بچوں کے انوار میں حسن اور ملاحت انتہا درجہ کی ہے۔ ایک بار ہمارا گذر ایک مقام پر ہوا اور وہاں سے ایک بچہ نکلا تو حضرت نے اس پر نظر ڈالی اور اس سے پوچھا صاحبزادہ تمہارا کیا نام ہے؟ اس نے کہا مقداد۔ آپ نے فرمایا اس بچہ سے ایک بڑا ولی پیدا ہوگا جو اللہ کے نزدیک معزز و محترم ہوگا۔

ایک مرتبہ دوسرے بچہ پر گذر ہوا تو آپ نے مجھے فرمایا دیکھو اس کے چہرہ پر ولایت کا نور (چمک رہا ہے) دیکھو اس کے منہ پر ولایت کی حلاوت (برس رہی ہے) دیکھو اس کی ذات میں ولایت (صاف نظر آ رہی ہے) کہ کسی پر بھی مخفی نہیں۔ اس کے بعد فرمایا میں تم کو وصیت کرتا ہوں کہ اس کے ساتھ خوبی برتنا چنانچہ وہ بڑا ہوا اور آج ماشاء اللہ کوئی چیز ہے۔ الحمد للہ حج بھی کر چکا، بڑے بڑے مقامات اس کو نظر آتے ہیں، عملی حالت نہایت اچھی ہے، امر دین میں استقامت اس کو نصیب ہے، اور چہرہ پر ملاحت کی شعاعیں دمک رہی ہیں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ بچہ کے ماں کے پیٹ سے نکلتے ہی اور زمین پر آتے ہی اس کشف والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا انجام کیا ہونا ہے۔ جیسے جو ہڑ کا حال ہے کہ نبات سے قبل تو بے شک پتہ نہیں چلتا کہ اس میں کچھ پیدا ہوگا یا نہیں۔ مگر جب اس میں بیل جم کر اوپر نظروں کے سامنے آجاتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ تربوز کا پتہ ہے (اور اس میں تربوز ہی لگے گا) اور یہ دوسرا پتہ ہے (جس میں تربوز آنے کی کوئی صورت نہیں) یا جیسے غنچہ کہ اگر زرد رنگ کا ہے تو سبز نہیں بن سکتا اور جو سرخ ہے وہ زرد نہیں بن سکتا۔ اس کے بعد میں نے عرض کیا کہ منافقوں کے بدترین کفار اور جہنم کے درک اسفل میں جانے کا کیا سبب ہے جب کہ اُن سے (حقیقۃً نہ سہی مگر صورۃً تو) نماز، روزہ، حج، جہاد وغیرہ کا صدور ہوا۔ اور یہ بھی نہ سہی انہوں نے ایذا رسانی سے تو مسلمانوں کو محفوظ رکھا۔ (برخلاف کفار کے کہ ان سے صورۃً صوم وصلوٰۃ بھی نہ پائی گئی اور ایذائیں بھی ان سے مسلمانوں کو زیادہ پہونچیں) فرمایا سبحان اللہ میاں کفر اور اس کی خباثت و شدت کا امتداد ازلی لکھت کی طرف سے ہوا کرتا ہے، نہ کہ اعمال کی طرف سے۔ بارہا ایسا ہوا کہ ہم نے برزخ کی طرف نگاہ کی تو ایک ظلمانی ستون نہایت نیلا خبیث دراز ہوتا اور وہاں سے اُترتا ہوا کفرستان کے کسی شہر کی طرف جاتا ہمیں نظر آیا اور میں نے خیال کیا کہ ضرور یہ کسی بڑے متمرد اور حاکم ذی جاہ پر اترے گا۔ اس لئے میں نے اپنی نگاہ اس کے پیچھے لگائی (کہ دیکھوں کس پر جا کر پڑتا ہے) مگر دیکھا تو وہ ایک بڈھے پھوس ضعیف الجثہ شخص پر آکر پڑا جو اپنی دکان میں بیٹھا ہوا چندھی آنکھوں سے تک رہا تھا۔ یہ دیکھ کر میں کلمہ طیبہ پڑھتا اور اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا کیا کرتا تھا کہ سبحان تیری قدرت کہاں یہ بڈھا گمنام اور کہاں شدید کفر کا یہ ظلمانی ستون، کہ کسی کا وہم و گمان بھی نہ جائے۔ بس کرم ہے تیرا کہ اس پر یہ وبال، اور ہم پر بلا استحقاق تیرا فضل اور لطف شامل حال)

ایک مرتبہ فرمایا کہ نیلا ڈورا اگرچہ شقاوت و کفر پر دلالت کرتا ہے مگر کبھی باذن اللہ متبدل بھی ہو جاتا ہے، جبکہ اس شخص کو اہل سعادت کی محبت نصیب اور اس کے دل میں ان کا تعلق قائم ہو جائے

پس اس صورت میں آہستہ آہستہ اس کا ڈورا صاف ہوتا رہتا اور آخر کار اہل سعادت کی طرح (صاف وسفید) بن جاتا ہے۔

ایک مرتبہ آپ نے فرمایا یہ نیلا ڈورا اگر نیلا تو ہو مگر اس میں (روشن کردہ گندھک کی سی) چمک نہ ہو تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ وہ (صحبت صلحائے عموماً بدل جاتا ہے۔ لیکن اگر نیلاہٹ کے ساتھ چمک بھی ہو تو اس کو بدلتے ہوئے ہم نے کبھی نہیں دیکھا۔

ایک مرتبہ فرمایا حضرات انبیار علیہم السلام کے مبعوث ہونے میں ایک حکمت یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو ایک کلمہ توحید پر جمع کریں گے۔ حتیٰ کہ سب ایک ملت و مذہب پر آجائیں گے تو باہم ایک دوسرے کی مدد اور ایک دوسرے کو نصیحت کیا کریں گے۔ اور ظاہر ہے کہ بعض ان میں اہل سعادت ہوں گے اور بعض وہ ہوں گے جن کا ڈورا نیلا ہوگا۔ پس اگر اس کو کچھ مدت تک اہل سعادت کی صحبت نصیب رہی تو ان کے ساتھ رہنے کی وجہ سے (اس کا نیلا ڈورا سفید رنگ قبول کرے گا اور) وہ بھی بہ برکت اجتماع صلحار سعید ہو جائے گا۔ پس محبت نصیب ہوئی بعثت انبیار کی وجہ سے، اور تبدل حال نصیب ہوا اس محبت کی وجہ سے۔ جامع کتاب کہتے ہیں یہی راز ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت میں شامل رہنے کا تاکیدی حکم فرمایا کہ بالشت برابر بھی سواد اعظم سے باہر نہ نکلا جائے (چنانچہ ارشاد ہے علیکم بالجماعۃ فانہ من شذ شذ فی النار جماعت سے لگے اور چپٹے رہو کہ جو اس سے علیحدہ ہوا وہ جہنم میں گیا۔

ایک بار میرا ہاتھ حضرت کے ہاتھ میں تھا اور ہم ایک بازار میں جا رہے تھے۔ میں حضرت سے اسی قسم کے کشفی سوالات کر رہا اور اسی میں محو تھا کہ ایک شخص ملا جو صلاح کی طرف منسوب اور لوگوں کا پیر بنا ہوا تھا۔ اس نے ہم سے ایک بات کہی جس میں بظاہر تو نصیحت تھی مگر قرینہ سے معلوم ہو رہا تھا کہ مقصود کچھ اور (یعنی طعن واعتراض) اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اس کا ڈورا اللہ پناہ میں رکھے نیلگوں ہے۔ اور بارہا اس پر قسم کھائی۔ اور یہ بھی فرمایا کہ مجھے پتہ نہیں اس کا ڈورا متبدل ہوگا (اور کسی وقت سفید ہو جائے گا) یا نہیں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جب آدمی مر جاتا اور اس کا جسم (قبر میں) پھولنا پھٹنا شروع ہو جاتا ہے تو روح کا تعلق اس سے منقطع ہو جاتا ہے اور وہ عالم برزخ میں چلی جاتی ہے۔ ہاں بعض اولیار میں سر روح کا تعلق قبر کے ساتھ ایسا ہی قائم رہتا ہے جیسا زندگی میں ذات کے ساتھ قائم تھا کہ اس کا نور ایمان ادھر قبر سے متصل رہتا اور وہاں سے اوپر کو چڑھتا ہوا اُدھر برزخ میں روح سے

جا ملتا ہے۔

نیز فرمایا میں اکثر فاس کے مقابر اور گورستانوں پر نظر ڈالتا ہوں تو انوار کو زمین سے نکلتا اور بسوئے برزخ ایسا چڑھتا ہوا پاتا ہوں جیسے بانس یا نیشکر زمین سے اُگ کر اوپر برزخ تک چلا جائے۔ اس سے معلوم کر لیتا ہوں کہ یہ لوگ (جن کی قبروں سے یہ نور برآمد ہو رہے ہیں) صلحاء اور اولیاء ہیں اسی طرح ہمارے آقا و مولانا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف سے آپ کے نور ایمان کا ستون ممتد ہو کر اُس برزخی قبہ تک جا پہونچا ہے جو کہ آپ کی روح مطہرہ کا مستقر ہے۔ اور اس نور ممتد کے ستون کا طواف کرنے کے لئے ملائکہ کی جماعتیں کی جماعتیں آتی رہتی ہیں کہ وہ تبرکاً نور شریف کو مس کرتے اور (شوق وولہ میں) اس پر ایسے گرتے ہیں جیسے شہد کی مکھیاں اپنے یعسوب (سلطان النحل مکھے) پر گرا کرتی ہیں جب کوئی فرشتہ سرّ الٰہی یا کسی امر کی برداشت سے عاجز آتا، یا اس کو کسی قسم کی گرانی و ماندگی لاحق ہوتی یا کسی مقام پر رکاوٹ پیش آتی ہے، تو وہ فوراً نور شریف کی طرف لپکتا اور (نور محمدی سے استفادہ کی نیت پر) اس کا طواف کرتا ہے۔ اور ایسا کرنے سے اس کو قوت کاملہ نصیب ہوتی ہے اور وہ شادکام و بامُراد اپنی جگہ واپس ہو جاتا ہے۔ ایک گروہ طواف سے فارغ نہیں ہونے پاتا کہ فرشتوں کا دوسرا گروہ آجاتا ہے اور ان میں کا ہر فرشتہ طواف میں بیتابانہ شوق کے ساتھ عجلت کرتا ہے۔ ف عجب نہیں بعض مشائخ کے کلام میں استفادۂ روحانی کے لئے مزارات صلحاء کے طواف کا طریق اسی سے مستنبط ہوا ہو۔ مگر جن علماء نے اس کو ممنوع قرار دیا ہے ان کی دلیل یہ ہے کہ یہ طریق سجدۂ آدمؑ کی طرح شریعت ملائکہ میں جائز و مستحسن ہے۔ مگر ہم شریعت محمدیہ کے مکلف ہیں نہ کہ شریعت ملائکہ کے۔ کیا ضرور ہے کہ نور روح محمدی سے استفادہ کا جو طریق ملائکہ کے لئے تجویز کیا گیا ہو وہی طریق بشر کے لئے بھی جائز ہو۔ بلکہ جب قولاً یا فعلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی تعلیم ثابت نہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ امت محمدیہ کے لئے یہ طریق استفادہ جائز ہی نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سلفاً و خلفاً حضرات صحابہ و تابعین یا دیگر اولیاء کاملین حتیٰ کہ اقطاب و اغواث سے بھی عملاً اس طواف کا مزار سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی کہیں کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ اصل مقیس علیہ وہی ہے۔ چہ جائیکہ دیگر صلحاء امت محمدیہ۔

دوم ملائکہ کی تخلیق ارواح کی طرح خالص نور سے ہے۔ اس لئے وہ اجلّہ کاملین جن کو قدرت ہے کہ اپنی ارواح کو اجسام سے جُدا اور ممتاز کر سکیں۔ مثلاً اقطاب و اغواث جن کی ارواح ان کے اجسام کے ساتھ ساتھ جدا رکوع و سجدہ کر سکتی ہیں اگر وہ اپنی ارواح محضہ سے جن کو نورِ مجسّم ہونے کے سبب

خالص مشابہت ہے فرشتوں کے ساتھ ؛ اس طریق استفادہ کو اختیار کریں تو ممکن ہے مفید ہو اور ان کو روحانیات میں فرشتوں کی طرح قوت کاملہ نصیب ہو کہ ان ہی کو صاحب مزار کا نور ایمان بصورت ستون نظر بھی آئے گا۔ مگر جن کی ظلمت بشریہ نے اس ستون نور کو نظروں سے اوجھل کر رکھا ہے اور ان کی روح اپنے ترابی جسم کثیف میں محبوس ہے کہ اس کو چھوڑنے پر قادر نہیں۔ وہ ملائکہ کی نقل اُتار کر نفع نہیں اُٹھا سکتے۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص کہے کہ سبزہ پر نظر ڈالنے سے بصارت کو قوت پہونچا کرتی ہے۔ اور یہ سنکر ایک بینا اور تندرست شخص تو اپنی آنکھیں کھول کر بار بار سبز گھاس کو دیکھا کرے اور ایک دکھتی آنکھ والا شخص جس کی آنکھیں کھلتی ہی نہیں حلقہ چشم میں چھپی ہوئی نگاہ کو سبزہ کا گشت کرانے لگے تو اس نقل سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اور نہ یہ قانون کہ سبزہ مفرح و مقوی بصر ہے اس کے لئے نافذ ہوگا۔ کہ اس کی بصر ہی محجوب ہے اور گشت کرنے والی شے نگاہ نہیں بلکہ گوشت کا کثیف جرم ہے جو نورانی ڈھیلے پر چھایا ہوا ہے۔ پس روحانی طواف کے استفاضہ پر جسمانی طواف کا استفاضہ قیاس مع الفارق ہے۔

سوم یہ امت مرحومہ سید عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبہ ہے اور اس میں مطلوبیت کی شان آئی ہوئی ہے کہ شفقت محمدیہ سے ہر لمحہ مالا مال ہے۔ ان کی طرف سے محبت خالصہ و عقیدت حقہ اور آپ کی تعلیم کردہ شریعت کا تمسک و اتباع اس کے لئے کافی ہے کہ روحانیت محمدیہ ان کی طرف متوجہ اور از خود اس کے انوار و تجلیات ان پر مبذول ہوں کہ ماں کی چھاتیوں سے دودھ کی نہریں جاری ہونے کے لئے بچہ کا اپنی جگہ بلبلانا اور اس کی طرف ذرا ہاتھ پھیلانا بھی کافی ہے۔ چنانچہ خود حیات شریفہ میں جبکہ وہ نورِ مطہرؐ عام نظروں کے سامنے تھا آپ نے کسی کو اپنے طواف کا محتاج نہیں رکھا۔ اس لئے آج یہ کہنا کہ اب استفادۂ روحانیت کا طریق آپ کے مزار کا طواف ہے گویا آپ کی حیات برزخیہ میں ضعف ثابت کرنا ہے۔ برخلاف ملائکہ کے کہ ان کی شان طالبانہ ہے اور وہ امت محبوبہ میں شامل نہیں۔ حیات میں بھی ان کا طریق استفادہ یہی تھا جواب ہے کہ آپ کے ستونِ نور ایمان کا طواف کیا کرتے تھے اور قوت ایمان و نور عرفاں میں ترقیات پایا کرتے تھے۔ لہٰذا اس قول کے مقابلہ میں کہ عامہ امت کا قول ہے اور نقل و عقل یعنی روایت و درایت ہر دو کے موافق ہے کسی شاذ قول کو در باب طوافِ روضہ مطہرہ بھی حجت نہیں بنایا جا سکتا۔ چہ جائیکہ دیگر اولیاء امت کے مزارات کا طواف۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ مخصوص ہے اس کے لئے جو روح کو جسم سے خالص کر سکے اور فرشتہ کا شبیہ و مماثل بننے کی طاقت رکھتا ہو۔ واللہ اعلم۔

ایک مرتبہ فرمایا کہ جب حق تعالیٰ نے چاہا کہ مجھے فتح نصیب فرمائے تو میں (اپنے وطن) فاس ہی میں تھا کہ دفعۃً (حجابی پردے میرے سامنے اُٹھا دیئے گئے اور) مجھے (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی) قبر شریف نظر آئی۔ اس کے بعد میں نے (آپ کے ایمان کامل واکمل کے) نور شریف کو دیکھا کہ وہ میری طرف قریب ہوتا چلا آرہا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ میرے قریب آگیا تو اس میں سے ایک شخص نمودار ہوئے اور وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ (یہ دلیل ہے کہ روح محمدی اپنے غلامان آستانہ کی طرف خود متوجہ، اور ابر نیساں کی طرح خود سروں پر آکر بارش برسانے کو آمادہ ہے، طواف مزار کا محتاج نہیں رکھا) یہ واقعہ سن کر (میرے شیخ) حضرت عبداللہ برناوی نے فرمایا اے مولانا عبدالعزیز رح اللہ پاک نے تم کو اپنی رحمت یعنی سید الوجود صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع فرمادیا، لہٰذا اب مجھے تم پر شیاطین کے تلاعب کا اندیشہ نہیں رہا۔ (کہ وہ تم کو اپنا کھلونا تو کیا بنائیں گے پاس بھی نہیں پھٹک سکتے)

نیز آپ نے فرمایا کہ برزخ کی شان بھی عجیب وغریب ہے۔ وہ خود مومنین کے نور ایمان سے منور ہے اور ان کی اتنی روشنی لیتا ہے جس سے عقول حیران ہیں۔ حتیٰ کہ سورج کی روشنی بھی ارواح مومنین ہی کے نور سے آئی ہے۔ اور چاند و دیگر ستاروں میں جو روشنی آئی ہے وہ نور آفتاب سے آئی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ برزخ کا حصہ زیریں (فلک چہارم سے نیچے جو کہ ارواح کفار کا مستقر ہے) وہ بالکل سیاہ اور تاریک ہے اور اس لئے اس کے مقابل جو سیارے واقع ہوئے ہیں ان میں روشنی نہیں ہے۔ اور وہی حائل اور مانع ہے کہ یہ سیارے ارواح مومنین کی اصل روشنی سے مستفید نہیں ہوسکتے کیونکہ اگر وہ اس سے منور ہوں تو ظاہر ہے کہ وہ نور ارواح اس برزخی حصہ کو عبور کر کے ان تک آئے گا اور اس لئے) وہ برزخی حصہ بھی منور ہو جائے گا۔ اور پھر کفار کی روحیں (تبعاً) منتفع ہو جائیں گی ارواح مومنین سے۔ حالانکہ مشیت الٰہیہ نہیں چاہتی کہ ارواح کفار کو ارواح مومنین سے کسی قسم کا بھی نفع پہونچے۔ لہٰذا (براہ راست ان کو نور نہ پہونچا اور) آفتاب کی روشنی سے ان کو منور کیا گیا۔ کیونکہ آفتاب برزخ سے باہر ہے اور یہ سیارے (چاند وغیرہ) اس کے مقابل پڑتے ہیں۔ لہٰذا اس سے نور اخذ کر لیتے اور روشن نظر آتے ہیں۔ (یعنی اس سے بالا بالا نور لے لیتے ہیں۔ برزخی تاریک حصہ کا کوئی دخل اور واسطہ نہیں پڑتا) اور چاند آسمان دنیا میں اس سمت پر واقع ہے جو ہمارے متصل ہے (اس لئے اس کی روشنی جو برزخ سے ہٹی ہوئی براہ راست سورج سے آئی ہے۔ ہمارے سروں پر پڑتی اور دنیا بھر میں پھیلتی ہے) ف غالباً یہی وجہ ہے چاند کے چھوٹے بڑے نظر آنے کی کہ تدریجاً ہلال سے ترقی پاتا ہوا شبِ چہار دہم کو بدر بن جاتا ہے اور پھر تدریجاً کم ہوتا ہوا ہلال بن کر دو تین شب کیلئے

نظروں سے غائب ہوجاتا ہے۔ کہ اس کے گول جسم کا جو حصّہ برزخ کے سامنے گیا۔ وہ تاریک ہوکر ہمیں نظر نہ آیا۔ اور جتنے حصہ کا مقابلہ قائم رہا آفتاب سے، وہ منور ہوا اور ہمیں نظر آیا۔ اور رفتار سیارگان کے اعتبار سے اس مقابلہ کی ہر مہینہ یہی صورت رہتی ہے جو نظر آتی ہے بلکہ سورج کی بھی اگر یہی وجہ ہو تو عجب نہیں کہ اپنی مقدار رفتار کے اعتبار سے چلتے چلتے جب اس کا کوئی حصّہ اس برزخی حصّہ کے مقابل آپڑے گا جو ارواح کفار کی وجہ سے بے نور ہے تو یہ حائل بن جائے گا اور ارواح مومنین کا نور اس پر نہ پڑ سکے گا۔ اور جتنا حصّہ اس کے مقابل پڑے گا اسی مقدار میں وہ بے نور ہو جائے گا یعنی گہہ جائیگا اور جتنا حصّہ اس کا براہ راست برزخ کے بالائی حصہ کے مقابل رہے گا وہ روشن رہے گا۔

غرض آفتاب کا براہ راست ارواح مومنین سے روشنی لینا اور ماہتاب کا براہ راست سورج سے روشنی لینا اس پر موقوف ہے کہ ان کا باہمی تقابل قائم رہے، اور برزخ کا حصّۂ زیریں جو مستقر ارواح کفار اور مظلم و سیاہ ہے درمیان میں حائل نہ ہو۔ جب اس کی حیلولت واقع ہو جاتی ہے تو وہ بے نور بن جاتا ہے۔ کیونکہ ذاتی نور کسی سیارہ یا ستارہ میں نہیں ہے۔ جو بھی منور ہے وہ ارواح مومنین کے انوار سے منور ہے۔ گرہن کا یہ سبب عقلاً بھی اقرب الی الفہم ہے بہ نسبت اس کے کہ زمین کی حیلولت کو اس کا سبب بتایا جائے۔ اس لئے کہ باوجودیکہ بندہ نے ریاضی اور ہیئت پڑھی ہے مگر اب تک نہیں سمجھ سکا کہ یہ زمین جس پر ہم آباد ہیں چکر کھاتی ہوئی ہمارے اور سورج کے درمیان حائل ہو جائے اور ہم اس کی گروی سطح پر چلتے پھرتے بلا کسی انقلاب کے قائم بھی رہیں۔ چہ جائیکہ روزانہ آفتاب و ماہتاب کے درمیان اس کی حیلولت ہوتی اور چاند کی روشن سطح کو کم و بیش بتاتی رہے ۱۲۔

میں نے غرض کیا کہ منجمین کا قول تو یہ ہے کہ نجوم ثوابت (جن کو گردش نہیں ہوتی اور ایک جگہ قائم ہیں) وہ سب فلک ثابت یعنی آٹھویں آسمان پر ہیں۔

فرمایا انھیں اس کی کیا خبر (اور وہ آسمان ہشتم پر پہونچے کہاں جو اس کا پتہ لگالائیں)

میں نے کہا سبع سیارہ کی رفتار کے اختلاف کی بنا پر انہوں نے اس کو ثابت کیا ہے۔

فرمایا ان کا خیال بالکل غلط ہے۔ ستارے سب کے سب اسی آسمان دنیا میں ہیں۔ اور ان کے منور یا تاریک ہونے کی وجہ یہی ہے ا کہ جو حصہ آفتاب کے مقابل پڑا وہ روشن ہوا اور جس میں آڑ پڑ گئی برزخی حصّۂ زیریں کی وہ تاریک رہ گیا اور ہمیں نظر نہ آیا۔ نیز اخذ نور میں بھی دخل ہے ہر ستارہ کے مادّہ کی صفائی اور کدورت کو اور اس کے جرم کی بڑائی چھٹائی کو۔ اس لئے جس میں جتنا اخذ اور مادہ جذب نور ہے اسی قدر وہ ہمیں منور و روشن دکھائی دیتا ہے۔ واللہ اعلم

گیارھواں باب

جنتوں کی ترتیب اور شمار

جنت الفردوس کے متعلق حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جتنی بھی نعمتیں عالم دنیا کے اندر سننے میں آئی ہیں وہ سب، اور نیز جو نعمتیں یہاں کسی نے سنی بھی نہیں وہ سب' جنت الفردوس میں موجود ہیں اور اسی سے جنت کی نہریں جاری ہوتی ہیں (کہ سب کا منبع یہی جنت الفردوس ہے) اور نہروں کے جاری ہونے کی کیفیت یہ ہے کہ پانی، شہد، دودھ، شراب، چاروں مشروبات ایک ہی نہر میں بہتے ہیں' اور ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط نہیں ہونے پاتا۔ جیسے قوس قزح (دھنک اور آسمانی کمان) کے رنگ مختلف نظر آتے ہیں کہ ایک دھاری سرخ ہے اور دوسری زرد۔ اور تیسری نیلی اور چوتھی سبز یہ سب رنگ کمان کی شکل میں الگ اور ممتاز ہیں (اور ایک دوسرے سے مخلوط نہیں ہوتے) اسی طرح ایک نہر میں چاروں مشروبات جدا جدا ہیں اور ایک دوسرے سے آمیز نہیں ہوتے اور یہ مشروبات جنت میں مومن کی حسب خواہش جاری ہوں گے کہ جس کو چاروں چیزوں کی رغبت ہو گی اس کے لئے چاروں جاری ہوں گی اور اس کے پاس والے مومن کی رغبت اگر دو چیزوں کی ہو گی تو اس کے لئے صرف دو جاری ہوں گی اور دو بمشیت الٰلیہ بند ہو جائیں گی اور ان کے قریب والا تیسرا مومن اگر صرف ایک چیز کی خواہش کرے گا تو اس کے لئے تین بند ہو جائیں گی اور صرف ایک جاری ہو گی۔ اور اگر کوئی جنتی چار سے زیادہ (کسی پانچویں چھٹی چیز) کی بھی خواہش کرے گا تو اس کے لئے حسب خواہش زائد چیزوں کی نہریں باذن اللہ جاری ہو جائیں گی، غرض اول سے آخر تک نہر کا جریان دیکھو گے تو باوجودیکہ نہر ایک ہو گی مگر کسی جگہ چار چیزیں بہتی نظر آئیں گی اور کسی جگہ دو چیزیں' اور کسی جگہ ایک اور کسی جگہ پانچ حالانکہ اُن کے درمیان نہ کوئی آڑ ہو گی نہ حد فاصل

نیز آپ نے فرمایا کہ جنت کی نہریں (دنیا کی نہروں کی طرح) کھدی ہوئی زمین میں نہ ہوں گی (بلکہ بالائے سطح محض قدرت حق پر ہوں گی۔

میں ایک مرتبہ آپ کے ساتھ باب الفتوح میں تھا اور عرض کیا کہ فلاں بزرگ فرمایا کرتے تھے

میں نے جنت کا انگور ایک ہاتھ کے برابر دیکھا ہے۔

فرمایا میں نے تو باب الفتوح کی اُس عیدگاہ کی دیوار کے برابر دیکھا ہے جو قبلہ رخ عرض میں واقع ہے۔ اور ایک بار فرمایا کہ اس دیوار کے طول کے برابر اور اس سے چھوٹے اور بڑے (مختلف مقدار کے) دیکھے ہیں۔

نیز آپ نے فرمایا کہ لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ جنت الفردوس تمام جنتوں سے اعلیٰ اور افضل ہے کہ کوئی جنت بھی اس کے درجہ کو نہیں پہونچ سکتی۔ حالانکہ ایسا نہیں بلکہ وہاں ایک اور جنت ہے جو اس سے بھی افضل اور اعلیٰ ہے۔ اور اس میں ان نعمتوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں ہے (وہاں کی نعمت صرف مشاہدۂ حق اور دیدار خداوندی ہے) اور اس میں بجز اہل مشاہدہ عارفین یعنی حضرت انبیاء علیہم السلام اور خواص اولیاء رضی اللہ عنہم کے اور کوئی نہ رہے گا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اہل مشاہدہ کے نزدیک حق تعالیٰ شانہ کا مشاہدہ ہر نعمت سے زیادہ افضل و اعلیٰ ہے اور ہر لذت سے زیادہ شیریں و لذیذ تر ہے (اگر محبّ ہی لذت دیدارِ محبوب کی قدر سمجھ سکتا ہے) اس جنت میں رہنے والوں کو (جسمانی لذتوں والی) دوسری جنتوں میں جانا ایسا ہی ناپسند ہوگا جیسا عام جنتیوں کو عالم دنیا کی طرف جانا ناپسند اور ناگوار ہوگا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنت الفردوس میں رہنے والے اکثر جنتی ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اُمتی ہوں گے اور بجز تقریباً بیس اقسام اہل ظلم و مرتکبین کبائر کے (کہ وہ تو اس میں جا نہ سکیں گے) باقی سب مومنین امتِ محمدیہ اسی جنت میں جائیں گے (اور اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سے جنت کا سوال کیا کرو تو بس جنت الفردوس کا کیا کرو۔ گویا اس سوال کے ضمن میں یہ دعا بھی آگئی کہ حق تعالیٰ اس ظلم اور کبیرہ گناہ کے ارتکاب سے محفوظ رکھے جو اس جنت میں جانے سے مانع ہے)

نیز آپ نے فرمایا کہ ہمارے آقا سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی امت کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ آپ کو خواہش ہوگی کہ جنت میں آکر اپنی اُمت کو دیکھیں اور انکے ساتھ (حسن سلوک و اعانت کا) ایسا برتاؤ فرمائیں گے جیسا قریبی رشتہ دار اپنے کنبہ اور خون کے تعلق والوں کے ساتھ کیا کرتا ہے۔ اسی لئے حق تعالیٰ نے مشاہدہ والی جنت عالیہ اور ہر قسم کی نعمتوں والی جنت الفردوس دونوں کو آپ کے لئے جمع فرمایا اور دونوں کے وسط کا مجموعہ آپ کا مسکن تجویز فرمایا ہے۔ تاکہ امت کی دونوں قسمیں گویا ہر وقت نظر کے سامنے رہیں اور ہر وقت ان کو دیکھ کر آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوتی رہیں۔ ذات محمدی کے سوا اور کسی کو بھی حق تعالیٰ نے یہ شرف عطا نہیں فرمایا۔ پس آپ اہل مشاہدہ اور غیر اہل مشاہدہ تمامی امت کے ساتھ صلہ رحمی کا

برتاؤ فرماویں گے۔

میں نے عرض کیا کہ یہ جنت غالباً وہ جنت عالیہ ہے جس کی طرف حضرت ابو سعید خدری رضی کی اس حدیث میں اشارہ ہوا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا علیین والے حضرات دوسری جنت کی طرف جھاکیں گے تو جنتیوں کو ان کا منہ ایسا روشن نظر آئے گا جیسا اہل دنیا کو چودھویں رات کا چاند چمکتا نظر آتا ہے، اور ابو بکر رضی و عمر رضی انھیں میں ہیں۔ نیز امام احمد اور امام ترمذی اور امام حبان نے حضرت ابو سعید رضی خدری سے اور طبرانی نے حضرت جابر رضی سے اور ابن عساکر نے حضرت ابن عمر اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت کی ہے کہ عالی درجات والوں کو نیچے درجے والے ایسا دیکھیں گے جیسے تم اس ستارہ کو دیکھتے ہو جو افق فلک میں طلوع کرے، اور ابو بکر رضی و عمر رضی انھیں میں ہیں۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ وہ دوسری جنت ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ جنت علیین بھی جنت الفردوس سے اوپر ہے مگر اس کی جہت سے خارج ہے اور اس کی ہم سمت نہیں ہے۔ اور یہ جنت (جس کا نام جنت عالیہ ہے اور اہل مشاہدہ کے لئے مخصوص ہے) اس کے علاوہ دوسری جنت ہے۔

میں نے کہا کیا یہ وہ جنت ہے جس کا نام دار المزید ہے؟

فرمایا ہاں یہی ہے اس کا نام، اور اس میں بجز مشاہدہ حق سبحانہ کے اور کوئی نعمت نہیں ہے۔ مگر اہل مشاہدہ کے لئے یہ لذت ہر نعمت سے زیادہ عزیز ترین ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت میں جتنی بھی نعمتیں ہوں گی ان کی لذتیں اس مشاہدہ میں موجود ہیں لہٰذا اس میں تمامی ما فی الجنۃ مع شیئے زائد پایا جاتا ہے۔ اور اس جنت والوں کی لذت (یعنی لذت دیدار حق) روحانی لذت ہے (جو اصل لذات ہے) اور دوسری جنتوں والوں کی لذتیں صرف جسمانی لذتیں ہیں، اگرچہ وہ باقیہ ہیں فانیہ نہیں۔ (مگر ہر جسمانی لذت روحانی لذت میں داخل ہے، اور ان کے علاوہ زیارۃ محبوب کی ایک خاص لذت محض روحانی ہے جو جسم کے کسی عضو سے تعلق نہیں رکھتی)۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جس کو ان قسموں (یعنی روحانی اور جسمانی لذتوں میں) کسی ایک قسم کی لذت حاصل ہوگی اس میں دوسری قسم کی لذت حاصل کرنے کی طاقت نہ ہوگی۔ کہ ہر دو لذتوں کو کوئی جمع نہیں کر سکتا۔ بجز ایک ذات یعنی سرور عالم و عالمیان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ کہ آپ کو لذت مشاہدہ بھی (روح شریف کے) اس درجہ پر حاصل ہوگی جس کی طاقت دوسرے میں نہیں۔ اور ذات مقدسہ ان جسمانی نعمتوں سے بھی اتنی لذت پائیگی جو کوئی دوسرا نہیں پا سکتا۔ اور یہ لذت اس کو مانع نہ ہوگی، اور جنت علیین میں تو بے شمار نعمتیں ہیں اور جنت الفردوس میں نعمتوں کی انواع اس سے بھی زیادہ

ہیں۔ مگر علیین کی نعمتیں رقیق اور دقیق زیادہ ہیں۔ گویا حضرت ممدوح کا یہ مطلب تھا کہ جنت علیین چونکہ دارالمزید (یعنی جنت مشاہدۂ دیدارِ حق) کے قریب ہے اس لئے اس کی نعمتوں کو مناسب ہے کہ معنوی کہا جائے کیونکہ وہ حسّی نہیں ہیں۔

نیز فرمایا کہ جنت علیین (بلحاظ کیفیت افضل اور) سب میں اعلیٰ اور شیریں تر ہے، اور جنت الفردوس (بلحاظ کمیت افضل ہے) اور نعمتوں کی اقسام و انواع اس میں زیادہ اور کثیر در کثیر ہیں۔ اس جنت میں حضرات انبیاء علیہم السلام کی ایک جماعت رہے گی اور سیدنا ابراہیم و سیدنا اسمٰعیل علیہما السلام بھی انھیں میں ہیں (جن کا مسکن و مقام علیین میں ہوگا)

میں نے عرض کیا کہ ان احادیث کا کیا جواب ہوگا جن میں آیا ہے کہ سب میں اعلیٰ جنت الفردوس ہے چنانچہ بخاری میں ہے کہ حضرتؐ نے ارشاد فرمایا سوال کیا کرو تو جنت الفردوس کا سوال کیا کرو کہ وہ وسطِ جنت ہے۔ اور اعلیٰ جنت ہے۔ بعض علماء نے وسط سے مُراد عمدہ اور جید لیا ہے اور اعلیٰ سے مُراد حقیقی مفہوم یعنی بلند تر اور افضل ترین۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ ان تینوں جنتوں (یعنی علیین اور دارالمزید اور جنت الفردوس کی شان ایسی ہے کہ تینوں کو ایک جنت کہہ دیا جائے اور مجموعہ کا نام جنت الفردوس رکھا جائے تب بھی مضائقہ نہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا قبہ شریفہ (جو آپ کا مسکن و مقام ہے) وہ تینوں پر محیط ہے۔ اس لئے جو لوگ جنت الفردوس میں ہیں ان کو بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت حاصل ہے، اور جو حضرات علیین میں ہیں وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہیں، اور جو حضرات دارالمزید میں ہیں وہ بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں ہیں۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام رفیع پر نظر کرتے ہوئے تینوں کو ایک کہہ دینا بھی صحیح ہے (اور اب اس کا اعلیٰ ہونا بلحاظ رفعت مقامی و باعتبار زیادۂ درجات و لذات جسمانی و روحانی ہر طرح محقق و ثابت ہو جائے گا) کیونکہ قبہ مطہرہ نے جنت الفردوس کا وسط اپنے دائرہ میں لے لیا ہے اور بجانب علیین چل کر اس کو لیتا ہوا دارالمزید تک پہونچ گیا ہے اور اس کے وسط کو اپنے اندر لے لیا ہے۔

میں نے پوچھا کیا باقی جنتوں میں بھی نعمتیں ہیں؟

فرمایا ہاں ان میں جانے والے جنتیوں کے اعمال کی مقدار کے موافق (کم و بیش) سب میں نعمتیں ہیں البتہ جنت الفردوس صرف امت محمدیہ کے لئے ہے یا ان مومنین کے لئے جنھوں نے نبی کی بعثت کے بغیر (وجدانی دو ہی ہدایت کے ذریعہ خدا کو ایک سمجھا (اور شرک چھوڑ کر توحید کو اختیار کیا ہے)

میں نے عرض کیا جیسے قس بن ساعدہ اور زید بن عمرو بن نفیل ؟

فرمایا کہ ان صاحبوں کے بارہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا ارشاد فرمایا ہے ؟ اس وقت تو مجھے جواب مستحضر نہ ہوا۔ مگر بعد میں علامہ ابن خلیل سبکی کے رسالہ شرح منظومۃ القبور میں یہ تصریح نظر آئی کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے (ایمان اور نجات اُخروی کے) متعلق شہادت دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں قیامت کے دن تنہا امت بنا کر اُٹھائے جائیں گے۔ چنانچہ اس کے بعد حضرت ممدوح سے ملاقات ہوئی تو میں نے یہ حدیث اور علماء کا قول آپ پر پیش کیا تو فرمایا ہاں اسی مطلب کو میں اپنی زبان سے ادا کرنا چاہتا تھا مگر اندیشہ ہوا لوگ کہیں گے کہ اہل جاہلیت کو بھی جنتی کہنے لگا اس لئے میں نے چاہا کہ معلوم کر لوں حضرات علماء نے اس بارہ میں کیا فرمایا ہے۔ فالحمد اللہ کہ ان کا قول میری موافقت میں مل گیا۔ ف قس بن ساعدہ مکہ کے باشندہ تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل فطری ہدایت سے بہرہ یاب ہوئے، شرک اور اپنے قومی مذہب بت پرستی سے بیزار ہو کر وحدانیت باری تعالیٰ کے قائل و معتقد ہوئے اور بعثت محمدیہ سے پہلے ہی انتقال فرما گئے۔

حضرت زید بن عمرو بن نفیل سیدنا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے چچا تھے۔ یہ بھی فطری ہدایت سے قومی مذہب کو چھوڑ کر توحید کے قائل ہوئے۔ بتوں کے نام پر ذبح کئے ہوئے جانور کا گوشت بھی نہ کھاتے تھے۔ لڑکیوں کو زندہ دفن کرنے کا رواج جو اشراف عرب میں شائع تھا اس کو خصوصیت سے روکتے اور نوزائیدہ لڑکیوں کو یہ کہہ کر باپ سے لے لیا کرتے تھے کہ تم پرورش کے بارے گھبراتے ہو تو اس کی کفالت میرے ذمہ ہے، اور پھر خود اس کی پرورش کیا کرتے تھے۔ جب بالغہ ہو جاتی تو باپ کو اختیار دیا کرتے کہ دل چاہے اس کو لے جاؤ کہ تمہاری امانت ہے اور اب بھی اگر بار مؤنت گراں گذرے تو میں عمر بھر کفالت کے لئے حاضر ہوں۔ دین حق کی تلاش میں ملکوں ملکوں چکر بھی لگایا اور آخر احبار یہود و نصاریٰ سے یہ سنکر کہ نبی آخر الزماں کا وقت قریب آلگا ہے اور ان کا ظہور وہیں ہوگا جہاں سے تم آئے ہو، بعجلت تمام واپس مکہ ہوئے۔ راستہ میں قبیلہ بنی لخم پر گذر ہوا تو انہوں نے ان کو قتل کر دیا۔ اس لئے کہ قومی مذہب چھوڑنے پر لوگ ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ یہ دونوں حضرات یا ان جیسے اور جنہوں نے قبل از بعثت توحید پر وفات پائی، مثلاً ورقہ بن نوفل، چونکہ موحد تھے مگر زمانہ نبوت نہیں پایا اس لئے مستقل امت بن کر بروز قیامت اُٹھیں گے۔ اس لئے کہ نہ کسی نبی کے تابع بنے کیونکہ زمانہ ہی نہ پایا اور نہ متبوع بنے اس لئے کہ خود نبی یا رسول نہ تھے۔ مگر چونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جویا اور شریعت حقہ اسلامیہ کے طالب و خواہاں تھے اس لئے بقول حضرت ممدوح امۃ محمدیہ

کے ساتھ جنت الفردوس میں جگہ پائیں گے۔ واللہ اعلم۔

فرمایا کہ ان صاحبوں کا جنت الفردوس میں جانا اس لئے ہوا کہ وہ اپنی کافر قوم کے درمیان رہتے ہوئے اللہ وحدہٗ لاشریک پر ایمان لائے۔ اور یہ محض حق تعالیٰ کے لطف عظیم کی بدولت نصیب ہوا کہ اتنا بڑا انوار ان کو عطا فرمایا جس کی وجہ سے کفار کی ظلمتوں کو چاک کر کے اپنے ہم جنس ہادی و راہبر کے بغیر از خود توحید خداوندی تک پہونچ گئے۔

میں نے دریافت کیا کہ جنتوں کی تعداد کیا ہے؟

فرمایا آٹھ۔

میں نے کہا کہ پہلی جنت کونسی ہے۔

فرمایا دارُ السلام اور اس کے بعد جنّةُ النّعیم پھر اس کے بعد جنّةُ المأویٰ پھر دارُ الخلد جنّةُ عدن پھر جنّةُ الفردوس پھر جنّةُ علیین اور پھر دارُ المزید جامع کتاب کہتے ہیں کہ علامہ سیوطی کی تصنیف البدور السافرہ سے معلوم ہوتا ہے جنتیوں کی تعداد کے متعلق علماء کی کوئی تحریر محقق نہیں چنانچہ بعض حضرات نے ان کی تعداد چار بتائی ہے، اور بعض نے سات، اور بعض نے کہا ہے کہ جنت ایک ہی ہے (صرف ان کے حصوں کے اعتبار سے جدا جدا نام ہو گئے ہیں) مگر حضرت ممدوح کا ارشاد ہے کہ جنتیں آٹھ ہیں اُن حدیثوں کے زیادہ مناسب ہے جن میں تذکرہ ہے کہ فلاں عمل والے کے لئے آٹھوں دروازے جنت کے کھولدئے جائیں گے جس دروازہ سے چاہے داخل ہو (پس دروازوں کا آٹھ ہونا قرینہ ہے کہ جنتیں بھی آٹھ ہیں)

نیز حضرت نے فرمایا کہ جنتوں کی ترتیب یہ نہیں ہے جو عام لوگ سمجھے ہوئے ہیں کہ سب فوقانی جہت میں ہیں اور ایک جنت دوسری جنت کے اوپر ہے۔ بلکہ ان کی ترتیب ایسی عجیب ہے کہ ہر چھ جانب سے آٹھ ہی نظر آتی ہیں۔ کوئی شخص ان کے نیچے سے آئے تب اُن کو آٹھ پائے گا، اور اگر دائیں جانب سے آئے تب آٹھ پائے گا، اور اگر بائیں جانب سے آئے تب آٹھ پائے گا اور سامنے سے، یا پیچھے سے، یا اوپر سے، غرض جدھر سے آئے ان کی تعداد آٹھ پائے گا۔ اور آخرت کا معاملہ دنیا کے مشابہ نہیں (اس لئے یہاں یہ صورت نہیں ہو سکتی کہ کوئی شے آٹھ کی تعداد میں ہو اور ہر شش سمت سے وہ آٹھ ہی نظر آئے۔ مگر دار آخرت میں ایسا ہی ہوگا) پھر دوسری مرتبہ میں نے جنتیوں کی ترتیب اور کیفیتِ وضع آپ سے دریافت کی تو فرمایا کہ سطح زمین پر یا دیگر مخلوقات میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو جنت کے ساتھ مشابہت ہو، بجز عالم برزخ کے کہ اس کو

جنت کے ساتھ کچھ مشابہت ہے۔ مگر برزخ کو لوگوں نے دیکھا نہیں اس لئے کس چیز کی مثال دیکر سمجھایا جائے؟
میں نے کہا کہ (اتنا حال تو برزخ کا احادیث سے) مسموع ہوا ہی ہے کہ اس کی شکل سینگ کی سی ہے اور وہ ایک بہت ہی بڑا عالم ہے جس کا گولائی کا دَور آسمان و زمین کے فصل کی برابر ہے۔
فرمایا ہاں اور اس میں ایسے سوراخ ہیں جیسے سمندر جھاگ میں ہوا کرتے ہیں، اور ان سوراخوں میں روحیں رہتی ہیں۔ پھر یہ سوراخ بھی اوپر ہی اوپر نہیں ہیں۔ بلکہ نہایت گہرے ہیں اور اوپر کی طرح اندر تک سوراخ ہیں۔ ایک ادنیٰ مثال کے درجہ میں یوں سمجھو کہ شہد کے چھتہ کے سوراخ گویا برزخی سوراخ ہیں۔ پھر مثلاً بیس چھتّے لے کر ایک کو دوسرے سے ملاؤ اور مجموعہ کو ایک شے سمجھو کہ اس مجموعہ کا بیرون اور اندرون سب گہرے سوراخوں سے بھرا ہوا ہو۔ اور پھر فرض کرو کہ ان سوراخوں کے مُنہ پر موم کا پردہ پڑا ہوا ہو کہ اندر کا شہد نظر نہ آسکے۔ یہ محض سمجھانے کے لئے جنت کا کچھ نمونہ بنے گا کہ اس کی حقیقت اور وہ نفس الامری حالت و کیفیت تو یہاں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔ اب اس مجموعہ کو سات حصوں میں تقسیم کرو۔ پس ایک فریق تو پہلے میں ہو جس کا ہر سوراخ (وسعت اور راحت و زیبایش میں) ساری دنیا اور اس جیسی دس دنیا کی برابر ہو۔ اور دوسرا حصہ اس کا بھی اضعافاً مضاعفہ ہو۔ اور تیسرا حصہ اس سے بھی اتنا زیادہ ہو جس کی مقدار کسی کے حد و شمار میں نہیں آسکتی۔ اور چوتھا حصہ انسانی خیال سے بالا ہو کہ اس کی لذتوں اور آنکھیں ٹھنڈی کرنے والی نعمتوں کا نہ کسی نفس کو علم ہے، نہ کسی آنکھ نے کبھی دیکھیں، نہ کسی کان نے کبھی سنیں، اور نہ کسی قلب پر ان کا تخیل کبھی گذرا۔ اور اسکا پانچواں حصہ حصہ سوم کے مثل ہو اور چھٹا حصہ حصہ دوم کے مثل۔ اور ساتواں حصہ حصہ اوّل کے مثل۔ پھر یہ نہ سمجھنا کہ حصہ اول میں رہنے والے سب کے سب حصہ دوم میں رہنے والوں سے ادنیٰ ہی درجہ کے ہوں گے۔ نہیں بلکہ اس جنت کے بعض جنتی دوسری جنت کے بعض جنتیوں سے برتر اور افضل بھی ہونگے
اور ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ حق تعالیٰ مومن کو جنت کا اتنا حصہ عطا فرمائے گا جتنا دنیا میں اوپر کے رُخ اس کے سر سے لے کر (ساتوں آسمانوں کو طے کرتا ہوا) عرش تک ہے اور نیچے کے رُخ پاؤں سے لے کر (ساتوں زمینوں کو قطع کرتا ہوا) عرش تک ہے، اور بہ سمت راست تا عرش اور بہ سمت چپ تا عرش، اور سامنے کے رُخ تا عرش، اور پشت کی جانب تا عرش۔ اور یہ شخص جس کو (ہر شش جہت تا عرش کی مقدار وسیع جنت عطا کی جائے گی) سارے جنتیوں میں ادنیٰ درجہ کا جنتی ہوگا۔ میں پھر کہتا ہوں یہ نہ سمجھنا کہ مثال مذکور نے جنت کی پوری یا قریب قریب کیفیت بیان کردی۔ حاشا و کلا حقیقت جنت میں اور اس مثال میں کوئی مناسبت ہی نہیں ہے۔ محض خفیف سا اشارہ کرنے کے لئے ہم نے اس کو ذکر کیا ہے کہ بالکل

خاموش رہنے سے بہر حال کچھ بیان کر دینا اچھا ہے۔

ف جنت میں جانے والی مخلوق کا شمار انسانی طاقت سے باہر ہے کہ سیدنا آدم علیہ السلام سے لیکر تا یوم قیامت جتنے بھی انبیاء و رسل اور ان کی امتوں کے صحابہ و صلحاء و اولیاء و مومنین دنیا میں آئے اور ایمان صحیح و سالم لے کر دنیا سے اُٹھے۔ خواہ ایشیا میں ہوئے یا یورپ میں، اور افریقہ میں ہوئے یا امریکہ میں اور جزائر میں ہوئے یا غاروں میں، اور کوہستانوں میں ہوئے یا بنوں اور جنگلوں میں، کسی قرن میں اور کسی ملک میں کیوں نہ ہوئے ہوں سب ہی جنت میں جائیں گے۔ پھر نفس ایمان کے قوت و ضعف کے لحاظ سے حضرات انبیاء و اولیاء کا فرق مراتب اور اعمال و حسنات کے اعتبار سے عامہ مومنین کا اختلاف درجات ایسا بیش از بیش ہے کہ جس طرح ایک صورت اور ایک سیرت کے دو آدمی ملنے مشکل ہیں اسی طرح اعمال کے اعتبار سے بھی دو مسلمانوں کا ایسا مساوی ہونا مشکل ہے جن میں کسی قسم کا کوئی فرق مطلق نہ ہو۔ بنا بریں جتنے نفوس جنت کے باشندے ہوں گے اتنے ہی جنت میں درجات اور مراتب ہوں گے۔ کہ ہر مومن کا جدا مرتبہ اور دوسروں سے بالکل ممتاز صلہ ہوگا۔ جب ادنیٰ سے ادنیٰ جنتی کا جس کے نیچے کوئی درجہ ایمان اور دخول جنت ہی کا نہیں ہے یہ صلہ ہے کہ ہر شش جہت سے عرش تک کی مقدار اس کو جنت کی سلطنت دی جائے گی تو اس سے بالا بر بالا بر بالا تا سید وُلد آدم صلی اللہ علیہ وسلم جس کے مافوق کوئی جنتی نہیں، ان سب کے جدا جدا مراتب مختلفہ کے اعتبار سے جنت کی مملکت اور اس سلطنت اُخروی کی وسعت کو قیاس کرو اور دیکھو کہ جنت کتنا بڑا ملک اور غیر متناہی قدرت والے خدا کی کتنی عظیم الشان مخلوق ہے۔ ایک وقت جو ہر انسان پر گذرا ہے وہ تھا کہ بطن مادر اس کا مسکن تھا اور وہی تنگ جگہ گویا اس کی دنیا تھی۔ کہ نو مہینہ اسی میں رہا سہا بڑھا اور پھولا پھلا۔ شکم مادر میں رہتے ہوئے اگر اس سے کوئی اس دنیا کی وسعت کا قصہ بیان کرتا جو اس وقت اس کی نظروں کے سامنے ہے تو اس کو یقین آنا مشکل تھا۔ اس لئے کہ نہ اس کی نظروں نے اپنے مسکن رحم سے زیادہ وسعت والی کوئی چیز دیکھی، اور نہ اس کا دماغ اس تنگ کوٹھری سے زائد چیز کا تخیل اپنے اندر لانے کی گنجائش رکھتا ہے۔ مگر جب نویں مہینہ بطن مادر سے باہر نکل کر گھر کی کوٹھری میں آیا اور نظر اُٹھا کر زمین سے لیکر چھت تک اور پھر ہر چہار سمت اس کی چار دیواری پر نظر ڈالی تو اب عقل میں آیا کہ میرے عالم حمل کے مسکن کو تو اس وسیع کوٹھری سے کچھ بھی مناسبت نہیں۔ کہ یہ اُس جیسے صدہا مساکن سے بھی زیادہ وسیع ہے۔ پھر کوٹھری سے زیادہ وسیع چیز کا تخیل اس کو ناممکن معلوم ہوا۔ مگر جب چند روز بعد گھر کے صحن میں نکلا تو معلوم ہوا کہ وہ بھی ایک تنگ کوٹھری تھی۔ اس مکان میں تو اس جیسی بیس کوٹھریاں نکل سکتی ہیں۔ مگر پھر بھی

اس کا تخیل محدود ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس سے بڑی چیز کوئی ہو ہی نہیں سکتی۔ مگر جب چلنے پھرنے کے قابل ہوا اور گھر سے باہر محلہ میں گشت لگایا تو سمجھا کہ میرے گھر کی کوئی حقیقت ہی نہیں۔ محلہ تو اتنا بڑا ہے کہ اس جیسے صدہا گھر اس میں آباد ہیں۔ مگر اس کا تخیل تنگ ہے کہ اس سے زیادہ وسعت اس کے ذہن میں نہیں سماتی، اور کوئی سیاح اگر اس سے کہتا ہے کہ میاں رئیسوں کے پاس تو تمہارے محلہ کے چار طرف کی مقدار اور اس کنارے سے لے کر اس کنارہ تک کا دس بیس بلکہ سو گنا جائداد ی حصہ موجود ہے۔ تم نے ابھی دیکھا ہی کیا ہے، تو اس کو یقین آنا مشکل ہے اور کہتا ہے کہ ہزارہا رئیسوں کے پاس محلہ سے بڑا حصہ کہاں سے آسکتا ہے۔ لیکن جب شہر کے بازار اور شہر کی گلیاں گھومنے کا وقت آیا اور چار طرف فصیل شہر کا چکر لگایا تو معلوم ہوا کہ میرے محلہ جیسے صدہا محلہ تو اس احاطہ فصیل کے پیٹ میں پڑے ہوئے ہیں۔

غرض اس کے بعد ضلع بھر کے دیہات و قصبات اور تحصیلات متعلقہ کا مشاہدہ ہوا، اور پھر کمشنری بھر کا چپہ چپہ چھانا، اور پھر صوبہ بھر کا دورہ کیا، اور پھر سارے ہندوستان کے ٹکڑے ٹکڑے کی سیاحت کی، اور پھر ایشیا بھر کا چکر لگایا جس میں ہندوستان کے رقبہ کا پچاس گنا بر زمین سمایا ہوا ہے اور پھر اسی جیسے دیگر ممالک ارضیہ کی سیاحت کی، اور سیاحت بھی وہ کہ پٹواری کے نقشہ میں اور نقشہ نویس کی نظر میں کسی حصہ کا رہ جانا ممکن ہو، مگر اس کی نظر سے بالشت برابر زمین بھی اوجھل نہ رہی ہو۔ ااا۔ اس تمامی مسافت اور وسعت پر بھی اہل مساحت کے نزدیک ابھی زمین کا ربع مسکون یعنی صرف چوتھائی حصہ ہوا ہے کہ تین حصے جس میں سمندر اور پانی ہے وہ ابھی باقی ہے۔ اور وہ بھی محض تخمین ہے کیونکہ ان کو خود اقرار ہے کہ کچھ دور چل کر اتنی خنکی ہے جس میں انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ اس لئے اُس کا رقبہ کہ وہ کتنا وسیع و عریض ہے، ظاہر ہے کہ کوئی نہیں بتا سکا اور نہ بتا سکتا ہے۔ با ایں ہمہ اس کو بھی محسوب کر لو اور بر و بحر سب کی حقیقی و تخمینی پیمائش کو جمع کر لو تب بھی وہ صرف زمین ہی کا سطحی رقبہ ہے۔ اب اس سے لیکر آسمان تک نظر اُٹھاؤ اور دیکھو کہ کرۂ ارض ہر جانب سے تا فلکِ اول بروئے وسعت کتنا بڑا عالم ہے۔ اس سب کے مجموعہ کا نام عالم دنیا ہے جو تمامی عوالم میں چھوٹا عالم ہے۔ اور اس سے بے شمار گنا بڑے صدہا عوالم حق تعالیٰ نے پیدا فرمائے ہیں جن کی بنا پر اس کا نام رب العلمین ہے۔

اب انسان کے قبل از ولادت عالم بطن مادر کو دیکھو اور پھر بعد از ولادت اس عالم دنیا کو دیکھو اور بتاؤ کہ اس میں اور دنیا میں بلحاظ وسعت کیا مناسبت ہے؟ اور اس پر بھی غور کرو کہ شکم مادر میں رہنے کے وقت کیا یہ وسیع بر و بحر تمہاری عقل و فہم میں سما سکتا تھا؟ اور اگر نہیں سما سکتا تو کیا تمہارے انکار کر دینے سے

یا اس وقت ہنسکر یہ کہہ دینے سے کہ کیا افسانہ سنا رہے ہو بھلا اتنا بڑا ملک کہاں ہو سکتا ہے، کیا دنیا کا وجود ثابت و محقق نہ رہتا۔ واقعہ بہرحال واقعہ ہے، وہ کسی کے اقرار و اعتقاد کا تابع نہیں۔ ساری دنیا بھی اگر کسی حقیقت کا انکار کر دے تب بھی حقیقت بہرحال حقیقت ہے اور جو شے موجود و محقق ہے وہ بہر صورت موجود و محقق ہے۔ اس لئے عالم جنت اگرچہ دنیا میں رہتے ہوئے ہماری نظروں سے ایسا ہی اوجھل ہے جیسے یہ عالم دنیا ہمارے جنین ہونے کے زمانہ میں رحم مادر میں رہنے کے وقت ہماری نظروں سے اوجھل تھا۔ مگر واقعہ ہے کہ وہ تمامی عالم دنیا سے اتنا ہی بلکہ اس سے بھی بدرجہا بڑا ہے جتنا بطن مادر سے عالم دنیا بڑا ہے کہ یہ دونوں پھر بھی عالم دنیا ہی میں ہیں اس لئے باہم کچھ مناسبت رکھتے ہیں۔ مگر وہ دار آخرت ہے جو دار دنیا سے بالکل مبائن ہے۔ یہاں ہر چیز کا تعلق اسباب سے ہے اور اسباب کو ظہور قدرت الٰہیہ کا واسطہ بنا دیا گیا ہے۔ مگر دار آخرت خالص مظہر قدرت ہے اور وہاں جو شے بھی ہے اس کا ظہور بلا واسطہ محض قدرت الٰہیہ سے ہوا ہے۔ اس لئے دنیا سے مہا سنگھ گنا بھی بڑی اور ان گنت مقدار میں عظیم الشان ہے تب بھی متناہی ہے اور قدرت الٰہیہ غیر متناہیہ کے سامنے ایک معمولی مخلوق ہے۔ لہٰذا ہمارے استعجاب یا کفار کے انکار کرنے سے اس کا تحقق معدوم یا مشتبہ نہ ہوگا۔ لاریب اور بے شک اس باب میں جو کچھ بھی آیا ہے سب حق ہے اور اس کی کیفیت اور وسعت جو کچھ بھی حضرات انبیاء و رسل نے بالخصوص صادق مصدوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے بالکل سچ اور صحیح اور واقعہ اور حقیقت ہے۔ ہمارے تنگ و تاریک متخیلہ میں اگرچہ نہ آئے مگر قدرت الٰہیہ کے بہرحال ماتحت ہے اس لئے اس کے ہونے میں بال برابر بھی شک نہیں ہے۔ اسی کا نام ایمان بالغیب ہے جس کے بغیر مومن مومن نہیں۔

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ جنت میں تخت (جنکی شان شاہی تخت کی ہوگی اس نوعیت کے ہوں گے) کہ ایک ہی تخت مختلف رنگوں پر نظر آئے گا۔ ایک رنگ چاندی کا سا سفید، ایک خالص سونے کا سا سنہرا ایک رنگ زمرد کی طرح سبز، ایک رنگ سندسی، ایک رنگ برنگ یاقوت سرخ وغیرہ وغیرہ۔ غرض رنگ بے شمار ہوں گے مگر سب کی اصل ایک ہوگی جس میں نہ تعدد ہوگا نہ اختلاف۔ پھر صاحب تخت جنتی کو جس وقت سیر اور تفریح کی خواہش ہوگی اور وہ تخت ہی پر ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا چاہے گا تو تخت اس کو وہاں لے جائے گا۔ اور اگر وہ خود جانا چاہے گا تو تخت وہیں رہے گا اور خود وہاں پہونچ جائے گا۔ نیز چھیوں سمت میں جس سمت بھی جانا چاہے گا جائے گا۔ برخلاف دنیا کے کہ یہاں بجز سامنے کی سمت کے اور کسی سمت نہیں چل سکتا۔ مگر جنت میں آگے، پیچھے، دائیں، بائیں، اوپر، نیچے، جس جانب چاہے گا (بے تکلف) چلے گا۔

نیز ہر شش جانب اس کے ہمسایہ بھی ہوں گے۔ (اور باوجود اتنا وسیع ملک ہونے کے تنہائی محسوس نہ ہوگی) برخلاف دنیا کے کہ یہاں اکثر مکانات کی بالائی جانب اور تمامی مکانات کے نیچے کی سمت ہمسایہ سے خالی ہوتی ہے کہ اوپر آسمان ہوتا ہے اور نیچے ٹھوس زمین۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنت کی تمامی نعمتیں اور پھل اور میوے سب بے نظیر ہیں کہ دنیا کی کوئی نعمت یا میوہ اس کی مشابہت نہیں رکھتا (وہاں کے پھلوں کو دنیوی پھلوں مثلاً انار انگور وغیرہ سے محض سمجھانے کے لئے تعبیر کر دیا ہے ورنہ) اگر ان کی نفس الامری حقیقت اور ان کے انوار کی مقدار پر (کہ اصل لذت وہی ہے) ان کے نام لئے جائیں تو کوئی سمجھ ہی نہ سکے اور کوئی لفظ ان کی حقیقت پر دلالت نہ کر سکے۔ حق تعالیٰ کا فضل وکرم ہے کہ علے سبیل لتنزل ان کا تذکرہ ان ناموں سے فرمادیا جن سے دنیا میں مانوس تھے اور عام بول چال میں وہ نام مشہور و معروف تھے تاکہ فی الجملہ ان کو سمجھ سکیں۔ اور ان کی مثال ایسی ہے جیسے ہم اپنے بچوں سے ان کی عقل و فہم اور ان کی صغر سنی و کمسنی کا لحاظ رکھ کر ان سے باتیں کیا کرتے اور روٹی کو بب، گوشت کو ششی (پانی کو مم، اور دودھ کو بو) کہا کرتے ہیں۔ پس ہم جس وقت مثلاً سنتے ہیں کہ جنت میں انگور ہوں گے تو فوراً ہمارا ذہن دنیا کے انگور کی طرف جاتا ہے اور) ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے انگور کی طرح ہوں گے۔ حالانکہ (ان کی حقیقت یہ ہے کہ سر تا پا لذت کے ساتھ ساتھ مجسم نور ہیں اور اسی لئے بول و براز اور سنک و تھوک کا سبب نہیں بنتے اور نور بھی اتنا کہ) اگر جنت الفردوس کا ایک دانہ انگور اس کے قریب والی جنت میں آجائے تو اس جنت والے اس کے نظارہ میں محو ہو کر اپنی جنت کی تمام نعمتوں کو بھول جائیں۔ اسی طرح اگر اس دوسری جنت کا دانہ انگور تیسری جنت میں اتر آئے تو یہاں کے جنتی اس میں محو ہو کر اپنی جنت کی تمام نعمتوں کو بھول جائیں۔ غرض ہر اعلیٰ جنت کا پھل نیچے کی جنت میں اترنے سے اس جنت والوں کا یہی حال ہو۔ حتیٰ کہ جو جنت ہماری دنیا یعنی ہفت افلاک و ہفت زمین کے قریب ہے اس کا ایک دانہ انگور اگر دنیا میں آجائے تو اس کے نور کی وجہ سے آفتاب و ماہتاب اور سب ستارے ماند پڑجائیں کہ کسی میں نہ نور باقی رہے نہ روشنی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنتوں کی شمار کے موافق دروازہ ہائے جنت بھی آٹھ ہیں۔ اور یہ دروازے جنتیوں کے جنت میں جانے سے پہلے ہی پہلے ہوں گے۔ جنتوں میں چلے جانے کے بعد کوئی دروازہ بھی باقی نہ رہے گا۔

میں نے عرض کیا شاید اس کی وجہ یہ ہوگی کہ دروازہ سے مقصود دخول و خروج ہوا کرتا ہے اور جنتی کے لئے خروج ہے نہیں کہ حق تعالیٰ فرماتا ہے وماھم عنھا بمخرجین اہل جنت جنت سے نکالے نہ جائینگے،

لہٰذا دخول جنت کے بعد پھر دروازہ کا کوئی فائدہ نہ رہا۔

اس پر آپ نے سکوت فرمایا اور کچھ جواب نہ دیا۔

اس سے میں سمجھا کہ اس میں کوئی دوسرا راز ہے جس کا ذکر کرنا آپ نے مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ جنت کے ہر دروازہ کے مقابل اُن آٹھ فرشتوں میں کا ایک فرشتہ ہے جو عرش خداوندی کو اُٹھائے ہوئے ہیں۔

میں نے پوچھا کہ اس میں کیا راز ہے ؟

فرمایا کہ حاملین عرش آٹھوں فرشتوں کو اور آٹھوں جنتوں کو حق تعالیٰ نے ہمارے آقا و مولیٰ سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نور مبارک سے پیدا فرمایا ہے کہ اوّل نور محمدی کو آٹھ قسموں پر منقسم کیا اور ہر قسم کو ایک خاص سرِ باطنی کے ساتھ مخصوص فرمایا۔ پھر ایک قسم سے ایک فرشتہ اور ایک جنت پیدا فرمائی کہ ان دونوں میں باعتبار اصل اور بلحاظ سرِ باطنی تناسب ہوا۔ اور دوسری قسم سے دوسری جنت اور دوسرا فرشتہ پیدا فرمایا کہ ان دونوں میں باہم مناسبت ہوئی۔ علیٰ ہذا القیاس آٹھوں قسموں سے آٹھ فرشتے (جو عرش کے حامل قرار پائے) اور آٹھ جنتیں پیدا فرمائیں کہ ہر جنت کے مقابل وہ فرشتہ رہا جس کے ساتھ مناسبت اور مشابہت تھی۔ اور اس فرشتہ کو اسی جنت کے نور سے سیراب کیا جاتا (اور روحانی غذا پہونچائی جاتی) ہے۔

میں نے عرض کیا کہ توبہ کا دروازہ جو آفتاب کے بسمت مغرب طلوع کرنے سے قبل تک کھلا رہے گا کیا وہ بھی جنت کا دروازہ ہے جیسا کہ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ ابو یعلیٰ طبرانی اور ابن ابی الدنیا نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جنت کے آٹھ دروازہ ہیں جن میں سات بند ہیں اور ایک دروازہ توبہ کے لئے کھلا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ آفتاب اسی سے طلوع کرتا ہے (اور جب وہ بند ہو جائیگا تو آفتاب کا طلوع مغرب کی جانب سے ہوگا)

حضرت ممدوح نے اس کی تاویل کرتے ہوئے یہ مطلب بیان فرمایا کہ نور ایمان بھی گویا جنت ہے منجملہ جنتوں کے، بلکہ جنتوں میں جتنی بھی نعمتیں ہیں سب کا سبب یہی نور ایمان ہے، بلکہ خود جنتوں کا سبب بھی درحقیقت یہی نور ایمان ہے کہ ہر خیر و سعادت کا سبب اصلی یہی ہے۔ اور چونکہ توبہ اس کا دروازہ ہے (کہ ہر کافر و مشرک توبہ ہی کے ذریعہ ایمان میں داخل ہوتا ہے) اس لئے بایں لحاظ توبہ گویا جنت کا دروازہ ہے۔

نیز جنت میں داخل ہونے والا جس طرح ذاتی خبث اور میل کچیل کی پست حالت سے بلند حالت یعنی نور و طہارت کی طرف منتقل ہوتا ہے اسی طرح توبہ میں داخل ہونے والا پستی کی حالت یعنی ظلمت معاصی سے

بلند حالت یعنی توبہ وطاعت کے نور کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے توبہ کو جنت کا دروازہ کہدیا گیا ہے۔ اور جانب مغرب سے آفتاب طلوع کرنے پر اس دروازہ کے بند ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ زمین سے اور زمین میں جو مخلوقات آباد ہے اس سے نور حق اُٹھ جائے گا۔ اور نور حق کا اُٹھ جانا ہی مُراد ہے۔ امراللہ سے جو اس حدیث میں آیا ہے لاتزال طائفۃ من امتی ظاھرین علی الحق حتے یاتی امر اللہ میری اُمت کا ایک گروہ حق پر (قائم اور سب پر) غالب رہے گا یہاں تک کہ امرالٰہی آئے (اور بحکم خداوندی نور حق دنیا سے اُٹھ جائے۔ یعنی قیامت آجائے) اس گروہ امت سے مُراد اہل دائرہ وعدد (نیز اولیاءِ امت) ہیں جنہوں نے اس نور سے (حسب استعداد) اپنا حصّہ لیا ہے کہ یہی حضرات اس نُور کے حامل ہیں اور انہیں کی وجہ سے نور ایمان زمین پر باقی ہے۔ پس جب حق تعالیٰ اس نور کو زمین سے اُٹھانا چاہے گا تو (ان حضرات کو وفات دیکر دنیا سے اُٹھالے گا اور) ان میں کوئی باقی نہ رہے گا۔ پس نور حق اُٹھ جائے گا کیونکہ اس کا اٹھلنے والا کوئی باقی نہ رہا۔ اس کے بعد ایک اور مضمون بیان فرمایا جو منجملہ اسرار کے ایک سرالٰہی تھا اور اس کا بیان کرنا مناسب نہیں ہے۔

میں نے حضرت ممدوح سے دریافت کیا اس کی کیا وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنے سے جنت وسیع ہوتی ہے اور تسبیح وتہلیل وغیرہ دیگر اذکار سے وسیع نہیں ہوتی؟

فرمایا اس کی وجہ یہ ہے کہ جنت کی اصل (اور وہ مادہ جس سے اس کی تخلیق ہوئی ہے) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا نور مطہر ہے۔ اس لئے وہ آپ کی طرف ایسا جھکتا ہے جیسے بچہ اپنے باپ کی طرف جھکتا ہے اور جنت آپ کا ذکر مبارک سنتی ہے تو مبتہج ہو کر اس کی طرف (ایسی) پرواز کرتی ہے (جیسے پیاسا پرند دریا کی طرف لپکتا ہے) کیونکہ وہ سیراب ہی نور محمدی سے کیجاتی ہے۔ اس کی مثال ایسی سمجھو جیسے چوپایہ اپنی خوراک اور چارہ کا مشتاق ہوا کرتا ہے۔ پس فرض کرو کہ وہ حد سے زیادہ بھوکا ہو اور اس کے سامنے جو کی گٹھری لائی جائے تو جس وقت بھی اس کی بُو اس کی ناک میں جائے گی وہ اس کے قریب آئے گا، اور جب گٹھری کو اس سے دور کرو گے وہ اس کے پیچھے پیچھے جائے گا۔ اور جب تک اس تک پہونچ نہ لے گا برابر اس کا تعاقب کرتا رہے گا۔ بس یہی حال اُن ملائکہ کا ہے جو جنت کے چار طرف اور اس کے دروازوں پر موجود ہیں کہ وہ ہر وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر اور صلوۃ وسلام میں مشغول رہتے ہیں۔ لہذا جنت (اپنی غذا یعنی) ذکر محمدی کی طرف جھکتی اور ذاکرین کی طرف چلتی ہے۔ اور چونکہ ذکر کرنے والے فرشتے جنت کی ہر جانب ہیں اس لئے وہ تمامی جوانب سے وسیع ہوتی اور بڑھتی چلی جاتی ہے۔

نیز آپ نے فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ نہ روکتا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں جنت عالم دنیا کی

طرف نکل پڑتی اور جہاں آپ جاتے وہاں وہ بھی جاتی اور جہاں آپ رات گذارتے وہاں وہ بھی رات گذارتی (اور شب و روز میں ایک لمحہ کے لئے بھی آپ سے جدا نہ ہوتی) مگر حق تعالیٰ نے آپ کی طرف نکلنے سے اس کو روک دیا تاکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان بالغیب حاصل ہو۔ (یعنی جنت پر ایمان لانا اور اس کا یقین کرنا آنکھوں سے دیکھنے کی بنا پر نہیں بلکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی وجہ سے ہو۔ کیونکہ ہر شے پر ایمان وہی معتبر ہے جو بامتثال امر محمدی ہو)

نیز آپ نے فرمایا کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم جنت میں تشریف لے جائیں گے اور نیز آپ کی امت اس میں ہوگی تو جنت کو بیحد فرح و سرور حاصل ہوگا اور وہ بہت زیادہ وسیع ہو جائے گی۔ اور جب دیگر انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتیں اس میں داخل ہوں گی تو اس میں انقباض پیدا ہوگا۔ وہ حضرات اس کی شکایت کریں گے اور وجہ پوچھیں گے تو جنت کہے گی کہ نہ میں تمہاری ہوں اور نہ تم میرے ہو۔ حتیٰ کہ بواسطہ حضرات انبیاء علیہم السلام کے ان کی امتوں کو مدد پہونچے گی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے، اور اس وقت جنت ان پر وسیع ہوگی۔

ف شفاعۃ کبریٰ کے وقت جس طرح شان محمدی کی رفعت و جلالت کا ظہور ہوگا کہ تمامی مخلوق پریشان ہو کر یکے بعد دیگرے اجلہ انبیاء علیہم السلام کے پاس حاضر ہوگی کہ بارگاہ احدیت میں شفاعت فرمادیں مگر سب حضرات انکار اور عذر فرمائیں گے۔ آج ہماری ہمت نہیں کہ کچھ عرض کر سکیں، اور سب کے اخیر ساری مخلوق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر استدعا کرے گی تو آپ اُٹھیں گے اور مقام محمود میں سربسجود ہو کر سفارش فرمائیں گے۔ اسی طرح اس کا ظہور کہ جنت کی تخلیق نور محمدی سے ہوئی ہے اور اسی ذات بابرکات کا دخول اس کی توسیع اور فرح و سرور کا سبب حقیقی ہے، بایں صورت کیا جائے گا تاکہ سب کو مشاہدہ ہو جائے کہ آپ سے استمداد و استفاضہ کے بغیر جنت میں داخلہ اور حصول راحت قطعاً ناممکن ہے۔ اور یہی راز ہے آپ کے خاتم النبیین اور بعثت عامہ کا کہ آپ پر ایمان لانا تمامی انبیاء اور ان کی تمامی امتوں یعنی ہر بشر پر ضروری ہے۔ اسی کی صورت مثالیہ یہ ہے کہ نور محمدی سے استفاضہ و استمداد کے بغیر حضرات انبیاء علیہم السلام کی امتوں پر بھی جنت بایں وسعت تنگ ہو جائے گی۔

نیز حدیث میں آیا ہے کہ جنت کا بند دروازہ کھلوانے والے صرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہوں گے کہ رضوانِ جنت آپ سے قبل کسی کے لئے بھی اس کا دروازہ نہ کھولیں گے۔

میں نے حضرت ممدوح سے عرض کیا اکثر علماء کا مشہور قول ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

پر جو شخص بھی درود پڑھے گا وہ یقیناً مقبول ہے۔ اس کے بارہ میں حضرت کی کیا رائے ہے؟

فرمایا اس میں تو شک وشبہ نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر درود پڑھنا تمامی اعمال سے افضل و برتر ہے۔ کہ جنت کے چار طرف جتنے بھی فرشتے ہیں سب کا ذکر وشغل یہی درود ہے، اور درود شریف ہی کی برکت ہے کہ ملائکہ جتنا درود پڑھتے رہتے ہیں اسی قدر جنت کی وسعت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور ملائکہ اطراف جنت کو چونکہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس میں کسل لاحق نہیں ہوتا اس لئے ہر دم جنت کی وسعت بڑھتی رہتی ہے اور ایک لمحہ کے لئے بھی اس کی توسیع میں رکاوٹ پیش نہیں آتی۔ کیونکہ ملائکہ درود پڑھتے ہوئے (ہر چہار جانب میں) آگے بڑھتے جاتے ہیں اور جنت (ہر سمت بڑھتی ہوئی) ان کے پیچھے چلتی رہتی ہے۔ اور جب تک کہ ملائکہ درود شریف کو چھوڑ کر (دوسرے ذکر یعنی) تسبیح کی طرف منتقل نہ ہونگے اس وقت تک جنت بھی توسیع سے نہ رکے گی۔ اور ملائکہ درود سے تسبیح کی طرف اس وقت منتقل ہوں گے جبکہ حق سبحانہ تعالیٰ جنت میں اہل جنت کے لئے تجلی فرمائے گا کہ اس تجلی کا مشاہدہ کرتے ہی ملائکہ اس کی تسبیح شروع کر دیں گے (اور اب ان کا ذکر بجائے درود شریف کے سبحٰن اللہ سبحٰن اللہ ہو جائے گا) پس ان کے تسبیح شروع کرتے ہی جنت اپنی جگہ ٹھیر جائے گی اور اہل جنت کے لئے ان کے منازل و مقامات قائم و متعین ہو جائیں گے۔ اگر ملائکہ اپنی پیدائش ہی کے وقت سے تسبیح میں مشغول ہو جاتے (اور درود شریف نہ پڑھتے) تو جنت میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوتا۔ یہ اضافہ (کہ ادنیٰ جنتی کو دس دنیا کی برابر ملک وسیع عطا ہوگا صرف درود شریف ہی کی برکت سے حاصل ہوا ہے (جس کا اظہار آیۃ شریفہ اِنَّ اللّٰہَ وَمَلٰئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِّ میں کیا گیا ہے) مگر یہ بات کہ درود پڑھنے کی قبولیت یقینی ہے صرف اس شخص کیلئے ہے جس کی ذات (نجاست معاصی سے) پاک اور جس کا قلب (اخلاقی گندگیوں سے) صاف ہو۔ کیونکہ درود شریف جب ایسے پاک صاف شخص کی زبان سے نکلے گا تو تمامی عیوب ونقائص مثلاً ریاء وعجب وغیرہ سے سالم ومحفوظ نکلے گا (ورنہ ہر شخص کے لئے یہ حکم نہیں کیونکہ) عیوب بکثرت ہیں اور (ہر طبیعت اور ہر قلب کا ان سے محفوظ رہنا ناممکن ہے۔ البتہ) ذات طاہرہ اور قلب طاہر میں (جو اللہ والوں کو نصیب ہوتی ہے) ان عیوب میں سے کوئی عیب نہیں ہوتا اور ان کا درود پڑھنا خالص محبت اور سچی اطاعت اور مخلصانہ شوق میں ہوتا ہے لہٰذا اس کی مقبولیت بے شک یقینی اور قطعی ہے) اور یہی مطلب ہے ان احادیث کا جن میں آیا ہے من قال لا الٰہ الا اللّٰہ دخل الجنۃ کہ جس نے لا الٰہ الا اللّٰہ کہہ لیا وہ یقیناً جنتی ہو گیا۔ یعنی بشرطیکہ یہ کہنے والا (عیوب سے) پاک صاف قلب رکھتا ہو۔ کیونکہ اس صورت میں وہ (سطوت الٰہیہ کی شان علو کا ملاحظہ کرتا ہوا) اخلاص کے ساتھ اس

کلمہ طیبہ کو کہے گا اور پھر ناممکن ہے کہ اس کے کسی حکم کے امتثال یا نہی سے اجتناب میں فروگذاشت ہو۔ لہٰذا اس شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ اس حدیث کی رو سے کلمہ طیبہ پڑھ لینا دخول جنت کے لئے کافی ہے اعمال کی ضرورت نہیں) مگر باوجود اس کے جب میں حق تعالیٰ شانہ کی شاہنشاہانہ سطوت اور بے نیازی و شان تقلیب اور اس امر پر نظر کرتا ہوں کہ بندہ کا قلب اس کی دو انگلیوں کے درمیان ہے کہ جس وقت اور جس طرح چاہے ان کو پلٹا دیدے تو (تھرا اٹھتا ہوں اور اطمینان نہیں کر سکتا کہ جس قلب کو ہم نے بے عیب اور اس کے درود کو قطعی مقبول سمجھا ہے وہ درحقیقت اور عنداللہ بے عیب ہے بھی یا ہم نے اپنے خیال میں اس کو مخلص اور عیوب سے سالم سمجھ لیا ہے۔ اس لئے کہ) اس کے قبضہ میں ہے وہ کسی عمل بد کو نظر میں مزین فرمادے اور انسان اپنے آپ کو پہلی حالت سے بہتر حالت میں سمجھنے لگے (حالانکہ وہ بہتر حالت نہیں بلکہ بدتر ہے) اس بنا پر کہتا ہوں کہ لا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون اللہ کی تدبیر اور شان عملی سے وہی بے خطر ہو سکتا ہے جس کے لئے دنیا و آخرت ہر دو عالم کا خسارہ مقدر ہوا ہے۔ اور اس لئے کسی کو بھی مطمئن نہ ہونا چاہئے کہ میرا درود پڑھنا یقیناً مقبول ہو گیا ہے۔ دیگر اعمال کی طرح اس کو اللہ کے کرم پر چھوڑنا چاہئے۔ واللہ اعلم

جامع کتاب لکھتے ہیں کہ ہر شخص کے درود شریف پڑھنے کی مقبولیت کا یہ سوال حضرت علامہ مولانا محمد بن یوسف سنوسی قدس سرہ سے بھی کیا گیا تھا اور انہوں نے اس کے دو جواب دئے تھے۔ مگر دونوں درحقیقت عقلی احتمال کا درجہ رکھتے ہیں۔ اور اس باب میں جب تک کوئی شرعی نص نہ ہو عقلی احتمال قابل قبول نہیں۔ اس قول پر اشکال یہ ہے کہ درود کی مقبولیت کو اگر قطعی مانا جائے تو درود پڑھنے والے کا حسن خاتمہ (اور جنتی ہونا) قطعی ہوا جاتا ہے، حالانکہ کسی کے خاتمہ کا حال کسی کو معلوم نہیں (اس لئے یہ حکم کیسے لگایا جا سکتا ہے کہ جو کوئی بھی درود شریف پڑھ لے گا اس کا خاتمہ ایمان پر یقیناً ہو گا)

حضرت علامہ سنوسیؒ نے ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ درود شریف کے یقیناً مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے لئے حق تعالیٰ نے حسن خاتمہ مقدر فرمایا ہے اس کے نامہ اعمال میں جو درود شریف ہو گا وہ ضرور اور بے شک و شبہ قبول شدہ درج ملے گا۔ برخلاف دیگر اعمال کے کہ باوجود جنتی اور مومن ہونے کے بھی وثوق نہیں کہ سب مقبول ہی درج کئے گئے ہوں۔ ممکن ہے کوئی طاعت مقبول ہو اور کوئی غیر مقبول۔" مگر یہ فرق چونکہ کسی دلیل شرعی سے ثابت نہیں اس لئے جواب محض عقلی احتمال ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ درود شریف کے قطعی مقبول ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بشرطیکہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کے تقاضہ سے پڑھا گیا ہو۔ اور قیاس کیا ہے ابو طالب کے واقعہ پر کہ ان کو چونکہ (چچا ہونے کی وجہ سے اور نیز بکفیل تربیت ہونے کے سبب) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت تھی اس لئے (باوجود کفر پر مرنے کے) آخرت میں ان کو سب سے ہلکا عذاب دیا جائیگا (جیسا کہ حدیث میں وارد ہے) اور اگر یہ محبت نہ ہوتی تو (دیگر کفار کی طرح) جہنم کے طبقہ زیریں میں داخل کئے جاتے۔

نیز ابولہب پر دوشنبہ کے دن عذاب میں تخفیف ہو جاتی ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ (دوشنبہ کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت شریفہ ہوئی اور) جس باندی نے آپ کی ولادت شریفہ کا مژدہ ابولہب کو سنایا اس کو ابولہب نے اس خوشی میں آزاد کر دیا تھا۔ نیز ابولہب نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دہن مبارک میں چسانے کے لئے اپنا انگوٹھا دیا تھا۔ جب کافروں کو طبعی محبت کی وجہ سے (حالانکہ غیر اختیاری ہے (اور لوجہ اللہ نہیں بلکہ محض خون کے تعلق کی وجہ سے ہوتی ہے) تخفیف عذاب کا نفع پہونچا تو کیا پوچھنا مومن کی محبت کا اور تبقاضا محبت آپ پر درود شریف پڑھنے کا کہ اس کا نافع اور مقبول ہونا تو اظہر من الشمس ہے۔ مگر اس جواب پر یہ اعتراض ہے کہ کلام اللہ و کلام الرسول کی نصوص کثیرہ اس پر دلالت کر رہی ہیں کہ کافر کے تمامی اعمال (کتنے ہی صورۃً حسنہ اور نیک کیوں نہ ہوں) حبط اور بیکار ہیں۔ کیونکہ ایمان کے بغیر کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہے (اور اس بنا پر ابولہب اور ابو طالب کی یہ محبت بھی ناقابل اعتبار ہے) مگر ان پر عذاب کی تخفیف چونکہ نص (اور خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد) سے ثابت ہوئی ہے۔ اس لئے ان کو مستثنیٰ کر لیا گیا۔ اور یہ مسئلہ اصولی ہے اور طے شدہ ہے کہ جو حکم خود خلاف قیاس ثابت ہوتا ہے اس پر دوسرے کو قیاس نہیں کیا جا سکتا (ورنہ لازم آئے گا کہ اور کسی کافر کو بھی اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ طبعاً محبت ہو یا وہ بحالت کفر درود پڑھے مگر ایمان نہ لائے، تو چاہئے کہ وہ بھی جنتی ہو جائے یا کم از کم آخرت میں عذاب اس پر ہلکا ہو جائے حالانکہ اس کا کوئی بھی قایل نہیں) علاوہ ازیں (خود یہ حدیث ہی پایہ ثبوت کو نہیں پہونچی جس سے درود شریف کی یقینی قبولیت ثابت کی جاتی ہے۔ چنانچہ) علامہ سیوطی نے درر منتثرہ میں لکھا ہے کہ حدیث عُرِضَتْ عَلَيَّ اَعْمَالُ اُمَّتِيْ فَوَجَدْتُ مِنْهَا الْمَقْبُوْلَ وَالْمَرْدُوْدَ اِلَّا الصَّلٰوۃَ عَلَيَّ کی

لہ مجھ پر میری امت کے اعمال پیش کئے گئے تو میں نے ان میں بعض اعمال کو مقبول پایا اور بعض اعمال کو نامقبول بجز مجھ پر درود پڑھنے کے کہ وہ مقبول ہی تھا نامقبول نہ تھا۔

مجھے سند نہیں ملی۔ اسی طرح یہ حدیث کُلُّ الْاَعْمَالِ فِیْهَا الْمَقْبُوْلُ وَالْمَرْدُوْدُ اِلَّا الصَّلٰوۃَ عَلَیَّ فَاِنَّهَا مَقْبُوْلَۃٌ غَیْرُ مَرْدُوْدَۃٍ کہ تمام اعمال میں کوئی عمل مقبول ہوتا ہے اور کوئی عمل مردود۔ بجز مجھ پر درود پڑھنے کے کہ وہ بہر حال مقبول ہوتا ہے کبھی نامقبول نہیں ہوتا۔

علامہ ابن حجر کہتے ہیں کہ یہ حدیث ضعیف ہے۔ اور بعض محدثین نے لکھا ہے کہ درود کے ردّ نہ ہونے کا مضمون کلام الرسول نہیں ہے بلکہ ابو سلیمان دارانی کا قول ہے۔ اور احیاء العلوم میں اس کو مرفوع حدیث بیان کر کے لکھا ہے کہ ہمارے شیخ یعنی مولانا ابوالخیر شمس الدین محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی مولف مقاصد حسنۃ فرماتے ہیں کہ مجھے اس کی سند نہیں ملی۔ اور میرے نزدیک یہ قول حضرت ابوالدرداء کا ہے نہ کہ ارشاد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا) بہر حال ان تمام اقوال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ درود شریف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر پڑھنے پر قطعاً و یقیناً قبولیت مرتب نہ ہونے کی تو کوئی دلیل نہیں ہے۔ البتہ دیگر اعمال کی بہ نسبت اس کی قبولیت زیادہ متوقع ہے، اور جن اعمال کی قبولیت پر ظن غالب کیا جا سکتا ہے ان میں درود شریف کا نمبر پہلا ہے۔ واللہ اعلم

ف بندۂ ناچیز کے ذہن میں یہ آرہا ہے کہ درود شریف دعا ہے حق تعالیٰ سے کہ رحمت کاملہ نازل فرما آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر۔ اور خود حق تعالیٰ کا ارشاد قرآن مجید میں اِنَّ اللّٰهَ وَمَلٰٓئِكَتَهٗ يُصَلُّوْنَ عَلَى النَّبِیِّ اس کا اظہار فرما رہا ہے کہ حق تعالیٰ سبحانہ ہمہ وقت آپ پر رحمت کاملہ نازل فرماتا رہتا ہے اور اللہ کے معصوم و مقبول بندے یعنی آسمان و زمین کے فرشتے ہمہ وقت ذات محمدی پر نزول رحمت کاملہ کی دعا مانگتے رہتے ہیں۔ پس کسی بندہ کے آپ پر درود پڑھنے کی مقبولیت کے دو مفہوم ہیں۔ ایک یہ کہ اس کی درخواست دربارہ نزول رحمت بر سیدنا محمدؐ مقبول ہو اور رد نہ کی جائے سو ظاہر ہے کہ جب ہمہ وقت حق تعالیٰ کی طرف سے آپ پر نزول رحمت ہو رہا ہے تو یہ دعا واقعہ کے موافق اور مقبول ہوئی۔ مردود نہ ہوئی۔ بالخصوص جبکہ وقت میں بھی موافقت کھا رہی ہے ملائکہ کی دعا سے جب دیگر دعاؤں کا یہ حال ہے کہ ملائکہ اس پر آمین کہیں تو وہ مقبول ہوتی ہے، یعنی درخواست منظور ہوتی ہے۔ تو یہ تو درخواست ہی ایسی چیز کی ہے جس کی مداومت حق تعالیٰ نے تجویز فرمائی ہے پس اس دعا کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی دعا مانگے یا اللہ اپنی ذات کا قدم قائم رکھ، حضرات انبیاءؑ کو معصوم بنائے رکھ۔ اہل جنت کو جنت میں داخل فرما، جن کو ایمان پر مرنا نصیب ہو انھیں دوزخ سے محفوظ رکھ وغیرہ وغیرہ کہ واقعہ مقدرہ و تجویز کردہ الٰہی کے موافق دعا ہے۔ لہٰذا اس کے ردّ اور نامقبول ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ اس کو نامقبول اس وقت کہا جائے جبکہ حق تعالیٰ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نزول رحمت کو بند فرما دے، اور وہ خلاف مفہوم آیت شریفہ ہے لہذا درود کی قبولیت بایں معنے یقینی وقطعی ہوئی۔ کہ جس شے کی یہ درخواست کر رہا ہے وہ اس کو مل رہی ہے۔ یعنی نزول رحمت ذات محمدی پر ہو رہا ہے اور جاری ہے۔ احادیث یا آثار میں جہاں بھی یہ مضمون آیا ہے میرے نزدیک اس کا محمل یہی ہے۔ البتہ دوسرا مفہوم قبولیت کا یہ ہے کہ درود پڑھنے والے کو اجر وثواب ملے، اور ایک بار درود پڑھنے کے صلہ میں اس پر دس رحمتیں حق تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوں۔ سو یہ دیگر اعمال کی طرح بے شک نیت اور اخلاص پر موقوف ہے کہ خود کلمہ طیبہ بھی اگر اخلاص سے نہ پڑھا جائے جیسا کہ منافقین کا کلمہ پڑھنا تھا تو وہ بھی مقبول نہیں۔ چہ جائیکہ درود شریف جو منجملہ اعمال حسنہ کے ایک عمل ہے۔ اور یہ اسی آیت شریفہ کا جزو دوم ہے یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا پس نماز روزہ اور دیگر اعمال کی طرح یہ بھی ایک امر خداوندی ہے جس کی تعمیل مومنین پر فرض وواجب کی گئی ہے۔ جب نفس ایمان کی قبولیت مشروط ہے اخلاص کے ساتھ تو اعمال بدرجہ اولیٰ مشروط ہیں اخلاص کے ساتھ۔ پس بایں اعتبار جیسے کلمہ طیبہ اور ایمان کسی کا مقبول ہے کسی کا مردود، اسی طرح درود شریف پڑھنا بھی کسی کا مقبول ہے کہ اجر ملے گا اور اس پر دس رحمتوں کا نزول ہوگا، اور کسی کا مردود ہے کہ کوئی صلہ دین یا دنیا میں اس کو نہ ملے گا۔ اگرچہ جو درخواست تھی کہ رحمت کاملہ نازل ہو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وہ مقبول ہوئی۔ اس کی مثال عکس کے درجہ میں ایسی ہے جیسے ابوجہل نے دعا مانگی۔

اَللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِکَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ

بار الہا اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے یا اور کوئی دردناک عذاب نازل فرما۔ ظاہر ہے کہ اس اعتبار سے کافر کی یہ دعا مقبول ہوئی کہ واقعہ کے مطابق ہوئی۔ درحقیقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم برحق تھے اور آپ کے دشمنوں پر عذاب آنا مقدر تھا۔ اس کی قبولیت قطعی ویقینی تھی اور اس کے رد ہونے کا احتمال ہی نہ تھا۔ مگر بایں معنے یہ دعا نامقبول تھی کہ دعا کنندہ کو نفع نہ پہونچا اور جس نیت سے اس نے دعا مانگی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ لہذا ابوجہل مستجاب الدعا نہ ہوا اور وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ اِلَّا فِیْ ضَلٰلٍ باموقع رہا۔ کہ کافر کی دعا قبول نہیں ہوا کرتی۔ یعنی اس کی خواہش کے موافق مراد اس کو نہیں ملا کرتی۔ واللہ اعلم

نیز حضرت ممدوح نے جنتیوں کے لباس کے متعلق فرمایا کہ نہ وہ (بوسیدہ اور پھٹ پھٹا کر) فنا ہوں گے اور نہ (میلے کچیلے ہو کر) پھینکے جائیں گے۔ اور ایک ساعت کے اندر جنتی ستر ہزار کی

مقدار لباس پہنے گا۔

میں نے دریافت کیا کہ جب لباس اُتارے اور بدلے جائیں گے تو اتنے لباسوں کا جنتی پر بوجھ ہوگا۔ (جو موجب کلفت ہے)

فرمایا کہ سب لباس مجسم انوار ہوں گے (اور نور کا ثقل نہیں ہوا کرتا) پس انوار آئیں گے اور جائیں گے (اور جتنے لباس جس رنگ کے بھی یہ چاہے گا وہ بدن پر چمکیں گے اور زیب تن ہونگے)

نیز آپ نے فرمایا کہ جنتی کی نظر جنت میں کسی حد پر کبھی رکے گی نہیں۔ کیونکہ جنت میں اللہ کی نعمتیں غیر محدود ہوں گی۔ پس جب جنتی کی نظر ایک نعمت پر پڑے گی (تو یہ نہ ہوگا کہ وہیں رُکجائے بلکہ) اس کا مشاہدہ ہوتے ہی فوراً اس کو دوسری نعمت نظر آئے گی۔ اور پھر (اس پر بھی نہ رُکے گی) فوراً ہی اس کو تیسری اور چوتھی نعمت نظر آئے گی وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر نظر پر ایک جدا لذت پائے گا کیونکہ نعمتیں جو نظر آئیں گی وہ سب مختلف قسم کی ہوں گی۔ اس کی مثال ایسی سمجھو مثلاً ایک قدِ آدم شیشہ پر تمہاری نظر پڑے جس میں از سر تا پا تمہارا وجود نظر آوے تو تم کو تعجب ہوگا (اور تمہاری نظر اس پر رُکی رہ جاویگی) پھر اگر دوسرا آئینہ اسی جیسا نظر آوے تو تعجب نہ ہوگا لیکن اگر اس کے خلاف دوسری حالت پر نظر آوے تو اب تم کو پھر تعجب ہوگا جیسا پہلے آئینہ کو دیکھ کر ہوا تھا۔ (اور اب نظر اس پر منتقل ہو جائے گی۔ اسی طرح یکے بعد دیگرے نئی شکل اور نئی وضع کے جتنے آئینے نظر آتے رہیں گے تو تعجب پر تعجب ہوتا اور نگاہ برابر منتقل ہوتی رہے گی) اور جنت میں جو کچھ بھی نظر آئے گا وہ پہلے سے نرالی شان کا ہوگا (اس لئے کسی ایک پر نظر کے رُک جانے کی صورت ہی نہ ہوگی)

نیز آپ نے فرمایا کہ ہاں اس میں اولیاء کا اختلاف ہوا ہے کہ (مثلاً دوسری نعمت سے نظر ہٹا کر) اگر پہلی نعمت کو دوبارہ دیکھیں گے تو اُس کو پہلی ہی حالت پر پائیں گے یا نہیں۔ (یعنی وہ شکل سابق پر بدستور قائم رہے گی یا نظر کی تجدید کے ساتھ جدت قبول کرے گی اور نئی وضع پر دکھائی دیگی) واللہ اعلم

ایک مرتبہ حضرت ممدوح نے اثناءِ کلام میں فرمایا کہ جنت میں بعض اہل جنت کو حزن و غم اور حسرت و افسوس بھی پیش آئے گا۔ ایک عالم وہاں بیٹھے تھے اُنھوں نے ٹوکا اور کہا کہ تحسر (ایک روحانی کلفت ہے اور اس کا وقوع) جنت میں نہ ہوگا۔

میں نے ان سے کہا کہ انکار نہ کرو۔ مجھے پانچ برس سے اس کا تجربہ ہے کہ حضرت ممدوح نے جو بھی ارشاد فرمایا اس کی تائید نصوص میں خصوصی یا عمومی ضرور ملی ہے۔ اس وقت مجھے کوئی نص مستحضر نہ ہوئی جو میں پیش کر دیتا۔ کیونکہ سفر کی حالت تھی۔

مگر حضرت ممدوح نے فرمایا مولوی صاحب اس کا انکار کیوں فرماتے ہیں - اہل جنت جب جنت میں داخل ہوں گے تو حمد وثنا کا نور اُن کی زبانوں پر جاری ہو گا (جیسا کہ آیت شریفہ میں مذکور ہے) - وَاٰخِرُ دَعْوٰنَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ ھَدٰنَا لِھٰذَا وَمَا کُنَّا لِنَھْتَدِیَ لَوْلَآ اَنْ ھَدٰنَا اللّٰہُ ط

یعنی اہل جنت کہیں گے اللہ کا شکر ہے اور وہی حمد کا مستحق ہے جس نے ہمیں اس جنت کا راستہ دکھایا اور ہم کو یہ راستہ کبھی نظر نہ آتا اگر اللہ ہمیں نہ دکھاتا) اور یہ نور اُس مقدار پر ہو گا جتنی ان کو دنیا میں اپنے رب کی معرفت حاصل تھی (کہ جتنی کسی کو معرفت زیادہ نصیب تھی اسی قدر وہ حمد وثنا کا نور زیادہ پائے گا) پس جب وہ جنت میں جائیں گے اور جتنی ان کو دنیا میں اللہ کی معرفت حاصل تھی اس سے بدرجہا زائد حق تعالیٰ کی معرفت ان کو حاصل ہو گی تو اوّل سے لیکر آخر تک سب ہی جنتی اپنے پروردگار کی حمد اور اس کی خدمت واطاعت میں اپنی کوتاہی وکمی پر نادم ہوں گے (اور افسوس کریں گے کہ ہائے رب متعال کا کچھ بھی حق ادا نہ کیا) پس یہ صورت آخرت میں ضرور ہونے والی ہے اور اس میں نہ شک ہے نہ شبہ (پھر حسرت کا انکار کرنے کی کیا وجہ)

نیز آپ نے فرمایا کہ ایک صورت (ایسی ہی اظہار تحسّر کی) خاص زنا کرنے والی جماعت کے لئے اور بھی پیش آئے گی - وہ یہ کہ جب یہ لوگ (سزا پاکر یا معافی ملنے پر) جنت میں داخل ہوں گے تو حق تعالیٰ شانہ ان پر تجلی فرمائے گا (اور اپنے دیدار سے عام جنتیوں کے ضمن میں ان کو بھی مشرف فرمائے گا) اس وقت جب ان کو علم ہو گا کہ ہم کس دنی اور رذیل حالت میں تھے، اور ذات حق کس درجہ جلالت وعظمت اور کبریائی وسطوت والی ہے اور باوجود اس شان قہر وغلبہ کے کتنی وسیع رحمت رکھتی ہے (کہ ہماری اس کمینہ حرکت کو بھی نظر انداز فرما دیا) تو نادم وپشیمان ہوں گے اور شرم کے مارے بے ہوش ہو جائیں گے، اور مدت کے بعد ہوش آئے گا - اس وقت جن کو حق تعالیٰ نے معصیت زنا سے محفوظ رکھا تھا وہ (ان کی ندامت وغشی دیکھ کر اللہ کا شکر کریں گے اور) ایک دوسرے سے کہے گا کہ اس وقت حق تعالیٰ نے ہمیں اپنی تمام نعمتوں سے نوازا (اور اس شرم وندامت سے بھی بچائے رکھا) پھر جب ان کو ہوش آئے گا تو حق تعالیٰ کی طرف سے ان کو ایک ایسی قوت اور کمال معرفت عطا کی جائے گی جس کی کیفیت ناقابل بیان ہے (تاکہ دوبارہ اس غشی وندامت کی تکلیف میں مبتلا نہ ہوں) اس سے حضرت ممدوح نے جنت میں حسرت وندامت ہونے کا استدلال فرمایا۔

نیز اور بھی نصوص ہیں جن سے اس کا ثبوت ہوتا ہے - مثلاً علامہ جلال الدین سیوطی نے بدور سافرہ میں باب ہی منعقد کیا ہے - ترک ذکر پر اہل جنت کا اظہار حسرت - اور پھر طبرانی وبیہقی سے

حضرت معاذ بن جبل کی یہ روایت نقل کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کو حسرت صرف اُس گذشتہ وقت پر ہوگی جو ان پر (دنیا کے اندر) ایسی حالت میں گذرا کہ انہوں نے اللہ کو یاد نہیں کیا۔ اور احمد اور ترمذی اور ابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوہریرۃؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو قوم کسی جگہ بیٹھی اور وہاں نہ ذکر اللہ کیا اور نہ نبی پر درود پڑھا وہ نشست بروز قیامت ان کے لئے حسرت کا سبب بنے گی (کہ ہائے افسوس وقت کو برباد کیوں کیا) اگرچہ وہ بصلہ اعمال جنت میں داخل ہو گئے۔ اور بیہقی وابن ابی الدنیا نے حضرت عائشہؓ سے روایت کی ہے کہ فرمایا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو ساعت کسی ابن آدم پر اس حالت میں گذری کہ اس نے اللہ کو خوبی کے ساتھ یاد نہیں کیا وہ قیامت کے دن اس کے لئے ضرور حسرت بن کر رہے گی۔

نیز لباس اہل جنت کے باب میں طیالسی اور نسائی وابن حبان اور حاکم نے حضرت ابوسعید خدری سے روایت کی ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے (مرد ہوکر) دنیا میں ریشم پہنا اور توبہ نہ کی، وہ آخرت میں ریشم نہ پہنے گا اگرچہ جنت میں چلا جائے۔ تمامی اہل جنت کو ریشمی لباس نصیب ہوگا مگر اس کو نصیب نہ ہوگا۔ اور دوسری جگہ شیخین یعنی بخاری ومسلم سے بروایت ابن عمرؓ نقل کیا ہے کہ فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس نے دنیا میں شراب پی اور توبہ نہ کی وہ آخرت میں اس سے محروم رکھا جائے گا (اور ظاہر ہے کہ ریشمی لباس اور خمر طہور سے دوسروں کو متمتع اور اپنے آپ کو محروم دیکھ کر حسرت ہوگی کہ دنیا رفانی میں اس کا استعمال کیوں کیا تھا کہ آج جنت باقیہ میں اس سے محروم رہے) واللہ اعلم۔

نیز حضرت نے فرمایا کہ عامہ مومنین جنت میں نعمتوں کے متعلق عقلیں دوڑائیں گے اور سوچ سوچ کر اپنے دلوں میں طرح طرح کی نعمتوں کے خیال لائیں گے (اور وہ سب فوراً موجود پائیں گے تو) جنت اور اس کی مہیا شدہ نعمتوں پر بہت مسرور اور فرحاں ہوں گے۔ مگر ولی کا فکر وخیال غیر اللہ سے بے تعلق ہوگا۔ اور اس کا یہ مطلب نہیں کہ غیر اللہ (یعنی جنت یا نعمائے جنت کی طرف) ان کا خیال تو متوجہ ہوگا مگر وہ اس سے اپنا خیال ہٹالیں گے۔ بلکہ مُراد یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان کی عقول میں ماسوی اللہ کا فکر وخیال پیدا ہی نہیں کیا اور نہ کبھی پیدا فرمائے گا (اس لئے ان میں اللہ کے سوا کسی طرف توجہ کرنے کا مادّہ ہی نہیں) اسی لئے ان کا نام اولیاء اللہ رکھا گیا ہے (کہ ان کا تعلق صرف اللہ کے ساتھ ہے اور) غیر اللہ سے منقطع ہے

حضرت ممدوح کا یہ کلام بندہ کو اپنے مولانا کی طرف متوجہ ویکسو کرنے اور اس کو بلند ہمت وعالی

حوصلہ بنانے کے لئے تھا کہ نعمت میں مشغول ہو کر ولی النعمۃ کو نہ بھولے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اپنے منعم میں مشغول ہو، اسی کی طرف لپکے، اسی کے حضور گڑگڑائے کہ بندہ مومن کو یہی شایان ہے۔ رہا نعمت کا قصہ سو اس کی طرف توجہ وخیال صرف اپنے رب کے ساتھ اظہار محبت کی خاطر ہو کہ آپ کی عطا کردہ ہے اس لئے تبعًا یہ بھی ہمیں پیاری ہے، اور اس اقرار کے لئے ہو کہ یہ حق سبحانہ کی طرف سے ہے۔ پس نعمت کو محض اس نظر سے دیکھے اور اس سے قبل اپنے منعم وخالق جل جلالہ کے ساتھ رہے۔ حتی کہ فرض کر و یہ نعمت ہوتی ہی نہیں، یا اب معدوم ومفقود ہو جائے، تو قلب بدستور اپنے آقا کے ساتھ وابستہ اور بحر توحید میں مستغرق اور اس کے اسرار الوہیت میں غرق رہے۔ کہ نعمت کا وجود اور عدم کوئی حال بھی منعم سے غافل نہ بنا سکے۔ اور اسی بنا پر حضرت نے یہ فرمایا کہ ولی کو جب اپنے مولیٰ تعالیٰ شانہ کے متعلق اپنی مُراد مل جاتی ہے تو پھر اُسے پروا نہیں ہوتی کہ حق تعالیٰ اسے کہاں رکھتا اور کس محل میں اتارتا ہے۔ اور اس کے بعد تمثیل بیان فرمائی کہ جیسے شہد کا کیڑا جو از سرتاپا تمام اجزائے شہد کھانے کا عاشق ہو، اگر اسے شہد کے مٹکے میں ڈال دیا جائے کہ اس کو اپنے مطلوب سے اتصال نصیب ہو جائے اور تمام رات وتمام دن وہ اس کے کھانے میں لگا رہے تو پھر اس شہد کے مٹکے کو جس میں کیڑا پڑا ہوا ہے چاہے اس سے بڑے مٹکے میں بھی ڈال دو جو رال سے لبریز ہو تو کیڑے کو اس کی کچھ پروانہ ہوگی اور اس کے قلب پر شہد کے سوا نہ کوئی خیال گذرے گا اور نہ رال یا کسی دوسری شے کی بو سے اس پر کوئی تکدر لاحق ہوگا۔ کیونکہ اس کی ذات بالکل شہد میں فنا وغرق ہے اور اس کے سوا ہر چیز سے بے تعلق ہے۔ اس لئے رال کی طرف اس کا دھیان بھی نہ جائے گا۔ چہ جائیکہ اس سے تکدر یا گرانی پیش آوے۔

بارھواں باب

جہنم کا بیان

حضرت ممدوح نے فرمایا کہ دوزخیوں کو وہ درخت اور نہریں جو ان کے قریب ہوں گی نظر نہ آئیں گی، بلکہ جن کا فاصلہ ساتوں زمین کی مقدار بعید ہوگا وہ نظر آئیں گے۔ تاکہ ان کے عذاب پر عذاب کا اضافہ ہو۔

ف مطلب یہ ہے کہ جہنم میں مختلف قسم کے درخت بھی ہوں گے مگر مجسم عذاب اور سرتاپا آگ کہ پتے اور شاخیں اور چھال اور پھل غرض اس کا ہر جزو اور ہر حصہ عذاب ہی عذاب ہوگا۔ اسی طرح پانی بہتی ہوئی نہریں نظر آئیں گی مگر وہ بھی مجسم عذاب، کہ کھولتا ہوا پانی ہوگا جو حلق سے لیکر معدہ تک کو جھلس دے گا۔ اہل جہنم کو یہ آگ کے درخت اور آگ کی نہریں پاس والی تو نظر نہ آئیں گی البتہ دور والی نظر آئیں گی۔ اور دور بھی اتنی جتنی ساتوں زمین کی مسافت ہے۔ (اور یہ بھی اس لئے کہ گو یہ درخت اور نہریں مجسم عذاب ہیں۔ مگر صورت ان کی پھل دار سبز درختوں اور شیریں و خنک آب جاری کی ہوگی جو کسی درجہ میں تسلی بخش اور سہارا دینے والی ہو سکتی ہیں اس لئے یہ سہارا بھی ان کو نصیب نہ ہوگا اور سبز منظر بھی انکو بعید از بعید مسافت پر نظر آئے گا۔ جیسے مسافر کو دور کا پڑاؤ اگر پاس نظر آوے تو سہارا بندھ کر بدن میں طاقت آجاتی ہے اور اگر پاس کا پڑاؤ دور نظر آوے تو رہی سہی ہمت بھی پست ہوکر ایک ایک قدم گویا ایک ایک میل بن جاتا ہے۔ پھر یہ دوسرا عذاب ہوگا کہ جب وہ پیاس کی بیتابی میں نہر کی طرف چلیں گے اور بھوک کی تڑپ میں پھلدار درخت کی جانب لپکیں گے تو یہ مسافت طویلہ جس کو محض سہارا نہ ملنے کی وجہ سے دور دراز دکھایا گیا تھا بحکم خدا صرف تین قدم میں طے ہوگا تاکہ اب اس عذاب میں دیر نہ ہو جو اس کے پھل کھانے اور نہر کا پانی پینے سے ان بدنصیبوں پر پڑنا ہے۔ غرض تخیل کے سہارے کی راحت بھی نصیب نہ ہوگی اور واقعہ عذاب میں بھی تاخیر نہ ہوگی۔ ہر دو راحت سے محروم ہوں گے)

حضرت ممدوح نے فرمایا اہل جہنم کو مسافت بعیدہ مذکورہ پر درختوں کی سی صورتیں نظر آئیں گی جن میں پھل لگے ہوئے اور سبز پتے پھیلے ہوئے ہوں گے۔ وہ (بیتابانہ) ان کی طرف لپکیں گے تاکہ اس کے پھل کھا کر اور ہرے درخت کے پاس پہونچ کر (بھوک اور تپش و سوزش کی) جس تکلیف میں مبتلا ہیں اس کو دور کریں۔ چنانچہ اتنی لمبی مسافت کو جلد از جلد پہونچنے کے لئے تقریباً تین قدم میں طے کریں گے اور اس کے پھل اور پتے لیکر (بعجلت تمام) اپنے منہ میں ڈال لیں گے۔ اور جہنم ہو یا جنت (اس میں یہ خاصیت ہے کہ) اس کی جو چیز بھی انسان اپنے منہ میں ڈال لے گا اس کو باہر نہ نکال سکے گا۔ (جنت کا پھل اس لئے کہ بیحد لذیذ ہے اور اگلنا اس چیز کا ہوتا ہے جو خلاف طبع بدمزہ ہو۔ اور جہنم کا پھل اس لئے کہ وہ عذاب ہے اور اگلنا عذاب کا رفع ہونا ہے جو ان کے نصیب میں نہیں۔ لہذا کھایا ہو تلخ پھل اُگل نہ سکے گا) برخلاف دنیا کے کہ یہاں منہ میں ڈالی ہوئی چیز کا اُگلنا (اور تلخ یا بدمزہ اور ناگوار معلوم ہو تو منہ سے باہر نکال دینا) انسان کے اختیار اور طاقت میں داخل ہے۔ پس جب اس پتے یا

پھل کو منہ میں ڈال لیں گے تو پہلے سے بھی زیادہ عذاب و تکلیف میں پڑ جائیں گے۔ اور اب اُلٹے پاؤں لوٹیں گے تو سابق مسافت بعیدہ کو تقریباً ڈیڑھ قدم میں قطع کریں گے۔ کیونکہ آگ لگی ہوئی ہوگی اور (اس کی حرارت و بدحواسی رفتار کو دوچند بنادے گی) واللہ اعلم۔

نیز آپ نے فرمایا کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ کی طرح لپٹ اور شعلوں والی نہ ہوگی۔ کیونکہ شعلہ والی آگ سے انسان کچھ مدت بعد مانوس ہوجاتا ہے۔ (چنانچہ مستورات روٹی پکانے کی خوگر ہوتی ہیں تو شعلہ میں ہاتھ دینے سے ڈرتی نہیں اسی طرح باورچی تنور کے بھڑکتے ہوئے شعلہ میں ہاتھ ڈال دیتا اور بے تکلف روٹی اس میں جماتا اور اس سے نکالتا ہے پس اگر جہنم کی آگ میں بھی شعلے ہوں تو جہنمی شروع تو اسکی تکلیف پائیں۔ مگر کچھ مدت بعد اس سے مانوس ہوجائیں اور اب تکلیف تکلیف نہ رہے۔ حالانکہ جہنم ہر لمحہ اضافہ عذاب کا مقام ہے نہ کہ تخفیف عذاب کا) اس لئے نار جہنم کی کیفیت یہ ہے کہ وہ خالص ظلمت اور اندھیرا ہے اگر اس میں سے ایک چھوارہ کی مقدار لے کر ہوا میں اس کا جرم منتشر کردیا جائے، حتّٰے کہ (ساری دنیا کی) ہوا میں وہ ایسا پھیل جائے جیسے دھواں، تو اس وقت اس میں چمک اور شعلہ نمودار ہوگا (مثلاً ایک گولی کو شیریں سمندر میں گھول دو اور وہ سارے پانی کو ایلوے کی طرح کڑوا بنادے تو اس گولی کی تلخی کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ اسی طرح جس آگ کا کھجور برابر حصّہ ساری ہوا میں دھوئیں کی طرح پھیل کر سارے جوّ کو شعلہ نار بنادے اس کھجور برابر اصل آتش کا کیا ٹھکانہ ہے)

نیز آپ نے فرمایا کہ اگر (مثلاً اس کنارہ سے لیکر اُس کنارہ تک) ساری دنیا کو آگ سے لبریز کردیں اور پھر فرض کرو (جس طرح میلوں میں پھیلی ہوئی گھاس کو مشین کے ذریعہ بھینچ کر چھوٹی سی گٹھری بنالی جاتی ہے اسی طرح) اس آگ کو بھینچیں اور انتہائی شدت سے اس کو مجتمع کریں، حتّٰی کہ وہ (بھینچ بھنچا کر ایک صندوق کی برابر ظرف میں سما جائے تو اب اس میں شعلہ ولپٹ کچھ نظر نہ آئے گا بلکہ) وہ محض سیاہ اور خالص اندھیر ہوگا (کہ شعلہ ولپٹ تو صرف پھیلاؤ کی وجہ سے تھا کہ آگ تھی کم اور اس کا ظرف یعنی خلا تھا وسیع اس لئے پھیل کر ہلکی ہوگئی اور تقسیم ہوکر شعلہ دے گئی۔ ورنہ جتنی جگہ کم اور حریق و سوزش شدید ہوگی اسی قدر ظلمت و سیاہی شدید و قوی ہوگی)

نیز آپ نے فرمایا کہ جہنم میں (عذاب کی) ندیاں ہوں گی (جن میں پانی نظر آئے گا مگر خالص عذاب اور حمیم و غسّاق ہوگا) دوزخیوں میں کی عورت اپنے بچہ کو کمر پر لادے ہوئے لاحق شدہ شدت تشنگی کی وجہ سے اسی مسافت سابقہ (یعنی ہفت زمین کی مقدار) کو قطع کرکے ندی کی طرف جائے گی، اور جب ندی پر پہونچکر جانوروں کی طرح بیتابانہ) اس میں منہ ڈال کر پیئے گی تو پانی اس کو بھی جھلس دے گا اور

اس کے بچہ کو بھی (کہ منہ کی کھال اتر کر ہڈیوں کا ڈھانچ نظر آنے لگے گا)

پھر میں حضرت سے یہ نہ پوچھ سکا کہ یہ بچہ جو اس کی کمر پر ہو گا وہ کون ہو گا۔ آیا جہنم میں بھی بصورت عذاب، توالد وتناسل جاری ہو گا اور یہ بچہ وہیں کا پیدا شدہ ہو گا، یا اُن بچوں میں کا ہو گا جو دنیا میں اسکے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔ پس اگر وہ ہو گا جو دنیا میں اس کے پیٹ سے پیدا ہوا تھا تو اس اختلاف پر محمول ہو گا جو کافروں کی (نابالغ وصغیر سن) اولاد کے بارہ میں علماء کا ہوا ہے (کہ بعض کہتے ہیں وہ غیر مکلف ہونے کے سبب جنت میں جائیں گے اور اہل جنت کے خادم بنیں گے۔ اور بعض کا قول ہے کہ والدین کے تبعاً دوزخ میں جائیں گے۔ اور بعض کا مذہب یہ ہے کہ یہ نہ سب جنتی ہیں اور نہ سب دوزخی بلکہ علم الٰہی میں اگر مومن تھے تو جنتی ہوں گے اور اگر علم الٰہی میں کافر تھے تو جہنم میں جائیں گے۔ چنانچہ حدیث میں آیا ہے کہ کسی شخص نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اولاد کفار کے متعلق استفسار کیا (کہ نابالغ ہی اگر مر جائیں تو جنت میں جائیں گے یا دوزخ میں) تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ اللہ اعلم بما کانوا عاملین اللہ خوب جانتا ہے کہ (زندہ رہتے تو) کیسے عمل کرتے (یعنی گو ظہور نہ ہونے کے سبب ان کا کفر یا ایمان ہمارے علم میں نہیں آیا۔ مگر اللہ کو تو معلوم ہے کہ اگر عمر پاتے اور زندہ رہتے تو کفر کرتے یا ایمان لاتے لہٰذا علم الٰہی کے موافق آخرت میں ان کے ساتھ برتاؤ کیا جائے گا)۔ اور یہی ہمارے امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب ہے۔ پس اس مسلک کی بنا پر کافر کے جس (نابالغ فوت شدہ) بچہ کے متعلق علم الٰہی یہ ہو گا کہ اگر وہ بڑا ہوتا تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتا (مگر طفولیت میں مر جانے کے سبب اس کا ظہور نہ ہوا) تو وہ جنت میں جائے گا۔ اور اسی پر حضرت جابرؓ بن سمرہ کی وہ حدیث محمول کی جائے گی جس میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خواب میں بعض کافروں کے بچوں کو جنت میں دیکھا؛ اور جس بچہ کے متعلق علم الٰہی یہ ہو گا کہ اگر وہ بڑا ہوتا تو کفر کرتا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ لاتا تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ اور اسی پر محمول کیا جائے گا شیخ کی اس روایت کو اور اسی پر مرتب ہو گا اُس بچہ کا قصہ جس کو صغر سنی میں حضرت خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا؛ اور علماء نے اس کے بارہ میں لکھا ہے کہ اس کی طبیعت اور جبلّت ہی کفر پر ہوئی تھی۔

میں نے اس مسئلہ کے متعلق بھی حضرت ممدوح سے دریافت کیا (کہ اولاد کفار کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے)

تو فرمایا اس بارے میں صحیح مذہب یہی ہے جو اس حدیث سے ثابت ہو رہا ہے (کہ علم الٰہی میں اس کے بڑے ہونے پر جس امر کا ظہور مقدر تھا اسی پر حکم جاری کیا جائے گا) بلکہ یہ بھی فرمایا کہ بہتیرے

بچے ہیں جو بحالت طفولیت مرجاتے ہیں مگر وہ قیامت کے دن حفاظ قرآن مجید کے زمرہ میں اُٹھائے جائیں گے۔ کیونکہ علم الٰہی میں تھا کہ یہ بچہ اگر زندہ رہتا تو قرآن مجید حفظ کرتا لہٰذا بروز قیامت وہ حافظ قرآن محشور ہوگا۔ اور بہتیرے بچے ہیں جو صغیر السن مرجاتے ہیں۔ مگر وہ علمار اور اولیار کے زمرہ میں اٹھائے جائیں گے۔ اسی لئے کہ ان کے متعلق علم الٰہی میں تھا اگر بڑے ہوتے تو عالم بنتے یا مثلاً ولی ہوتے یا فلاں گروہ وجماعت میں ہوتے۔

جامع کتاب کہتے ہیں ایک واقعہ ہمارے زمانہ میں پیش آیا کہ ایک بچہ قریب البلوغ تھا اور اس نے بروایت قالون یا بروایت ابن کثیر قرآن مجید حفظ کیا تھا اور اس کی تمنا یہ تھی کہ سبع قرارت کا حافظ بنے چنانچہ وہ حضرت ابویعزیؒ کے مزار پر حاضر ہوا (جہاں مشہور ہے کہ دعا قبول ہوتی ہے) اور دعا مانگی کہ میں اہل سبع بن جاؤں۔ فوراً اس کی آنکھ جھپک گئی اور اس نے خواب میں دیکھا کہ حضرت ابویعزی سامنے کھڑے ہیں اور ان کے ہاتھ میں اجازت نامہ ہے جیساکہ بلاد مغرب میں اہل سبع حفاظ کا دستور ہے کہ تحریر کر کے بصورت سند فارغ التحصیل شاگرد کو، دیا کرتے ہیں۔ اور اس پر علمار قرار کے دستخط بھی تھے کہ یہ زیارت کنندہ شخص اہل سبع میں سے ہے۔ شیخ نے خواب ہی میں وہ اجازت نامہ اس کو دیا اور فرمایا لو اپنی سند اجازت کہ تم اہل سبع میں سے ہو۔ اس کی آنکھ کھل گئی اور یہ اپنے وطن واپس آگیا۔ چند ہی روز بعد بیمار رہا اور اس کا انتقال ہوگیا۔ کہ جتنا پڑھا تھا اس میں کچھ بھی اضافہ نہ ہوا تھا۔ اس کے باپ نے اس کی خواب مجھ سے بیان کی اور تعبیر دریافت کی تو میں نے اسی تقریر سابق کے موافق اس کو جواب دیا کہ وہ قیامت کے دن اہل سبع قرار کے زمرہ میں محشور ہوگا اور خواب میں شیخ کا اجازت نامہ دینا گویا علم الٰہی کا اظہار تھا۔ کہ اگر زندہ رہتا تو اہل سبع قرارت کا حافظ بنتا)۔ یہ سنکر اس کا باپ بہت خوش ہوا اور بچہ کی موت کا حزن وغم سب جاتا رہا۔ واللہ اعلم بالصواب

ف اس مسئلہ میں کہ کفار ومشرکین کی اولاد جو قبل از بلوغ مر گئی ہے جنت میں جائے گی یا دوزخ میں، علمار کا بہت اختلاف ہے۔

ایک فریق کا مسلک یہ ہے کہ والدین کے تابع ہو کر جہنم میں جائیں گے۔ جیسے سانپ کا بچہ سنپولیا اس سے قبل بھی کہ کسی کو کاٹے یا کاٹنے کے قابل ہو ہدر الدم ہے اور مارے جانے کا مستحق ہے۔

دوسرا مسلک یہ ہے کہ وہ جنت میں جائیں گے۔ اس لئے کہ ان سے کفر کا صدور نہیں ہوا تھا اور بچپن کا کوئی فعل شرعاً معتبر نہیں۔ لہٰذا جہنم کا دخول جو متفرع ہے کفر پر مرتب نہ ہوگا۔ بلکہ بحکم اصل فطرت کہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلَی الْفِطْرَۃِ ہر بچہ فطرت وہدایت پر پیدا ہوتا ہے، عام اہل جنت

کی طرح ان کو بھی جنت میں داخل کیا جائے گا۔

تیسرا مسلک یہ ہے کہ عامل اور غیر عامل کا فرق قائم رکھنے کے لئے وہ اہل جنت کے خدمت گار بنائے جائیں گے۔

چوتھا مسلک یہ ہے کہ جس طرح عمل کفر کے بغیر دخول جہنم مرتب نہیں ہوا اسی طرح عمل ایمان کے بغیر دخول جنت بھی مرتب نہ ہو گا۔ کہ طفولیت کا ایمان بھی معتبر نہیں۔ لہذا درمیانی ایسے مقام پر رکھے جائیں گے جہاں نہ تنعم والتذاذ ہو گا نہ کلفت و تاذّی۔

پانچواں مسلک یہ ہے جو شیخ ممدوح کا ظاہر ہوا کہ علم الٰہی کے موافق حکم دائر ہو گا۔ یعنی اگر بڑے ہو کر حسب علم الٰہی ایمان لانے والے تھے تو جنت میں بھیجدیے جائیں گے۔ اور اگر بڑے ہو کر حسب علم الٰہی کفر کرنے والے تھے تو جہنم میں بھیجدیے جائیں گے۔ اس پر یہ اعتراض کہ عمل کے بغیر سزا دینا ظلم ہے بالکل غلط ہے اس لئے کہ اپنی مِلک میں تصرف کرنا ظلم ہی نہیں کہلاتا۔ انسان اپنی عارضی مِلک میں جو چاہتا ہے تصرف کرتا اور مکان کے جس حصہ میں چاہتا پاخانہ تعمیر کرتا اور اپنے باغ کے جس درخت کو چاہتا ہے کاٹ کر سوختہ بناتا اور چولھے میں جلاتا ہے۔ پھر حقیقی مِلک بلکہ تخلیق مِلک و ایجاد میں کِس کا منہ ہے کہ کوئی کہہ سکے حق تعالیٰ اس کی کس خطا پر اس کو جلا رہا ہے۔ اس میں ظلم کا شائبہ بھی ہو تو ہر جانور کی تخلیق پر بھی شبہ عاید کیا جا سکتا ہے کہ گدھے اور خنزیر کو کس خطا میں گدھا اور خنزیر بنایا اور آدمی نہ بنایا۔ بلکہ ہر انسان کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ محکوم رعایا کیوں بنایا حاکم پادشاہ کیوں نہ بنایا، اور دنیا دار المحن میں کیوں اُتارا، بلا عمل کے جنت میں کیوں نہ بھیجدیا۔ غرض خلاق و شاہنشاہ اور ملیک مقتدر کے تصرفات میں مزاحمت گویا اس کے شاہنشاہانہ اقتدار کو محدود کرنا ہے لَا يُسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُوْنَ ٥ ہاں اس کے لطف و کرم اور اِنّ رحمتی سبقت علی غضبی پر نظر کرتے ہوئے رجحان اس طرف ہوتا ہے کہ شاید عمل کفر کے بغیر جہنم میں کوئی نہ جاوے۔ کیونکہ خود اسکے تجویز کردہ قانون وما کنّا معذّبین حتّٰی نبعث رسولا کا بظاہر مقتضیٰ یہی ہے۔ اس صورت میں حضرت ممدوح نے اس عورت کا جو قصہ بیان فرمایا اوّل تو حجت نہیں کہ کشف ہے جو نص کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ دوم صرف ایک عورت کا قصہ ہے۔ حالانکہ لاکھوں بچے مشرکین کے بحالت طفولیت مر چکے ہیں اس لئے لاکھوں عورتیں اپنے بچوں کو کمر پر لادے جہنم میں نظر آنی چاہئیں پس ممکن ہے یہ بچہ مستثنیات میں ہو کہ حسب علم الٰہی دخول جہنم کا اقتدار اور مالکانہ تصرف اس پر ظاہر فرمایا گیا ہو۔ سوم خود جامع کتاب کہتے ہیں کہ میں دریافت نہ کر سکا یہ بچہ دنیا میں اس کے بطن سے پیدا شدہ تھا جو بچپن میں مر گیا تھا، یا جہنم ہی میں بصورت عذاب اس کی ولادت ہوئی تھی۔ کہ ماں کو اپنی ذاتی تکلیف کے ساتھ

بچہ کی تشنگی و گرسنگی اور ہر قسم کی تکلیف کا جداگانہ درد و الم پہونچے اور ایک نوع عذاب پر اس دوسری نوع عذاب کا اضافہ ہو۔ کیونکہ دوزخ تمامی انواع عذاب و کلفت کا گھر ہے۔ لہٰذا اس نوع عذاب یعنی بچہ کی تکلیف کے سوہان روح سے بھی خالی نہ ہونی چاہیئے۔ پس مشتبہ حالت سے جبکہ احتمال ہے جہنمی ولادت کا بھی یہ علماء کا معرکۃ الآراء مختلف فیہ مسئلہ کہ کفار کے بچے جہنم میں جائیں گے ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ خود حضرت ممدوح ہی کا قول ثابت نہیں ہوا کہ وہ اس کو دینوی ولد کا فر قرار دیکر جہنمی بتا رہے ہیں۔ چہارم جن علماء کا مسلک یہ ہے کہ والدین کے تبعاً یا حسب علم الٰہی کفار کے بچے جہنم میں جائیں گے غالباً اس کا مفہوم یہ ہے کہ ان کو دیگر جہنمیوں کی طرح بڑا اور جوان بنا کر جہنم میں ڈالا جائے گا۔ نہ یہ کہ وہ بحالت طفولیت اور اسی عمر میں رکھ کر جہنم میں ڈالے جائیں گے جس عمر میں ان کا انتقال ہوا تھا۔ اس لئے کہ بچہ کو تکلیف کا احساس و شعور کم بلکہ بہت کم ہوتا ہے۔ بچہ جتنا بڑھتا ہے اسی قدر اس کا احساس اور شعور و ادراک بھی بڑھتا ہے۔ پس اگر کفر کی سزا دینی ہے تو تکلیف کا کامل شعور و ادراک ہونا چاہیئے۔ اور جب حس و شعور ہی نہیں یا بہت کم ہے تو نہ سزا ہے نہ تکلیف۔ اور یہ بچہ جس کو ماں کمر پر لادے ہوئے تھی ابھی نو عمری و طفولیت میں تھا اس لئے اس کے متعلق یہ کہنا کہ ماں کے تبعاً کافر قرار پا کر جہنمی ہوا ہے اس مبحث ہی میں داخل نہیں ہے جس میں علماء کا اختلاف ہو رہا ہے۔ پنجم حضرت خضر علیہ السلام کے قتل کردہ بچہ پر اس کو قیاس کرنا صحیح نہیں کہ اوّل تو اُسی مقتول کے جہنمی ہونے کا ثبوت نہیں۔ ممکن ہے وہ بھی جنت میں جائے اور اسی اختلافی حکم کا اسپر ترتب ہو۔ دوم علماء کا اس کو مجبول علی الکفر کہنے کا مطلب صرف حضرت خضر علیہ السلام سے اس الزام کا اُٹھانا ہے کہ انہوں نے باوجود نبی یا ولی کامل ہونے کے بیگناہ معصوم کو کیسے قتل کر دیا۔ سو اس کی توجیہ ہو گئی کہ علم الٰہی میں چونکہ یہ تھا کہ بڑا ہو کر کفر کریگا اور غالب تھا کہ مادری و پدری شفقت کی بنا پر اپنے دیندار والدین کو بھی کافر بنا چھوڑے، لہٰذا اپنے اس علم ازلی سے حق تعالیٰ نے حضرت خضر علیہ السلام کو مطلع فرما کر اس کے قتل کا مامور بنا دیا اور اس لئے وہ قتل فساد و ظلم نہ ہوا بلکہ عین اصلاح و احسان ہوا۔ اُخروی نتیجہ کے متعلق اس میں کوئی بحث نہیں کہ جنتی ہو گا یا دوزخی سوم ممکن ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے اس فعل کو جہاں حق تعالیٰ نے والدین پر احسان بنایا کہ وہ کفر سے محفوظ رہے وہیں خود اس مقتول کے لئے بھی انعام بنایا ہو کہ بڑا ہو کر کفر کرتا تو جہنم میں جاتا اور اب بچپن میں مقتول ہو کر سزا سے بچ گیا اور دخول جہنم سے محفوظ ہو گیا۔ بہر حال حضرت ممدوح کے کسی قول سے کوئی ایسی بات محقق نہیں ہوئی جس کی بنا پر علماء کے دیگر اقوال کو مسترد کیا جا سکے۔ رہے بچوں کے زمرۂ حفاظ و علماء و اولیاء میں محشور ہونے کے واقعات سو یہ مقتضاء کرم الٰہی ہیں اور

منجملہ اُن انعامات مخصوصہ کے ہیں جو بطفیل محبوبیت محمدیہ حق تعالیٰ نے اُس اُمت مرحومہ پر مبذول فرمائے کہ جس طرح امت محمدیہ کے لئے عزم فعل بلکہ نیت پر بھی قبل از صدور عمل کا ثواب مرتب فرمادیا

اسی طرح اپنے علم ازلی پر اعمال مقدرہ کو

اعمال صادر بنا کر حشر کے میدان میں ظاہر فرمادیا۔ اس سے تعذیبی صورت کا استدلال کہ اسی نوع پر سزائے جہنم بھی مرتب ہوگی، میرے نزدیک قیاس الفارق ہے۔

چھٹا مسلک اس مبحث میں سکوت وخاموشی کا ہے کہ نصوص اس بارہ میں مختلف ہیں اور اس اختلاف میں راز بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود اس بارہ میں عدالت عالیہ کے قطعی فیصلہ کا عوام پر اظہار پسند فرماتے۔ کیا ضرورت ہے کہ اخروی شاہنشاہی فیصلے بھی دنیا میں ہر بشر کو معلوم ہو جاویں۔ لہٰذا یہی مسلک احوط اور مقتضائے آداب الوہیت معلوم ہوتا ہے کہ کوئی حتمی رائے قائم نہ کی جائے۔ اس کا اعتقاد ضرور رکھا جائے کہ حق تعالیٰ مالک الملک والملکوت کو لاریب حق ہے کہ اپنے علم ازلی کے موافق بلا صدور اعمال بھی جزا وسزا مرتب فرمائے اور یہ بھی عین عدل ہوگا کیونکہ اس بارگاہ میں ظلم کی ماہیت وحقیقت کا تحقق ہی محال ہے۔ باقی یہ امر کہ وقوع کس صورت کا ہوگا یعنی عدل کا یا لطف وکرم کا سووہ جانے اس کا کام یفعل مایشاء ویحکم مایرید کسی کو کیا معلوم ہی کرنا ہے تو اس کا وقت بھی قریب آلگا ہے مشاہدہ سے خود معلوم ہوجائے گا ؎

کار کن کار بگذار از گفتار		کاندریں راہ کار آید کار	

اس کی بہ نسبت کہ تفتیش وکرید کی جائے مرنے والے بچے کہاں جائیں گے زیادہ ضروری واہم یہ ہے کہ اپنی فکر کی جائے۔ ع تجھ کو کسی کی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

نیز آپ نے فرمایا کہ مالک علیہ السلام کو کہ جہنم کے داروغہ ہیں جس کا بھی دوزخ پر گذر ہوگا خواہ مومن ہو یا کافر ہر شخص دیکھے گا (کہ پل صراط کو عبور کرتے ہوئے جہنم پر مومنین کا بھی گذر ہوگا) مگر مومن تو ان کو دیکھ کر معلوم کرے گا کہ ان کی تخلیق مومنین کے ستر ایمان سے ہوئی ہے (اور وہ اللہ کے معصوم فرشتہ اور مقبول بندہ ہیں) اس لئے دہشت نہ کھائے گا۔ لیکن کافر ان کو دیکھتے ہی رعب کی وجہ سے دم فنا ہوجائے گا (اور گو مرے گا نہیں مگر مرنے سے بدتر اور مدہوش بن جائے گا)

نیز فرمایا کہ دوزخ میں ادنیٰ سے ادنیٰ کافر کے لئے بھی (جس کا عذاب سب میں ہلکا ہوگا) دنیا اور اس جیسی دس دنیا کی برابر وسیع حصہ دیا جائے گا (جو عذاب سے لبریز ہوگا)

میں نے عرض کیا کہ پھر کافر کے لئے تنگی کا کیا مطلب؟

فرمایا چار طرف سے عذاب اس کو محیط ہوگا اس لئے آگ کے شکنجہ میں دبے ہوئے شخص کی طرح تنگی بھی بحالہ رہے گی)

میں نے کہا کہ ایک شخص اپنے وسیع گھر میں ہو اور شب و روز اس کو زدوکوب کیا جائے تاہم اس کو وسعت کا علم ہوکر ایک قسم کی راحت ملتی ہے اور اس کا قلق و اضطراب اس درجہ کا نہیں ہوتا جیسے کسی کو تنگ مکان میں (جہاں ہاتھ پاؤں بھی نہ پھیلا سکے) مثلاً نیزہ کی انی سے رات دن چھیدا جائے۔

حضرت نے فرمایا اس کی وجہ تو یہ ہے کہ ہوا اس پر عذاب ہی نہیں ہے (بلکہ دیواریں سبب تکلیف بنی ہوئی ہیں۔ اس لئے دیواریں جتنی دور ہیں اتنی تکلیف کم ہے اور دیواریں جتنی قریب ہیں اسی قدر تکلیف زیادہ ہے۔ اور اسی کا نام تنگی و ضیق ہے) برخلاف جہنم کے کہ اس کی تو ہوا ہی (جو چار طرف بدن کو چپٹی ہوئی ہے) خالص عذاب ہے۔ لہٰذا وہ ظاہراً بھی مبتلائے عذاب ہے (کہ شکنجہ کی طرح گویا آگ کی دیواروں میں بھچا ہوا ہے) اور باطناً بھی مبتلائے عذاب ہے (کہ اندرون کا ریشہ ریشہ جل اور جھلس رہا ہے اور دنیا سے دس گنا وسیع میدان سارا اسی عذاب سے لبریز ہے) اُس میں اس کے تڑپنے کی یہ حالت ہوگی جیسے مرغی کو ذبح کرکے ڈالدیا جائے اور تڑپتی پھرے (کہ کھلا میدان اس کے لئے بیحد تنگ اور جانکنی کی تکلیف میں تڑپنے کے لئے ایک ناقابل بیان ضیق ہے) غرض (کبھی مرغ نیم بسمل کی طرح تڑپیں گے اور) کبھی ہائے واویلا مچائیں گے اور چیخیں چلائیں گے۔ اور چلانے کا ان کے یہ عالم ہوگا کہ اگر کسی مومن کا اس حالت میں ان پر گذر ہو جائے اور وہ ان کی چیخ پکار کو سن پائے تو اس کے حواس معطل ہو جائیں۔ (اور دنیا میں تو چیخنے چلانے سے پھر کچھ آرام مل جاتا اور بھاپ نکل کر تکلیف ہلکی پڑ جاتی ہے) مگر اہل جہنم کی تکلیف میں تو اس سے (بجائے کمی کے) اضافہ ہی ہوگا۔ کیونکہ ان کی ہائے واویلا سے آگ کی قوت اور سوزش و تپش بڑھ جائے گی۔ اور ایسی مثال ہوگی جیسے انگیٹھی میں سلگتی ہوئی لکڑیوں کے انگارے اور راکھ کو جھاڑ دیا جائے تو آگ لکڑیوں میں زیادہ بھڑک جاتی اور ان کی آنچ تیز ہو جاتی ہے۔ واللہ اعلم

نیز آپ نے فرمایا کہ جہنم میں (چھوٹے بڑے) مکانات بھی ہیں، (اونچے اونچے) محلات بھی ہیں، (ان کے) دروازے بھی ہیں، درخت بھی ہیں، ندیاں اور نالے بھی ہیں، جیسے دنیا کے عام شہروں میں ہوا کرتے ہیں (مگر سب مجسم عذاب ہیں کہ) جس چیز کے جس حصہ اور جس جزو کو بھی لوگے خالص آگ اور محض عذاب پاؤ گے۔ مکانات و محلات اور اشجار و ندیاں وغیرہ سب آگ ہی آگ ہوں گے کہ اگر اس کا ایک پتنگا بھی عالم دنیا میں اُتر آئے تو اس کنارہ سے لے کر اس کنارہ تک تمامی دنیا کو جلا پھونک کر خاکستر بنا دے۔

نیز فرمایا کہ بندہ عالم دنیا میں اعمال بد کرتا ہے تو جہنم میں اس کے لئے (آگ کے) محل تعمیر ہوتے رہتے

ہیں۔ مگر جب ان اعمال بد سے توبہ کر لیتا یا کوئی ایسا نیک عمل کرتا ہے جسے حق تعالیٰ نے قبول فرمالیا تو وہ محل جو اس کے لئے جہنم میں تعمیر کئے گئے تھے منہدم و معدوم ہو جاتے ہیں، اور ان کی جگہ جنت میں اس کے لئے محل تعمیر کر دئے جاتے ہیں۔

اس کے بعد آپ نے ایک قصہ نقل فرمایا کہ ایک مومنہ حاملہ تھی اور اس کے پیٹ میں جو بچہ تھا وہ غوث زمانہ بننے والا تھا۔ اس کے پڑوس میں ایک شادی کی تقریب ہوئی اور یہ بھی بغرض تفریح دولہن کے گھر چلی گئی۔ اتفاق سے دولہن کا کوئی قیمتی زیور کسی نے چرا لیا۔ اہل خانہ نے اس بے خطا حاملہ کو الزام لگا کر پکڑ لیا اور گھر جانے سے روک دیا کہ (جب تک چیز نہ دے گی گھر واپس نہ جانے دیں گے) اس کا شوہر ایک شریف شخص تھا جسے یہ بھی گوارا نہ تھا کہ بیوی اپنے دروازہ مکان پر کھڑی ہو چہ جائیکہ پڑوس میں کسی کے گھر جانا۔ پھر غیرت مند بھی بہت تھا (بیوی پر چوری کا دھبہ مر جانے سے بدتر تھا) اس لئے خوف ہوا کہ خاوند کو جب خبر ہوگی کہ گھر سے باہر نکلی تھی تو مجھ پر کیا آفت لوٹے گی۔ چہ جائیکہ چوری کا میری طرف انتساب، اور چہ جائیکہ اس میں پکڑا جانا اور محبوس و قید ہو جانا۔ ان طرح طرح کے خطرات سے اس کو اپنے خاوند کا خوف انتہا بے انتہا اور ناقابل بیان لاحق ہوا کہ حمل کو نقصان پہونچا (اور گو اسقاط نہیں ہوا مگر حزن و خوف کے اندرونی صدمہ نے ریشہ ریشہ میں دوڑ کر جنین کو اذیت پہونچائی) اس لئے اس جھوٹا بہتان باندھنے والی عورت کے لئے جہنم میں کئی محل تعمیر کر دیئے گئے۔ اور وہ مدت دراز تک تعمیر شدہ باقی رہے۔ حتیٰ کہ وضع حمل ہوا اور بچہ (جو کہ اپنے زمانہ کا غوث ہونے والا تھا) بڑا ہو گیا۔ بچہ کی ماں کا بھی انتقال ہو گیا اور باپ بھی دنیا سے اُٹھ گیا۔ بالغ ہونے کے بعد انہوں نے نکاح کا ارادہ کیا (مگر مہر ادا کرنے کے لئے کچھ پاس نہ تھا) تب اسی عورت نے (جس نے ان کی والدہ کو چوری کا الزام لگایا تھا اور ان کو بحالت حمل اذیت پہونچائی تھی) ان کو اتنی رقم دی جو مہر کے لئے کافی ہو گئی۔ اس وقت حق تعالیٰ نے اس کے وہ محل جو جہنم میں تعمیر کئے گئے تھے معدوم فرما دیئے اور اس مالی خدمت کو اپنے فضل و کرم سے قبول فرما کر اس غلطی کو محو اور معاف فرما دیا جو اس نے بحالت حمل غوث وقت کے ساتھ کی تھی۔

نیز آپ نے فرمایا کہ بندہ جو بھی حرکت کرتا ہے حتیٰ کہ آگے چلنے کے لئے اپنا قدم اُٹھاتا یا پیچھے پھرنے کی قدم لوٹاتا ہے تو اس کے لئے یا تو محل تعمیر کیا جاتا ہے جنت میں (بشرطیکہ اس قدم نے طاعت میں حرکت کی تھی) اور یا محل تعمیر کیا جاتا ہے دوزخ میں (اگر قدم کی حرکت کسی معصیت میں ہوئی تھی) بحالت خواب اس کے پیٹ میں جو رگ بھی حرکت کرتی ہے اس پر یا محل تعمیر ہوتا ہے دوزخ میں اور یا محل تعمیر ہوتا ہے جنت میں۔ اور جب ان افعال میں یہ حال ہے جن کا صدور بندہ کے قصد و ارادہ سے نہیں ہوتا تو

کیا پوچھنا ان افعال کا جن کو بالقصد کرتا ہے جبکہ شریعت نے اس کی ممانعت کی ہے یا اس کے کرنے کا حکم دیا ہے۔

میں نے عرض کیا کہ غیر اختیاری افعال پر محلات کی تعمیر کیسی۔ بالخصوص اُن افعال پر جو سونے کی حالت میں صادر ہوں (جبکہ ان میں قصد و ارادہ کا مطلق دخل ہی نہیں)

فرمایا محلات کی تعمیر میں اعتبار اُس حالت کا ہے جو قصد و ارادہ کی صورت میں انسان کا مرجع بنتی ہے (یعنی یہ دیکھا جائے گا کہ اگر یہ فعل بالقصد اور بالارادہ کرتا تو اس وقت وہ کس حالت میں ہوتا) کیونکہ محلات کی تعمیر کا حقیقی سبب وہی ہے۔ پس کافر کی وہ حالت ظاہر ہے کہ بالقصد صدور فعل کے وقت بھی کفر و تمرد کی حالت ہوتی۔ لہٰذا اس کے لیے جہنم میں محل تعمیر ہوتے رہیں گے خواہ اس کے افعال قصداً صادر ہوں یا غفلت سے یا بحالت خواب۔ اور مومن کی وہ حالت ظاہر ہے کہ بالقصد صدور فعل کے وقت بھی ایمان ہی کی ہوتی لہٰذا اس کے لئے جنت میں محل طیار ہوتے رہیں گے خواہ اس کے افعال قصداً صادر ہوں یا غفلت سے یا بحالت خواب۔

ف اس تقریر کی شرح یہ ہے کہ فعل جس طرح اپنے سبب قریب کی طرف منسوب ہوتا ہے اسی طرح سبب بعید کی طرف بھی منسوب ہوتا ہے جبکہ وہی سبب اصلی ہو۔ مثلاً ایک شخص نے قاتل کو اُبھارا اور آمادہ کیا کسی بے گناہ کے قتل پر۔ تو جس طرح فعل قتل سبب قریب یعنی قاتل کی طرف منسوب ہوگا اسی طرح سبب بعید یعنی قتل پر اُبھارنے والے کی طرف بھی منسوب ہوگا۔ بشرطیکہ یہ اُبھارنا ہی قتل قاتل کا سبب بنا ہو۔ کہ اگر یہ نہ اُبھارتا تو وہ قتل نہ کرتا۔ لہٰذا دونوں جرم میں مساوی بلکہ اُبھارنے والا اصل قاتل سمجھا جائے گا اگرچہ صدور قتل کے وقت پڑا سوتا ہی کیوں نہ ہو۔ یہی نوعیت کافر اور مومن کے افعال کی ہے کہ اُن کا صدور اگرچہ قصد اور ارادہ سے ہوتا ہے اور قصد و ارادہ ہی اعمال کے لئے سبب قریب ہے مگر قصد پیدا کرنے والی شے جو سکون کے ساتھ بیٹھے ہوئے ارادہ کو ابھارتی اور ارتکاب فعل پر آمادہ کرتی ہے وہ ان کی طبیعت اصلیہ اور مادّہ طبعیہ ہے کہ کافر کی طبیعت میں چونکہ حق تعالیٰ سے عناد و بغض بھرا ہوا ہے اس لئے اس کا ہر فعل خواہ بالقصد ہو یا باقتضاء طبیعت بلا قصد وہ بغض و عناد ہی کا ہوگا اور مومن کی طبیعت میں چونکہ اللہ و رسول کی محبت بھری ہوئی ہے اس لئے اس کا ہر فعل خواہ بالقصد ہو یا بلا قصد باقتضاء طبیعت اللہ و رسول کی محبت اور خلوص ہی کا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ منافقین کا نماز روزہ بھی معصیت میں داخل ہے اور اس کو خداع اور دھوکا قرار دیکر ان پر جرم عائد کیا گیا ہے

کیونکہ ان کی طبیعت کفریہ نے جو کہ اس قصد صوم و صلوٰۃ کا سبب اصلی ہے اُن افعال حسنہ کو عین سیئہ بنا دیا ہے۔ اور مومنین کی اکثر سیئات بھی مبدل بہ حسنات کر دی گئی ہیں۔ اس لئے کہ گو قصد و ارادہ نے غلطی کھائی مگر مادہ طبعیہ نے اس کو حسنہ بنا رکھا ہے۔ جب طبیعت اصلیہ قصد و ارادہ کو معطل اور مبدل الحال بنا دیتی ہے تو بلا قصد فعل پر مادہ طبیعت کا اثر پڑنا کیا بعید ہے حدیث میں ہے من سن سنۃ حسنۃ فلہ اجرھا و اجر من عمل بھا الخ جو شخص کوئی نیک ڈگر ڈال جاتا ہے تو اس پر جو کوئی بھی عمل کرے گا سب کا ثواب اس کو ملے گا اور اسی طرح جو کوئی بُری ڈگر ڈال جائے اس پر جتنے بھی عمل کرنے والے ہوں گے سب کا مجموعی گناہ اس پر بھی ہو گا۔ اس کا سبب یہی ہے کہ دوسروں کے عمل کرنے میں حالانکہ اس کے قصد و ارادہ کا کوئی دخل نہیں مگر سب کے عمل کی جڑ چونکہ اسی کی قائم کی ہوئی ہے اس لئے سبب بعید کہ اصل سبب درحقیقت وہی ہے، اس کا سبب بن گیا کہ گویا تمامی اعمال اسی نے کئے۔

انسان رفاہ عام کے لئے نہر جاری کر جاتا ہے۔ حالانکہ قبر میں جا سویا ہے اور قصد و ارادہ تو کیا معنی اس کو علم بھی نہیں کہ کون اس سے نفع اٹھا رہا اور آبپاشی کر رہا یا پانی پی رہا ہے۔ مگر اس کے نامۂ اعمال میں جب تک نہر قائم ہے برابر اجر لکھا جائے گا۔ اس لئے کہ انتفاع خلق کی اصل یہی نہر ہے جو اُس نے گھدوائی اور جاری کی ہے۔ غرض ایمان اور کفر انسان کا فعل اختیاری ہے اس لئے جو افعال اس سے بلا قصد بھی صادر ہوں گے چونکہ ان کا محرک یہی کفر و ایمان ہے اس لئے سب اختیاری افعال کی طرح مستحق جزا و سزا ہوں گے۔ جیسے کوئی شخص سنکھیا کھالے اور مر جائے تو گو جان کنی اور نزع روح میں اس کے قصد و اختیار کا بالکل دخل نہیں ہے مگر جس پر جان کنی مرتب ہوئی ہے یعنی سنکھیا کھانا وہ تو اس کے قصد و اختیار سے ہوا ہے لہٰذا خودکشی کا مجرم قرار دیا جائے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حکم کا ترتب مادہ اصلیہ پر ہوتا ہے اس لئے مومن کی بیداری تو طاعت ہے ہی۔ حالت خواب بھی طاعت میں داخل ہے، اور اس کا ہر فعلِ مباح پر عمل بھی حسنہ میں شمار ہے۔ اور کافر کی بیداری تو کفر و طغیان ہے ہی، حالت خواب بھی معصیت میں داخل ہے اور اس کا مباح پر عمل بھی سیئہ میں شمار ہے۔ کیونکہ یہ مباح کا استعمال بحکم خدا و رسول نہیں کر رہا بلکہ اپنی اُس گندی طبیعت کے اقتضا سے کر رہا ہے جو اللہ و رسولؐ سے آزاد اور بالکل بے تعلق ہے۔ پس ہر شخص کا ہر فعل اپنے محرک حقیقی کا حکم لے گا اور وہ اس کی طبیعت یعنی کفر ہے یا ایمان۔ واللہ اعلم۔

اسی نفیس بحث پر یہ اختلافی مسئلہ متفرع ہوگا کہ مباح افعال مثلاً کھانا پینا وغیرہ کفار کے لئے بھی مباح ہیں (کہ ان پر ان کو سزا نہ ملے گی) یا ان کے لئے مباح نہیں (اور ان پر بھی ان کو دیگر معاصی کی طرح سزا ملے گی) چنانچہ ایک گروہ علماء کا مسلک یہی ہے کہ اباحت بھی چونکہ ایک شرعی حکم ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے خطاب بن کر ہم تک پہونچا ہے اس لئے کافروں کے لئے کوئی مباح مباح نہیں ہے اس لئے کہ انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اقرار نہیں کیا اور اپنے آپ کو تحت شریعت محمدیہ داخل نہیں سمجھا۔ لہٰذا وہ اباحت شرعیہ کے تحت میں ہی داخل نہیں ہوئے۔ اور کوئی مباح شے ان کے لئے مباح نہیں ہوئی) علماء محققین مثلاً تقی الدین سبکی وغیرہ کا یہی مذہب ہے اور ہمارے نزدیک بھی صحیح وصواب یہی معلوم ہوتا ہے۔ اس بنا پر کفار کے تمامی افعال (حتیٰ کہ خور و نوش بول براز نشست و برخاست وغیرہ سب) معاصی اور سیئات ہوتے۔ واللہ اعلم۔

ف مشہور حدیث ہے من قال لا الٰہ الا اللہ دخل الجنۃ جس نے بھی لا الٰہ الا اللہ کہہ لیا وہ جنت میں جائے گا۔ اس پر یہ شبہ وارد ہوتا ہے کہ یہودی اور عیسائی بھی توحید کے قائل ہیں۔ بلکہ بعض ہندو بھی موحد بن جاتے ہیں تو چاہئے کہ اس حدیث کی رو سے وہ سب جنتی ہوں۔ تقریر سابق سے اس کا جواب واضح ہوگیا کہ شریعت محمدیہ چونکہ ناسخ الشرائع ہے اور دین عیسوی وموسوی غرض تمامی ادیان و مذاہب اس سے منسوخ ہو چکے اس لئے اگر کوئی شخص اب دَورِ شریعت محمدیہ میں بحکم سیدنا موسیٰ وسیدنا عیسیٰ علیہما السلام بھی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کہے گا تو وہ مقبول نہ ہوگا۔ چہ جائیکہ باقتضاء عقل وفہم یا بتقاضاء طبیعت اگر کوئی اس کلمہ توحید کا قائل ہو تو وہ کیسے معتبر ہو سکتا ہے۔

نیز دوسرا شبہ کہ دخول جنت کے لئے صرف توحید کافی ہے اقرار رسالت کی ضرورت نہیں۔ وہ بھی اس سے دفع ہوگیا کہ جب کلمۂ توحید پڑھنا وہی معتبر ہے جو سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں اور آپ کے ارشاد قولوا لا الٰہ الا اللہ کے امتثال کی نیت سے ہو تو اس سے اقرار رسالت خود لازم آگیا۔ بلکہ شرط لاینفک بن کر لازم آگیا۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت کا اقرار خود مقتضی ہے کہ اللہ کو سچا اور حاکم مختار سمجھا جائے اور خود اس کا ارشاد ہے محمد رسول اللہ نیز اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول اور امنوا بالنور الذی انزلنا پس جب رسالت محمدیہ کا اقرار نہ کیا اور آپکے حکم قولوا لا الٰہ الا اللہ کی اطاعت میں کلمۂ توحید نہ پڑھا۔ بلکہ منسوخ دین کے حکم کو بحال سمجھ کر اسکی تعمیل حکم میں یا بتقاضاء عقل وطبع کلمۂ توحید پڑھا تو درحقیقت اللہ کو اللہ نہ سمجھا اور اس کے حکم کی اطاعت نہ کی۔ لہٰذا اس کا لا الٰہ الا اللہ پڑھنا محض نقالی اور طبعی فعل ہوا۔ یہ توحید درحقیقت توحید نہ ہوئی اور وہ بدستور کافر بنا رہا۔ واللہ اعلم

نیز حضرت نے فرمایا اگر جنت اور جہنم پر نظر ڈالو اور ان کے محلات اور باغات پر نظر ڈالو تو آخرت کی اِن نعمتوں اور کلفتوں میں اور بندوں کے اُن اعمال میں جو دنیا کے اندر وہ کر رہے ہیں ایک ربط اور خاص تعلق پاؤ گے کہ جس درجہ کا اعمال میں حسن و قبح ہوتا ہے اُسی درجہ کی شدت و کمی نعمائے جنت اور عذابہائے جہنم میں پیدا ہوتی ہے)

اس کے بعد آپ نے ایک قصہ نقل فرمایا کہ ایک اہل مشاہدہ ولی نے ایک مومن کے قصر جنت پر نظر ڈالی جو ابھی بقید حیات تھے تو اُس میں ان کو ایک نعمت نظر آئی جو بڑھو تری کی طرف حرکت کر رہی تھی۔ جیسے انگور کا درخت جب اس درجہ پر پہونچتا ہے کہ اس میں عرق اور مٹھاس پیدا ہو تو ترقی کی طرف حرکت کیا کرتا اور (چاہتا ہے کہ ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہو) پھر اس کے بعد اُس ولی نے اس مومن پر نظر ڈالی جس کا یہ قصر تھا تو دیکھا کہ وہ اپنی دکان پر بیٹھا ہے اور کپڑا فروخت کر رہا ہے۔ دفعۃً اس کی طبیعت میں ایک حرکت پیدا ہوئی اور وہ گھبرا کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا۔ دکان بند کر کے قفل لگایا اور اپنے گھر پہونچا۔ (کسی تہوار وغیرہ کا دن تھا جس میں لوگ عمدہ کھانے پکانے اور خرچ کرنے کے عادی تھے) اُس نے گھر آکر اپنی بیوی سے کہا کہ آج کھانے پینے کا دن ہے اور ہمارے پڑوسی (غریب و نادار ہیں) ان کے پاس کچھ نہیں ہے اس لئے اٹھو اور ہمارے لئے بھی کھانا طیار کرو اور ہماری غریب پڑوسن کے لئے بھی۔ صورت حال یہ تھی کہ اس کے پڑوس میں ایک محتاج عورت رہتی تھی جس کی کئی لڑکیاں تھیں (اور سوت کاتنے پر اُن کا گذران تھا) عورت نے اپنی لڑکیوں کو تاکید کی کہ جلدی جلدی سوت کات لو تاکہ سویرے فراغت ہو جائے تو دن ہی میں اس کو بیچکر کھانے کا ضروری سامان خرید لیا جائے اور دوسروں کو کھاتا پیتا دیکھ کر بچیوں کی نیت نہ بھٹکے (چاہے رُوکھا سوکھا ہی سہی مگر جب پیٹ بھرا ہوگا تو دوسروں کے کھانے پر حرص وطمع کی نگاہ نہ پڑے گی) غرض بیوی اپنے شوہر کی رائے کو پسند کرتی ہوئی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ شوہر اس کو یہ تاکید کر کے کہ جلد پکاؤ اور خوب اچھا کھانا پکاؤ خود دو بادیئے لیکر بازار کی طرف روانہ ہوا اور ان کو دودھ سے لبریز کر کے گھر واپس آیا۔ جب بیوی نے کھانا طیار کر دیا تو شوہر نے اس کو نصفا نصف کیا۔ ایک حصہ تو اپنے لئے رکھا اور دوسرا حصہ ایک سینی میں رکھ کر خود اُٹھایا اور دودھ کے ایک بادیئے سمیت اپنی پڑوسن کے دروازہ پر آیا۔ لڑکیاں بڑے جد وجہد کے ساتھ سوت کاتنے میں مشغول تھیں اور سب خالی پیٹ اور بھوکی تھیں۔ دفعۃً انھوں نے سنا دروازہ پر کوئی دستک دے رہا ہے۔ دیکھا تو ایک شخص کھانا لئے کھڑا ہے اور کہہ رہا ہے کہ مجھے معلوم ہے تمہاری آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں اور آج کھانے پینے کا دن ہے اس لئے بقدر کفایت کھانا لے آیا ہوں اس کو

قبول کرو۔ اور لو یہ دودھ بھی اس کے ساتھ ہے۔ لڑکیاں بیحد خوش ہوئیں اور کھانا لے لیا۔ وہ شخص تو چلا گیا اور اُن سب نے کھانا کھا کر اور دودھ پی کر اُس کے لئے دعا مانگی کہ اللہ اس کے صدقہ کو قبول فرمائے اور اجر جزیل بخشے۔

اس وقت ولی نے جنت کی اُس نعمت پر پھر نظر ڈالی جس نے بڑھوتری کی طرف حرکت کی تھی تو دیکھا کہ وہ بڑھ گئی ہے اور اتنی بیرون نبیان حالت کی طرف منتقل ہو گئی ہے جس کی توصیف سے زبان قاصر ہے۔ جنت میں تو یہ ہوا مگر اس مومن کو اس کی کچھ خبر بھی نہ ہوئی۔ یہ ہے اللہ کا فضل و کرم کہ جس نعمت سے بندہ کو نوازنا چاہتا ہے اس کی حرکت اس کے قلب میں ڈال دیتا اور پھر عمل کی توفیق بخشتا اور اس کو زیادتی نعمت کا سبب قرار دے دیتا) ہے۔

ایک دن حضرت کے سامنے ایک شخص کا تذکرہ آگیا جو نہایت ظالم اور سنگدل تھا کہ لوگ اس سے بیحد تنگ اور بیزار تھے۔ میں نے عرض کیا حضرت بددعا فرما دیں (کہ حق تعالیٰ اُسے موت دے تاکہ مخلوق کو امن نصیب ہو)

فرمایا ہنوز اس کے محل جہنم میں پورے نہیں ہوئے اور ابھی بہت محل باقی ہیں جن کے پورے ہونے سے قبل اس کو موت نہیں آئے گی۔ چنانچہ حضرت ممدوح کا وصال بھی ہو لیا مگر وہ شخص اب تک زندہ ہے (اور اپنے جہنمی محلات کی تکمیل میں بیمانہ ظلم لبریز کر رہا ہے) ایک ظالم جبّار کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کیا جو کہ اپنے عہدہ سے برخاست کر دیا گیا تھا اور لوگ اس کے معزول ہو جانے سے بیحد خوش تھے (کہ اُس کے مظالم سے پناہ ملی) تو حضرت نے فرمایا واہ میاں ابھی اس کا نصاب پُورا کہاں ہوا ہے۔ چنانچہ وہ پھر اپنے عہدہ پر بحال ہو گیا اور اس وقت تک کہ رمضان ۱۳۳۶ھ کا آخری دن ہے بقید حیات (اور مشغول ظلم و تعدّی) ہے۔

نیز ارواح حیوانات کے متعلق آپ نے فرمایا کہ جانوروں کے لئے نہ ثواب ہے نہ عذاب۔ مگر بعض جانور اہل جہنّم کے لئے عذاب بن کر جہنم میں ہوں گے اور بعض جانور اہل جنت کے لئے نعمت بن کر جنت میں ہوں گے۔ چنانچہ کتّے، بھیڑیئے اور دیگر درندے یا قبیح جانور اگر دنیا میں کافروں کے ساتھ رہتے اور وہ ان کو پالتے اور ان کے ساتھ اُنسیت رکھتے) تھے تو وہ (اپنے مالک و مُربّی کے ساتھ) جہنم میں ہوں گے۔ (کہ ان کو کاٹیں اور پھاڑیں گے) اور اگر ان کے ساتھ نہیں رہتے تھے تو جہنم میں نہ جائیں گے۔ (بلکہ مٹی بنا دئے جائیں گے)

عیدالاضحیٰ کا دن تھا کہ آپ نے فرمایا آج کے دن قربانیوں کی ارواح قبض کرنے کے لئے خاص فرشتے

اُترتے ہیں اور ہر قصبہ ہر شہر اور ہر جگہ کا جہاں بھی عید کی قربانی کی جاتی ہے گشت لگاتے ہیں۔ آج کے دن کے سوا زمین پر انکا نزول کبھی نہیں ہوتا۔ پس جب قربانی کا جانور ذبح کیا جاتا ہے تو اس کی روح کو لیکر یا جنت کی طرف جاتے ہیں یا جہنم کی طرف۔ اگر قربانی کرنے والے کی نیت مستحسن اور خالص لوجہ اللہ ہوتی ہے تو قربانی کرنے میں نہ تفاخر ہے نہ بڑائی، نہ نمود ہے نہ طلبِ شہرت۔ تب اس کی قربانی روح کو اس کے جنتی محلات کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ منجملہ نعمائے جنت کے اس کے لئے ایک نعمت بن جاتی ہے اور اگر قربانی کرنے والے کی نیت اس کے برعکس اور فاسد ہوتی ہے تو اس کی قربانی رُوح کو جہنم کی طرف لے جاتے ہیں اور وہ اس کے لئے منجملہ عذابہائے جہنم کے ایک عذاب بن جاتی ہے کہ اسی صورت کا اُون اور سینگوں سمیت کھال بدن والا مینڈھا (یا جو جانور بھی قربانی کیا ہے وہ) نظر آتا ہے۔ مگر مجسّم آگ ہوتا ہے کہ اس کا بال بال آگ ہے اس کے سینگ بھی آگ ہیں اور سر سے لے کر پاؤں تک سارا آگ ہے۔ نیز فرمایا کہ لوگوں سے اس کا تذکرہ کردو کیونکہ عوام کو اس اطلاع کی سخت ضرورت ہے۔ چنانچہ میں نے اکثر لوگوں کو یہ مضمون سُنا دیا۔

نیز آپ نے فرمایا کہ جنات کو جہنم میں آگ کا عذاب نہیں دیا جائے گا اس لئے کہ آگ تو ان کی طبیعت ہے (اور اسی سے ان کو پیدا کیا گیا ہے) لہذا اس سے ان کو تکلیف نہ ہو گی اس لئے اُن کو زمہریر اور انتہا درجہ کی خنکی کا عذاب دیا جائے گا کہ اس میں ٹھٹھر جائیں گے (دنیا میں بھی جنات سردی سے بیحد ڈرتے ہیں۔ چنانچہ موسم گرما میں (خوش رہتے اور) ہوا میں گھومتے ہیں۔ مگر ٹھنڈی ہوا کا اُن کو خطرہ لگا رہتا ہے۔ اگر اتفاق سے ٹھنڈی ہوا چل جائے تو ایسے (بدحواس ہو کر) بھاگتے ہیں جیسے جنگلی گدھے بھاگا کرتے ہیں۔ اور پانی کے اندر نہ تو جن داخل ہو سکتا ہے نہ شیطان۔ اگر کسی میں قدرت ہو کہ اُن کو پکڑ کر پانی میں ڈالدے تو بجھ کر ایسے فنا ہو جائیں گے جیسے انسان آگ میں گر کر فنا ہو جاتا ہے۔

ف حق تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ ۝ جہنم کے سات دروازے ہیں اور ہر دروازے کے لئے فریق معین ہے۔ یعنی دوزخ کے اُوپر نیچے سات طبقات ہیں کہ ہر طبقہ کا دروازہ جدا ہے اور ہر طبقہ خاص کفار کے لئے مخصوص ہے۔ چنانچہ مروی ہے کہ باب اسفل یعنی سب سے نیچے کا طبقہ فرعون اور اس کے اعوان وانصار کے لئے اور منافقین کے لئے ہے اور اس کا نام ھاویہ ہے۔ اس کے اُوپر دوسرا طبقہ مشرکین کے لئے ہے اور اس کا نام جحیم ہے اس سے اُوپر تیسرا طبقہ لامذہب فرقہ صابئین کے لئے ہے اور اس کا نام سقر ہے۔ اس سے اُوپر چوتھا طبقہ ابلیس اور اس کے تابعین کے لئے ہے اور اس کا نام لظیٰ ہے۔ اس سے اوپر پانچواں طبقہ یہود کے لئے ہے اور اس کا نام حطمہ ہے۔ اس سے اُوپر چھٹا طبقہ نصاریٰ کے لئے ہے اور اس کا نام سعیر ہے اس سے اوپر ساتواں طبقہ

عصاۃ مسلمین کے لئے اور اس کا نام جہنم ہے۔ مگر سب پر جہنم کا اطلاق آیا ہے جس کا ترجمہ دوزخ ہے۔ اُسی کے اُوپر کی صورت میں صراط قائم کی جائے گی جس کو عام زبان میں پل صراط کہتے ہیں۔ طبقات جہنم کے ہر دروازہ سے دُوسرے دروازہ کا فصل سات سو برس کی مسافت ہے۔ اور پل صراط کی نوعیت ممکن ہے ایسی ہو جیسے اسٹیشنوں پر پل ہوتے ہیں۔ کہ ایک ہزار برس کی مسافت اس کا صعود ہو گا اور ایک ہزار برس کی مسافت اُس کی سطح مستوی جس پر عبور ہو گا۔ اور ایک ہزار برس کی مسافت اس کا ہبوط ہو گا۔ مگر ہر شخص اپنے اپنے اعمال کے موافق عبور کرے گا۔ کوئی مثل برق خاطف کہ یا اِدھر تھی یا کوند کر ایک لمحہ میں اُدھر۔ کوئی آندھی کی رفتار۔ اور کوئی تند ہوا کی رفتار۔ اور کوئی تیز گھوڑے کی رفتار وغیرہ وغیرہ۔ سب سے پہلے اس پر عبور کرنے والی ذات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہو گی اور سب سے آخر گھٹنیوں چلنے والے اور سرینوں پر گھسٹنے والے ہوں گے۔ اور جن کو بسزاء معصیت جہنم میں جانا ہے وہ کٹ کٹ کر نیچے جہنم میں جا پڑیں گے واللہ اعلم وعلمہ اتم ونسئلہ العصمۃ من ہذہ المہالک ۱۲۔

نیز آپ نے فرمایا کہ قاتلین کا عذاب عام اہل نار کی طرح نہ ہو گا (بلکہ خاص اور شدید ہو گا) اس کے بعد ایک مثال بیان فرمائی کہ کسی با اقتدار بادشاہ کی رعایا میں یہودی بھی ہوں اور مسلمان بھی اور فرض کرو دونوں فریق کے مجرموں کی سزا کے لئے اس نے علیحدہ علیحدہ فصیل قائم کر رکھی ہو کہ مسلمان رعایا کے قاتل مجرم کو پھانسی دیکر ایک دیوار پر لٹکایا جاتا ہے۔ اور یہودی رعایا کے قاتل مجرم کو دوسری دیوار پر لٹکایا جاتا ہے۔ پس بادشاہ مسلمان مجرم کو یہود کی فصیل پر لٹکائے جانے کا حکم فرمائے تو ظاہر ہے کہ اس میں اُس کی بڑی اہانت اور خاص تذلیل کا اظہار ہے کہ (باوجود مسلمان ہونے کے اس کو سزائے جرم میں) یہودیوں کے ساتھ شامل کر دیا۔

اسی طرح دوزخ میں نار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک نار حارہ یعنی گرم آگ اور اس میں عُصاۃِ بنی آدم کو مبتلاء عذاب کیا جائے گا۔ اور ایک نار باردہ یعنی ٹھنڈی آگ (جس کا نام زمہریر ہے) اور اس میں (ناری مخلوق یعنی) شیاطین کو مبتلاء عذاب کیا جائے گا۔ اور جنہوں نے ناحق کسی کی جان لی اور قتل نفس کا ارتکاب کیا ہے ان کو اسی نار باردہ (یعنی زمہریر) میں شیطانوں کے ساتھ عذاب دیا جائے گا (تاکہ عذاب کے ساتھ شرکتِ شیاطین کی خاص اہانت و تذلیل بھی ان کے شامل حال ہو)

نیز فرمایا کہ قاتلین ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ بعض اور معصیتوں کے مرتکبین بھی (شیاطین کیساتھ

اسی عذاب میں شامل کیے جائیں گے۔ اس کے بعد آپ چاہتے تھے کہ ان معاصی کو معین فرمائیں (جن کا ارتکاب اس سزا کا سبب بنا ہے) اور ان کو زمہریری عذاب دیئے جانے کی حکمت بیان فرمائیں۔ مگر ایک شخص نے آکر قطع کلام کر دیا (اس لئے دوسری گفتگو شروع ہوگئی اور بیان ناتمام رہ گیا)

ایک مرتبہ آپ نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ جانتے بھی ہو قیامت کے دن سب سے زیادہ سخت عذاب میں کون ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ہی بیان فرماویں۔

فرمایا وہ شخص کہ جس کو حق تعالیٰ نے جسم کامل اور اعضاء صحیحہ عطا فرمائے، عقل کامل بخشی، صحت تام نصیب فرمائی۔ ہر قسم کا عیش اور رزق کے اسباب مہیا فرمائے اور اس پر ایک دن دو دن یا زیادہ اس حالت سے گذرے کہ اس کو اپنے رب کا خیال بھی کبھی نہ آیا۔ اور جب کسی گناہ پر قدرت پائی تو سارے بدن اور عقل سے اس پر ٹوٹ پڑا اور اس کے مزے لینے لگا کہ پروردگار کی طرف سے ذرہ برابر فکر بھی لاحق نہ ہوا جو اسے پریشان کر دیتا یا معصیت کی حلاوت میں کمی لے آتا۔ چونکہ اس شخص کی معصیت کے ساتھ کمال درجہ کا اتصال اور رب سے پورا انقطاع ہو چکا ہے اور جسداً و قلباً ہر طرح معصیت کی طرف مائل اور اس کو حد درجہ شیریں پا رہا ہے لہٰذا قیامت کے دن اس کی سزا بھی یہی ہوگی کہ اس کے تمام اجزاء کو جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ اور سارے کو عذاب میں ڈال دیا جائے گا۔ پس معصیت کے ارتکاب کی حالت بہت قابل اہتمام ہے۔ مومن کو چاہیئے کہ اگر معصیت بھی کرے تو اس کا علم اپنے قلب میں ضرور قائم رکھے کہ کوئی اس کا رب بھی ہے جسے اس پر ہر طرح کی قدرت حاصل ہے۔ ایسا سمجھتے ہوئے اللہ کا کچھ خوف دل میں قائم رہے گا۔ اور پھر اگر عذاب بالکل معاف نہ بھی ہو تو کم از کم اُس کا جوش فرو اور ہلکا ضرور ہو جائے گا۔

ف یہی مضمون صفحہ ۲۲ پر مذکور ہو چکا ہے۔ ممکن ہے کہ سہواً اعادہ ہوا ہو اور ممکن ہے کہ قصداً مکرر بیان کیا ہو کہ اسی پر کتاب ختم ہوئی ہے اور متنبہ کیا ہے کہ فلاح و صلاح کی اصل یہی مراقبۂ خوفِ الٰہی اور خشیۂ خداوندی ہے۔ اگر حق تعالیٰ اپنے کسی بندہ کو یہ نعمت عطا فرمادے کہ اُس کو سطوت و قدرت غیر متناہیہ اور اقتدار و مواخذہ کا استحضار رہنے لگے تو اس سے معصیت کا صدور ہی نہ ہو سکے گا۔ کیونکہ معصیت ثمرۂ غفلت ہے۔ اور اگر بحکم تقدیر صدور ہوگا تو فوراً گریہ و ندامت اور سچی توبہ نصیب ہوگی جس سے یہ سیئہ مبدل بہ حسنہ ہو جائے گی و ذالک ھوالفوز العظیم ۔

الحمدللہ کہ ابریز کا حصہ دوم بھی ختم ہوا اور اب چند امور مجھے عرض کرنا ہیں۔

(۱) اوّل میں نے کوشش کی ہے کہ شیخ کی عبارت کا نفسِ مطلب ادا کروں اور اس لئے ترجمہ کو تحت اللفظ

کے قریب رکھنے کا اہتمام کیا ہے۔ اگر توضیح کی ضرورت پیش آئی ہے تو قوسین کے درمیان عبارت کا اضافہ کیا ہے یا فائدہ کی صورت میں مستقل مضمون بڑھایا ہے۔ اگر دوبارہ اس کی طباعت میسّر و موفق ہوئی تو خیال ہے کہ خلاصہ مضمون اپنی عبارت میں ادا کروں گا کہ کتاب بھی مختصر ہو جائے گی اور عبارت بھی دلچسپ و جاذبِ قلوب بن جائے گی۔

(۲) دوم جلد اوّل صفحہ ۲۹ پر شق شجرہ کا قصہ صاحب کتاب نے سیدنا یحیٰی علیہ السلام کا بیان کیا ہے۔ مگر مشہور یہ ہے کہ یہ واقعہ سیّدنا زکریا علیہ السلام کا ہے۔ ممکن ہے کہ ذہول ہوا ہو یا کاتب کی زلت قلم ہو۔ اور ممکن ہے کہ جامع کتاب کی تحقیق یہی ہو جیسا کہ سیدنا آدم علیہ السلام کو جس درخت کے کھانے کی ممانعت ہوئی تھی مشہور یہ ہے کہ وہ گندم کا درخت تھا مگر شیخ کی تحقیق یہ ہے کہ وہ انجیر کا درخت تھا اور اُس کو بلا شک و شُبہ نہایت وثوق سے ظاہر فرمایا ہے۔ اس لئے بندہ نے وہاں اُس سے کوئی تعرض نہیں کیا کہ بحث واقعہ سے ہے نہ کہ صاحب واقعہ سے۔ خواہ کوئی کیوں نہ ہو۔

(۳) سوم اکثر کتاب کے مضامین علمی اور دقیق ہیں۔ بالخصوص انزل القراٰن علیٰ سبعة احرف اور حقیقت رؤیا اور علم الحروف کی بحث زیادہ دقیق ہے۔ چونکہ جامع کتاب علاّمہ احمد بن مبارک سلجماسیؒ جامع الفنون اور متبحر عالم تھے اس لئے ان کے سوالات بھی علم کے اُونچے پیمانہ کے تھے۔ خیال ہوا کہ طویل و دقیق ہونے کے سبب اُن کو بھی فصل مستقل کی طرح ترک کردوں۔ مگر اس خیال سے کہ تحقیق بہت پیاری اور انوکھی ہے اور قدر شناس کے لئے اس کا ایک ایک لفظ جواہرات میں تولنے کے قابل ہے، میں نے حتی الوسع اُس کو سہل بنانے کی کوشش کی ہے امید ہے کہ عوام نہیں تو خواص ذی فہم اس سے زیادہ منتفع ہوں گے۔ باقی عام اشتباہات متعلق آیات و احادیث کے اُنوکھے جوابات ہر طبقہ کے لئے بحد لذیذ اور موجب احتظاظ ہیں

(۴) چہارم برزخ اور جہنم و جنت کے ابواب بالخصوص موجبِ عبرت ہیں جن سے مسلمان عموماً غافل ہوتے جاتے ہیں۔ اس لئے ان کو بغور ملاحظہ کرنے کی ضرورت ہے۔ کہ واقعات ہیں جو عنقریب پیش آنے والے ہیں اور انسان ہر شب میں خواب کے اندر عموماً پریشان کُن صورتیں دیکھتا ہے چیختا ہے، چلاّتا ہے، لرزتا ہے، کانپتا ہے روتا ہے اور بُری طرح تنہا تکلیف پاتا ہے کہ نہ کوئی یار رہتا ہے نہ مددگار۔ ہر چند کہ عارضی ہے اور آنکھ کھلتے ہی وہ خوف کا منظر ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اتنی ہی دیر میں اُس پر جو گذرتی ہے وہ اس کا ہی دل خوب جانتا ہے زندگی تلخ اور بیداری کی ساری لذتیں ہیچ بن جاتی ہیں۔ پھر کیا پوچھنا حقیقی اور دائمی تکالیف کا جو آنکھیں بند ہوتے ہی اکیلی جان پر پڑتی ہیں کہ دفن کرنے والے اپنے سرور و آرام میں مشغول ہوں گے اور قبر میں سونے والے پر جو گذر رہی ہوگی اُس کو وہی برداشت کر رہا ہوگا۔ وہ حسرت و ندامت کا وقت ایسا ہوگا

کرنہ حسرت کچھ نفع دے گی نہ ندامت۔ پس زد و کوب ہوگی اور اس کی ناقابل برداشت تکلیف۔ پس اگر ایمان ہے کہ مرنا ہے اور برزخ وجنّت وجہنم کوئی چیز ہے جیسا کہ مقتضا ہے اسلام کا اور دعویٰ ہے ہر مسلمان کا تو اُس کے انتظام اور تحفظ آلام کا یہی وقت ہے جس کا نام زندگی ہے اس لئے غفلت نہ کرو اور بیدار ہو جاؤ کہ صدہا کو اپنے ہاتھوں نہلا و کفنا اور زیر خاک دفنا و سلا چکے ہو۔

(۵) پنجم قطب اور غوث وغیرہ ناموں کا ذکر اگرچہ قرآن مجید و احادیث شریفہ میں نہیں آیا۔ مگر درجات ولایت وخدمات تکوینیہ کے مراتب کا فرق بتانے کے لئے یہ ایسی اصطلاحات ہیں جیسے محدثین میں ثبت حافظ اور حجتہ وغیرہ، اور درجاتِ حدیث ظاہر کرنے کے لئے صحیح وحسن وغیرہ علمار کی اصطلاحات ہیں۔ اور خدمتِ تکوینیہ کے ثبوت کی اصل سیّدنا خضر علیہ السلام کا قصہ ہے جو قرآن مجید میں مفصل مذکور ہے۔ کہ سیّدنا موسیٰ علیہ الصّلوٰۃ والسّلام ان کی ملاقات کے لئے تشریف لے گئے اور صورۃً خلاف شرع متعدد واقعات پیش آئے جن کو سیدنا موسیٰ علیہ السلام ضبط نہ فرما سکے اور اُن پر اعتراض کیا۔ اس لئے اسکے اثبات کے لئے مزید دلائل کی ضرورت نہیں ہے۔

(۶) ششم تمامی کتاب کے ارشادات سے مقصود اصلاحِ حال اور حق تعالیٰ شانہٗ کے ساتھ غلامانہ برتاؤ درست رکھنے کی ترغیب وتلقین ہے۔ جس کا طریق یہ ہے کہ اوّل عقائد اہل السنت والجماعۃ اختیار کریں۔ اور پھر حق تعالیٰ کے اوامر کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کا پورا اہتمام کریں۔ اعمال حسنہ پر مُواظبت کریں، اور محبت وشوق کے ساتھ کریں اور حق تعالیٰ شانہٗ کی سطوت و ربوبیت کا استحضار رکھ کر محض اُس کے شاہانہ حکم کی تعمیل میں کریں کہ اخلاص اسی کا نام ہے۔ جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دامنِ مبارک کو باب عطاء الٰہی سمجھ کر اس مضبوطی کے ساتھ پکڑیں کہ دوسرے نبی کی تعلیم بھی اس میں تذبذب پیدا نہ کرے۔ چہ جائیکہ قومی رواج یا آبائی رسُوم۔ اگر مباح پر بھی عمل کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ سیّدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے چونکہ اس کو مباح بتایا ہے اس لئے اس کو اختیار کرتا ہوں۔ ایسا کرنے سے مباح بھی طاعت بن جائے گا۔ اخلاق ہوں یا عادات اور معاملات ہوں یا معاشرت اور نشست و برخاست ہو یا رفتار وگفتار ہر امر اور ہر حال میں اتباعِ سُنّت کا شوق ہو اور ہر بن مُو میں سرور عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم کی محبّت ہو کہ آپ کی محبت ——— واطاعت کے بغیر نجات وفلاح ہرگز نصیب نہیں ہو سکتی۔

(۷) ہفتم چونکہ سید الانبیا صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے تشریف لے گئے ہوئے ساڑھے تیرہ صدیاں [۱۳۵۰] گذر چکیں اور جو لمحہ بھی اس زمانۂ خیر القرون سے بعید ہوتا جاتا ہے وہ ظلمت بڑھاتا جاتا ہے۔ اس لئے آج

جو بھی دین سے وحشت اور دنیا کی فرطِ محبت عامۂ قلوب میں بڑھ گئی ہے" بس اس کی فریاد اللہ کریم سے ہے کہ اے ڈوبتی کشتی کے کھیون ہار، اور اے نبی اسرائیل کو قعرِ مذلت سے نکالنے والے جبار و قہار، اپنے محبوب کی امت کو سنبھال اور اُس کی اصلاح میں اپنی قوت جبروتی کا اظہار فرما، اور ہم کو اُس نادان بچہ کی طرح پرورش کر جسے اپنے بُرے بھلے کی تمیز نہیں۔ ہمارے دِلوں میں اپنے دین کی عظمت اور شریعت کی محبت ڈال، اور آنکھوں میں وہ نور عطا کر کہ ریت اور پانی کا فرق نظر آوے۔ یا ارحم الراحمین ہمیں اپنی محبت بخش کہ ساری دنیا ہمیں محبوب سمجھے، ہمارے قلوب میں اپنی عظمت اور اپنا خوف بھر دے کہ ہر دشمن ہماری عظمت کرنے اور ہم سے ڈرنے پر مجبور ہو۔ اے ربِ محمدؐ ہم پر بلا استحقاق رحم و لطف و کرم فرما کہ صاحب اقتدار بنیں تو عمر فاروق رضؓ کی طرح جس کے داہنے ہاتھ میں شریعت تھی اور بائیں ہاتھ میں سیاست و حکومت۔ اور اگر نادار و بدحال رہیں تو اس طرح کہ شریعتِ مطہرہ ہماری لیلیٰ اور شیریں ہو اور ہم اس کے مجنوں اور فرہاد۔

(۸) ہشتم اللہ پاک کی مشیت تھی کہ زمانۂ ترجمہ کی پوری ششماہی اس طرح گذری کہ یا خود بیمار رہا یا متعلقین بیمار رہے۔ محض اُس کا فضل تھا کہ اسی بیماری و تیمار داری میں یہ خدمت بھی انجام پاتی رہی ناظرین سے استدعا ہے کہ کوئی غلطی پائیں تو اصلاح فرمائیں اور بندۂ ناچیز کے لئے دعائے حُسنِ خاتمہ کریں۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین وصلے اللہ علی سیدنا و مولانا و شفیعنا محمد وآلہٖ وصحبہٖ وبارک وسلم۔

بندۂ ناچیز
عاشق الٰہی عفی عنہٗ (مولوی فاضل) میرٹھی

کتابخانہ احمد ہارون موسیٰ

مدارج النبوت اردو

حضرت علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی
کی
رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائل و فضائل
حیاتِ طیبہ پر جامع و مانع کتاب

جلد اوّل

اس میں رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیاتِ سابق و آخر اور افضل الکائنات کو دلائل عقلی و الہامی اور اثباتِ فکری اور روحانی سے ثابت کیا گیا ہے۔ اس جلد میں ان امور پر بھی بحث کی گئی ہے جو شرفِ حسب و نسب، شرفِ نبوت و رسالت، شرفِ ابوت، شرفِ عصمت اور شرفِ معجزات سے متعلق ہیں اور کمال تو یہ ہے کہ ان خصائص اور فضائل کو قرآن پاک کی آیات سے ثابت کیا گیا ہے۔ اندازِ تحریر اور طریقۂ استدلال اتنا پیارا اور دلنشیں ہے کہ بات دل و دماغ میں آتی چلی جاتی ہے اور بہت سے ایسے شکوک و شبہات جو مادیت اور الحاد کے پیدا کردہ ہیں خود بخود زائل ہو جاتے ہیں اور دل و دماغ دولتِ ایمانی سے مالا مال ہو جاتے ہیں ——— خوشنما کتابت ——— آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت، مضبوط پلاسٹک کا خوبصورت کور ——— سائز ۲۰×۲۶ ——— آٹھ سو سے زائد صفحات ——— قیمت :- چوبیس ۲۴ روپے

جلد دوم

اس جلد میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ اور متعلقات حیات مبارکہ کو پیش کیا گیا ہے۔ طلوع آفتاب رسالت، اہالیانِ مکہ کے شدائد، رسول اکرم کی استقامت، ہجرت، غزوات، سرایے، دربار نبوی کے فیصلے، اصحاب سے آپ کا برتاؤ، غیروں سے حسن سلوک، ازواج مطہرات کے حالات، اولادوں کا ذکر، یہاں تک کہ جس کو رسولِ مقبولؐ سے ذرا سی بھی کسی قسم کی نسبت تھی اس تک کے حالات ایسے دلکش اور پیارے انداز میں تحریر کیے ہیں کہ جنھیں پڑھ کر حضرت علامہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ کو علم کا بحرِ ذخار تسلیم کر لینا پڑتا ہے جو کچھ لکھا ہے عشقِ رسول میں ڈوب کر لکھا ہے اور جو بھی انھیں پڑھے گا ان ہی کیفیات کو اپنے دل میں محسوس کریگا۔ یہ بات بھی پورے وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ اردو میں اس کے مکمل ترجمے اور اشاعت کا فخر صرف مدینہ پبلشنگ کمپنی کراچی ہی کو حاصل ہے۔ اس کا ترجمہ مفتی غلام معین الدین مراد آبادی نے کیا ہے۔ جس کیلئے وہ ہم سب کے شکریے اور تحسین کے مستحق ہیں ——— خوشنما کتابت ——— آفسٹ کی دیدہ زیب طباعت ——— مضبوط پلاسٹک کا خوبصورت کور سائز ۲۰×۲۶ ——— ایک ہزار سے زائد صفحات ——— قیمت :- چوبیس روپے

مدینہ پبلشنگ کمپنی

بندر روڈ، کراچی